اول المسلمین

محمدؐ کی کہانی

اردو ترجمہ

لیزلی ہیزلٹن

عمر بنگش

اول المسلمین

محمدؐ کی کہانی

The First Muslim: STORY OF MUHAMMAD

لیزلی ہیزلٹن

اردو ترجمہ

عمر بنگش

جملہ حقوق محفوظ ہیں2020ء

www.omerbangash.com

فہرست

فہرست	III
پیش لفظ	1
حصہ اول: یتیم	3
باب:1	3
باب:2	9
باب:3	20
باب:4	27
باب:5	36
باب:6	48
باب:7	57
حصہ دوم: جلاوطن	66
باب:8	66
باب:9	77
باب:10	87
باب:11	99
باب:12	110
باب:13	123
باب:14	134
باب:15	148

باب:16 159
باب:17 168
باب:18 178
حصہ سوئم: رہنما 191
باب:19 191
باب:20 200
باب:21 210
ماخذ/ حوالہ جات 221

پیش لفظ

محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اول المسلمین اور خاتم النبیین ہیں۔ آپ کی زندگی پر ہزاروں کتابیں لکھی جاچکی ہیں جو لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں صفحات پر مشتمل ہیں۔ ان تصانیف کے مصنفین بھی سینکڑوں ہیں۔ علماء، محققین اور تاریخ دان وغیرہ۔ ان میں مسلم اور غیر مسلم، ہر طرح کے لوگ شامل ہیں۔ محمد مصطفیٰ کی زندگی چونکہ مسلمانوں کے لیے مشعل راہ کی حیثیت رکھتی ہے، ان ساری تصانیف کی اہمیت اپنی جگہ بڑھ کر ہے۔

مشرق، بالخصوص اسلامی دنیا کے علاوہ مغرب میں بھی تاریخ دان اور محققین نبی کریم کی زندگی پر تحقیق جاری رکھتے ہیں اور اس ضمن میں بے شمار کتب اور مقالات شائع ہو چکے ہیں۔ سنجیدہ مغربی مصنفین کا مقصد اسلام کے ابتدائی دور اور نبی کریم کی زندگی کو عقلی بنیادوں پر سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یعنی، اکثر دلچسپی کا سامان تاریخ اور اس سے جڑے عوامل ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں چونکہ اسلام اور نبی کریم کی زندگی کا آج کے دور میں معاشرت، سیاست، عقائد اور نظریات پر گہرا اثر ہے، مغرب میں کی جانے والی سنجیدہ تحقیق اس لیے بھی دلچسپی سے بھرپور ہے کہ آج کے دور میں اس بابت سمجھنے کے جدید رخ اور جہتیں میسر آ سکتی ہیں۔

زیر نظر کتاب، برطانوی نژاد امریکی مصنفہ لیزلی ہیزلٹن کی تصنیف ہے۔ ہیزلٹن سیاست، مذہب اور تاریخ پر کئی کتابیں اور مقالات پیش کر چکی ہیں۔ چونکہ وہ جامعہ میں نفسیات کی طالب علم رہ چکی ہیں تو اپنی دوسری تصانیف کی طرح اس کتاب میں بھی نبی کریم کی سوانح حیات میں بجائے صرف واقعات کے بیان پر توجہ کے ہر واقعے کا تاریخی، معاشرتی اور نفسیاتی پس منظر، وقت اور حالات کے مطابق وجوہات اور کرداروں، بالخصوص نبی کریم کی نفسیاتی حالت کا تفصیلی جائزہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی کریم کے زندگی کا احوال بیان کرتی دوسری سوانح عمریوں سے یہ کتاب 'The First Muslim' قدرے مختلف معلوم ہوتی ہے۔

اردو زبان میں پہلے ہی نبی کریم کی اسوہ حسنہ پر کئی کتابیں دستیاب ہیں۔ اس کتاب کی بنیاد یعنی اوائل تاریخ اسلام میں تحریر کی جانے والی پہلی 'سیرۃ رسول' (ابن اسحاق) اور 'تاریخ اسلام' (ال طبری) بھی اردو میں دستیاب ہیں۔ مگر اس کتاب اردو ترجمہ پیش کرنے کا مقصد اول، اردو زبان سمجھنے والے قارئین جو دلچسپی رکھتے ہوں، انہیں سنجیدہ مغربی محقق اور تاریخ دان کی نظر سے نبی کریم کی زندگی کو دیکھنے کا موقع مل سکے اور دوم یہ کہ، اس کتاب کے ذریعے اس دور کے حالات اور واقعات کو عقلی خوردبین سے جانچا جاسکے۔

چونکہ، یہ کتاب خالصتاً تحقیق، نفسیات اور تاریخ کے حقائق پر مشتمل ہے تو بعض قارئین کو اس کا بیان اور مواد اچھوت معلوم ہو۔ یہ فطری ہے۔ اسی طرح، دوسری کتابوں کی طرح یہ ترجمہ سادہ اردو زبان میں ترتیب دیا جارہا ہے۔ اس کا بنیادی مقصد مجھ جیسے عام فہم رکھنے والے قارئین کے لیے نبی کریم کو علامت کی بجائے ایک انسان کے طور پر جاننے کا موقع فراہم کرنا ہے۔ اور عقیدت کی

بجائے حقائق پر مبنی یا داشت ترتیب دینا ہے۔ یہاں یہ باور کرانا لازم ہے کہ اس کتاب کا سارا مواد اوائل دور میں لکھی گئی دو تواریخ، سیرۃ النبی (ابن اسحاق) اور تاریخ اسلام (ال طبری) سے لیا گیا ہے۔ یہ دونوں ذرائع تاریخ اسلام اور اسوۂ رسول کے حوالے سے انتہائی مستند سمجھے جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں کئی دوسرے حوالوں سے بھی کام لیا گیا ہے، جن کی مکمل فہرست کتاب کے آخر میں فراہم کی گئی ہے۔

یہاں ایک نکتہ، جس کی طرف اس بلاگ کے قارئین کی توجہ دلانا لازم ہے اور یہ بات واضح کر دی جائے کہ مصنف اور مترجم دونوں کی ہی نظر میں نبی کریم محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے اصحاب کا ادب ہر صورت برقرار ہے۔ کتاب کے مندرجات کی روانی برقرار رکھنے کے لیے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے لیے محمدؐ اور باقی برگزیدہ ہستیوں کے صرف پہلے نام استعمال کیے گئے ہیں۔ اس سے نہ صرف بیان کی روانی اور دلچسپی برقرار رہے گی بلکہ کتاب کا بنیادی مقصد یعنی اس طرح ان تمام ہستیوں کے شخصی خاکے ابھر کر سامنے آپائیں گے۔ ہم ان سے بطور انسان آشنا ہو سکیں گے۔ قارئین پر واضح رہے کہ تمام برگزیدہ ہستیوں کے لیے تکریم نام، خطاب اور القاب کے ساتھ اور ان کے بغیر، ہر دو حالتوں میں جوں کی توں، قائم ہے۔

اسی طرح یہ نکتہ بھی باور کرانا لازم ہے کہ اس کتاب کا ترجمہ انتہائی احتیاط سے ترتیب دیا جا رہا ہے۔ مگر تمام مندرجات لیزلی ہیزلٹن کی انگریزی زبان میں تصنیف 'دی فرسٹ مسلم' سے لیے گئے ہیں۔ یہ اسی کتاب کا اردو ترجمہ، 'اول المسلمین' کے نام سے شائع کیا جا رہا ہے۔ کتاب کا اردو اور انگریزی عنوان سورۃ انعام آیت 163 سے لیا گیا ہے۔ کتاب اور اس سے متعلق تحقیق، مواد کی صحت اور حقوق مصنفہ سے منسوب اور سختی محفوظ ہیں۔ مواد کی صحت کے حوالے سے یہ بات یاد رہے کہ تمام مواد اوائل تواریخ اسلام کے مستند ذریعوں سے لیے گئے ہیں۔ ان حوالوں کے سوا بھی کئی دوسرے ذرائع اس کتاب کو تشکیل دینے میں استعمال کیے گئے ہیں۔ اس بارے، کتاب کے آخر میں تفصیلات فراہم کی گئی ہیں اور انگریزی نسخے میں مفصل حوالے دیے گئے ہیں۔

مزید براں یہ ترجمہ کتاب کا لفظ بہ لفظ ترجمہ نہیں ہے۔ بلکہ انگریزی سے اردو میں ڈھالتے ہوئے، زبان کے قواعد، روانی اور ضرورت کے ساتھ ساتھ چاشنی کو بھی ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے۔

نبی کریم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شخصیت بہت ہی قد آور ہے اور ان کی زندگی کے آج تک مرتب ہونے والے اور مستقبل میں دور رس اثرات اتنے زیادہ ہیں کہ شاید کوئی بھی کتاب ان کا کلی طور احاطہ نہ کر سکے۔ اس کتاب اور ترجمے کو ایک کاوش، علمی سمندر میں ایک اور قطرہ اور سوچنے کی ایک سادہ مگر نئی جہت کے طور پر پڑھا اور سمجھا جائے۔

عمر بنگش

حصہ اول: یتیم

باب:1

اس تاریک رات میں محمدؐ کا تن تنہا پہاڑی پر عبادت کی غرض سے موجود ہونے کے سوا، کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ آپ خطہ حجاز کے شہر مکہ کے ایک شہری ہیں۔ قدیم ترین تاریخی ذرائع بھی ان کی شبیہ کو مبہم انداز میں بیان کرتے ہیں۔ جیسے، 'محمدؐ کا قد نہ تو لمبا تھا اور نہ ہی چھوٹا۔۔۔' یا، 'وہ نہ تو گورے تھے اور نہ ہی کالے۔۔۔' اسی طرح، 'بہت بھاری بھر کم اور نہ ہی دبلے پتلے۔۔۔' وغیرہ۔ پھر بھی، بعض معلوم حقائق سے ہم ان کی ہیئت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ جیسے، جو شخص مسلسل کئی راتیں تنہائی کے عالم میں مراقبہ میں بسر کرتا ہو۔ وہ یقیناً دبلا اور تنہائی پسند ہو جائے گا مگر اس مشقت کے قابل آدمی جسمانی اور اعصابی طور پر کمزور نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح جا بجا دہرایا گیا ہے کہ محمدؐ کے رخسار گول اور کھلتے ہوئے تھے جبکہ روایتی عربوں کی طرح رنگت سرخی مائل تھی۔ قدرے بھاری ڈیل ڈول کا سخت جسم اور نسبتاً ابھری ہوئی چھاتی کی وجہ سے چال میں مخصوص انداز پیدا ہو گیا تھا۔ پیدل چلتے ہوئے گندھے میں خم پڑ جاتا، گویا کسی چیز کی جانب یا آگے کی طرف تیزی سے لپک رہے ہوں۔ محمدؐ کے ہم عصر بتاتے ہیں کہ وہ مڑ کر کسی کی طرف دیکھتے تو بجائے اس کے صرف سر کو گھمائیں، پورے جسم کو موڑ کر دیکھتے تھے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی گردن میں لچک نہیں تھی۔ عربوں سے منسوب اگر کوئی روایتی وجاہت تھی تو وہ آپ کا خاندان اور چہرہ تھا۔ ناک لمبی اور خطف جو حجاز میں شرافت، اعتبار اور امانت داری کی علامت سمجھی جاتی تھی۔

پس، عمومی لحاظ سے کہیں تو محمدؐ مکہ کے ایک اوسط باشندہ تھے۔ اس رات وہ چالیس کے پیٹے میں ایسا شخص ہیں جس نے کبھی یتیمی میں آنکھ کھولی تھی مگر آج اپنے لیے ایک ایسی زندگی بنانے میں کامیاب ہو چکے تھے جو عام حالات میں شاید ممکن نہ ہوتی۔ آپ نے ایسا بچپن پایا کہ کنبے، قبیلے اور معاشرے کے لیے اجنبی ہو کر رہ گئے۔ پھر بھی چالیس سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے، خود کی پہچان منوالی تھی۔ انتہائی مشکل حالات اور ہر طرح کے مسدود راستوں کے بیچ میں سے اپنے لیے اچھی خاصی دنیا بنالی تھی۔ اس رات محمدؐ خوش خرم، شادی شدہ، بھرے پرے گھر میں، منافع بخش کاروبار اور اپنے حلقہ احباب میں اچھے خاصے باعث عزت و تکریم۔۔۔ الغرض دنیاوی لحاظ سے ہر طرح کامیاب تھے۔ یہ ساری کمائی بے انتہا محنت کا نتیجہ تھا (تھی)۔ لوگ محمدؐ کو اچھی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ان کے خیال میں، محمدؐ امر اشہر میں وہ آدمی تھے جس نے اپنے بل بوتے پر اپنے لیے دنیا قائم کی تھی اور دلچسپ بات یہ کہ سب کچھ بنانے (میں) اخلاقی طور پر کوئی چوک نہیں ہوئی۔ محمدؐ نے کسی بھی اوچھے ہتھکنڈے، زیادتی سے کام نہیں لیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ مکہ کا تقریباً ہر آدمی اپنے معاملات میں محمدؐ سے رائے لیتا۔ لوگوں کے نزدیک محمدؐ کے کوئی مخفی مفادات نہیں تھے۔ جس طرح کے حالات میں انہوں نے پرورش پائی تھی، قبیلے اور کنبے کی رکاوٹیں ان کے لیے بے معنی تھیں۔ وہ سیدھے سادھے، سچے اصولوں کو مانتے تھے۔ لہٰذا، فیصلہ کرنے میں وہ کسی بھی قسم کی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے تھے۔ سب سے بڑھ کر یہ تھا کہ محمدؐ کا کوئی فیصلہ ناانصافی پر مبنی نہیں ہوتا تھا۔ یوں، ادھیڑ عمری تک پہنچتے محمدؐ نے معاشرے میں ہر طرح سے عزت اور تکریم پالی تھی، رتبہ اور حق پایا تھا۔ اسی طرح تجارت میں اتنا مال بھی کمالیا تھا کہ اب باقی ماندہ زندگی، مکہ کے شہری علاقے میں آرام اور سکون سے بسر کر سکتے تھے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر سب کچھ ہونے کے باوجود محمدؐ تن تنہا، رات کی تاریکی میں اپنا گھر بار چھوڑ کر اس پہاڑی پر شب بیداری کیوں کر رہے تھے؟ جب پورا شہر نیند میں ڈوبا ہوا تھا تو ایسے میں ایک خوشحال، شادی شدہ شخص آخر عبادت کی غرض سے سہولت اور آرام کو وداع کیوں کرے گا؟ سب کچھ ہوتے ہوئے، اس طرح تارک دنیا کیوں ہو جائے گا؟

اس بابت ایک اشارہ ہے۔ یہ اشارہ، محمدؐ کے لباس میں ہے۔ جتنی دولت ان کے پاس تھی وہ یقیناً مہنگے، ریشمی لباس خرید کر پہن سکتے تھے۔ مگر اس وقت انہوں نے سستا، عام کپڑا زیب تن کر رکھا ہے۔ گھر کی کھڈی پر بُنا کپڑا، جس میں پیوند نہ لگے ہوتے تو تار تار ہو کر بکھر جاتا۔ یہ لباس صحرا کی ٹھنڈی راتوں میں تن ڈھانپنے اور سردی سے بچانے کے لیے کافی بھی نہیں ہے۔ جوتی ٹوٹی ہوئی ہے اور چمڑے سے بنے کمربند، کوزے اور تسمے کا رنگ دھوپ میں اڑ چکا ہے۔ محمدؐ پہاڑی پر، غار کے منہ پر آگے کو خم کھائے مراقبہ میں قیام کی حالت بنائے اس طرح کھڑے ہیں جیسے منہ زور ہوا کے سہارے پر ہوں۔ ایسے میں جسم گویا زمین کی مساوی سطح پر ایک زاویہ بنا رہا ہے۔

غور و فکر کرنے کے لیے اس سے موزوں جگہ دوسری نہیں ہو سکتی۔ رات کے پچھلے پہر، اس حالت میں کوئی بھی دنیا پر سوچ دھرے تو وہ اس کو مختلف پائے گا۔ ایسی جگہ پر خیال جداگانہ انداز میں پنپتا ہے۔ ظاہر ہے، جس طرح کی طبیعت تھی، محمدؐ کو خامشی (خاموشی) میں سکون ملتا ہو گا۔ یہاں، پہاڑی پر ان کا ساتھ دینے کے لیے صرف سنسناتی ہوئی ہوا ہے۔ دنیا اور مافیہا، معاملات اور واقعات سے دوری میسر ہے۔ شہر کے برعکس یہاں مکمل سکوت ہے۔ شہر میں تو لوگ صرف طاقت اور مال و دولت کی گردان پڑھتے (کرتے) ہیں۔ یہ واحد جگہ ہے جہاں دماغ سوچ اور مشاہدے کے لیے آزاد ہے۔ اس طرح کی خلوت میں ایک وقت ایسا آتا ہے کہ آدمی سوچنا ترک کر دیتا ہے۔ مشاہدے سے گریز کرنا ضروری ٹھہرتا اور بالآخر اس جہان اور قدرت سے منسوب بے پایہ وسعت سے تعلق، ایک رابطہ بن جاتا ہے۔

قریب سے دیکھیں تو محمدؐ کی آنکھوں کے کونے کھدروں میں تنہائی نظر آئے گی۔ ایسے شخص سے واسطہ پڑے گا جس کی نظر تنہائی تلاش کرتی ہے۔ بلاشبہ، محمدؐ کو اس بات کا ادراک ہے کہ ایک وہ وقت تھا جب یہ اس معاشرے، قبیلے اور کنبے میں تقریباً نو وارد تھے۔ غربت کا وہ عالم تھا اور ابھی یہ دور ہے کہ سب کچھ میسر ہے۔ جب سب کچھ ہے تو یہ ایسے میں سچائی پھن پھیلا کر سامنے کھڑی ہے کہ دنیاوی معاملات، یہ حاصل بے معنی ہے۔ یہ تلخ حقیقت تنہائی کے عالم میں کسی بھی سوچنے سمجھنے، غور کرنے والے کسی بھی شخص کے روبرو ننگے کھڑی کر سکتی ہے۔ محمدؐ کے ادھ کھلے ہونٹوں پر مراقبے کی حالت میں جو سرگوشی ورد جاری ہے۔ اس میں محتاجی، اس خوف کی بابت ذات مقدس کے حضور التجا سنی جا سکتی ہے۔ اس ضمن میں محمدؐ کی بحیثیت انسان محتاجی، بے بسی واضح ہے۔ جو بھی ہو پھر بھی ہم کہہ سکتے ہیں کہ، آخر جب ایک شخص کو سب کچھ حاصل ہے۔ دنیاوی آرام اور سہولت بھی میسر ہو تو پھر اطمینان کیوں نہیں۔ آخر چین کیوں نہیں پڑتا؟ کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ محمدؐ نے یہ سب کچھ مشکلات کا سامنے کرنے کے بعد، انتہائی مشقت اٹھا کر کمایا ہے؟ اب بعد اس کے، جب سب کچھ حاصل کر لیا تو ان کو یقین نہیں کہ یہ باقی رہے گا یا یہ سب ان کے ہاتھ سے چھن بھی سکتا ہے۔ یا شاید، جیسا کہ معاشرے نے اپنے تئیں طے کر رکھا تھا، اس کمائی پر، عزت و تکریم پر ان کا حق نہیں تھا؟ یتیمی میں جنم لینے والا تو اس معاشرے میں صرف محتاجی کا مستحق ہوتا ہے۔ محمدؐ نے جو رتبہ اور مقام بنا لیا تھا، کیا وہ اس معاشرے کے لیے انوکھی بات نہیں تھی؟ یا شاید، بات یہ نہیں تھی۔ معاملہ تو کچھ اور تھا۔۔۔

یہ کچھ اور کیا تھا؟ وہ کیا تلاش کر رہے تھے؟ شاید اپنے اندر روحانی سکون، اطمینان کی تلاش میں تھے؟ یا صرف اسی پر اکتفا نہیں، وہ تو اس سے کچھ بڑھ کر چاہتے تھے۔ شاید، وہ دل ہی دل میں رب ذوالجلال کا جلوہ یا اس کی طرف سے ایک اشارہ دیکھنا چاہتے تھے۔ یکتائی اور روحانی طلب سے بڑھ کر کوئی اشارہ، ایک کنایہ جو اس سب دنیا، جہان اور اس کے معاملات سے بڑھ کر ہوتا؟

ہم چاہے جیسا بھی گماں پال لیں مگر ایک بات طے ہے۔ اس بات کا اقرار خود محمدؐ نے بھی کر رکھا ہے کہ سن 610ء کی اس رات مکہ شہر کے باہر حرا کی پہاڑی پر جو واقعات پیش آئے تھے، وہ ان کے لیے بھی غیر متوقع تھے۔ وہ اس واردات کے لیے ہرگز تیار نہیں تھے۔

اس رات ایک انسان کا سامنا ذوالجلال، حق ربانی سے ہوتا ہے۔ ایک عقل پسند کے لیے یہ بات حقیقت نہیں ہو سکتی۔ عقل پر یقین رکھنے والوں کے یہاں یہ زیادہ سے زیادہ ایک پر لطف، افسانوی قصہ شمار ہو گا۔ مگر محمدؐ نے اس واقعے کے بعد انوکھا ردعمل ظاہر کیا ہوتا جیسا کہ اس طرح کے کسی بھی پر لطف، افسانوی قصے میں سوچا جا سکتا ہے تو ہم کہہ سکتے تھے کہ یہ ایک افسانہ، گھڑی ہوئی داستان ہے۔ حقیقت میں مگر، محمدؐ کا ردعمل بالکل مختلف ردعمل تھا۔ یہ خالصتاً انسانی تھا۔

وہ پہاڑ سے نیچے یوں نہیں اترے کہ ہواؤں میں اڑتے ہوں یا دوڑے دوڑے چلے آتے ہوں۔ نعرے لگاتے، تکبیر بلند کرتے شہر میں داخل نہیں ہوئے تھے۔ یہاں تک کہ محمدؐ واپس ہوئے تو ان کے گرد کوئی روشنی بھی نہیں پھوٹ رہی تھی۔ انہیں فرشتوں نے گھیرے میں نہیں لے رکھا تھا اور نہ ہی وہ فرشتے جنت کے راگ الاپ رہے تھے۔ ایسا کچھ بھی تو نہیں ہوا۔ وجدان کا عالم اور نہ ہی کوئی سنہری روشنی کا ہالہ۔۔۔ کچھ بھی نہیں۔ حتیٰ کہ اس رات بحیثیت پیغمبر خدا، ان کا کردار بھی واضح نہیں کیا گیا تھا۔ بس قران کی چند ابتدائی آیات سونپ دی گئی تھیں۔ قصہ مختصر، محمدؐ نے بعد اس واقعہ ایسا کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا، جس سے محسوس ہوتا ہو کہ اس شخص نے ناممکن کو ممکن کر دکھایا ہے۔ بالآخر، کئی رتجگوں کے بعد حق واحدنیت کا جلوہ ہو گیا ہے۔ مراقبوں کے نتیجے میں انہوں نے دوسرے جہان سے ربط پیدا کر کے انہونی کر دی ہے۔ غور کریں تو اس واقعہ کے فوراً بعد محمدؐ کا رویہ قطعاً ایسا نہیں ہے کہ اس واقعہ کی صحت پر شک کر سکیں۔ یک جنبش قلم اس واردات کو رد کر دیں یا اس کو اختراع کہنے کا موقع ڈھونڈیں۔۔۔ یا کہیں کہ محمدؐ کو کوئی مغالطہ، کچھ وسوسہ سا ہوا ہے۔ اس معاملے میں ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ سب سے پہلے خود محمدؐ نے اپنے ساتھ پیش آنے والے اس واقعہ کی صحت پر سوال اٹھایا۔ وہ خود شبہ میں گرفتار تھے۔ اس طرح کی واردات ایک عام شخص کے لیے زیادہ سے زیادہ نفسیاتی ہذیان ہو سکتا ہے۔ شاید حواس دھوکہ دے گئے۔۔۔ آنکھ اور کان چوک گئے ہوں۔ نہیں تو شاید، دماغ کوئی کھیل کھیلتا ہو؟ سب سے بدتر صورتحال یہ ہو سکتی تھی کہ شاید کسی شریر جن کا سایہ آگیا تھا۔ شیطان نے ان کے ساتھ یہ چال چلی ہو۔ یہ بات خطرناک تھی کہ اس صورت میں تو محمدؐ کی جان بھی جا سکتی تھی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ خود محمد کو یہ گماں ہوا کہ وہ جنون کی حالت میں چلے گئے، مجنوں ہو گئے۔ یہی وجہ تھی کہ جب وحی ہو چکی تو انھوں نے خود کو زندہ پا کر اپنی جان لینے کے بارے میں بھی سوچا۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ اس دہشت اور ہیبت سے چھٹکارا پانے کے لیے بہتر یہ ہو گا کہ وہ اس پہاڑ کی اونچی چٹان سے کود کر جان دے دیں۔ یوں، اس حالت، دہشت ناک کیفیت سے جان چھوٹ جائے گی۔

یہی وہ حالت تھی کہ اس واقعہ کے بعد، ہم دیکھتے ہیں کہ حرا سے واپسی پر محمدؐ کی حالت ابتر تھی۔ وہ خوشی سے جھوم نہیں رہے تھے۔ محمدؐ پر خوف طاری تھا۔ وہ شدت خوف سے کپکپا رہے تھے۔ ان پر ایقان نہیں شک اور شبہ کا غلبہ تھا۔ ہاں، ان کو اس ایک بات کا یقین ضرور تھا کہ یہ جو بھی معاملہ پیش آیا تھا، وہ خود کو اس قابل نہیں سمجھتے تھے۔ ایک ادھیڑ عمر شخص کے ساتھ یہ معاملہ کیسے پیش آسکتا ہے جو صرف اور صرف سکون، اطمینان چاہتا تھا یا زیادہ سے زیادہ خدا کی طرف سے ایک جھلک اور اشارہ مانگتا تھا۔۔۔ اس قدر بھاری بھر کم، الہامی نزول کیونکر ہو سکتا تھا؟ اگرچہ محمدؐ کو اپنی جان کی فکر نہیں تھی مگر ان کو اپنے ہوش اور حواس یقیناً عزیز تھے۔ ان کو ڈر یہ تھا کہ شاید تنہائی میں، شہر سے دور مراقبہ کی غرض سے گزاری ہوئی کئی راتوں کے نتیجے میں ذہنی حالت اپنی انتہا کو چھو گئی ہے۔ انتہائی صورت میں، شاید وہ اس حالت میں جانبر نہ ہو پائیں، مکمل طور پر ہوش و حواس نہ کھو دیں۔

غار حرا میں جو بھی ہوا۔۔۔ محمدؐ کا ردعمل انسانی تھا۔ یہی ردعمل تاریخ میں اس واقعے کی سچائی کو ظاہر کرتا ہے۔ آپ شاید سوچتے ہوں کہ وہ الفاظ جو محمدؐ نے سنے تھے، کیا وہ خود ان کے اندر کی آواز تھی یا یہ ان پر بیرون سے وارد ہوئے تھے؟ اس سے قطع نظر اہم بات یہ ہے کہ محمدؐ کا ان الفاظ، اس کیفیت سے سامنا ہوا۔ یہ اس قدر طاقتور تجربہ تھا کہ ہوش اڑ گئے۔ ان پر طاری ہونے والی ہیبت فطری تھی۔ قدرتی طور پر ایک انسان کی نفسیاتی و اعصابی حالت، اس طرح کی واردات پر یوں ہی منتج ہوتی۔ دہشت اور نفی کی حالت۔ اگر محمدؐ کا یہ ردعمل کسی کو بھی غیر فطری محسوس ہوتا ہے تو یہ اس بات کی غمازی ہے کہ ہمیں روحانی تجربات اور ان پر ردعمل بارے کس قدر گمراہ کن قصے اور کہانیاں پڑھائی جاتی رہی ہیں۔

یہاں ایک معاملہ اور بھی ہے۔ عقلیت پسندوں کو چھوڑ، اس بحث کو ایک طرف رکھ کر سوچیں۔ خود مسلمانوں میں، بالخصوص قدامت پسند مسلمان اس بات سے اتفاق نہیں کرتے کہ نزول وحی کے بعد محمدؐ نے خودکشی کے بارے میں سوچا ہوگا۔ وہ اس بات کا تذکرہ کرنے سے کتراتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ محمدؐ کی اوائل سوانح حیات میں اس کا بھرپور اور واضح ذکر موجود ہے۔ قدامت پسند اس بات پر مصر ہیں کہ محمدؐ کو ایک لمحے کے لیے بھی ایسا کوئی گماں نہیں ہوا۔ ان کو کسی بھی طرح سے شک اور شبہ نے نہیں جکڑا۔ مایوسی تو بہت دور کی بات ہے۔ جیسے عقلیت پسندوں کے لیے روحانی تجربات افسانوی قصے ہیں، ویسے ہی قدامت پسند اس معاملے کو بے نقص ماننا چاہتے ہیں۔ قدامت پسند انسان سے متعلق جو ناتمامی، ادھورا پن یا کثافت ہے۔ اس کو محمدؐ جیسی شخصیت کے لیے برداشت نہیں کر سکتے۔

شاید اسی وجہ سے آج یہ جاننا بہت مشکل ہو گیا ہے کہ اصل میں محمدؐ کون تھے؟ ان کے اس کامل خاکے کے سبب انہیں، بطور ایک انسان سمجھنا مشکل ہو چلا ہے۔ دنیا بھر کے مسلمانوں کے لیے محمدؐ ایک آئیڈیل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ رسول، پیغمبر خدا جو کسی بھی طرح کے انسانی جذبات، معاملات اور نفسیاتی حالات سے مبرا ہیں۔ حالانکہ خدا نے ان کو قران میں بارہا تاکید کی ہے کہ کہتے رہیں، 'میں تم میں سے ایک ہوں!'۔ ایک آدمی، مگر پھر بھی نسبت رسول اور عشق میں مبتلا مسلمان ان کو عقیدت میں لتھڑا، تبرک کی چاندی اور سونے سے سجا ہوا لبادہ پہنانے سے نہیں چوکتے۔ محمدؐ کی بابت مسلمانوں میں ایک مالکانہ سوچ پائی جاتی ہے۔ محمدؐ کی نسبت آج بھی ہر مسلمان کے ہاں ایک محافظت، مرافعت نظر آتی ہے۔ یہ تب بھی جوں کی توں قائم ہے جب خود مذہب اسلام کے لیے شرق و غرب میں ایک کڑا وقت چل رہا ہے۔ محمدؐ سے مسلمانوں کی یہ نسبت اس لحاظ سے بے مثال ہے۔

مگر دیکھیے، یہ قدرتی بات ہے کہ جب آپ کسی کو یوں مثالی، کامل بنا کر پیش کر لیتے ہیں تو دراصل یہ اس شخص کو انسانی خصائل سے محروم کرنے اور اس کی آدمیت کو سلب کرنے کے مترادف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج لاکھوں اور کروڑوں صفحات پر لکھی گئی سوانح عمریوں میں محمدؐ کو بطور انسان، ایک آدمی کی طرح دیکھ پانا انتہائی مشکل ہے۔ اس سارے علمی مواد کے جکڑ میں جوں جوں آپ آگے بڑھتے، پڑھتے جاتے ہیں، یقینی طور پر محمدؐ کے بارے میں جانتے جاتے ہیں مگر خود محمدؐ کون تھے، یہ کبھی معلوم نہیں ہوتا۔ ان کی اپنی شخصیت، تشخص الفاظ کے اس کہر میں کہیں گم ہو کر رہ جاتا ہے۔

عقیدت میں لتھڑے مقالات جب محمدؐ کی زندگی کے حالات بیان کرتے ہیں تو ان پر دیومالائی روایات، حکایات، قصے اور داستان کا گماں ہوتا ہے۔ یہ تکریمی بیانات وہی کام کرتے ہیں جو انہیں کرنا چاہیے۔ یعنی، محمدؐ ایک انسان کی بجائے علامت کے طور پر ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ آج جب کہ اسلام، عیسائیت کے مقابلے میں دنیا کا سب سے بڑا مذہب بننے کی طرف گامزن ہے۔ افسوسناک بات یہ ہے کہ ہم اس آدمی کی بابت بہت کم جانتے ہیں جس کو قران میں کم از کم تین بار تاکید کی گئی کہ وہ خود کو 'اول المسلمین'، یعنی سب سے پہلا مسلمان کہلوائیں۔ ان کی زندگی بلاشبہ آج تک کے کسی بھی انسان کے مقابلے میں جی جانے والی بھرپور زندگی تھی۔ شاید ہم اس سے اتفاق نہ کرتے ہوں یا ہم انہیں صرف علامت کے طور پر جاننا چاہتے ہوں مگر پھر بھی محمدؐ کے نام سے جڑے طلسم یا شاید اس نام اور کارناموں کی وجہ سے، تاریخ اور دنیا میں اونچے مقام کی نسبت سے۔۔۔ ہمیں ان کو بحیثیت انسان جاننے، ان کی زندگی کے متعلق اس رخ پر تحقیق، مطالعہ کرنے کی اشد ضرورت ہے۔

ذرا سوچیے۔ یہ کیونکر ہوا کہ ایک شخص جب وہ ایک نوجوان تھا اور اپنے سماج میں رد کر دیا گیا تھا، قران میں بھی، جس شخص کو مخالفین کی زبانی ان کو 'غیر اہم' گردانا گیا ہے، اپنی دنیا بدل کر رکھ دیتا ہے؟ ایک شیر خوار بچہ جس کا بچپن اپنے خاندان سے دور گزرا ہو، وہ بڑا ہو کر خاندان اور قبیلے کی رائج تعریف کو اس سے کہیں بڑے معنوں میں تبدیل کر دیتا ہے؟ یعنی امت مسلمہ کا تصور پیش کر دیتا ہے۔ یہ کیونکر ہوا کہ ایک تاجر، بالآخر صاحب حکمت و فکر ہوا۔ اپنے زمانے میں رائج خدا اور سماج کے متعلق بنیادی نظریات کو بدل کر رکھ دیتا ہے، وہ بھی یوں کہ اس کا سامنا رائج معاشرتی اصولوں اور انتہائی مضبوط سیاسی قوتوں سے ہے؟ ایک ایسا شخص جس کو اپنے آبائی شہر سے نکال باہر کر دیا جاتا ہے، ہجرت پر مجبور کر دیا گیا مگر پھر وہ اسی شہر میں فاتح بن کر لوٹا اور ایک نئی شروعات کی، نئی بنیاد ڈال دی۔ یہ کیسے ہوا کہ صرف

آٹھ سال بعد وہ اسی شہر میں ایک قومی ہیرو کے طور پر لوٹ آتا ہے؟ اس آدمی نے آخر نا ممکنات کے بحر میں امکانات کی ندی کیسے نکال لی جو بالآخر ممکنات کا سمندر بن گیا؟

ان سب سوالات کا جواب تلاشنے کے لیے ضروری ہے کہ محمدؐ کی شخصیت پر بات کرنے والوں، ان کی سوانح حیات لکھنے والوں کو یہ استحقاق اور آزادی میسر ہو کہ وہ صرف واقعات بیان نہ کریں بلکہ وجوہات، پس منظر اور اس وقت سے جڑے معنی بھی تلاش کریں۔ اس میں دلچسپی رکھنے والوں کو یہ سہولت ہو کہ وہ اس کی اصل میں خود کو غرقاب کر سکیں۔ وہ آزادی سے سوچ سکیں اور واقعات کا ہر لحاظ سے، انسانی افعال، نفسیات اور کئی دوسری بنیادوں پر جائزہ لے سکیں۔ یعنی، ان کی زندگی میں پیش آنے والے واقعات اور معاملات کو اس طرح نُفے کی کوشش کریں کہ محمدؐ کا قرطاس پر سہ جہتی خاکہ بن کر سامنے آئے۔ ایسی شبیہ کہ جو رائج اصولوں اور تصورات سے کہیں بڑھ کر ہو۔ یہ ایک انسان کی مورت ہو نہ کہ کسی علامت کا تذکرہ ہو۔

برطانوی فلسفی اور تاریخ دان، آر جی کولنگ وڈ نے اپنی کتاب 'آئیڈیا آف ہسٹری' میں لکھا تھا کہ تاریخ کی کسی شخصیت بارے اچھی طرح لکھنا ہو تو آپ کو حقیقت اور تخیل دونوں کی ہی ضرورت پڑتی ہے۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ قصے گھڑنے لگیں۔ بلکہ، جو معلوم ہے اس کو زماں اور مکاں کی نسبت سے پوری طرح کھنگال لیں۔ تاکہ ایسی کہانی سامنے آئے جو حقائق پر مبنی ہو اور ہم کہہ سکیں کہ وہ حقیقت کے قریب تر معلوم ہوتی ہے۔ اگر ہم تاریخ کے کسی شخصی خاکے کی جہتوں کے متعلق بات کریں، جو بیان ہو سکتی ہیں۔ یا ایسی شبیہ جس میں کم سے کم ابہام ہے اور یہ کسی کی بے مثال زندگی سے متعلق بھی ہے۔ ایسی زندگی جو اپنے زمانے میں دنیا کو بدل کر رکھ دے گی اور آنے والے دور میں، حتیٰ کہ آج بھی ہماری زندگیوں، دنیا پر اثر انداز ہے گی تو ہمیں محمدؐ کی زندگی کو ایمانداری اور تحقیق کی نظر سے دیکھنے کا حق دینا ہو گا۔ ہمیں ان کی زندگی کا اجمالی، بھرپور اور کلیت کے ساتھ جائزہ لینا ہو گا۔

محمدؐ کی زندگانی ایک آدمی، اس آدمی کا اپنے زمان و مکاں اور اپنے دور میں رائج ثقافت کے بیچ غیر معمولی تعلق کی کہانی ہے۔ اس بابت پہلا سوال جو ابھرتا ہے وہ یقینی طور پر اس آدمی سے متعلق ہے۔ یعنی محمدؐ ہی کیوں؟ ساتویں صدی کے حجاز عرب میں، محمدؐ ہی کیوں؟

ان خطوط پر سوچنا اچھا خاصہ دلچسپ مگر بہر حال پریشان کن ہے۔ ایک طرف تو یہ سوال ایک دم عقائد، اس دور سے متعلق عصبیت اور ثقافتی مفروضات کی طرف دھکیل دیتا ہے جبکہ دوسری جانب یہی سوال ہمیں محمدؐ کی شخصیت کو واضح طور پر دیکھنے کا موقع بھی فراہم کرتا ہے۔ اسی سوال سے ہمیں یہ سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے کہ آخر محمدؐ نے گمنامی سے ناموری، بے وقعتی سے اقتدار اور بے وقری سے صدا قائم رہنے والی اہمیت کیسے پائی؟

محمدؐ کی زندگی میں جھانکنے کے لیے ہمارے پاس مشعل راہ، ابتدائی دور میں لکھی گئی دو اسلامی تواریخ ہیں۔ پہلی تو ان کی طویل سوانح حیات ہے جو آٹھویں صدی عیسوی میں، شہر دمشق میں ابن اسحاق نے تحریر کی۔ ابن اسحاق کی تحریر کردہ یہ سوانح عمری، آج تک محمدؐ پر لکھی جانے والی تقریباً ہر سوانح کی بنیاد ہے۔ دوسری تاریخ، جو کہ اسلام کی سیاسی تاریخ ہے۔ یہ ال تبری نے نویں صدی عیسوی میں بغداد شہر میں لکھی۔ اس تاریخ اسلام کے تراجم کی کل انتالیس جلدیں ہیں جن میں سے چار صرف محمدؐ کی زندگی کا احاطہ کرتی ہیں۔

ان اصحاب، یعنی ابن اسحاق اور الطبری کے متعلق یہ کہ، دونوں تاریخ دان ایماندار اور اصول پسند ہیں۔ ان کی لکھی گئی یہ تواریخ خاصی جامع ہیں۔ انہوں نے تاریخ بیان کرنے میں حقیقت پسندی سے کام لیا ہے۔ یاد رہے، ان کو یہ تواریخ قلم بند کرنے کے لیے صرف زبانی بیانات کا سہارا لینا پڑا تھا۔ یہ اس بات سے کلی طور پر آگاہ ہیں کہ وقت اور عقیدت کسی بھی شخص کے حافظے پر کس طرح اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ اس طرح یہ دونوں تاریخ دان حقیقت اور خواہش کے بیچ باریک خط کو واضح طور پر سمجھتے ہیں۔ جہاں کسی غلطی کا احتمال بھی ہو تو اس پر بحث کار جحان مکمل بیان، حوالے کی طرف ہے نہ کہ وہ خود اس پر فیصلہ صادر کریں۔ ان دونوں تواریخ کا مطالعہ کرتے ہوئے محسوس کیا جا سکتا ہے کہ دونوں ہی اپنے شعبہ سے منسوب ذمہ داری اور روایت کے نہایت باریک خط پر انتہائی مہارت سے گزرتے ہیں۔ تاریخ

اور عقیدے، حقیقت اور مفروضے کے بیچ یہ توازن برقرار رکھنے کی بھرپور کوشش میں، جہاں مغالطے کا گماں ہو تو باقاعدہ اس کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ یہ کسی بھی تاریخ دان کی ایسی خاصیت ہے، جو آج کے انتہائی جدید دور میں بھی جب کہ ہر چیز کئی طرح سے، چھاپی ہوئی مل جاتی ہے، اتنی ہی ناپید ہے جتنی کہ اس دور میں تھی۔ ایک مرتبہ پھر، یہ بات قابل ذکر ہے کہ ان اصحاب کو صرف زبانی بیانات سے کام لینا پڑا تھا۔ اسی وجہ سے ان تواریخ میں انہوں نے متضاد بیانات کو بھی شامل کیا ہے اور فیصلہ کرنے کا اختیار پڑھنے والوں پر چھوڑ دیا ہے مگر اس کا کسی بھی طرح سے یہ مطلب نہیں کہ ان کا مقصد کسی بھی صورت ابہام پیدا کرنا تھا۔ ابہام سے بچنے کے لیے جہاں پر ضرورت محسوس ہوئی، انہوں نے اپنا نکتہ نظر واضح طور پر الگ سے بیان کیا ہے۔ مثال کے طور پر، ابن اسحاق کی لکھی تاریخ میں آپ کو جابجا، 'ایسا گماں ہے کہ۔۔۔'، 'مجھے ایسے بتایا گیا۔۔۔' وغیرہ جیسی سطور ملیں گی۔ اسی طرح، جہاں پر کئی عینی شاہدین کے بیانات میں تضاد نظر آتا ہے تو وہ اس کو یوں لپیٹ کر کہ، 'خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ان میں سے جو بیان درست ہے۔۔۔' آگے بڑھ جاتے ہیں۔ گویا، اس بابت وہ اپنی معذوری، علمی بے بسی کو بھی واضح کر دیتے ہیں۔

تاریخ میں محمدؐ کے علاوہ کسی دوسری شخصیت کی زندگی بارے اگر اتنا کچھ لکھا گیا، وہ بھی یوں کہ ان کی شخصیت پھر بھی ایک بھید ہی رہے تو وہ عیسیٰ ہیں۔ مگر، عیسیٰ کے معاملے میں یہ ہے کہ پچھلی چند دہائیوں میں کئی عالمانہ مکالمے پیش کیے گئے ہیں۔ بحث کی گئی ہے۔ ان کوششوں کے نتیجے میں آج ان کا ایک انسانی خاکہ مل جاتا ہے۔ عیسیٰ کے بارے یہ مقالات نہ صرف ان کے دور، در پیش حالات کو واضح کرتے ہیں بلکہ ان کی مدد سے اس شخصیت اور اس کے اپنے زمانے اور رہتی دنیا تک اثرات کا بھی بخوبی جائزہ لیا جاسکتا ہے۔ اس کاوش میں، عالمین نے تاریخ میں بیان کردہ داستانوں، سیاسیات، علوم مذاہب سے کہیں بڑھ کر نفسیات کا سہارا لیا ہے جس سے عیسیٰ کی شخصیت اور ان کا پیغام زیادہ واضح ہو جاتا ہے۔ یوں عیسیٰ کے متعلق جب اس طرح، اس زمانے کی مطابقت میں دیکھنے کی کوشش کریں تو وہ ہمیں اپنے جیسا ایک شخص، مگر ہر لحاظ سے غیر معمولی انسان نظر آتے ہیں۔

محمدؐ اور عیسیٰ کے بیچ مماثلت غیر معمولی ہے۔ دونوں ہی سماجی ناانصافی کا شکار رہے۔ دونوں پر ہی وحی اتاری گئی اور ان دونوں شخصیات نے ہی اپنے زمانے میں رائج نظام کو للکارا۔ عیسیٰ کے یہاں عقائد ویسے ہی بیان کیے گئے ہیں جیسے کہ محمدؐ نے بالترتیب بیان کیے یا دونوں کے لیے تاریخ ایسے ہی کھلتی ہے جیسی کہ در حقیقت پیش آئی۔ یعنی عقائد اور تاریخ کے بیان ریل کی پٹڑی کی طرح ایک ساتھ چلتے ہیں مگر جابجا ایک دوسرے سے بہت دور بھی نکل جاتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ان سے منسوب معجزات اور کرامات بھی جب بیان کیے جاتے ہیں تو گویا وہ بیان کرنے والے کی مرضی، منشاء کے مطابق ہیں۔ یعنی کہ جیسے وہ چاہتا تھا کہ ہوا کریں، گرچہ ایسا نہ ہوا ہو۔ حتیٰ کہ قران میں بھی جابجا ان اصحاب کو پیش آنے والے واقعات کا بیان کسی معجزے یا کرامت کے طور پر نہیں کیا گیا پر پھر بھی لوگوں کو ایسا محسوس ہونا، انسانی فطرت کے عین مطابق ہے۔ یہاں، جب ہم دوسری جانب انہی واقعات کو عقائد کی رو سے دیکھیں تو پھر یہ ایمان کا معاملہ بن جاتا ہے۔ ان کو جوں کا توں ماننا لازم ہو جاتا ہے۔ جن واقعات کو ہم معجزے کہتے ہیں، عقل پسندوں کے لیے یہ شاید افسانوی حیثیت رکھتے ہوں مگر بحیثیت ایمان رکھنے والے کے لیے اس ناممکن پر یقین رکھنا کڑے امتحان کے جیسا ہے۔ یہ واقعات عقیدے کا تول بن جاتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اسلامی قدامت پسند نظریہ اس بات پر مصر ہے کہ محمدؐ کی پیدائش ایک نبی، رسول کی پیدائش تھی۔ وہ شروع سے ہی پیغمبر خدا تھے اور یہ ان کی قسمت میں پہلے سے لکھ دیا گیا تھا۔ اگر ایسا ہے تو پھر محمدؐ کی اپنی کوئی زندگی نہیں تھی۔ اس طرح تو ان کی ساری عمر بس ربانی حکم ہے جو وقت کے ساتھ کھلتا چلا جاتا ہے۔ ان کی اپنی جدوجہد، کوشش اور مشقت بے معنی ہے۔ دوسری طرف، ان سارے تضادات اور اختلافات جو کسی بھی انسان سے متعلق ہو سکتے ہیں، اس صورت میں ان کو بیچ ہو جانا چاہیے۔ کچھ لوگوں کے خیال میں، محمدؐ کی زندگی امر مطلق تھی۔ یوں ان کی کوئی بھی سوانح حیات ہو، وہ لکھنا، پڑھنا اور سمجھنا بالکل بے سود ہے۔ یہاں کئی دوسرے لوگ بھی ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ پیغمبر کی زندگی کوئی معجزہ یا کرامت نہیں بلکہ ایک جدوجہد کا نام ہے اور اس کا حاصل، اسلام کا آفاقی پیغام اسی

جدوجہد کا ثمر ہے۔ محمدؐ کی زندگی اتنی بے مثال ہے کہ حقیقت کی آنکھ سے دیکھیں تو یہ اتنی کرشماتی ہے کہ حقائق پر کرامات کا گماں ہوتا ہے۔ ان کی حقیقی زندگی کی داستان اور انسانی جدوجہد کسی بھی دیومالائی قصے سے کہیں بڑھ کر ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اگر کرامات ڈھونڈنے کی بجائے، معجزات تلاشنے سے زیادہ اگر صرف ان کی زندگی پر غور کیا جائے تو یہ انتہائی غیر معمولی زندگی ہے۔ ان کا بطور انسان جو خاکہ ابھر کر سامنے آتا ہے وہ شاید کسی دیومالائی، افسانوی کردار کا بھی نہ ہو سکے۔ وجہ یہ ہے کہ یہ ہر لحاظ سے انسانی شبیہ ہو گی اور اس پر میں، آپ اور ہم سب یقین کر سکیں گے۔ یہ ممکنات کا واضح اور حقیقی بیان ہو گا کہ انسان، کس قدر بڑا، کتنا قابل ہو سکتا ہے۔ یوں، ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ محمدؐ کی حقیقی زندگی کسی بھی متاثر کن گھڑی ہوئی داستان سے بڑھ کر ہے۔ کیونکہ یہ ایک انسان کی داستان ہو گی۔ یہ سچ پر مبنی ہو گی۔ جوزف کیمپ بیل کی زبانی، محمدؐ کی زندگی 'ایک ہیرو کا سفر' جیسی ہے جو کہ بے وقعتی سے شروع ہو کر کامیابی کے انتہائی درجے کو چھوتی ہے۔ مگر یہ سفر آسان نہیں ہے۔ اس میں ہمہ وقت جدوجہد ہے، خطرات کا سامنا ہے۔ مشکل فیصلے کرنے پڑے ہیں اور اس داستان میں کسی بھی بے مثال داستان کے ہیرو کی مانند ۔۔۔ انفرادی اور اجتماعی تضاد ہیں۔ یوں، اگر اس بے مثال زندگی کے بارے میں پوری طرح جاننا چاہیں تو ہم متنازع واقعات کا بیان چھوڑ کر محمدؐ، ان کی جدوجہد اور پیغام کے ساتھ انصاف نہیں کریں گے۔ ہمیں اگر محمدؐ کو جاننا ہے تو ان کو مکمل طور پر موقع فراہم کرنا ہو گا۔ ان کو انسان کی طرح دیکھنا ہو گا۔ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ ہمیں غیر جانبدار ہونا پڑے گا۔ عقیدت کو ایک طرف اور مفروضوں کو دوسری طرف رکھنا ہو گا۔ اس کے بیچ چوکس رہنا ہو گا اور کسی بھی طور، ان کے متعلق کوئی بھی اندازہ لگانے سے گریز کرنا ہو گا۔ یہاں کسی بھی طور، کسی قسم کے اندازے، فیصلے صادر کرنے کی بجائے اور ان کو اپنے بنائے کسی بھی نظریاتی ترازو میں تولنے کی بجائے انسانی تعلق بنانا پڑے گا۔ یعنی اس مقصد کے حصول، سمجھ پانے کے لیے ہم عملیت اور تصوریت، عقیدے اور نظریے، تشدد اور عدم تشدد، قبولیت اور رد کرنے کے بیچ میں سے گزرنے کی کوشش کریں گے۔ محمدؐ کے بارے نہیں، محمدؐ کو جاننے کی کوشش کریں گے۔

بلاشبہ محمدؐ کی ساری زندگی کا محور غار حرا کی وہ رات ہے۔ یہ اسی رات کا واقعہ ہے جب وہ اس دور میں داخل ہوئے جس کی بابت کئی لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ محمدؐ کی منزل ثابت ہوئی۔ اسی وجہ سے مسلمان اس رات کو لیلتہ القدر یعنی شب قدر کہتے ہیں۔ اسی رات محمدؐ پہلی بار ہمیشہ کے لیے تبدیل ہو جانے والی انسانی تاریخ کے دھارے میں داخل ہوتے ہیں۔ یہ بھی مسلمہ حقیقت ہے کہ محمدؐ کی زندگی میں بعد اس رات کے پیش آنے والے واقعات کا نتیجہ اس قدر بڑا ہے کہ آج بھی ہم ان واقعات کے اثرات اپنی زندگیوں پر محسوس کرتے ہیں۔ یوں ہم بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ اس رات شروع ہونے والی تاریخ ابھی بھی جاری و ساری ہے۔ اس رات جو واقعہ پیش آیا اور اس کے بعد جیسے جیسے واقعات پیش آتے رہے۔ ان کا واضح اثر آج کے دور، دنیا کی سیاست، عقائد اور مذہب پر ابھی بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

قبل اس کے ہم یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ غار حرا میں محمدؐ کا فرشتے جبرائیل سے سامنا کیسے ہوا اور وہاں کیا واقعہ پیش آیا یا بعد اس کے کیا ہوا۔۔۔ ہمیں یہ سمجھنے کی زیادہ ضرورت ہے کہ محمدؐ غار حرا تک کیونکر پہنچے؟ یہ داستان، شروع سے بیان ہونی چاہیے۔ جس طرح کے دنیاوی معاملات محمدؐ کو درپیش تھے اور اس زمانے میں جو رائج دستور اور سماجی لیکے تھے، ان کی رو سے آپ کسی بھی طور پیغمبری کے لیے موزوں قرار نہ پاتے۔ اسی وجہ سے جب ہم حقیقت کو جاننے کی کوشش کرتے ہیں، محمدؐ کو ان حالات، ناممکنات اور مشکلات سے نبرد آزما دیکھیں گے تو ان کی زندگی سے جڑی جدوجہد مقدس اور کرشماتی۔۔۔ ایک ہیرو کا سفر معلوم ہو گی۔

باب:2

اگر آپ فال میں یقین رکھتے ہیں تو محمدؐ کا پیدا ہونے سے پہلے ہی یتیم ہو جانا کوئی اتنا اچھا شگون نہیں ہے۔ ان کی سوانح حیات لکھنے والے تقریباً تمام مورخین اس بات کو اہمیت نہیں دیتے۔ ان کی زندگی کا احوال بیان کرتے ہوئے اس مرحلے سے فوراً آگے بڑھ جاتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ قسمت کا لکھا ایسا معاملہ ہے جس پر

مزید بات کرنے کی ضرورت اور شاید گنجائش بھی نہیں ہے۔ حالانکہ محمدؐ کی یتیمی نفسیاتی طور پر اس قدر بھاری وزن رکھتی ہے کہ اس کی وجہ سے تاریخ کا دھارا متعین ہوا۔ بالخصوص، جن حالات میں محمدؐ کی پیدائش ہوئی تھی۔ صرف اسی پر غور کریں تو محسوس ہوگا کہ محمدؐ کی پیدائش غالباً معجزہ ہے۔ ملاحظہ کریں کہ آمنہ محمدؐ کو لے کر حاملہ ہوئیں تو اس سے چند گھنٹے قبل تک محمدؐ کے دادا آپؐ کے والد کو تقریباً موت کے منہ میں دھکیلنے کا سامان کر چکے تھے۔ وہ شاید اس روز عبداللہ کو قتل کر چکے ہوتے۔ پھر چونکہ محمدؐ کے والد کا ان کی زندگی میں واحد کردار پورا ہو چکا تھا۔ آپؐ کے والد کی وفات بھی شہر سے باہر ہوئی۔ جب عبداللہ کی موت واقع ہوئی تو وہ جانتے بھی نہیں تھے کہ ان کے یہاں ایک بیٹا بھی ہے۔ محمدؐ کی پیدائش سے متعلق یہ حقائق افسانوی معلوم ہوتے ہیں۔

محمدؐ کے دادا کا نام عبدالمطلب تھا۔ آپ قبیلہ قریش کے سربراہ اور شہر مکہ کی مختصر مگر شاندار روایات کے امین تھے۔ جوانی میں عبدالمطلب نے گم شدہ زمزم کا چشمہ دوبارہ سے کھود کر نکالا تھا۔ یہ چشمہ کعبہ کے نزدیک ہی واقع تھا۔ چونکہ کعبہ عرب کے طول و عرض میں حجاج کے لیے مرکز تھا، اس لیے زمزم کی اہمیت بڑھ کر تھی۔ اسی طرح کعبہ کے پہلو میں زمزم چشمے کا دوبارہ سے دریافت کرنا بھی خاصی بڑی سعادت اور کامیابی شمار ہوتی تھی۔ پھر اس چشمے سے متعلق مقامی لوگوں کے یہاں خصوصی روحانی نسبت پائی جاتی تھی۔ اس وقت یہ مشہور تھا کہ پہلی بار یہ چشمہ تب پھوٹا تھا جب ہاجرہ نے اسماعیل کو جنم دیا اور ابراہیم نے اپنے ہاتھوں سے اس کے گرد پانی جمع کرنے اور کوزے بھرنے کے لیے تعمیرات کی تھیں۔ آنے والی کئی صدیوں میں یہ چشمہ مکہ کی گھاٹی میں پے در پے سیلابوں کے سبب دب گیا۔ اب بالآخر، عبدالمطلب نے اس کو دوبارہ دریافت کیا اور کھود کر نکالا تھا۔ عبدالمطلب کے اس چشمے کو کھودنے اور دریافت کرنے سے متعلق بھی کئی قصے مشہور تھے۔ جیسے، چشمے کے دہانے پر ایک سانپ کا پہرہ تھا جو اس قدر خطرناک تھا کہ کسی شخص میں اس کے قریب پھٹکنے کی جرات نہیں تھی۔ تب آسمان میں ایک دیوہیکل شاہین نمودار ہوا۔ شاہین نے سانپ کو پنجوں میں دبوچا اور پھر آسمان میں گم ہو گیا۔ اسی طرح، ایک قصہ یہ بھی مشہور تھا کہ چشمے کے مقام سے پانی کے ساتھ بیش بہا خزانہ بھی برآمد ہوا تھا۔ خزانے میں سونے، چاندی اور قیمتی پتھر، یاقوت جڑی بھاری بھر کم تلواریں اور خنجر جو عام خنجروں سے قدرے بڑے تھے اور دستوں میں خالص سونا اور ہیرے جڑے ہوئے تھے، برآمد ہوئے۔ زمزم سے منسوب ان تمام داستانوں میں معروف وہ واقعہ ہے جو آج بھی یاداشت، عمل اور روایت میں زندہ ہے۔ یہ ہاجرہ اور اسماعیل کی داستان ہے۔ اس کا ذکر قران میں بھی آیا ہے اور آج بھی مسلمان اسی روایت کو زندہ رکھتے ہوئے صفیٰ اور مروہ کے بیچ دوڑ لگاتے ہیں۔ زمزم کے پانی کو متبرک جانتے ہیں۔

چونکہ زمزم کا چشمہ عبدالمطلب نے دریافت کیا تھا۔ فطری طور پر اپنے کنبے کا اس بابت حق جتایا کرتے تھے۔ ان کے مطابق، بنی ہاشم اس متبرک چشمے سے حاصل ہونے والی آمدن کا جائز حقدار تھا۔ بنی ہاشم، قبیلہ قریش کے چار میں سے ایک کنبہ تھا اور عبدالمطلب اپنے کنبے کے ساتھ پورے قبیلہ قریش کے سردار تھے۔ مکہ میں کئی دوسرے چشمے بھی تھے مگر ان میں سے کوئی بھی چشمہ کعبہ کے اتنے قریب واقع نہیں تھا۔ مکہ شہر کا کوئی چشمہ اس قدر میٹھا تھا اور نہ ہی کسی چشمے کے ساتھ اتنی مشہور اور تاریخی داستان، حکایات منسوب تھیں۔ یوں، عبدالمطلب کا بنی ہاشم کے حق جتانے پر باقی قریش کا اس دعویٰ پر اعتراض کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی۔ قریش نے نہ صرف اس دعویٰ پر اعتراض کیا بلکہ عبدالمطلب کی نیت اور قبیلے میں ان کے کردار اور ارادوں کی بابت بھی خاصی بازپرس کی۔ اس قدر شدید ردعمل پر عبدالمطلب کا جواب بھی اچھا خاصا جذباتی اور چونکا دینے والا تھا۔ انہوں نے ایک عجب قسم اٹھائی۔ قسم یہ تھی کہ جب ان کے دس بیٹے بلوغت کی عمر کو پہنچ جائیں تو وہ یعنی عبدالمطلب۔۔۔بنی ہاشم کی عزت اور زمزم پر حق کی قسم اٹھاتے ہیں کہ دس میں سے ایک بیٹے کو کعبہ کے قدموں میں، زمزم کے دہانے پر اپنے ہاتھوں سے قربان کر دیں گے۔

اس قدر بھاری قسم نے ناقدین کی زبانوں پر تالا لگا دیا۔ ایک انسان کی قربانی پیش کرنا کوئی آسان بات نہ تھی۔ بالخصوص ابراہیم اور اسماعیل کی اس داستان کے بعد تو اس طرح کی قربانی کا دعویٰ کرنا بھی گویا کعبہ کی حرمت سے روحانی نسبت کی حدوں کو چھونے کے مترادف تھا۔ مکہ کے باسیوں کے اذہان میں ایسی قربانی کا

سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کسی شخص میں اتنی ہمت نہیں تھی۔ اس عہد کا اثر اس لیے بھی بڑھ کر ہوا کہ اسماعیل اور ابراہیم کی داستان کا نشان ابھی تک کعبہ کے اندر موجود تھا۔ مبینہ طور پر کعبے کے اندر ابھی تک اس مینڈھے کے سینگ آویزاں تھے جس نے قربان گاہ میں اسماعیل کی جگہ لے لی تھی۔ علاوہ ازیں، اس دور میں کسی شخص کے دس فرزندوں کا بلوغت تک پہنچ پانا بھی معجزہ ہی شمار ہوتا۔ تب بچوں کی شرح اموات بہت زیادہ تھی۔ عربوں کے یہاں کئی بیویاں ہونے کے باوجود، کسی شخص کے یہاں بلوغت کی عمر تک جانبر ہونے والے بیٹوں کی تعداد شاذ و نادر ہی دس ہوا کرتی۔ بہر حال، عبد المطلب کے یہاں یہ معجزہ ہو گیا۔ 570ء میں ان کے یہاں دس بالغ بیٹے تھے۔ ابن اسحاق نے راویوں کی زبان میں ان دس بیٹوں کا تعارف نہایت شاندار الفاظ میں کیا ہے۔ لکھتے ہیں، 'پورے مکہ میں عبد المطلب کے دس بیٹوں سے ہر ایک سے زیادہ طاقت ور اور قد آور جوان کوئی دوسرا نہیں تھا۔ سبھی نیک اور پارسا۔ ان کی طرح ایماندار بھی شاید کوئی نہیں تھا۔ ہر ایک کی ناک اونچی اور لمبی تھی۔ اس قدر کہ پانی پیتے ہوئوں سے قبل ناک پانی کو چھوا کرتی تھی۔ یعنی، عزت دار تھے'۔ عرب معاشرے میں لمبی ناک عزت و تکریم کی نشانی تھی جیسے بازنطینی یونانیوں میں مردوں کی سنہری رنگت عزت کی علامت ہوا کرتی تھی۔

بہر حال، اب عبد المطلب پر قسم پوری کرنے کا وقت آچکا تھا۔ عرب معاشرے میں ایک مرد اپنی زبان، حلف اور ارادے سے پہچانا جاتا تھا اور عبد المطلب نے دانستہ یا غیر دانستہ، انتہائی عجب قسم لی تھی۔ مرتے کیا نہ کرتے عرب روایات کی پاسداری، ناک اونچی رکھنے اور زبان کی حرمت برقرار رکھنے کے لیے عبد المطلب پر قسم پوری کرنا لازم تھا۔ سوال قسم پوری کرنے کا نہیں بلکہ یہ تھا کہ دس میں سے آخر کون سا بیٹا قربان کیا جائے گا؟ ایک باپ کے لیے شاید اس سے مشکل فیصلہ کوئی نہ ہوتا، تبھی فیصلہ روایتی طور پر خدا کے ہاتھ میں دے دیا گیا۔ قریش قبیلے کے لیے مختص دیوتائی نشان ہبل کے پتھر سے رجوع کیا گیا جو کعبہ کے پہلو میں ہی نصب تھا۔ ہبل کے اس پتھر کے قدموں میں حلف اٹھائے جاتے تھے۔ عہد لیے جاتے اور معاہدے طے پاتے تھے۔ اس کے سائے میں دوستی اور دشمنی کی قسمیں لی جاتی تھیں اور جب کوئی مشکل فیصلہ درپیش ہوتا یا دو گروہوں میں کسی مسئلے پر فیصلہ کروانا مقصود ہوتا تو ہبل کا یہ پتھر گویا سروش غیبی، کہانت کا کردار ادا کرتا۔ ہبل کے بارے میں عام خیال تھا کہ یہ 'اللہ' یعنی 'سب سے برتر ذات' کی ترجمانی کرتا ہے۔ اللہ کی ذات، اس پاک زمین مکہ کی مائی باپ اور سارے جہاں کا کرتا دھرتا، مالک ہے۔ یہ ذات اس قدر اونچی اور پراسرار ہے کہ انسانوں کی اللہ تک رسائی صرف اور صرف ثالثوں کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ ایسے کئی ثالثوں میں ایک ثالث، ہبل کا پتھر بھی تھا۔

معاملہ چاہے کتنا بڑا کہ کسی کی زندگی اور موت داؤ پر کیوں نہ ہوتی، ہبل کا پتھر معاملات طے کر سکتا تھا۔ اس سے خدا کی مرضی طلب کی جا سکتی تھی۔ اس کا طریقہ یہ تھا کہ مطلوب نتیجے لکھ کر نیزوں پر چسپاں کر دیے جاتے تھے۔ مثلاً کسی معاملے میں وقت کا تعین کرنا ہوتا تو تین نیزے استعمال میں لائے جاتے۔ ان پر، 'ابھی'، 'بعد میں' یا 'کبھی نہیں' کے سرنامے چسپاں کر دیے جاتے۔ بسا اوقات، ضرورت کے مطابق دنوں کا تعین بھی کر دیا جاتا۔ جیسے، 'آج'، 'سات ایام میں' یا پھر 'تیس ایام میں' وغیرہ۔ جب یہ ہو رہتا تو پھر التجا، مناجات کی جاتیں۔ پھر ایک بکری یا بعض اوقات اونٹ کی بھینٹ چڑھائی جاتی۔ بعد اس کے ہبل کا رکھوالا یا تحویل دار اپنے ہاتھوں سے نیزوں کو جمع کر کے گٹھڑی سی بنا لیتا اور اس گٹھڑی کو زمین پر سیدھا کھڑا کر دیا جاتا۔ جیسے قدیم چینی تہذیب میں رواج ہوا کرتا تھا، اس گٹھڑی کو گرنے کے لیے چھوڑ دیتے کہ نیزے زمین پر آگریں۔ ان میں جو نیزہ ہبل کی جانب یا بہت سارے نیزوں میں سے جس کا رخ بالکل ہبل کی طرف ہوتا، اس نیزے پر لکھا فیصلہ طے سمجھا جاتا۔ خدا کی مرضی قرار پاتا۔

اب کی بار کل دس نیزے تھے۔ دس نیزوں پر عبد المطلب کے دس بیٹوں کے نام لکھ کر چسپاں کر دیے گئے تھے۔ اس موقع پر مکہ کا سارا شہر امڈ آیا تھا۔ ہر طرف چہ مگوئیاں جاری تھیں اور معاملہ اس قدر گھمبیر کہ ہر شخص خوفزدہ بھی تھا۔ ایک انسانی جان داؤ پر تھی یا شاید مکہ میں پہلی بار ہبل اتنا انوکھا معاملہ طے کرنے جا رہا تھا۔ جوں جوں فیصلے کی گھڑی نزدیک آ رہی تھی، مجمع میں جوش اور بے چینی بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی۔ جب تحویل دار نے نیزوں کی گٹھڑی کو آزاد چھوڑا تو سب کو

سانپ سونگھ گیا۔ ہر شخص فیصلہ سننے کو بے تاب تھا۔ لوگ ہبل کے اور قریب آ گئے۔ ہر شخص قرعہ میں نکلنے والے بیٹے کا نام سب سے پہلے سننا چاہتا تھا۔ جب نام پکارا گیا تو سناٹا چھا گیا۔ دس میں جو نیزہ ہبل کے رخ پر گرا تھا، اس پر عبد المطلب کے سب سے چھوٹے اور لاڈلے بیٹے عبد اللہ کا نام درج تھا۔

کہتے ہیں اگر عبد المطلب کی داڑھی عمر رسیدگی کے سبب سفید نہ ہو چکی ہوتی تو اس وقت یہ فیصلہ سن کر ضرور ہو جاتی۔ مگر عبد المطلب کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔ نہ صرف یہ کہ عبد المطلب کی اپنی عزت بلکہ بنی ہاشم کی تکریم اور غیرت بھی داؤ پر لگ چکی تھی۔ عبد اللہ اس عزت کی بھینٹ چڑھنے والے تھے۔ عبد المطلب کے باقی بیٹے وہیں دم بخود اور حیران و پریشان بت بنے کھڑے رہے اور یہاں عبد المطلب نے عبد اللہ کو قتل کرنے کی تیاری شروع کر دی۔ سارے ہی بیٹوں کی حالت ابھی تک ایسی تھی کہ کاٹو تو خون نہیں، یا باپ کے سامنے اتنی جرات نہیں تھی کہ وہ انہیں اس فعل سے باز رکھتے۔ فطری بات یہ بھی ہے کہ بچ جانے والے بیٹوں میں سے ہر ایک نے سکھ کا سانس لیا ہو گا کہ قرعہ میں اس کا نام نہیں نکلا تھا۔ ہبل پر ایمان کا یہ عالم تھا کہ انہیں اب بھی اس سے ایک آخری اشارے امید تھی مگر پتھر بھلا کیا کرتا؟ عبد المطلب کے بیٹوں کے ہوش اس وقت واپس آئے جب انہوں نے عبد اللہ کو اپنے زانو پر کھڑے ہونے کا حکم دیا اور خنجر تھام لیا۔

اب پہلی بار عبد المطلب کے بیٹوں کو خیال آیا کہ انہیں باپ کو اس فعل سے روکنا چاہیے۔ چنانچہ، انہوں نے خدشہ ظاہر کیا کہ شاید ہبل کی یہ مرضی نہیں تھی۔ ہبل، انسانی جان کو یوں داؤ پر نہیں لگا سکتا۔ وہ ایک باپ کے ہاتھوں بیٹے کا یوں خون ہونے کی اجازت کیونکر دے سکتا ہے؟ یہ فیصلہ اس لحاظ سے بھی عجیب تھا کہ عبد المطلب کے دس بیٹوں میں سے کوئی بھی اس قسم کی بھینٹ چڑھ سکتا تھا۔ یہ مشیت حق سے زیادہ ایک اتفاق لگتا تھا۔ پس، انہوں نے عبد المطلب سے گذارش کی کہ اس معاملے میں، ہبل کے فیصلے کی تشریح کے لیے کسی کاہن سے رجوع کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ کاہن، عربوں میں گویا پیشن گوئی کرنے والے نجومیوں جیسے تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ کاہن علم نجوم جاننے کے علاوہ ارواح سے بھی رابطہ کر سکتے تھے۔ وہ روحوں کی مرضی، مشیت خدائی جانچ سکتے تھے۔ پورے عرب میں ایک کاہن سے زیادہ عزت و تکریم والا، خدا کا پیارا کوئی دوسرا شمار نہیں ہوتا تھا۔ بیٹوں نے باپ کو سمجھایا کہ اگر کاہن بھی عبد اللہ کو قربان کرنے کا حکم دے تو پھر بے شک وہ عبد اللہ کو قربان کر دیں اور اگر کاہن عبد اللہ کی قربانی کے علاوہ کچھ بھی فیصلہ کرے تو انہیں اس بات پر راضی ہو جانا چاہیے۔

یثرب کے نخلستان میں بسنے والی ایک عورت کاہنہ مشہور تھی۔ اس کا نام بھی کاہنہ ہی تھا۔ یثرب مکہ سے دو سو میل شمال میں واقع ہے۔ اس دور میں دو شہروں کے بیچ اتنا فاصلہ دو ملکوں کے سفر جتنا شمار ہوا کرتا تھا۔ اتنا لمبا سفر ذات خود اس معاملے کی اہمیت کو اجاگر کرتا تھا۔ پھر، معاملے کی باریکی کو مد نظر رکھا جاتا تو کاہنہ میں خوبی یہ تھی کہ وہ قبیلہ قریش نہیں بلکہ یثرب کے قبیلے خزرج کی ارواح تک رسائی رکھتی تھی۔ چونکہ، صرف روحیں ہی دوسری روحوں کو اچھی طرح سمجھ سکتی ہیں اور دوسرے قبیلے کی روحوں کی قریش سے کوئی نسبت بھی نہیں تھی۔ یوں، فیصلے کی جانچ غیر جانبدار ہوتی۔ ہر طرح سے یہ تسلی کر لینے کے بعد کہ ہبل کے فیصلے کی جانچ میں کسی بھی قسم کا جھول نہیں ہو گا، اسی کاہنہ سے ثالثی کرانے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ یہ ہبل کے تحویل دار، مکہ شہر کے لوگوں اور عبد المطلب اور ان کے سارے کنبے کے لیے بھی قابل قبول صورتحال تھی کہ یوں عبد اللہ کی جاں بخشی ہونے کی صورت نکل سکتی تھی اور ساتھ عبد المطلب کو اپنی اس خوفناک قسم سے چھٹکارا مل جاتا۔

عبد المطلب اپنے تمام بیٹوں کو ساتھ لیے، تازہ دم اور سریع اونٹوں کے قافلے پر سوار سات دن کے اندر یثرب جا پہنچے۔ وہ اپنے ساتھ کاہنہ اور قبیلہ خزرج کی ارواح کے لیے تحائف اور منت بھی لائے تھے۔ معاملہ پیش ہوا۔ کاہنہ نے تیاری کر کے اپنی آنکھیں موند لیں۔ یہ سب بیٹھے کاہنہ کو بے چینی سے دیکھتے رہے۔ انہوں نے انتظار کیا، کاہنہ کا جسم شدت سے کانپ رہا تھا اور منہ سے سرگوشیاں اور ورد جاری تھا۔ پھر کاہنہ پر خاموشی چھا گئی اور وہ سکون کی حالت میں چلی گئی۔ خاصی دیر کے

بعد جب اس نے آنکھیں کھولیں تو بات چیت کے قابل ہونے میں اسے مزید کچھ دیر لگ گئی۔ حالت سدھرتے ہی، کاہنہ بجائے یہ کہ خداؤں اور ارواح کی منشاء بتاتی، اس نے ایک سادہ سا سوال کیا۔ یہ سوال، خون کے بدلے رقم کی بابت تھا۔ پوچھا کہ، 'مکہ میں عام طور پر خون کے بدلے میں کتنی رقم ادا کی جاتی ہے؟'

'دس اونٹ' انہوں نے جواب دیا۔ کاہنہ نے یوں اثبات میں سر ہلایا، جیسے یہ وہ پہلے سے جانتی تھی۔ 'مکہ واپس جاؤ' اس نے کہا، 'عبد اللہ کو دس اونٹوں سمیت کعـبہ کے احاطے میں نصب ہُبل کے پاس لے جاؤ اور اس کے آگے دس نیزے گراؤ۔ اگر پھر بھی فال میں عبد اللہ کا نام نکلے تو اونٹوں کی تعداد میں دس کا اضافہ کر دو۔ پھر سے ہُبل کے قدموں میں نیزے گراؤ، اور اس وقت تک نیزے گراتے رہو اور کل تعداد میں دس اونٹوں کا اضافہ کرتے رہو جب تک خدا اس خون کے بدلے اونٹوں کی قربان ہونے والی تعداد سے راضی نہ ہو جائے'۔

جیسا کاہنہ نے تاکید کی تھی، عبد المطلب نے ویسا ہی کیا۔ مکہ پہنچتے ہی، کعـبہ کے احاطے میں نصب ہُبل کے پتھر کے سامنے نیزے گرائے جاتے رہے اور ہر بار عبد اللہ کا نام نکلنے پر دس اونٹوں کا اضافہ کیا جاتا رہا۔ دسویں بار نیزے گرانے پر جب عبد اللہ کی جان خلاصی ہوئی تو قربان کیے جانے والے اونٹوں کی تعداد سو ہو چکی تھی۔ سو کاہندسہ اتنا بڑا تھا کہ مکہ کا ہر آدمی انگشت بدنداں رہ گیا۔ یوں، اس جانچ کے بعد اور کاہنہ کی ثالثی کی بدولت نہ صرف عبد اللہ کی جان بخشی ہو گئی بلکہ پورے شہر میں یہ بات بھی پھیل گئی کہ خدا کی نظر میں عبد اللہ کی زندگی کی قیمت دس عام مردوں سے بڑھ کر ہے۔

اسی شام عبد المطلب نے بھرپور جشن کا انتظام کیا۔ وہ بیٹے کی جان بخشی پر انتہائی مطمئن اور مسرور تھے۔ اس موقع پر جہاں خون بہا کے سو اونٹ ذبح کیے گئے وہیں عبد المطلب نے عبد اللہ کی شادی آمنہ سے نہ صرف طے کر دی بلکہ اسی وقت اس کا انتظام بھی کر دیا۔ شاید یہ ضروری نہ ہو تاہم اس معاملے میں اپنے کنبے اور عبد اللہ کے لیے یہ عبد المطلب کا اشارہ تھا کہ وہ عبد اللہ کو جیتے اور نسل کو پھلتا پھولتا دیکھنا چاہتے ہیں۔

شادی سے متعلق راویوں نے پوری سنجیدگی سے قسم اٹھا کے بتایا ہے کہ اس رات عبد اللہ کی پیشانی پر سفید روشنی جگمگا رہی تھی مگر اگلی صبح جب عبد اللہ اپنے گھر سے نکلے تو ان کے ماتھے پر یہ روشنی نہیں تھی۔ عبد اللہ کی پیشانی پر ایسی کوئی روشنی تھی یا نہیں۔۔۔ شادی کے بعد عبد اللہ اپنی دلہن کے ساتھ صرف تین دن گزار سکے۔ تین دن بعد عبد اللہ ایک تجارتی قافلے کے ساتھ شام چلے گئے اور زندہ واپس نہیں آئے۔ مکہ واپس پہنچنے سے دس روز قبل، سفر میں ہی یثرب کے مقام پر چل بسے۔ لوگوں کے خیال میں، عبد اللہ کا یثرب میں انتقال ارواح کا ان کی بابت ذہن تبدیل کرنے کے مترادف تھا۔ ارواح کی اصل مرضی یہ تھی کہ ان کی موت کاہنہ کے شہر میں، کاہنہ کے نزدیک ہو جس نے ان کی جان بچائی تھی۔ یہ خاصی مضحکہ خیز بات تھی۔

صحرا میں اونٹوں پر لدے قافلوں کا سفر آسان نہیں تھا۔ یہ خاصا مشقت کا کام ہوا کرتا۔ پھر حادثات، بیماریوں، بچھو اور سانپ کے کاٹے کا خطرہ اور ایسے کئی دوسرے جوکھم کا سامنا رہتا ہے۔ عبد اللہ کے موت کی اصل وجہ معلوم نہیں ہو سکی۔ ان کو یثرب میں ہی کسی نامعلوم مقام پر دفن کر دیا گیا اور ان کی قبر پر کوئی کتبہ بھی آویزاں نہیں ہوا۔ آمنہ بیوہ ہو گئیں اور محمدؐ پیدائش سے قبل ہی یتیم ہو گئے۔ عبد اللہ کو بچے کے بارے میں کبھی پتہ نہیں چل سکا۔

محمدؐ کی پیدائش سے منسوب داستان کے بھی دو رخ ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ بھرپور کوشش کے باوجود ان میں سے ایک بھی روایت میں محمدؐ کی بڑائی ثابت نہیں ہو پاتی۔ جیسے راوی کہتے ہیں محمدؐ نے مکہ میں جنم لیا۔ مقدس شہر مکہ کے مرکز، کعـبہ میں پیدا ہونے والے اس بچے کا باپ اور عزت دار خاندان کے خون کی نسبت، ایک عظیم روایت اور شاندار عرب روایات سے تعلق تھا۔ انہی روایات کی بنیاد پر یہ شہر قائم تھا۔ یہاں غور کریں تو جہاں ایک طرف محمدؐ کی بجائے ان کے خاندان کی بڑائی بیان ہوتی ہے، وہیں دوسری جانب یہی روایت محمدؐ کے لیے کچھ اچھی خبر نہیں تھی۔ ایسا معاشرہ جو عزت اور بڑائی کو حسب نسب سے۔۔۔ باپ سے جوڑتا تھا۔ چھٹی صدی کا مکہ کا شہر اور معاشرہ بیواؤں اور یتیموں پر کسی صورت نرمی نہیں برتتا تھا۔

سادہ الفاظ میں، اس معاشرے میں یتیم پیدا ہونے کا مطلب وراثت کے حق سے محرومی یا حق وراثت سے متعلق کوئی امید باندھنا بھی خام خیالی تھی۔ وراثت صرف بیٹوں کو ملتی تھی اور انہیں بھی بلوغت سے قبل وراثت نہیں مل سکتی تھی۔ پھر، ایسی صورت میں جیسی آمنہ اور محمدؐ کو درپیش تھی۔ یعنی، اگر بچے کے بالغ ہونے سے قبل ہی والد وفات پائے تو جائیداد والد کے قریبی بالغ رشتہ دار مرد کے حوالے ہو جاتی تھی۔ یہ بالغ رشتہ دار جائیداد کے ساتھ مرحوم کے خاندان کی کفالت اور فیصلہ لینے میں خود مختار ہوتا۔ روایتی قبائلی معاشرے میں یہ طریقہ قابل قبول بھی تھا۔ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ قبیلے میں کوئی بھی شخص واقعی ذاتی جائیداد کا مالک نہیں اور صرف قبیلے کا مفاد عزیز رکھا جاتا ہو تو اس صورت میں لاوارث نہیں رہ سکتا۔ قبیلے میں اس طرح ہر شخص چاہے وہ ایک بیوہ اور شیر خوار یتیم ہی کیوں نہ ہو، ان کی مناسب پیمانوں پر کفالت ممکن تھی۔ مگر مکہ میں صورتحال یکسر مختلف تھی۔ یہاں تجارتی قافلوں اور کعبہ کی تحویل داری سے آمدن کی ریل پیل تھی اور قبائلی روایات آہستہ آہستہ دم توڑ رہی تھیں۔ قبائلی نظام ہی کی مرہون منت، پچھلی چند دہائیوں میں دولت جمع ہو کر چند بااثر افراد کے پاس محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ اس طرح، چونکہ یہ شہری علاقہ تھا، یہاں عملاً ہر شخص خود اپنے معاملات کا ذمہ دار تھا۔ ایک شیر خوار یتیم، چاہے وہ کتنے ہی برتر خاندان سے تعلق رکھتا ہو، رحمت سے زیادہ زحمت سمجھا گیا۔ محمدؐ کے معاملے میں صنف نے کو کچھ بچت کر دی۔ اگر محمدؐ بیٹی ہوتے تو شاید انہیں شہر سے باہر صحرا میں سفاک شکاری جانوروں کے رحم و کرم پر بے آسرا چھوڑ دیا جاتا یا وہ زندہ دفن کر دیے جاتے۔ نرینہ اولاد کے لیے شیر خوار بچیوں کی طفل کشی عرب میں بھی ویسے ہی عام تھی جیسی کہ قسطنطنیہ، ایتھنز اور روم میں رہی ہے۔ اس غیر انسانی روایت کے حوالے سے بعد ازاں قرآن میں باقاعدہ ذکر آیا اور اس کی شدید ترین الفاظ میں ممانعت بھی کی گئی۔

بہر حال، یتیمی کے باعث معاشرے نے محمدؐ کی قسمت میں گمنامی اور ادنیٰ حیثیت لکھ دی۔ پھر، مکہ شہر میں اپنے کنبے اور خاندان سے اجنبیت اور گمنامی کا معاملہ یوں بھی ثبت ہو گیا کہ محمدؐ کو زندگی کے پہلے پانچ سال گھر سے دور، قریش کے نزدیک ادنیٰ اور کم حیثیت بدو قبائل کے بیچ، رضاعی ماں کے یہاں بسر کرنے پڑے۔ مکہ سے دور، صحرا کے بیچوں بیچ آباد یہ بدو قبائل شہروں کے تہذیب یافتہ معاشرے سے کٹ کر شمار کیے جاتے تھے۔

یہ قحط کا سال تھا۔ سننے میں یہ بات عجیب لگتی ہے مگر محمدؐ کے لیے یہ قحط خوش قسمتی لے کر آیا۔ مسلسل چند سال تک بارشیں نہ ہونے کی وجہ سے صحرا میں شدید قحط پیدا ہو چکا تھا۔ یوں، بدو قبائل کو قحط کے نتیجے میں پیدا ہونے والی مشکلات کے سبب شہری علاقوں کی طرف عارضی ہجرت کرنا پڑی۔ ان قبائلیوں میں ایک جوان بدو عورت حلیمہ بھی اپنے شوہر کے ہمراہ مکہ تشریف لائیں۔ عام طور پر یہ ہجرت معاش کی تلاش میں ہوا کرتی تھی۔ مردوں کے ساتھ قبائلی عورتیں بھی اس لیے آیا کرتیں کہ شہر میں کسی امیر خاندان کا شیر خوار بچہ رضاعت کے لیے گود لیں اور اس کے عوض معاوضہ کما سکیں۔ یہاں محمدؐ کا معاملہ دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ اس برس قحط کے سبب بہت سی عورتیں، جن میں حلیمہ بھی شامل تھیں، ہجرت کر کے مکہ آنے پر مجبور ہوئیں۔ اگر اس سال حلیمہ محمدؐ کو گود نہ لیتیں تو شاید آپؐ شیر خواری کی عمر میں جانبر نہ ہو پاتے۔

صحرا میں قحط کا کچھ لوگوں کو شاید عجیب لگتا ہو کہ صحرا سے مراد ایسا خطہ لیا جاتا ہے جہاں نباتات اور زندگی پنپ ہی نہیں سکتی۔ دنیا بھر میں، صحراؤں میں بس چند ہی مقامات ایسے ہیں جہاں پر بارش کا ایک بھی قطرہ نہیں برستا۔ زیادہ تر صحرائی علاقے بشمول شمال اور وسطی عرب میں ہر سال تھوڑی ہی سہی مگر بارشیں ضرور برسا کرتی ہیں۔ موسم سرما میں برسنے والی یہ بارشیں گو مختصر ہوتی ہیں مگر ان کے باعث صحرا میں جیسے بہار آجاتی ہے۔ معمولی نمی کے تڑکے سے ہی ریت میں دبے خوابیدہ جنگلی بیج جان پکڑ لیتے ہیں اور ہر طرف ہریالی ہو جاتی ہے۔ صحرا نخلستان کا منظر پیش کرنے لگتا ہے اور صحرائی سرسبز گھاس پھونس سے مال مویشی کے لیے چارہ مہیا ہو جاتا ہے۔ بعض دفعہ ایسا ہوتا کہ سردیوں کے موسم میں بارشیں نہیں برستی تھیں۔ جیسے کہ یہ سال تھا۔ بدو قبائل مال مویشی کو چرانے دور دراز علاقوں تک لے جاتے مگر چراگاہیں بنجر اور خشک ملتیں۔ نتیجہ، جانور کمزور ہو جاتے اور تھن سوکھ جاتے۔ بدو بے بسی سے جانوروں کو یوں برباد ہوتا دیکھتے رہتے۔ بدترین قحط میں، یعنی جب دو تین سال تک مسلسل بارشیں نہ برستیں تو صورتحال خاصی بگڑ جاتی۔ ایسی صورتحال میں جانور مرنا شروع ہو جاتے اور یوں خانہ بدوش صحرائی اپنے آبائی علاقوں

سے ہجرت کرنے پر مجبور ہو جاتے۔ بد ترین قحط کے دنوں میں یہ قبائلی مکہ جیسے شہری علاقوں کا رخ کیا کرتے اور شہر سے باہر ہی خیمے تان کر ان میں پڑے رہتے۔ شہر میں مردوں کو معمولی اجرت پر مزدوری تو مل جاتی تھی مگر اس میں مشقت خاصی ہوتی۔ پورے کنبے کو بہر حال اسی قلیل آمدن پر گزارہ کرنا پڑتا۔ یوں غیرت مند اور آزاد بدو مزدوری کی تلاش میں در بدر ہو جاتے۔ مکہ جیسے شہری علاقوں میں ان مجبور خانہ بدوشوں کی حالت غلاموں سے بھی بدتر ہو جاتی۔ غلاموں کو تو مالکان کی سرپرستی حاصل ہوتی تھی مگر بدو بے سروسامانی اور محتاجی کی بدترین صورت میں جینے پر مجبور تھے۔

دوسری طرف ہجرت کر کے آنے والی بہت سی دوسری بدو عورتوں کی طرح، حلیمہ نے بھی قحط کے پیدا کردہ حالات سے نبٹنے کے لیے آیا بننے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ وہ دور تھا جب خطہ عرب اور دنیا بھر میں تقریباً ہر طرف غریب اور دیہی عورتوں کی اکثریت اسی پیشے میں تھی۔ آیاؤں کا رواج بیویں صدی میں اس وقت تک عام رہا جب منڈی، بازاروں میں بچوں کے لیے خصوصی خوراکیں عام نہیں ہو گئیں۔ اس کے ساتھ جدید دور میں دیہی زندگی بھی روایتی نہیں رہی تھی۔ یوں، بیویں صدی میں دنیا بھر سے آیاؤں اور رضاعی ماؤں کا تصور ختم ہونے لگا اور ان کی جگہ باقاعدہ تربیت یافتہ نرسوں اور شیر خوار کفالت سکولوں نے لے لی۔ یہ تو خیر جدید دور کا عالم ہے، بیویں صدی تک کے سب ہی ادوار جیسے رومیوں اور یونانیوں کی شہنشاہی، قرون وسطیٰ، نشاۃ ثانیہ اور حالیہ جدید دور سے پہلے تک شہری علاقوں کے خوشحال گھرانوں میں پیدا ہونے والے بچوں کو ابتدائی دو سال تک رضاعی ماؤں کا دودھ پلایا جاتا تھا۔ بلکہ اس دوران ان بچوں کی کفالت بھی یہی رضاعی مائیں کیا کرتی تھیں۔ بسا اوقات اور بعض معاشروں میں بچوں کے لیے رضاعت سماجی رتبے کی علامت بھی سمجھی جاتی تھی۔ پھر رضاعی ماؤں سے کفالت کے دوسرے کئی فوائد بھی تھے۔ جیسے رضاعت کے سبب خوشحال دولت مند گھرانوں کے بچوں کی بہتر، قدرتی ماحول میں پرورش جیسے مقاصد پورے ہوتے آئے تھے۔

تب دولت مند گھرانوں میں شاہانہ انداز سے زندگی بسر کرنے والی عورتوں کا شہری معاشرے میں واحد کردار نرینہ اولاد پیدا کرنے کی کوشش رہا کرتا تھا۔ اس دور میں بچوں کی شرح اموات بہت زیادہ تھی۔ اس لیے بہت کم شیر خوار بچے بلوغت کی عمر تک پہنچ پاتے، جانبر ہوتے۔ اس لحاظ سے یہ کردار کہ عورتیں صرف نرینہ اولاد پیدا کرتے رہنے کی کوشش میں جتی رہتی تھیں، آسان نہیں تھا۔ رضاعت کے سبب نرینہ اولاد پیدا کرنے کے مواقع بڑھ جاتے تھے۔ مطلب یہ کہ اگر عورت بچے کی پیدائش کے بعد جتنی جلد حمل سے ہو رہتی تو نرینہ اولاد پیدا کرنے کا موقع بڑھ جاتا۔ علاوہ ازیں، چونکہ ماں کا دودھ پلانے سے عورتوں کی تولیدی اہلیت بوجوہ قدرے کم ہو جاتی ہے تو اس مسئلے سے نبٹنے کا قابل عمل طریقہ بھی رضاعت ہی تھا۔ تب مزارعین اور خانہ بدوش عورتیں جو کہ رضاعی ماں کے طور پر دایہ کا کام کرتی تھیں، بہت کم حمل سے ہوا کرتیں۔ جس طرح آج عام ہے کہ غریب طبقے کی عورتیں زیادہ بچے پیدا کرتیں ہیں، تب معاملہ اس کے برعکس تھا۔ اس دور میں خوشحال طبقے کی عورتوں میں زیادہ بچے پیدا کرنے کا رواج ہوا کرتا تھا۔

حلیمہ کے مطابق، 570ء میں بہار کے اواخر میں جب وہ شہر مکہ میں دایہ کی نوکری تلاش کرنے نکلیں تو یہ ان کی سوچ سے بھی زیادہ مشکل کام ثابت ہوا۔ حلیمہ کا تعلق مکہ سے خاصا باہر صحرائی علاقوں میں آباد نیم خانہ بدوش بدو قبیلے سے تھا۔ قحط کے باعث کئی دوسرے بدو قبائلیوں کی طرح ان کا کنبہ بھی اپنی بقاء کی جنگ لڑ رہا تھا۔ حالات اس قدر ابتر ہو چکے تھے کہ جس گدھے پر سوار ہو کر حلیمہ یہاں تک پہنچی تھیں وہ بھی خاصہ کمزور اور لاغر ہو چکا تھا۔ خود حلیمہ کے پستانوں میں دودھ سوکھ رہا تھا اور ان کا اپنا شیر خوار بچہ بھوک سے بلبلاتا رہتا۔ وہ جانتی تھیں اس حالت میں وہ مکہ کے خوشحال، دولت مند گھرانوں کی نظر میں بطور دایہ جچ نہیں سکتیں مگر ان کے پاس کوشش کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ حلیمہ کے ساتھ آنے والی عورتیں، ایک کے بعد دوسری، مکہ سے شیر خوار بچوں کو گود لے کر واپس روانہ ہوتی رہیں۔ یوں، دستیاب محدود مواقع اور بھی مسدود ہوتے چلے گئے۔ حلیمہ کی زبانی، جلد ہی ان کے ساتھ آنے والی ہر عورت کو گود لینے کے لیے شیر خوار بچہ مل گیا مگر وہ ویسی ہی ناکام رہیں جیسی پہلے دن تھیں۔ ان کی نظر میں، شہر بھر میں صرف ایک بچہ باقی رہ گیا تھا۔ بشمول ان کے، ہر عورت نے اس بچے کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ یہ بچہ یتیم تھا اور دایہ کے کام کی اجرت بچوں کے والد سے وصول کی جاتی تھی۔ بچے، بالخصوص ایک بیٹے کا والد عام طور پر مناسب اور بسا

اوقات منہ مانگی اجرت دے دیا کرتا تھا۔ یوں، ایک یتیم کو قبول کرنے کا مطلب یہ تھا کہ کام کا منہ مانگا تو دور، شاید مناسب معاوضہ بھی نہ مل پائے۔ چنانچہ ہر عورت اس بچے کو قبول کرنے سے انکاری تھی۔

اس وقت تک حلیمہ نے اس بچے کے بارے میں ایسی کوئی بات نہیں سنی تھی جن باتوں کی بابت بعد میں لوگ قسمیں اٹھانے کو تیار تھے۔ جیسے، جس رات عبد اللہ کی شادی ہوئی ان کی پیشانی پر سفید روشنی تھی یا یہ کہ جب آمنہ حمل سے تھیں تو ان کا پیٹ اس طرح جگمگاتا تھا گویا، 'آپ اس روشنی کو اتنی دور، یہاں تک کہ شام کے محلات سے دیکھ سکتے تھے'۔ اس طرح کے قصے کم از کم ایک سو سال بعد مشہور ہوئے۔ بہر حال، حلیمہ اور دوسری دایہ عورتوں کا معاملہ تب یہی تھا کہ وہ شیر خواری کے لیے ایک یتیم بچے کو بوجوہ قبول نہیں کر سکتی تھیں۔ ایک یتیم کسی کو بھی قبول نہیں تھا۔ حتیٰ کہ خود عبد المطلب کو بھی نہیں۔ اصولی طور پر تو آمنہ اور محمدؐ بنی ہاشم کے سربراہ عبد المطلب کی ذمہ داری تھے مگر عمر رسیدہ شخص پر ایک اور پوتے، وہ بھی ایک یتیم کی ذمہ داری تھی۔ جس کی قسمت کا بھی کچھ علم نہیں تھا، وہ نہیں جانتے تھے کہ یہ جانبر بھی ہو پائے گا یا نہیں؟ بلوغت تک پہنچ پائے گا یا نہیں؟ عبد المطلب کے پاس محمدؐ کی شیر خواری کے عرصہ دو سال تک رضاعت کا خرچہ اٹھانے کی کوئی مناسب وجہ نہیں تھی۔

آمنہ اور نہ ہی حلیمہ کو شماریات کا اندازہ تھا مگر وہ دونوں اس بات سے بخوبی واقف تھیں کہ شہر کی فضا، شیر خوار بچوں کی صحت کے لیے کسی طور بھی مناسب نہیں تھی۔ اگر بچہ کسی دایہ کے حوالے کر دیا جاتا جو اس کو شہر کی کثافت سے باہر قدرتی ماحول میں دو سال تک پرورش کرتی تو بچے کے لیے زندہ رہنے کے مواقع بڑھ جاتے تھے۔ یاد رہے، اس دور میں جب آج کی طرح جدید ادویات میسر نہیں تھیں۔ شیر خواری کی عمر میں بچے کا جانبر ہو پانا ہی اچھی خاصی کامیابی تصور کی جاتی تھی۔ چھٹی صدی عیسوی ہی کیا، حالیہ دور سے پہلے کی معلوم شماریات ملاحظہ ہوں۔ رومی سلطنت کے شہری علاقوں میں پیدا ہونے والے تمام بچوں کا صرف تیسرا حصہ ہی پانچ سال کی عمر تک پہنچ پاتا تھا۔ اسی طرح اٹھارہویں صدی میں لندن کی شماریات سے پتہ چلتا ہے کہ سولہ سال کی عمر تک پہنچتے، بچوں کی آدھی آبادی مر جایا کرتی تھی۔ اس دور میں چاہے وہ یورپ کا شہر پیرس ہو یا مشرق وسطیٰ میں حجاز کا مکہ شہر۔۔۔ معمولی زخم، چاہے ذرا سی خراش ہی کیوں نہ ہو، جراثیمی وبا اور انفیکشن کے سبب مہلک ثابت ہو سکتا تھا۔ اس دور میں بیماریوں، غذائی قلت، پر تشدد واقعات، حادثات، زچگی، خوراک اور پانی کی آلودگی، جنگ اور جدل کی وجہ سے تقریباً آبادی کے صرف دس فیصد لوگ ہی پینتالیس یا اس سے زیادہ عرصے تک جی پاتے۔ بیسویں صدی کے آغاز میں جب جراثوموں کے بارے تحقیق وضع ہوئی اور اینٹی بائیوٹک ادویات دریافت کر لی گئیں تو حالات میں بہتری آئی۔ شرح عمر میں اضافہ ہوا۔ آج ان بہتر حالات کو ہم نعمت غیر مترقبہ جانتے ہیں۔

آج کے لحاظ سے تب ایک معاملہ اور بھی مختلف تھا۔ اس دور میں شیر خوار بچوں کی شرح اموات دیہی علاقوں میں بہت کم تھیں۔ پوری دنیا میں یہ معاملہ ایسا ہی تھا۔ اس کی اصل وجہ تو معلوم نہیں مگر تازہ ہوا اور پانی کا صحت پر اثر سمجھا جا سکتا ہے۔ شہروں میں پرورش کے لیے ماحول سازگار نہیں ہوتا۔ یہ چھٹی صدی کے شہر مکہ کے لیے بھی اتنا ہی درست ہے جتنا کہ آج کے شہری علاقوں بارے مستند مانا جاتا ہے، یہاں سہولیات اور ماحول میں فرق ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہے۔

موسم گرما میں، جب دن کے وقت درجہ حرارت چالیس درجے سے بڑھ جاتا تو ہوا ناقابل برداشت ہو جاتی۔ شہر کے اندر نہ صرف موسم کی گرمی بلکہ گھروں کی چمنیوں اور بھٹیوں میں بھڑکتی آگ سے حدت کی وجہ سے حبس بڑھنے لگتا۔ چونکہ مکہ چاروں طرف سے پہاڑیوں میں گھرا ہوا ہے تو شہر میں گرمی شدید ہو جاتی۔ اسی طرح شہر سے قدرے باہر کوڑے کرکٹ کا ڈھیر تھا جس پر گدھ منڈلاتے اور جنگلی آوارہ جانور گھومتے رہتے تھے۔ کوڑے کے ڈھیر میں گرمی کے سبب جراثیم کی بہتات ہو جاتی جو ہوا کے دوش پر سارے شہر میں پھیل جاتے۔ اسی طرح شہر میں نکاسی کا کوئی انتظام نہیں تھا جس سے کنوؤں کا تازہ پانی بھی آلودہ ہو جاتا۔ یوں شہر بھر میں وبائی امراض عام تھے۔ جس برس محمدؐ کی پیدائش ہوئی، اس سال بھی مکہ میں چیچک کی وبا پھیلی ہوئی تھی۔ الغرض، یہ ماحول شیر خوار بچوں کے لیے ہرگز موزوں نہیں تھا۔

ایسے حالات میں کہا جاسکتا ہے کہ آمنہ محمدؐ کے لیے دایہ، رضاعی ماں تلاش کرنے میں جان توڑ کوشش کرتی ہوں گی۔ دایہ جو شیر خوار محمدؐ کو گود لے کر شہر سے باہر صحرائی علاقے میں منتقل ہو جائے۔ تب ہی تو وہ حلیمہ جیسی کمزور، بھوک و غذائی قلت کی شکار رضاعی ماں، جس کی گود میں پہلے سے ایک شیر خوار بچہ تھا کے ہاتھ محمدؐ کو گود دینے پر تیار ہو گئی تھیں۔ اسی طرح حلیمہ کی اپنی حالت کے باعث ان کے متعلق یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ہر طرف سے جب ناکام اور ناامید ہو چکیں تو بالآخر محمدؐ سے یتیم کو گود لینے پر رضامند ہونا، ان کی مجبوری بن گیا۔

شاید حلیمہ نے محمدؐ کو گود لینے کی حامی اس لیے بھی بھر لی تھی کہ وہ مکہ سے واپس جانے والی تمام عورتوں میں واحد عورت نہیں بننا چاہتی تھیں جو اپنے قبیلے، علاقے کو خالی ہاتھ لوٹ رہی تھی۔ چونکہ بدو قبائلی عورتیں اچھی خاصی اناپسند مشہور تھیں تو یہ ممکن تھا۔ یا پھر شاید، حلیمہ کو محمدؐ پر ترس آگیا تھا۔ خود حلیمہ کا بیان اس طرح قلم بند ہے کہ، "جب ہم نے واپس جانے کا فیصلہ کر لیا تو میں نے شوہر سے کہا، 'بخدا، میں خالی ہاتھ واپس نہیں جانا چاہتی۔ میں جا کر اس یتیم بچے کو گود لے لوں گی'۔ اس پر شوہر نے کہا، 'جیسے تمہاری مرضی ہو۔ شاید اسی یتیم کے صدقے خدا ہم پر رحم کر لے۔' چنانچہ وہ واپس ہوئیں اور صرف اس وجہ سے کہ وہ خالی ہاتھ لوٹنا نہیں چاہتی تھیں، محمدؐ کو گود لے لیا۔"

اس کہانی پر بھی بعض جگہوں پر مسیح مولود کی ولادت سے متعلق کہانی کا گماں ہوتا ہے۔ محمدؐ کی کہانی میں حلیمہ اور ان کے شوہر کی مثال حلیم طبیعت چرواہوں سی ہے۔ گو اس کہانی میں بوڑھے، عقلمند لوگ تو نہیں ہیں جو تحائف لاتے ہوں یا رات میں آسمان سے شہابیے گر رہے ہوں یا کوئی فاتح شہنشاہ جنون میں انتقامی کاروائی کرتا پھر رہا ہو مگر اس کے باوجود مقبول عام روایت ان دونوں کہانیوں میں کرامات اور کرشمے کا تقاضا کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جوں ہی حلیمہ نے محمدؐ کو گود لینے کا فیصلہ کیا، جیسا کہ ابن اسحاق نے روایت کی ہے، حلیمہ سے منسوب بیانات میں ان کا لب و لہجہ ایک دم بدل جاتا ہے۔ جیسے عیسیٰ کے قصے میں چرواہوں کے بارے احترام کا لہجہ اختیار کیا جاتا ہے، یہاں بھی حلیمہ اب صرف ایک باتونی، شوہر سے نوک جھوک کرنے والی اناپسند، بدو عورت نہیں بلکہ بی بی حلیمہ ہیں۔ راویوں کے بیان سے اخذ کریں تو محمدؐ کو گود لیتے ہی حلیمہ اور ان کے خاندان کے ساتھ گویا معجزہ ہو گیا ہے۔ حلیمہ کے پستانوں میں دودھ بھر آیا ہے جو محمدؐ اور ان کے اپنے شیر خوار کے لیے کافی تھا۔ جو اونٹنی وہ ساتھ لائے تھے اس سے بھی دوبارہ دودھ دوہا جانے لگا تاکہ وہ اور ان کا خاندان جتنا چاہتے، دودھ پی سکتے تھے۔ جس گدھے پر سوار ہو کر آئے تھے وہ بھی یکدم چست اور توانا ہو گیا۔ اسی طرح، روایت کیا جاتا ہے کہ جب وہ اپنے گاؤں میں واپس پہنچے تو بھیڑ بکریاں بھی اب کمزور اور لاغر نہیں رہی تھیں۔ بدترین قحط کے باوجود موٹی تازی تھیں اور پھر سے دودھ دینے کے قابل ہو گئی تھیں۔ یوں، حلیمہ اور ان کے شوہر نے اندازہ لگایا کہ محمدؐ کو گود لینے سے ان کے خاندان پر خدا کی رحمت ہو گئی ہے۔ شاید، حلیمہ نے جب یہ حالات بیان کیے تو وہ ماضی کو یاد کر رہی تھیں۔ ماضی کا حال عام طور پر بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کئی دہائیوں بعد جب یہ واقعات دوبارہ اور سہ بارہ بیان کیے جانے لگے تو محمدؐ کو گود لینے کے واقعہ بارے جس قدر ادب اور تعظیم کا تقاضہ تھا، معجزاتی اور کرشماتی انداز اپنایا جانے لگا۔ عقل اور حقائق سے دور یہ احوال بالکل عیسیٰ کی شیر خواری جیسا ہے۔ عیسیٰ اور محمدؐ، دونوں کے بارے میں مشہور ان واقعات میں کافی مشابہت پائی جاتی ہے۔ عقیدت پکتی ہے اور یہ معجزہ معلوم ہوتے ہیں۔ ان پر لوگوں کا ایمان کی حد تک یقین قائم ہے۔

ہم یہ تو جانتے ہیں کہ ماں کا دودھ بچے کے لیے غذائی ضرورت اور قوت مدافعت بڑھانے کا ذریعہ ہے مگر ساتھ یہ بھی ماننا ہے کہ اس کی تاثیر ان ضرورتوں سے کہیں بڑھ کر ہے۔ قدیم روم میں مشہور تھا کہ رضاعی ماؤں کا دودھ پینے والا بچہ دودھ کے ساتھ یونانی زبان بھی پیتا ہے۔ یعنی بڑا ہو کر یونانی اور لاطینی، دونوں زبانیں بول سکتا ہے۔ یہ بات درست تھی۔ درست اس لیے کہ بچہ دودھ میں یونانی رضاعی ماؤں کی زبان گھول کر نہیں پیتا تھا بلکہ پہلے دو برس اس کی بسر یونانیوں کے یہاں ہوا کرتی تھی جو یونانی زبان بولتے تھے اور بچہ ان کی آوازیں سنتا تھا۔ آج ہم ماں اور شیر خوار بچے کے بیچ انس، تعلق، فعلیات اور نفسیات کے بارے میں تحقیق اور بات کرتے ہیں۔ تحقیق سے ثابت ہے کہ کوئی بھی خصوصی خوراک، ماں کے دودھ کا نعم البدل نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح زچہ و بچہ کے مابین دودھ اور انسیت بچے

کی صلاحیتوں پر خوشگوار اثر ڈال سکتی ہے۔ یہ بات گو آج تحقیق سے ثابت ہے مگر چھٹی عیسوی صدی میں مکہ شہر کے لوگ بھی اس بات کو بخوبی سمجھتے تھے۔ مشہور تھا کہ بدو عورتوں کے دودھ میں تاثیر تھی۔ ان کے دودھ میں قوت حیات ہے۔ یہ صرف جسمانی نہیں بلکہ روحانی اور اخلاقی لحاظ سے بھی بچے پر مثبت اثرات مرتب کرتا ہے۔ آمنہ بھی اس بات پر یقین رکھتی تھیں، معاملے کو سمجھتی تھیں۔ جیسے دوسرے لوگ، وہ بھی یہ مانتی تھیں کہ حلیمہ کی گود میں، ایک بدو رضاعی ماں کا دودھ محمدؐ کی صحت اور طبیعت میں اصیل خصلتیں پیدا کرے گا۔ صحرا کا جوہر، صحرا کی روح۔ بدو قبائل کے بارے میں عام خیال یہ بھی تھا کہ یہ حجاز کے صحرائی، اصیل عرب ہیں۔

عزت، غیرت، وفاداری، آزادی، مہمان نوازی اور جنگجوئی۔۔۔ یہ عرب، بالخصوص بدو قبائل کی وہ خصلتیں تھیں جو حجاز کے طول و عرض میں مشہور تھیں۔ یہ خصوصیات، طویل نظموں اور شیریں نغموں میں بیان کی جاتی تھیں۔ عرب روایات اور بدو قبائل کی جرات بارے شاعری، جیسے قصیدے، سہرے، رباعیاں اور گیت وغیرہ خاصے مشہور تھے۔ شاعروں کو انتہائی عزت دی جاتی تھی اور دھیان سے سنا جاتا تھا۔ ان شاعروں کے شہرہ آفاق کلام کی ہر طرف دھوم تھی۔ بسا اوقات تو شاعروں میں انعام کے طور پر خالص سونے کی اشرفیاں بھی بانٹ دی جاتیں۔ عربوں کی زیادہ تر آبادی دیہی علاقوں میں بسر رکھتی تھی۔ یہ بدو لوگ تھے جو اونٹ کے بالوں سے بُنے ہوئے خیموں میں بسر رکھتے تھے۔ ان میں تقریباً لوگ پڑھ اور لکھ نہیں سکتے تھے مگر اس کا ہرگز مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ الفاظ کی خوبصورتی سے بے بہرہ ہیں۔ چونکہ تقریباً آبادی کا دارومدار زبانی کلام پر تھا، عربی زبان کے لیے ہر ایک شخص چاہے شہری ہو یا بدو، دل اور دماغ میں خصوصی گوشہ رکھتا تھا۔ یوں، عربی صرف ایک زبان نہیں پہچان کے طور پر مشہور تھی۔ عرب اسی زبان کی بدولت قدیم روایت سے جڑے ہوئے تھے۔ اسی طرح، پڑھنے لکھنے کی سہولت نہ ہونے کے سبب، لوگوں کو عربی زبان میں لکھی گئی یہ شاعری گویا حفظ تھی۔ بچوں کو روز رات لوریاں، داستانیں سنائی جاتیں۔ انتہائی طویل نظمیں اور بحریں لوگوں کو زبانی یاد ہوتیں اور یہ سینہ بہ سینہ نسل در نسل منتقل ہوتیں۔ شاعر محفلوں میں گزرے ہوئے زمانے کے نامور عرب قبائلیوں کے قصیدے اور نوحے پڑھتے جو وقت کے دھارے میں کہیں گم ہو گئے تھے۔ ان کی یاد، بہادری کے نت نئے قصے گھڑے جاتے۔ اسی لیے شاعری کے ساتھ داستانیں بھی تھیں۔ عربوں کے جنگی کارناموں، فتوحات اور کمالات کی داستانیں، جن میں بہادری اور قربانی کا ذکر رہتا، خاصی مشہور تھیں۔ یہ داستانیں بھی زیادہ تر شیریں اور رواں عربی میں بیان کی جاتیں اور اسی طرح یاد کی جاتیں۔ داستانیں اس قدر مشہور تھیں کہ ان میں سے بعض، جیسے 'سات کا قصیدہ' نامی ادبی شاہکار آج بھی عرب دنیا میں مشہور ہے۔ اس داستان میں کثرت سے رومان، جان پر کھیل کر جو کھم، دکھ، بڑائی اور گمشدہ محبتوں کا ذکر ملتا ہے۔ چونکہ محبت، دکھ اور گمشدہ بڑائی عرب اور عربوں سی ہر قوم اور فرد کے ماضی کا معاملہ تھا، یہ قصے تادیر مشہور رہے۔ جنگ ہمیشہ ہی لڑی جاتی رہی ہے، محبت ہر دور میں تازہ رہتی ہے اور کون ہے جس کو کوئی غم نہیں ہے؟ تب ہی تو، یہ قصے، داستانیں اور شاعری ہمیشہ ہی عام رہی۔ لوگ اس کو بار بار دہراتے، ہر نئے موقع پر، تازہ ہونے والی یاداشت پر مجالس میں پڑھتے۔ ہر دور میں یہی اظہار کا ذریعہ رہی ہیں۔ اگر کسی قوم کا ماضی تابناک اور حال ابتر ہوتا جاتا ہو تو گم شدہ ماضی کی یاد، خلا اور خسارے کا احساس بڑھتا جاتا ہے۔ عربوں کا حال بھی مختلف نہیں تھا۔ اسی لیے عرب معاشرے کے حافظے میں بیت چکے سہانے ماضی کی یہ داستانیں، شاعری اور موسیقی ہمیشہ کے لیے امر ہو گئی تھیں۔

چھٹی صدی عیسوی میں جدید دور کے امین، مکہ کے شرفاء اور بااختیار طبقے کے نزدیک بدو قبائلی شاعری اور داستانیں، اس حسرت کا اظہار تھیں جو وہ بننا چاہتے تھے۔ بدوؤں کو بھی احساس تھا کہ شاعری وغیرہ میں جیسا بیان کیا جاتا ہے، حقیقت حال میں وہ باقی نہیں رہے۔ یہ جوش اور ہیجان ماضی کی یاد پر استادہ تھا۔ گزرے ہوئے وقت کی چاہ تھی۔ صحرائی قبیلوں میں نفاست اور خالص عرب روایات کا ارمان، رومان کی حد تک بڑھ چکا تھا۔ اس ہیجان کی وجہ یہ تھی کہ اب ان کی روایات اور معاملات میں تجارت اور نفع نقصان کا کھوٹ شامل ہو چکا تھا۔ ایک عرب بدو تو تعریف کی رو سے جنگجو، سادہ اور غیرت مند آدمی ہوا کرتا تھا۔ اس کی زندگی بہادری اور جرات، جنگجوئی سے متعلق تھی۔ جیسے اٹھارہویں صدی عیسوی میں یورپ بھر میں چرواہوں کی سادہ زندگی سے رومان جڑا ہوا تھا یا بیسویں صدی عیسوی میں

امریکیوں کا ہیرو کاؤبوائے تھا۔ اسی طرح چھٹی صدی عیسوی کے مکہ میں بدوؤں کو عرب کی علامت، صحرا کا بیٹا سمجھا جاتا تھا۔ مگر جیسے یورپ کے چرواہے اور امریکہ کے کاؤبوائز کی حقیقت کچھ اور تھی۔ بدو اور بدوؤں کے لیے بھی معاملہ اس سے مختلف نہیں تھا۔

گو بدو قبائل ماضی کو یاد کرتے تھکتے نہیں تھے مگر حقیقت میں ان کا حال اب بھی ماضی سے مختلف نہیں تھا۔ قبائلی علاقوں کا حال مکہ جیسے شہروں کے مقابلے میں ماضی کا ہی کوئی دور معلوم ہوتا تھا۔ اسی وجہ سے تو مکہ کے لوگ انہیں قدامت، خالص عرب روایات سے جوڑا کرتے تھے۔ دوسرے لفظوں میں یہ قبائل شہریوں کے نزدیک تہذیب یافتہ نہیں تھے۔ ان کے لیے غیر مہذب، جنگلی اور گنوار وغیرہ کی اصطلاحات اوائل اسلامی تواریخ میں عام ملتی ہیں۔ شہر کی پختہ عمارتوں میں بسر کرنے والوں کے نزدیک خیموں میں بسنے والے یہ بدو غیر شائستہ لوگ تھے۔ ان کی اوقات مال مویشی پالنے، شہریوں کے بچوں کی کفالت کرنے اور قافلوں کو صحرا میں راستہ دکھانے سے بڑھ کر نہیں تھی۔ مکہ کے شرفاء کے نزدیک بدو شہروں میں بسنے کے لائق نہیں تھے۔ حالانکہ، خود مکہ کے یہ شہری، تہذیب یافتہ لوگ صرف پانچ نسل پہلے تک اسی قبیل سے تعلق رکھتے تھے۔

بدوؤں کو بھلے مکہ کے لوگ حقیر جانتے تھے مگر حقیقت میں مکہ کا شہر انکے بغیر چلنا مشکل تھا۔ اصیل گھوڑے، چست اور توانا اونٹ جن پر مکہ کے لوگ تجارتی قافلے لے کر دور دراز علاقوں جیسے شام اور یمن تک جایا کرتے تھے، بدوؤں کے مرہون منت تھے۔ ان کے بغیر شاید مکہ تجارتی مرکز نہ ہوتا۔ اسی طرح بدو لوگ روزمرہ کے استعمال کی اشیاء پیدا کرتے تھے۔ جیسے گھوڑوں کی زین، کاٹھیاں، کپڑے اور کمبل، دودھ سے بنی مصنوعات، گوشت، جوتے اور کوزے وغیرہ وغیرہ۔ یعنی، ہر طرح کی ضروریات زندگی بدوؤں کے یہاں سے بن کر آتی تھیں۔ شہری آبادی اور بدو قبائل کے بیچ معیشت کا گہرا تعلق قائم تھا۔ یہ تعلق دونوں کے لیے ناگزیر تھا۔ اس کے باوجود دونوں میں ایک دوسرے کے لیے گہری آزردگی بھی پیدا ہو گئی تھی جو اکثر ہتک کی حد تک بڑھ جاتی تھی۔ تعلق بہرحال جوں کا توں برقرار رہتا تھا۔

مکہ کے باسیوں کے لیے یہ ایک لحاظ سے آج امریکہ میں سیاسی مفادات کے تحفظ کی مثال جیسا بھی تھا۔ امریکہ میں شہری سیاسی طبقہ دیہی علاقوں اور وہاں کی آبادی کی قدر اور منزلت کا دعوی کرتا ہے۔ امریکی دیہاتیوں کے محنتی ہونے، خلوص اور استقامت کے گن گائے جاتے ہیں۔ یہ اس لیے کہ دیہاتی لوگ ان کی سیاسی ضرورت ہیں۔ گو مکہ کے لوگوں کی ایسی کوئی سیاسی مجبوری تو نہیں تھی مگر پھر بھی وہ بدو قبائل کے شاندار ماضی، روایت، جنگجوئی، بہادری اور استقامت کے گن گاتے تھے، کیونکہ بدو قبائل مکہ اور اس جیسے دوسرے شہروں کی معاشی ضرورت تھے۔ اس لحاظ سے کہیں تو آج امریکہ میں سیاسی شہری طبقے اور اس دور میں مکہ کے تاجر شہری معاشرے میں کوئی خاص فرق نہیں تھا۔

ایک طرح سے محمدؐ کے لیے بہتر یہی تھا کہ وہ زندگی کے پہلے پانچ برس بدو قبائل کے بیچ بسر کرتے۔ محمدؐ کی مانند، بدوؤں کی بھی زبانی کلامی قدر تو تھی پر حقیقت اس کے برعکس تھی۔ بدو عرب گو معاشرے میں مرکزی حیثیت رکھتے تھے، جیسے محمد صلعم اونچے خاندان کے فرزند تو تھے مگر بدو قبائل اور محمدؐ دونوں کو ہی منہ زبانی دھوم اور منزلت کارتی بھر فائدہ نہیں تھا۔ پھر، جیسے روم میں شیر خوار بچے یونانی زبان کو سن کر بولنا سیکھ جاتے تھے۔ اسی طرح محمدؐ نے بھی گویا، دودھ میں بدو قبائل کی عرب روایات اور اقدار کو گھول کر پی لیا۔ قدرت کے پوشیدہ اسرار اور روحانی منزلت پر یقین، انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی مفاد عامہ، روایتی موسیقی اور عربی زبان کی چاشنی، تاریخ اور اصلیت سے آگاہی وغیرہ۔ یہی اقدار آگے چل کر محمدؐ کو وہ شخص بنائیں گی جیسا کہ وہ ثابت ہوئے۔ یعنی، ایک طرف دنیاوی معاملات نبھانے کی باری آئی تو اپنے شہر میں محمدؐ بدو قبائل کے یہاں سیکھی ہوئی انہی اقدار کی پاسداری اور روایات پر عمل پیرا ہونے کے باعث معتبر ٹھہرائے گئے۔ وہیں، دوسری جانب ان کا یہ طریق فطری طور پر اپنے آبائی شہر میں جہاں قدریں کچھ اور تھیں، محمدؐ اجنبیت کا شکار ہو گئے، بیگانے قرار پائے۔

باب:3

جہاں حلیمہ نے یتیمی کے باوجود محمدؐ کو گود لے لیا تھا۔ وہیں یتیمی کے باعث ہی محمدؐ نے رواج کے برعکس دو سال کے بجائے مزید چند سال حلیمہ کے ہاں گزارے۔ تاہم یہ اس کی واحد اور قابل قبول وضاحت نہیں ہے۔ ایک دوسری وجہ خود حلیمہ کے مطابق یہ تھی کہ محمدؐ ان کے خاندان کے لیے خوش نصیبی لائے تھے۔ ان کے صدقے حلیمہ کے خاندان کی بدترین قحط کے دنوں میں بھی اچھی خاصی بسر ہو رہی تھی۔ بیان منسوب ہے، "ہم نے دو سال تک محمدؐ کی کفالت کی۔ میں نے انہیں اپنا دودھ پلایا۔ اس کو خدا کا فضل سمجھا۔ یہاں تک کہ دودھ چھڑانے کا وقت آگیا۔ "وہ مزید بتاتی ہیں، "ہماری بھرپور خواہش تھی کہ محمدؐ کو مزید کچھ دیر اپنے پاس رکھتے، کہ یہ بچہ خوش بختی لایا تھا۔ مگر، ہمارے پاس محمدؐ کو مکہ میں واپس آمنہ کے پاس لے جانے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا'۔ میں نے آمنہ سے کہا، 'یہ بہتر ہوگا کہ آپ اپنے بیٹے کو مزید چند سال ہمارے پاس ہی رہنے دیں۔ اس طرح یہ مکہ میں بیماریوں سے دور، محفوظ رہے گا'۔ ہم نے اس پر اصرار جاری رکھا۔ حتیٰ کہ آمنہ راضی ہوگئیں"۔

اگر یہ کہا جائے کہ شاید ایک بدو عورت بچے کو ہتھیانے کے لیے ہوشیار چالاکی سے حفاظت کا جواز بنا کر پیش کر رہی تھی تو وہیں یہ بھی عین ممکن ہے کہ آمنہ نے فرط جذبات میں محمدؐ کو بانہوں میں بھر لیا ہو۔ وہ اپنی مامتا کے ہاتھوں محمدؐ کو خود سے جدا کرنے میں مشکل محسوس کرتی ہوں۔ مادرانہ خواہش اور بچے کی صحت کے بیچ فیصلہ لینے میں مشکل سے دوچار ہوں۔ دونوں ہی صورتوں میں ایسے کسی ڈرامائی سین کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ ویسے بھی، یہ اکیسویں صدی کے جذبات ہیں اور چھٹی صدی عیسوی میں حقیقت خاصی مختلف رہا کرتی تھی۔ آمنہ کو ہر حال میں محمدؐ کی صحت، مامتا سے بڑھ کر عزیز تھی۔ اسی لیے، واجبی پس و پیش کے انہوں نے محمدؐ کو مزید چند سال صحرا میں بسر کرنے کے لیے حلیمہ کے ساتھ واپس روانہ کر دیا۔

یہاں ایک اور بات بھی ہے۔ آمنہ نے عبداللہ کی موت کے بعد دوبارہ شادی نہیں کی تھی۔ روایتی طور پر ایک بیوہ عورت، بالخصوص ایسی بیوہ جس کی عمر بمشکل بیس سال رہی ہو گی اور گود میں ایک شیر خوار بچہ بھی تھا۔ اس طرح کی صورتحال میں عین ممکن تھا کہ وہ فی الفور شادی کر لیتیں۔ ضرورت پڑنے پر اور جیسا عرب معاشرے میں رواج تھا، عبداللہ کے بھائیوں میں سے ہی کوئی ایک آمنہ کے ساتھ شادی کے لیے تیار ہو جاتا۔ اس طرح وہ کسی شخص کی دوسری یا شاید تیسری بیوی ہوتیں مگر خود اپنی حفاظت اور محمدؐ کی کفالت، معاشرے میں مقام کو یقینی بنا سکتی تھیں۔ مگر نئے دور کے شہر مکہ میں قدیم روایات دم توڑ رہی تھیں۔ اصولاً تو آمنہ اپنے سسر عبدالمطلب کی پناہ میں تھیں۔ ماں بیٹے کی کفالت، ان کی ذمہ داری تھی مگر خود عبدالمطلب کا حال یہ تھا کہ لاڈلے بیٹے کے تقریباً قتل کی قط اور اس کے فوراً بعد اس کی ناگہانی موت نے کمر توڑ کر رکھ دی تھی۔ عبدالمطلب کی ہمت جواب دے رہی تھی۔ یہ بیٹے کے غم میں وقت سے پہلے ہی بوڑھے ہو چکے تھے۔ عبدالمطلب کے اس طور زوال کے باعث اب بنی ہاشم کے اثر و رسوخ اور مال و دولت میں بھی خاصی کمی آچکی تھی۔ مکہ میں بنی ہاشم کی بجائے، امیہ خاندان صبعود اور قیادتی کردار میں آچکا تھا۔ گو حالت ایسی ابتر تو نہیں ہوئی تھی کہ مکہ کے لوگ اور قریش کے باقی کنبے ان کو محتاج اور غریب جانتے مگر پھر بھی کسی کو آمنہ سے شادی میں کوئی فائدہ نظر نہیں آیا۔ پھر محمدؐ کے نام پر کوئی وراثت بھی نہیں تھی اور عبدالمطلب کے دس بیٹوں میں بٹ جانے کے بعد شاید محمدؐ کے حصے میں کچھ بھی نہ بچتا۔ یوں، عین ممکن ہے کہ آمنہ کی قسمت میں ہمیشہ کے لیے بیوگی اور محمدؐ جو آمنہ کے اکلوتے بیٹے تھے، سدا اکلوتا رہنا ٹھہرا دیا گیا۔ سبب اس کے، محمدؐ کے کبھی سوتیلے بہن بھائی نہیں ہوں گے۔ یعنی، محمدؐ ان خاندانی تعلقات اور رشتوں سے محروم رہ جائیں گے جن کی بنیاد پر مکہ کا سماجی ڈھانچہ کھڑا تھا۔ سادہ الفاظ میں، مکہ میں محمدؐ کا سماجی رتبہ نہ ہونے کے برابر اور یہ اپنے آباء، خاندان سے کٹ کر رہ گئے۔ اس طرح کے حالات میں جب کہ کوئی دوسری صورت نہ تھی۔ آمنہ کے پاس

سوائے محمدؐ کو حلیمہ کے ساتھ رخصت کرنے کے کوئی چارہ نہیں تھا۔ ویسے بھی حلیمہ نے محمدؐ کی کفالت کے عوض ابھی تک کسی بھی طرح کے معاوضے کا تقاضہ نہیں کیا تھا۔

یوں، رواج کے برعکس محمدؐ دودھ چھڑانے کے بعد بھی واپس صحرا میں اپنے رضاعی ماں باپ کے یہاں پہنچ گئے۔ وہ مزید تین سال تک یہیں بسر کرنے والے تھے۔ ان تین برسوں میں بدو طرز زندگی آپؐ کے رگ و پے میں اتر جائے گی۔ کیتھولک فرقے کے بانی فرانسس جیویر نے کہا تھا کہ، 'مجھے ایک کم عمر بچہ تربیت کے لیے دو۔ میں اس کی ساتویں سالگرہ پر تمہیں وہ مرد دے سکتا ہوں جو یہ باقی عمر رہے گا۔' اس مقولے میں فرانسس نے جدید نفسیات کی پیش بینی کی ہے۔ یہی محمدؐ کے ساتھ ہوا۔ بدوؤں کے یہاں بتائے بچپن نے آپؐ کو وہ مرد بنا دیا جو وہ رہا کرتے تھے۔

صحرائی زندگی کے بارے جو خالص ہونے کی بات مشہور ہے، وہ دراصل فقر اور غربت کی عفت ہے۔ دودھ چھڑانے کے بعد محمدؐ دوسرے بدو بچوں کی ہی طرح کا کھانا کھاتے۔ یعنی، اونٹنی کے دودھ اور صحرا میں اگنے والے قلیل جنگلی اناج پر صبر کرنا پڑتا تھا۔ کھانے کے لیے یہی سادہ اور چھدری خوراک میسر تھی جو بدو طرز زندگی کی طرح منتشر اور حیثیت میں کم تھی۔ گوشت صرف خاص تہواروں یا کبھی کبھار کوئی معزز مہمان آن نکلتا تو صرف اس کی خاطر مدارت کے لیے پکایا جاتا تھا۔ یہاں کسی قسم کی تعیش اور تکلف کا کوئی سامان نہیں تھا۔ یہاں تک کہ بدوؤں کو کھانے میں شہد اور کھجوریں بھی دستیاب نہیں تھیں۔ گو یہ سادہ اور معمولی، بہر حال صحت مند زندگی تھی۔ محمدؐ کا زیادہ تر وقت گھر سے باہر گزرتا تھا۔

لق و دق صحرا میں بسر کرنے کا مطلب خود قدرت کے ہاتھوں تربیت حاصل کرنا اور فطرت کی تمام تر رعنائیوں مگر دشوار گزاریوں کے ساتھ گزارہ کرنا پڑتا ہے۔ صحراؤں کے باسی کو ان مشکلات کے ساتھ جینا سیکھنا پڑتا ہے اور ہر دم نبرد آزما، کم سے کم تر پر اکتفا، معمول پر قناعت کرنی پڑتی ہے۔ یہاں کی زندگی خاصی دلچسپ بھی ہوتی ہے۔ سیکھنے کو بہت کچھ ملتا ہے اور خالص عملی تجربات سے پالا پڑتا ہے۔ یہاں بھول چوک کی بھی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ مثال کے طور پر چراگاہوں کی بابت علم کو لے لیں۔ سرد سے گرم پڑتے موسم میں ریوڑ کو کہاں تک چرانے لے جا سکتے ہیں کہ یہ موسم کی سختی برداشت کر سکے؟ بھول ہوئی تو ریوڑ، یہاں تک کہ خود اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑ سکتا تھا۔ اسی طرح ایسی جگہوں پر جہاں دور دور تک پانی کا نام و نشان بھی نہ ہو، وہاں پانی کیسے اور کہاں تلاش کیا جا سکتا ہے؟ تپتے ہوئے صحرا میں پیاس پر کیونکر قابو رکھنا ہے؟ یا پھر، اونٹ کے بالوں سے بُنے خیموں کو کس طرف نصب کریں کہ گرمیوں میں سورج سے سایہ اور سردیوں میں ضروری تپش مل سکے؟ بدوؤں کے یہاں بچوں کو بھی ہر وہ کام کرنا پڑتا جو ان کے بس میں ہوتا تھا۔ محمدؐ ابھی صرف چلنے پھرنے کے قابل ہوئے تھے، ان کی رضاعی بہن شائمہ جو آپ سے بس چند سال بڑی تھیں، بھیڑ بکریوں اور اونٹ کے ریوڑ چرانے جاتیں تو محمدؐ کو ہمراہ لے جاتیں۔ آپؐ اس دوران شائمہ کے گندھے پر سوار یا ان کی بغل سے لگے رہتے۔ شائمہ کو بھیڑ بکریوں، اونٹوں کو ہانکتا، چراتا اور سنبھالتا دیکھتے رہتے۔ دن بھر بھاگ دوڑ اور محمدؐ کو سنبھالتے رہنے کے باعث شائمہ کی ٹانگیں جواب دے جاتیں مگر انہوں نے کبھی محمدؐ کو ساتھ لے جانا ترک نہیں کیا۔ وہ محمدؐ سے بے انتہا محبت کرتی تھیں۔ صحرا میں ان کا خیال رکھتیں۔ محمدؐ بھی اس دوران شائمہ پر نظر گاڑے رکھتے اور ان کو آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے دیتے۔ یہیں پر محمدؐ نے شائمہ سے بکریوں اور اونٹوں کو سنبھالنا سیکھا۔ آپؐ کم سنی میں ہی گویا ہر لحاظ سے ایک بدو لڑکے میں ڈھل چکے تھے۔ وہ بدوؤں میں سے ایک ہو چکے تھے۔ صرف ایک قباحت تھی کہ محمدؐ کو نام کے برعکس 'قریشی' کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ یعنی، قبیلہ قریش سے تعلق رکھنے والا۔

یہ نام، 'قریشی' محمدؐ کو یاد دہانی کراتا کہ گرچہ ان کی کل وقت گزر بسر حلیمہ کے خاندان میں ہے۔ ان کے رضاعی بہن بھائی اور ماں باپ ان سے بہت محبت رکھتے ہیں مگر پھر بھی وہ ان میں سے ایک نہیں ہیں۔ ان کا تعلق، خاندان اور اصل تو کسی اور جگہ میں ہے۔ باور کرایا جاتا کہ وہ پہاڑوں کے سلسلے حجاز کے اس پار واقع مکہ شہر سے تعلق رکھتے ہیں۔ حجاز کے لفظی معنی رکاوٹ کے ہیں۔ گو مکہ وہاں سے صرف پچاس میل کی دوری پر تھا اور اگر یہ فاصلہ ہزاروں میل بھی ہوتا تو بدوؤں کو

فرق نہیں پڑتا تھا۔ ان کے نزدیک مکہ جہان دیگر، زمین غیر تھا۔ بدو اس شہر کے متعلق بات کرتے ہوئے وحشت، بیزاری کا اظہار کرتے۔ ان کے نزدیک مکہ اس قدر عجیب تھا کہ جہاں لوگ ہر وقت پتھر کی دیواروں کے اندر بند، پابند ہو کر رہنے پر خوش رہتے ہیں۔ یہ کیسی تنگ جگہ ہے کہ آزادی سے گھومنے، مٹر گشت کی کوئی صورت نہیں ہے؟ یہاں تک کہ گھر سے باہر بھی کھلی فضا نہیں ملتی۔ مکہ سنگلاخ پہاڑیوں اور گھاٹیوں میں گھرا ہوا تھا۔ یہ سوچ کر ہی بدو متنفر ہو جاتے کہ ایسے شہر میں بھلا کوئی کیسے بسر کر سکتا ہے؟ یہ کس طرح کے لوگوں کا شہر ہے؟ گو بدو مکہ کو ایک ذرہ پسند نہیں کرتے تھے۔ پھر بھی ان کے لہجے میں اس شہر کے لیے احترام سدا قائم رہتا تھا۔ یہ شہر آخر کار ان کے معاشی تحفظ کا ضامن تھا۔ مشکل وقت میں مکہ ہی ان کی جائے پناہ ثابت ہوا کرتا اور گزر بسر کے لیے بدوؤں کا ہر حال میں مکہ کے شہریوں پر انحصار تھا۔ اس لحاظ سے بھی محمدؐ کے لیے معاملہ الٹ تھا۔ آپؐ کا تعلق مکہ سے تھا، ان کا خاندان بھی مکہ کے شرفاء میں شامل تھا مگر فی الوقت، محمدؐ کی گزر بسر بدوؤں پر منحصر تھی۔ جہاں محمدؐ کو ہر وقت 'قریشی' پکارتے رہنے سے انہیں قریش سے اپنی نسبت یاد رہی وہیں ذہن میں یہ بات بھی اچھی طرح بیٹھ گئی کہ بدو، ان کے محسن ہیں۔

جب محمدؐ پانچ سال کے ہوئے تو وہ تن تنہا جانوروں کو سنبھال سکتے تھے۔ مثلاً کنویں پر اونٹوں کو سیر ہو کر پانی پیتا دیکھتے اور صبر سے انتظار کرتے رہتے، یہاں تک کہ اونٹوں کے کوہانوں میں سرخی پھول کر دوڑنے لگتی۔ آپؐ جان لیتے کہ اب واپسی کا وقت ہو چلا ہے۔ اسی طرح رات بھر جاگ کر باڑے میں ریوڑ کا پہرہ کرتے۔ اونگھتے، اور رات بھر سوتے جاگتے، جانوروں کی دیکھ بھال میں ہاتھ بٹانا پڑتا۔ صحرا کے شکاری جانوروں سے بھیڑ بکریوں کو بچاتے، باڑے کے گرد آگ جلا کر حفاظت کا سامان کرنے میں مدد کرتے۔ رات بھر ارد گرد صحرائی لومڑیوں کو چیختا سنتے اور بعض اوقات محسوس ہوتا کہ شاید کوئی صحرائی شیر باڑے کے قریب ہی کہیں خاموشی سے راستہ کاٹ گیا ہے۔ اس پر رات کے یہ پہرے دار سہم جاتے مگر پھر کمال ہوشیاری سے خاموشی سادھ کر ایک طرف دبک کر بیٹھے رہتے۔ کئی بار ایسا ہوا کہ اگلی صبح باڑے کے پاس ریت پر شیر کے پنجوں کے نشان پائے گئے۔ یوں، ان حالات میں محمدؐ کو خود صحرا نے عجز، انکساری اور حلم سکھا دیا تھا۔ محمدؐ نے اسی عرصے میں ہر طرح کے نمود اور حرص سے بچنے اور بچ کر رہنے کا کڑا مگر عملی سبق پا لیا تھا۔ معصوم ذہن کے نہاں خانوں میں یہ بات جم کر بیٹھ چکی تھی کہ صحرا اور زندگی کس قدر سفاک اور بے رحم ہو سکتے ہیں۔ اندر ہی اندر وہ جان چکے تھے کہ یہ دنیا کس قدر عظیم اور بقید حیات ہے اور اس میں ایک انسان کی حیثیت بہت معمولی ہے۔

یہ تو خیر اس مادی دنیا کی معلومات تھیں جس سے محمدؐ بہر طور واقف ہو ہی رہے تھے۔ مگر صحرا میں تو ہر شے گویا جادو رنگ رکھتی ہے۔ جیسے دن بھر دھوپ میں جلتے رہنے والے پتھر بھی رات پڑتے ہی ایسے محسوس ہوتے کہ شاید رات کی ٹھنڈی ہوا میں گرمائش نکال کر سکھ کا سانس لیتے ہیں۔ جیتے جاگتے ہوئے معلوم ہوتے۔ رات میں سر پر تنی ستاروں کی چھتری، جس میں ہر کہکشاں گویا ایک جدا کہانی کا کردار نظر آتی تھی۔ یہ منظر ایک بچے کے لیے مسحور کن مگر سمجھنے میں دشوار ہو سکتا ہے۔ محمدؐ کا معصوم ذہن اس دوسری دنیا کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ یہاں ہر طرف انسانوں کے علاوہ ارواح اور چھو کر نفوس کا بھی بسیرا تھا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ہر طرح کے غیر ممکنات کے باوجود جنگل بیابان، خشک صحرائی وادی میں جہاں دور دور تک پانی کی ایک بوند نہیں ملتی، وہاں ایک درخت ضرور سرسبز و شاداب، اونچا تن کر کھڑا مل جاتا ہے؟ یا لق و دق صحرا میں کہیں نہ کہیں کوئی بڑا بھاری بھر کم پتھر ریت میں دھنسا ہوا ضرور ہوتا تھا جو دیکھنے میں گویا یادگار ہو مگر غور کرنے پر لگتا کہ شاید آسمان سے کسی نے گرایا ہے؟ یہ شاہیے تھے۔ ان یادگاروں، عجوبہ قدرت کے سامانوں کے بارے کہا جاتا کہ یہاں ارواح کا بسیرا ہے۔ یہ ارواح، یعنی جنات خاصے نا پیش بین تھے۔ ان میں اچھے اور برے، ہر طرح کے جنات مل جاتے تھے۔ ہر دو صورت یہ انسانوں سے احترام مانگتے تھے۔ جس طرح عیسائی شیاطین سے محفوظ رہنے کے لیے اپنے سینے پر صلیب کا نشان بناتے ہیں، اسی طرح تب صحرا میں مسافر، رات کے وقت بیابان میں پڑاؤ ڈالنے سے قبل با آواز بلند ٹوکا کرتے۔ وہ کہا کرتے، 'آج کی رات میں جنات کی اس وادی کے رب کی شیاطین سے پناہ مانگتا ہوں جن کا یہاں بسیرا ہے۔' اسی طرح کہا جاتا کہ اگر کسی شخص کے ذہن میں ان قوتوں اور قدرت کی ان طاقتوں پر ذرہ برابر بھی ایمان لڑکھڑایا تو پھر اس صورت میں بعض اوقات پاؤں کے تلے زمین ایسے انسانوں کو خود اس حماقت پر سبق سکھاتی

ہے۔ بیٹھے بٹھائے پیروں تلے سے زمین کھسکنے لگتی۔ مضبوط اور سخت چٹانیں لرزنے لگتیں۔ زمین چنگھاڑتی ہوئی معلوم ہوتی اور انسانوں کو چھپنے، حتیٰ کہ کھڑے رہنے کو بھی جگہ نہ ملتی۔ زلزلے قدرت، برتر ذات کا غضب کہلاتے۔

یوں، صحرا میں بسی ظاہری اور باطنی دنیا میں کسی کو تبلیغ کی ضرورت نہیں تھی کہ انسان سے برتر بھی کوئی طاقت وجود رکھتی ہے۔ آپ اپنی سہولت کے لیے اسے آج کے حساب سے قدرتی اصول یا پھر کوئی مافوق الفطرت طاقت سمجھ لیں مگر چھٹی صدی عیسوی میں دونوں میں ہی کوئی فرق نہیں تھا۔ عام خیال یہ تھا کہ جو ان طاقتوں سے منکر ہو یا علیحدہ کر دیا جائے تو ایسے شخص کا اس جہان میں چل پانا مشکل تھا۔ اگر ایسا تھا تو پھر محمدؐ کیونکر جانبر ہو پائیں گے جب ان کی ساری دنیا جس سے وہ واقف تھے، ایک دم چھن جائے گی؟ بغیر کچھ بتائے محمدؐ کو اچانک، ان کی اس چھوٹی سی دنیا سے نکال دیا گیا۔ پانچ سال کے کمسن بچے کو اپنے بہن بھائیوں سے جدا کر کے پہاڑوں کے اس پار ایک ایسے شہر میں لا کر چھوڑ دیا گیا جو ان کے لیے ناگفتہ بہ الفاظ میں غیر، اجنبی ملک جیسا تھا۔ محمدؐ کے ساتھ ایسا کرنے والا بھی کوئی دوسرا نہیں، خود حلیمہ تھیں۔ ماں، جس کی گود میں انہیں اس دنیا کی پہچان ہوئی۔ محمدؐ جب حلیمہ کے یہاں سے واپس مکہ آ رہے تو پھر جتنا ہم جانتے ہیں، انہیں اپنے رضاعی خاندان کو دوبارہ دیکھنے کا موقع پچاس سال بعد میسر آیا۔

حلیمہ، محمدؐ کو اچانک واپس مکہ پہنچا گئیں۔ روایت میں اس کی بابت ایک واقعہ مشہور ہے۔ ابن اسحاق حلیمہ کی زبانی یہ بیان منسوب کرتے ہیں کہ، 'محمدؐ اور اس کا رضاعی بھائی خیموں کی پشت پر بھیڑوں کے پاس تھے۔ رضاعی بھائی ہانپتا ہوا آیا اور بتایا، 'سفید کپڑوں میں ملبوس دو آدمیوں نے قریشی کو زمین پر لٹا کر پیٹ چاک کر لیا ہے اور اس کی آنتوں کو دھو رہے ہیں'۔ یہ سن کر سب دوڑ کر خیموں کی پشت پر گئے۔ ہم نے اسے وہیں کھڑا پایا، محمدؐ کا رنگ شوخ سرخ ہو کر دمک رہا تھا۔ میں نے اس کو بازوؤں میں اٹھالیا اور پوچھ گچھ کی۔ محمدؐ نے کہا، 'دو آدمی آئے اور مجھے زمین پر لٹا دیا۔ پھر میرا پیٹ چاک کیا اور اس میں نہ معلوم کیا تلاش کرتے رہے۔'

اس واقعہ کی دو مزید روایات ہیں۔ یہ دونوں ہی محمدؐ کے اپنے الفاظ میں، بالغ عمری میں منسوب ہیں۔ پہلی روایت میں وہ یہ تو نہیں بتاتے کہ جب یہ واقعہ پیش آیا تو اس وقت ان کی عمر کیا تھی مگر کہتے ہیں کہ، 'دو آدمی میری طرف آئے۔ انہوں نے ہاتھوں میں سونے کے سنہری پیالے اٹھا رکھے تھے۔ جو برف سے لبریز تھے۔ انہوں نے مجھے زمین پر لٹا کر پیٹ چاک کیا اور میرا دل باہر نکال کر کھول دیا۔ دل میں سے سیاہ رنگ کا ایک قطرہ الگ کر کے نکال کر دور پھینک دیا۔ پھر دل کو برف سے دھویا، یہاں تک کہ یہ پاک صاف ہو گیا۔'

محمدؐ سے منسوب دوسری روایت میں اس بابت پہلی روایات سے کہیں زیادہ تفاصیل اور جزیات بیان کی گئی ہیں۔ آپؐ یہاں بچپن کی بجائے اس وقت کا ذکر کرتے ہیں جب وہ مکہ سے مدینہ ہجرت کر چکے تھے۔ یہ روایت یوں ہے، 'دو فرشتے میرے پاس آئے۔ اس وقت میں مدینہ کی وادی میں کہیں موجود تھا۔ ان میں سے ایک فرشتہ زمین پر اترا اور دوسرا آسمان اور زمین کے بیچ معلق رہا۔ ایک نے دوسرے سے کہا، 'اس کا سینہ کھول دو' اور پھر، 'اس کا دل نکال لاؤ'۔ دوسرے فرشتے نے ایسا ہی کیا اور میرے سینہ اور دل چاک کر کے اس میں سے خون کا ایک سیاہ لوتھڑا نکال لیا۔ یہ میرے دل میں شیطان کے بھرے وسوسے تھے۔ اس لوتھڑے کو فرشتے نے نکال کر دور پھینک دیا۔ پھر پہلے فرشتے نے کہا، 'اس کے دل کو اس طرح دھو لو جس طرح تم کوئی پیالہ اندر سے مانجھتے ہو اور سینے کو یوں صاف کر دو جیسے تم کسی غلاف کو باہر سے دھویا کرتے ہو' بعد اس کے، سکینہ کو بلالیا۔ سکینہ جو کہ پاک روح ہے وہ ایک سفید بلی کی صورت میں حاضر ہوئی۔ اس نے میرے سینے پر استراحت کی۔ دوسرے فرشتے نے پھر کہا، 'اس کا سینہ سی ڈالو'۔ فرشتے نے سینے کو سی دیا اور میرے گندھوں کے بیچ رسالت کی مہر ثبت کر دی۔ میں محمدؐ اس واقعے کو اپنی آنکھوں سے ایسے دیکھ رہا تھا جیسے قریب ہی کھڑا ہوں۔'

غور کریں تو حلیمہ اور بالخصوص محمدؐ سے منسوب بیانات میں ہر بار دہرانے پر واقعات میں نئی تفصیلات جیسے صحرا میں برف، پاک روح کی سفید صورت بلی، فرشتوں کے بیچ مکالمہ وغیرہ، کا اضافہ ہو رہا ہے۔ ہم ایک باقاعدہ کہانی کو بنتا ہوا دیکھ سکتے ہیں۔ یہ معاملہ جوں جوں بڑھتا ہے، عرب نہیں رہتا بلکہ قصے میں دنیا بھر سے افسانوی کردار شامل

ہوتے جاتے ہیں۔ جیسے، یونانی اور مصری افسانوی کردار (سنہری پیالہ اور بلی)، عیسائیت میں مشہور شیطان سے منسوب قلب میں وسوسوں سے بھرا خون کا سیاہ لوتھڑا، یہودیوں میں مشہور سکینہ جو عرب لوک داستانوں کی کردار شیخینہ سے مشابہت رکھتی ہے۔ اسی طرح بدھ (مت) مذہب اور روایات میں مشہور، گندھوں کے بیچ پیغمبری کی مہر وغیرہ۔ یہ معاملہ غیر حقیقی، خواب سا ہوتا جاتا ہے۔

لڑکپن میں یا پھر جب وہ مرد تھے، محمدؐ کی طبیعت میں جو ٹھہراؤ اور ان کے گرد و پیش مناظر سے منسوب بے انتہا سکون ہے۔ اس میں خوف کی کوئی جگہ نہیں جیسا انہوں نے حرا کی پہاڑی پر محسوس کیا۔ لوگوں کا اس پر اصرار اس سوانح کا حصہ ہے جو وہ محمدؐ کے لیے چاہتے تھے یا وہ خواہش رکھتے ہیں کہ یہ ایسی ہی ہوا کرتی۔ یہ سوانح محمدؐ کے بعد زمانوں میں اہل ایمان اور عقیدت مندوں نے اپنی تسلی اور غرض کے لیے گھڑ دی۔ گو قران نے بارہا معجزات اور شگون سے اجتناب اور احتراز کی تاکید کر رکھی ہے مگر اس کے باوجود یہ ہو کر رہا کیونکہ یہ انسانی فطرت میں شامل اس خواہش کا تقاضا ہے کہ معجزات ہوا کریں اور شگون پورے ہو کر رہیں۔ لوگوں کو ایمان لانے کے لیے ایسے عقیدے کی ضرورت تھی جس میں مادی ثبوت بکثرت پائے جاتے ہوں۔ یوں محمدؐ کی ایسی شبیہ پر اصرار ہونے لگا جس میں وہ معجزے کی روایت کے عین مطابق واقعتاً خدائے بزرگ و برتر کے پسندیدہ ترین شخص بن کر ابھر آئے۔ یہ قرانی احکامات کے متضاد تو تھا مگر بہر حال اس شبیہ پر لوگ ایمان لا سکتے تھے۔ اس کو باقاعدہ خصوصی اور مافوق الفطرت مان سکتے تھے۔ ایک ایسی دنیا جہاں پر اسراریت اپنے جوبن پر ہو وہاں محمدؐ کے ساتھ اس طرح کی فوق الفطرت روایات جوڑنا صرف رواج نہیں بلکہ ضرورت بن گیا۔ یہ توقع کے عین مطابق تھا۔ اسی لیے کئی دوسری روایات جیسے شادی کی رات عبد اللہ کی پیشانی پر روشنی یا حمل کے دوران آمنہ کے پیٹ سے روشنی پھوٹنا یا پھر حلیمہ کے یہاں محمدؐ کو گود لینے کے بعد دودھ کی فراوانی وغیرہ بھی مشہور ہو گئیں۔ لوگ آنکھ بند کر کے ان واقعات کی بنیاد پر محمدؐ پر ایمان لاتے اور عقیدت پالتے آرہے ہیں۔

حلیمہ کی زبانی جو روایت ہے یا جو ان سے منسوب ہے۔ اس میں کہیں بھی حلیمہ اور نہ ہی ان کے شوہر نے اس واقعہ کو فوق الفطرت سمجھا۔ انہوں نے اپنے بیٹے کے بیان کردہ واقعات پر بھی کان نہیں دھرے، بلکہ انہوں نے معقول والدین کی طرح اس کو بچے کے تخیل کی کارستانی سمجھا۔ علمی لوگوں کی طرح انہوں نے محمدؐ کی اس کیفیت کو بیماری سے جوڑ دیا۔ "ہم محمدؐ کو واپس خیمے میں لے آئے"، حلیمہ نے یاد کر کے بتایا، "میرے شوہر نے کہا، 'مجھے ڈر ہے کہ شاید اس بچے کو کوئی عارضہ لاحق ہے۔ اس سے قبل کہ اس طرح کا واقعہ دوبارہ نمودار ہو، اس کو مکہ واپس لے جانا چاہیے۔' ان کو جو اصل ڈر یہ تھا کہ خدانخواستہ محمدؐ پر کسی جن کا سایہ نہ ہو گیا ہو۔ وہ کہتی ہیں، 'مجھے ڈر ہوا کہ بیماری محمدؐ کو آن لے گی"۔

گو اس واقعہ میں محمدؐ کی ڈاکٹر کے سامنے کرسی پر بیٹھے کسی مریض کی طرح تشخیص کرنا خاصی مضحکہ خیز بات ہے مگر جو معلومات میسر ہیں، ان کی بنیاد پر چند لوگوں نے یہ رائے قائم کی ہے کہ شاید محمدؐ کو مرگی کی بیماری تھی۔ مگر یہ صائب رائے نہیں ہے۔ کیونکہ، یہ تو طے ہے کہ محمدؐ کے ساتھ اس طرح کا واقعہ زندگی میں صرف ایک آدھ بار پیش آیا۔ ویسے بھی اگر ان کو مرگی یا اس طرح کی کوئی اور بیماری لاحق ہوتی تو مکہ میں ان کے مخالفین اس بات کو ضرور اچھالتے، ان کی دماغی حالت کا ضرور تذکرہ کرتے۔ جیسا کہ مخالفین نے محمدؐ کی تعلیمات اور دعویٰ نبوت کو جھٹلانے کے لیے کئی حربے استعمال کیے۔ مشہور کیا گیا کہ محمدؐ فضول قصے گھڑتے ہیں، جھوٹے ہیں یا پھر کوئی جادوگر یا ساحر ہیں۔ انہوں نے بہر حال کبھی محمدؐ کی اس بیماری کا کبھی ذکر نہیں کیا۔ اس بات کو نہیں اچھالا۔

قصہ مختصر، آخر میں اس ملکوتی مداخلت کا ایک ہی مقصد باقی رہ جاتا ہے جو خالصتاً دنیاوی ہے۔ یہ آلہ داستان، بیانیے کو آگے بڑھانے کی سبیل ہے۔ اس واقعے کے باعث محمدؐ کو مکہ واپس جانا پڑا۔ مسلمانوں کے لیے یہ واقعہ محمدؐ کی مکہ واپسی کی دلیل کے طور پر کافی ہو سکتا ہے مگر کچھ اور وجوہات اور زمینی حقائق بھی ہیں جو بہر حال اٹل ہیں۔ جیسے، ابھی تک آمنہ اور بنی ہاشم کی قسمت جوں کی توں تھی بلکہ شاید بگڑ رہی تھی اور اس میں کسی بہتری کی کوئی امید نظر نہیں آرہی تھی۔ ان حالات میں حلیمہ اور ان کے شوہر کو محسوس ہوا کہ شاید انہیں محمدؐ کی کفالت کا معاوضہ شاید کبھی نہیں مل پائے گا۔ پانچ سال کی عمر کا یہ کم سن بچہ حلیمہ اور ان کے شوہر کے لیے گھر میں

ایک اضافی فرد تھا۔ صحرائی زندگی کی مشکلات اور مسلسل قحط سے نبرد آزما اس خاندان کے لیے، جس میں کئی کھانے اور صرف ایک کمانے والا تھا، محمدؐ جو ان کی اپنی اولاد بھی نہیں تھے، بوجھ بن کر رہ گئے تھے۔

حلیمہ جس لڑکے کو ساتھ واپس لائیں، وہ قریش کم اور بدو زیادہ تھا۔ بلکہ وہ بدو ہی تھا۔ دبلا پتلا مگر پھرتیلا اور اپنی عمر سے بڑا لگتا تھا۔ جسم چھانٹا ہوا تھا اور اس پر اضافی چربی اور گوشت کا شائبہ تک نہیں تھا۔ محمدؐ کے ہاتھوں پر صحرا جیسے نقش ہو کر رہ گیا تھا۔ انگلیوں کی پوروں تک میں صحرائی ریت بھر چکی تھی اور آنکھیں مسلسل دھوپ اور صحرا کی ریت سے بچاتے بچاتے چندھیا گئی تھیں۔ پیر سخت، چوڑے اور پاؤں کی انگلیاں لمبی پھیل رہیں جبکہ ایڑھیاں پھٹ کر اکڑ چکی تھیں۔ محمدؐ مکہ میں گدھے پر سوار ہو کر داخل ہوئے ہوں گے تو بلاشبہ ان پر کسی دیہاتی، گنوار لڑکے کا گماں ہوتا ہو گا۔ یہ لڑکا پہلی بار شہر آیا تھا۔ یعنی شہر کی گہما گہمی سے پریشان، ناگوار بو اور شور سے نالاں۔ شہر کا رنگ و رونق، لوگوں کا طریق، ان کے کپڑوں کی نفاست اور ملائم جلد۔۔۔ محمدؐ کے لیے یہ سب اجنبی تھا۔ ذرا تخیل کو دوڑائیں تو ہم دیکھ سکتے ہیں کہ جب حلیمہ محمدؐ کو ہمراہ لیے ان کے گھر پہنچی ہوں گی تو شاید وہ ان کے پلو کے پیچھو چھپ کر شرمائے سے، پریشان کھڑے ہوں۔ یا شاید ایسا نہ ہو بلکہ محمدؐ ایک صحرائی بدو لڑکے کی مانند سیدھے سادھے، بے نیاز ہو کر الگ تھلگ اکڑ کر کھڑے ہوں جیسے عام صحرائی لڑکے ہوا کرتے ہیں۔

بدو ماں باپ سے بچھڑ کر اب رات میں ان کی بسر سپاٹ دیواروں کے پیچھو بند ہو کر رہتی ہو گی۔ یہ مکان اور کمرے ہرگز اونٹ کے بالوں سے بنے خیموں جتنے نرم اور گداز نہیں تھے۔ ریتلی زمین پر بستر کی بجائے ایک پلنگ یا شاید سخت فرش پر اکیلے، اپنے رضاعی بہن بھائیوں سے گھل مل کر سونے کی بجائے اپنی اصل مگر اجنبی ماں کے ساتھ سونا پڑتا ہو گا۔ یقیناً محمدؐ کا دم ان دیواروں میں گھٹتا ہو گا جیسا سارے بدوؤں کا جی یہاں آیا کرتے تو گھٹ کر رہتا تھا۔ اسی طرح شہر کے گرد پہاڑوں کے بیچ بھی ان کی کیفیت عجیب ہو جاتی ہو گی، جیسا کہ بدوؤں کے یہاں اس کیفیت کو 'مکہ شہر کا حبس زدہ خلا' کہا جاتا تھا۔ صحرا میں آسمان پر ستارے قریب معلوم ہوتے تھے، شہر میں آکر وہ بہت دور ہو چکے ہوں گے۔ شہر میں بے شمار چولہوں اور تندوروں کے دھوئیں کی آلودگی کے سبب آسمان میں جھانکنا، تارے دیکھنا اتنا آسان نہیں رہا ہو گا۔ خالص ہوا اور کھلی فضاؤں، رضاعی خاندان کے لیے جو محمدؐ کے دل میں بے چینی پیدا ہوتی ہو گی، یقیناً اس کی وجہ سے وہ تنہائی بھی محسوس کرتے ہوں گے۔ ورنہ، محمدؐ کی آنکھوں کے کونے کھدروں میں تنہائی کے خول کہاں سے آتے؟ بلاشبہ محمدؐ صحرا میں رہنے کے بعد خلوت اور گوشہ نشینی کی کیفیات سے واقف ہو چکے تھے، ذائقہ چکھ چکے تھے مگر یہاں کا ماجرا یکسر مختلف تھا۔ یہاں گوشہ نشینی نہیں تھی۔ خلوت کا کوئی وجود نہیں تھا۔ گھروں کے اندر اور باہر گلی کوچوں، شہر کے میدانوں الغرض، ہر طرف لوگ تھے۔ لوگوں کا ایک جم غفیر اس چھوٹی سی گھاٹی میں جمع ہو کر رہا کرتا تھا۔ اتنے لوگوں کے بیچ رہ کر صحرا کی مانند، خلوت اور گوشہ نشینی کا میسر ہونا، ممکن ہی نہیں تھا۔ یہاں تو گویا تفرید تھی۔ ہر شخص دوسرے کے قریب تھا مگر اس کے باوجود جیسے یہ سب لوگ ایک دوسرے سے علیحدہ، کٹے ہوئے تھے۔ شاید، بدو مکہ کے بارے میں درست ہی کہتے تھے۔ انہی بدوؤں کے تربیت یافتہ محمدؐ شہر کے لوگوں میں، اپنے آبائی قبیلے میں ایک اجنبی، نووارد سے بڑھ کر کچھ نہ تھے۔

پھر محمدؐ جس طرح بدو لہجے میں بات کرتے، بدوؤں کی طرح بات کرتے ہاتھوں سے اشارے کرتے، اس سے بھی ان کا اس جگہ سے بیر ہونا صاف ظاہر تھا۔ دوسرے لڑکے آپؐ کے لہجے اور ہتھ اشاروں کا اس وقت تک مذاق اڑاتے رہے جب تک آپؐ نے باقی قریش کے طور طریق سیکھ نہ لیے۔ اسی مشکل کے سبب، کڑے سبق کی وجہ سے محمدؐ کی آنکھیں چوکس ہو گئیں اور ان کی مسکراہٹ خاصی سرسری اور محتاط ہوتی چلی گئی۔ کئی دہائیوں کے بعد بھی جب محمدؐ ادھیڑ عمری کو پہنچ گئے تھے، قریش میں مقبول اور حتیٰ کہ رہنمائی پر بھی فائز ہو گئے۔ مگر تب بھی شاذ و نادر ہی کھلکھلا کر ہنسا کرتے تھے۔ مسکراتے بھی واجبی سا ہی تھے۔ وہ قریش تھے، قریش میں معروف بنی ہاشم سے تعلق تھا مگر اس کے باوجود وہ ان کے بیچ بے وقعت تھے۔ محمدؐ کی بسر ایک ایسے معاشرے میں تھی جہاں والد کے ہاتھ تلے تربیت اور پدرانہ نسبت اہم ترین جز تھی۔ یہاں، محمدؐ کے لیے یتیمی طعنہ بن کر رہ گئی۔ وہ اس کیفیت کو کوئی نام تو نہیں دے سکتے تھے مگر ہمہ وقت اسی حال میں

رہتے کہ خود کو ثابت کرتے رہیں، بار بار اپنے وجود کا یقین دلاتے رہیں۔ اسی طرح ہر وقت ان پر یہ خیال سائے کی طرح چھایا رہتا کہ آخر وہ کس بنیاد پر جیتے ہیں اور ان کا یہاں والی، وارث کون ہے؟ ایسے میں، محمدؐ کی مسکراہٹ کا واجبی یا نسی کا مفقود ہو جانا کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی۔

یہ یتیمی کی دین تھی۔ محمدؐ کے بچپن میں بے فکری کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ ان کے لیے کوئی بھی چیز، کوئی بھی سہولت نعمت غیر مترقبہ نہیں تھی۔ آپؐ کا بچپن دوسرے بچوں کی طرح معصوم اور بے نیاز نہیں تھا۔ یہ پہلو جس قدر افسوسناک معلوم ہوتا ہے وہیں یہ بات بھی خوب ہے کہ محمدؐ کی بحیثیت مرد کامیابی اور خصوصیات کی کنجی یہی محرومی اور پیمانہ حالات ہیں۔ جن لوگوں کا بچپن اور لڑکپن بے فکری میں گزرتا ہے، بنیادی ضروریات بغیر مانگے پوری ہو جاتی ہیں وہ اس کیفیت، حالت کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔ ان کے خیال میں شاید یہ سب کچھ یوں ہی ہے، سب کے لیے اسی طرح طے ہو کر رہتا ہے۔ ان کے لیے وقت آسانی سے، بغیر کسی سوال اور کوئی مشکل لائے بیت جاتا ہے۔ حاجات پوری ہوتی رہتی ہیں۔ ایسے لوگ گویا اپنے حال سے آنکھیں چرائے گزرتے رہتے ہیں۔ دوسری جانب وہ لوگ ہیں جن کی اوقات، معاشرے بلکہ اپنے گھر تک میں بھی جگہ، رتبہ اور حیثیت غیر یقینی ہو۔ جن کے لیے اپنے وجود کو منوانا اتنا آسان نہ ہو، جو اس سب پر سوال اٹھا سکتے ہوں بلکہ ان کے لیے اپنے حال پر سوالات اٹھانا ناگزیر ہو۔ یہی لوگ، عام طور پر نئے جواب، نئے حالات، نئے خیالات ڈھونڈ کر لاتے ہیں۔ نئی راہیں نکال سکتے ہیں۔ ایسے لوگ شاید محرومیوں کا شکار تو ہوں مگر عامی نہیں ہوتے۔

نفسیات دانوں نے ایسے افراد کی ایک طویل فہرست بنا رکھی ہے جن کا بچپن یتیمی میں بسر ہوا تھا۔ اس فہرست میں چند نام، کنفیوشس، مارکس اوریلس، ولیم الفاتح، رشیلیو، جان ڈون، لارڈ برائن، آئزک نیوٹن اور نتشے وغیرہ کے ہیں۔ اسی فہرست میں عیسیٰ کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ تحقیق کی بنیاد پر یہ مانا گیا ہے کہ تمام تر توقعات کے برعکس زندگی کے ابتدائی دور میں خسارے اور محرومی کے بعد بقایا عمر میں کامیابی کی شرح بڑھ جاتی ہے۔ محرومی کا یہ احساس زندگی میں کچھ پا لینے اور انوکھا کر دکھانے کی جہد میں محرک کا کام کرتا ہے۔ جیسا کہ ایک ریسرچ سکالر نے لکھا تھا کہ محرومی اور محتاجی کا احساس نفسیاتی اور اعصابی طور پر بے پناہ قوت کا حامل ہوتا ہے۔ 'بلند اخلاق، باضمیر شخصیت اور بے پناہ تخلیقی صلاحیتیں اوائل عمر میں یتیم ہو جانے والے بچوں کو ناانصافی اور محرومی کے ہر وقت طاری رہنے والے احساس کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔ محرومی کا یہ احساس بلوغت اور بعد اس کے تقریباً تمام عمر ہی برقرار رہتا ہے۔' ایک وقت آنے پر یہ احساس بالآخر بڑھ کر جداگانہ انفرادی شناخت، خود کو منوانے کی پیاس بن جاتا ہے۔ اس طرح یہ بچے، دنیا پر اپنا وجود ثابت کرنے کے لیے تخلیق، سوچ میں گھل کر رہ جاتے ہیں۔'

یتیمی کے باعث اگر ایسی پیاس کا وجود، جو بلاشبہ محمدؐ میں بھی پائی جاتی تھی، جلد ہی دوگنی ہو گئی۔ جیسا کہ ہم اندازہ لگاتے آئے ہیں کہ آخر آمنہ نے محمدؐ کو بدو قبائل کے یہاں روایت کے برعکس کئی برس تک کیوں رہنے دیا؟ یہ اندازہ لگانے کی بڑی وجہ یہ ہے کہ آمنہ تادیر زندہ نہیں رہیں کہ ان کے بیانات قلمبند کیے جا سکتے، یاد رکھے جا سکتے یا منقول ہو سکتے۔ جس طرح ہم کبھی ان کے خیالات سے آگاہ نہیں ہو سکیں گے۔ ویسے ہی یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ محمدؐ کی بدو قبائل کے یہاں سے مکہ واپسی کے صرف چند ماہ بعد ہی وہ ان کے ہمراہ دو سو میل دور مدینہ کے سفر پر کیوں نکل پڑیں؟

اس دور میں ایک عورت کے لیے اس طرح کا سفر آسان نہیں تھا۔ بالخصوص جب پلو کے ساتھ ایک کم سن بچہ بھی بندھا ہو۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر آمنہ نے یہ سفر کیوں اختیار کیا؟ کیا وہ جانتی تھیں کہ مرنے کا وقت قریب ہے؟ شاید وہ زچگی کے باعث خاصی کمزور ہو چکی تھیں۔ یہ ان کی دوبارہ شادی نہ کرنے کی وجہ بھی ہو سکتی ہے؟ اگر وہ پہلے سے بیمار تھیں تو یہ سفر گویا ان کے لیے موت کا سفر ثابت ہوتا۔ یہ جانتے ہوئے بھی وہ اس سفر پر نکل پڑیں۔ اس کی ضرور کوئی بڑی وجہ رہی ہو گی۔

جیسا کہ نظر آ رہا تھا، محمدؐ کا مستقبل مکہ میں تابناک نہیں تھا۔ ان کے لیے یہاں کوئی خاص جگہ نہیں تھی۔ ہاں، مدینہ میں شاید مکہ کی زندگی سے بہتر متبادل مل سکتا تھا۔ محمدؐ کے دادا کا ننھال مدینہ سے تعلق رکھتا تھا۔ عبدالمطلب کا جنم بھی مدینہ میں ہی ہوا تھا۔ چنانچہ، آمنہ نے بیماری کی حالت میں یہ سفر اپنے بچے کے لیے دور کی رشتہ

داری میں ایک محفوظ گھر کی تلاش کے لیے اختیار کیا ہو گا۔ مگر یہ سفر بے سود ثابت ہوا۔ آمنہ کو مدینہ میں محمدؐ کے لیے کوئی مناسب گھر اور قریبی رشتہ نہیں ملا۔ اس سفر کے چھیالیس سال بعد محمدؐ نے مدینہ میں پناہ لی تھی مگر اس وقت بھی ان کے رشتے داروں کا محمدؐ سے قریبی رابطے یا تعلق، ہجرت مدینہ میں کردار کا کہیں کوئی ثبوت نہیں ہے۔ تاریخ میں محمدؐ کی مدینہ میں اپنے آباء کی نسبت یعنی عبد المطلب کے ننہال یا آمنہ کے اس سفر کے مختصر اور ناکافی تذکرے کے سوا کوئی اور حوالہ موجود نہیں ہے۔ اگر محمدؐ کا مدینہ میں کبھی کوئی خونی رشتہ رہا بھی تھا تو وہ اب گم ہو چکا تھا۔

ہم نہیں جانتے کہ آمنہ کو کیا عارضہ لاحق تھا۔ صرف یہ معلوم ہے کہ مدینہ سے واپسی پر، جس قافلے کے ساتھ وہ سفر کر رہیں تھیں، اس نے ابوہ کے مقام پر پڑاؤ کیا۔ ابوہ مکہ اور مدینہ کے عین مرکز میں واقع ہے۔ یہیں، ابوہ میں محمدؐ کے سامنے آمنہ وفات پا گئیں۔ جس قافلے کے ساتھ وہ سفر کر رہے تھے اس نے محمدؐ کو بخیر و عافیت واپس مکہ میں عبد المطلب کے ہاں پہنچا دیا۔ یوں صرف چھ سال کی عمر میں محمدؐ دوبارہ یتیم ہو گئے اور وراثت میں مکمل عدم تحفظ اور بے انتہا دنیاوی بے وقعتی پائی۔

باب:4

روایت سے منقول ہے کہ محمدؐ اپنے دادا کے لاڈلے تھے۔ یہ اور اس طرح کی کئی دوسری روایات مسلمانوں کی محمدؐ سے جذباتی نسبت اور استدلال کی ضرورت ہیں۔ ایمان والوں کے لیے محمدؐ جیسی قد آور اور نادر شخصیت کو یوں بے توجہی کا شکار ہوتے دیکھنا تکلیف دہ بات ہے۔ اسی طرح خیر خواہوں، ایمان کی حد تک ماننے والوں نے رقم تاریخ میں چھٹی صدی کی تلخ حقیقتوں میں اپنی تشفی کے لیے روایات کو توڑنا مروڑنا شروع کر دیا گیا۔ مثال کے طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ دوہری یتیمی کا شکار لڑکا بالآخر اپنے دادا کے یہاں شناخت اور پدرانہ شفقت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ روایت کیا جاتا ہے کہ آپؐ زیادہ تر وقت دادا کے ہمراہ گزارتے اور عبد المطلب کنبہ بنی ہاشم اور قبیلہ قریش کے کارناموں کی داستانیں سنایا کرتے تھے۔ ان داستانوں میں اکثر کامرکزی کردار خود عبد المطلب رہا کرتے تھے۔

حالانکہ، حقیقت میں عبد المطلب اس قدر ناتواں اور ضعیف ہو چکے تھے کہ چھڑی کے سہارے بھی چلنا پھرنا دوبھر ہو چکا تھا۔ آپ ہر روز صبح پالکی، جس پر زریں قالین بچھا رکھی تھی، سوار ہو کر کعبہ کے احاطے میں تشریف لاتے اور سارا دن وہیں کھجور کے درخت تلے آرام کرتے۔ یہیں محمد ودرہا کرتے تھے۔ لوگ ان سے صلاح اور مشورہ لیتے اور آپ کے دبدبے و عمر رسیدگی کے باعث کنی کتراتے تھے۔ یہ خاصہ جذباتی اور خوب صورت تصور ہے کہ عبد المطلب کی آنکھوں میں لاڈلے پوتے کو پالکی کے پائیوں سے لٹک کر اپنے سینے پر سوار ہوتے دیکھ کر آنکھوں میں چمک در آتی ہو گی اور وہ محمدؐ کو سینے سے چمٹائے خاندان کی میراث جو پالکی پر بچھی زریں قالین کے نقش و نگار کی طرح حسین مگر پیچیدہ تھی، تاریخ بارے تفصیلات اور قصے ازبر کراتے۔ آباء، خاندان اور حسب نسب کی بابت بتاتے جو ان کی اصل تھا۔ محمدؐ کی پیڑھی پر مکہ کے تقریباً سبھی باسی فخر کیا کرتے تھے۔ یہ اس حسب و نسب کی روداد ہوا کرتی تھی جس میں ہر شخص کی حیثیت خاندان اور بزرگوں کی نسبت سے طے ہوا کرتی ہے۔ یہاں باپ دادا، رنگ و نسل اور قبیلے سے نسبت کی عقیدے کی حد تک پرستش کی جاتی اور اس پر فخر کیا جاتا تھا۔ بزرگوں کے مزارات پر باقاعدگی سے حاضری دی جاتی اور مقبروں پر پرستش کی حد تک تعظیم سے چڑھاوے چڑھائے جاتے تھے۔ یہ رواج آج بھی شمالی افریقہ، جنوبی ایشیاء اور مشرق وسطیٰ میں عام ہے۔ حبرون میں واقع ابراہیم کے مزار سے لے کر ہر طرف جا بجا قائم تقریباً ہر امام اور ولی اللہ، راہب اور فقیر تک کے مقبروں کا عبادت کی حد تک احترام اور دیکھ بھال کی جاتی ہے۔

مگر سوچنے کی بات یہ ہے کہ کم سن محمدؐ کو اپنے نسب کے قصے، روداد سن کر کیا ملتا ہو گا؟ وہ اپنی نسبت کہاں جوڑتے ہوں گے؟ غور کریں، چھ سالہ محمدؐ کو اپنی پیدائش سے متعلق ڈرامائی کہانی کو سن کر کیا حاصل ہو سکتا ہے؟ اس قصے میں عبد المطلب تقریباً اپنے بیٹے کو قتل کر چکے تھے اور یہ کہ وہ ایسا صرف ایک پتھر کی ایماء پر کر رہے تھے؟ پانی کے ایک چشمے کی ملکیت پر حق جتانے کی غرض سے؟ جس طرح اوائل تاریخ کے مورخین کا خیال ہے، کیا محمدؐ واقعی اس واقعہ سے کسی خاص نسبت کا

اشارہ لیتے تھے؟ کیا محمدؐ کو، جنہیں اپنے والد کی وفات کے سبب، ان کے نام کی بدولت آج تک کوئی عزت و تکریم نہیں ملی تھی، واقعی اس تعلق کو موروثی بڑائی سمجھتے تھے؟ یقیناً ان روایات سے یہی سب مقصود تھا کہ محمدؐ بھی اپنے قبیلے، خاندان، نسل اور آباء پر فخر کرتے یا کیے، محمدؐ کی شاندار خاندانی نسبت اجاگر ہو سکتی مگر یہاں تو یہ خیال ہی عجب معلوم ہوتا ہے کہ ایک کم سن یتیم بچہ جس کے والدین، یعنی ماں اور باپ دونوں ہی باقی نہ رہے ہوں وہ اس کو یکسر مختلف انداز میں سوچ سکتا ہے۔ شاید، اس کی آنکھیں یہ کہانی سن کر فخر اور غرور سے نہیں بلکہ دہشت سے کھلی کی کھلی رہ جاتی ہوں گی۔ اس کو یہ ڈر ہو کہ یہ بوڑھا شخص اس کو بھی اتنی ہی آسانی سے قتل کر سکتا ہے، جتنی آسانی سے آپؐ کے والد تقریباً بھینٹ چڑھ چکے تھے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ ہر دو صورت یہ معاملہ خاصہ مشکوک ہے۔ یہ خلاف قیاس ہے کہ محمدؐ کو یہ قصے اور نسبت کی روداد اپنے دادا کی زبانی سننے کو ملی ہو۔ اٹھارہویں صدی عیسوی میں فلپ ایریز نے ایک نظریہ پیش کیا تھا۔ اس کو 'بچپن کی ایجاد' کہا جاتا ہے۔ اس نظریے سے پیشتر دنیا بھر میں کم سن بچوں کو 'کم عمر بالغ' سمجھا جاتا تھا۔ تب، اتنی زیادہ شرح اموات اور مختصر انسانی عمر کے بیچ جذبات کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی، بالخصوص یتیموں کے لیے تو قطعاً نہیں تھی۔ اگر عبد المطلب نے کبھی محمدؐ کی موجودگی محسوس بھی کی ہو تو وہ ان کے لیے یہاں وہاں، بھاگتا دوڑتا ہوا صرف ایک اور بچہ ہوں گے جو ان کی قد آور، رعب دار شخصیت سے کترا کر یہاں وہاں کھسکتا، چھپتا پھرتا رہتا ہوگا۔ اور اسی طرح اگر محمدؐ نے کبھی اپنے دادا کو دیکھ رکھا تھا تو وہ شاید ان کے بیچ کافی فاصلے رہے ہوں۔ ان کے لیے عبد المطلب ایک بعید اور اجنبی شخصیت رہے ہوں گے جو اس قدر قد آور ہے کہ شاید اس تک رسائی تو دور، اس پر توجہ دینا بھی بے کار ہے۔ اتنے بڑے کنبے اور قبیلہ قریش کی ذمہ داری کے بیچ عبد المطلب کے لیے اپنے باقی کے نو بیٹے اور دوسرے پوتے زیادہ اہم رہے ہوں گے جن کے مستقبل سے وہ اپنے کنبے اور قبیلے کے لیے کچھ امید پال سکتے تھے۔ محمدؐ نے شاید کبھی عبد المطلب کے قریب پھٹکنے کی جرات بھی نہ کی ہو گی۔ ان کو یقیناً ڈر رہتا ہوگا کہ شاید وہ ان کو دھتکار دیں یا شاید کسی قابل نہ سمجھیں۔ 'خود کو کار آمد بناؤ اور کسی کام میں لگ جاؤ' ان کو بتایا جاتا، 'ایندھن کی لکڑیاں ڈھولاؤ یا کنویں سے پانی نکالنے میں مدد کرو'، یا جیسے بچوں کو دور بھگایا جاتا ہے، 'پرے ہو جاؤ، تک کر بیٹھو!' وغیرہ۔ یا شاید زیادہ سے زیادہ کبھی کبھار ایک آدھ بار بہت ہوا تو عبد المطلب آپؐ کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیر دیتے ہوں گے۔

غالباً محمدؐ بھی یوں نظر انداز کیے جانے پر شکر ادا کرتے ہوں گے۔ کیونکہ اس طرح انہیں خود کے لیے وقت، اور اپنے آپ میں مصروف رہ کر سیکھنے کا موقع ملتا ہوگا۔ پسماندہ اور دھتکارے ہوئے یتیموں اور مساکین وغیرہ کے لیے حالات سے سمجھوتہ کرنا اور اپنے آپ کے ساتھ جینا سیکھ لینا خود ان کی اپنی بقاء کے لیے انتہائی ضروری ہوتا ہے۔ ایک کم سن لڑکا جس کی حیثیت اور پیدائشی حق تک نہ مانا جاتا ہو، اس کے لیے ایسے حالات میں اپنا وجود قائم رکھنا بھی، دشوار اور مشروط ہو کر رہ جاتا ہے۔ ایسے بچوں کو کم آمیز، کم گو اور منکسر المزاجی کے ساتھ پس منظر میں چھپ کر گزر بسر کرنی پڑتی ہے۔ خاصا محتاط ہو کر جینا پڑتا ہے۔ یہ بھی ایک لحاظ سے آپؐ کے لیے بہتر تھا، یوں کہ وہ اپنے گرد و پیش کو کھلی آنکھوں کے ساتھ صاف دیکھ سکتے تھے۔ ان لوگوں کے رویے کا قریب سے مشاہدہ کر سکتے تھے جو انہیں کنبے اور قبیلے کا حصہ جانتے ہوئے بھی بیگانہ سمجھتے تھے۔ اسی طرح ارد گرد پھیلے تضادات کا اچھی طرح مشاہدہ کر سکتے تھے۔ یہ عملی سبق تھا۔ ہمہ وقت یاد دہانی تھی کہ وہ سماج جو ان کا اپنا تھا، اسی میں ان کے لیے کوئی جگہ، حیثیت کی گنجائش نہیں تھی۔

اس چھ سالہ کم سن بچے کو اپنے گرد ایسا معاشرہ نظر آ رہا تھا جس میں دین اور بے دینی کچھ اس طرح گڈمڈ ہو کر رہ گئی تھی کہ ان کے بیچ تفریق کرنا ناممکن تھا۔ لوگ ایسا سمجھتے آئے ہیں مگر مکہ پسماندہ نہیں تھا بلکہ حجاز میں ابھرتا ہوا تجارتی مرکز رہا کرتا تھا۔ مکہ غربی عرب میں جنوبی یمن کی بندرگاہوں سے شمال کی طرف بحیرہ روم اور شام میں دمشق اور اس سے کہیں آگے تک کے علاقوں کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی تجارتی راہداری کا مرکزی نقطہ تھا۔ یہاں قریش نے کمال ہوشیاری سے تجارت اور حج (یعنی سفر/زیارت مقدسہ) کی عبادات کے بل بوتے پر اپنے لیے اچھی خاصی خوشحال دنیا بسالی تھی۔ عقیدے اور تجارت سے کمایا جانے والا نفع، ان کے شہر کی خوشحالی کا ضامن تھا۔

قریش کی تاریخ یہ تھی کہ اس قبیلے نے صرف پانچ نسل پہلے مکہ پر اپنا اثر و رسوخ قائم کیا تھا۔ مکہ کی گھاٹی میں واقع قدیم درگاہ کو ایک بار پھر زندہ کیا تھا اور خود اس حرم کے والی بن کر یہیں بس گئے تھے۔ قریش نے یمن سے شمال کی جانب ہجرت کی تھی۔ ان کا آبائی علاقہ یمن تھا۔ جیسا کہ تاریخ میں ہر عظیم ہجرت کی وجہ کوئی تباہی ہوتی ہے، یہ بھی ایک آفت کے سبب مجبور ہو گئے تھے۔ قریش کی ہجرت کا سبب ماریب بند کا ٹوٹنا تھا۔ تباہ حال بند کے آثار آج بھی یمن کے شہر صنعاء سے باہر شیبانامی قدیم مقام پر دیکھنے کو مل جاتے ہیں۔

اس بند سے نکالی گئی کشادہ نہروں سے قریب ڈھائی لاکھ ایکڑ اراضی سیراب ہوا کرتی تھی۔ زرعی خوشحالی کے سبب یہاں ایک عظیم تہذیب پروان چڑھ رہی تھی اور قریش اس تمدن کا ادنی حصہ تھے۔ پیشے کے لحاظ سے یہ کاشتکار تھے اور گزران مقامی طور پر اگنے والے ایک جھاڑی دار پودے، ببول کی کاشت پر تھی۔ ببول میں سے سیپ رستی ہے جسے مرکلی گوند کہا جاتا ہے۔ مرکلی گوند خاصی مہنگی قیمت پر بک جایا کرتی اور اس کاروبار سے اچھا خاصا منافع مل جاتا تھا۔ یہ خطہ عرب میں خاصا خوشحال مشہور تھا اور یہاں دولت کی ریل پیل تھی۔ فطری طور پر دولت کی افراط سے لالچ بھی بڑھنے لگا۔ تقریباً سبھی کی نظر اس خطے پر تھی اور ہر پڑوسی ریاست اور مقامی عرب سردار یمن کے اس علاقے پر ایک دوسرے سے الجھے رہتے۔ اسی وجہ سے اس علاقے میں جنگ و جدل اور حکمرانی کی کشمکش صدا جاری رہی۔ کئی دہائیوں تک جنگ اور جھڑپوں کے بعد انتظام جو کبھی بازنطینی پشت پناہی میں چلنے والی عیسائی ایتھوپیا کے پاس تھا، بکل کر آتش پرست سلطنت فارس اور پھر اسی طرح مقامی بادشاہوں اور سرداروں (پانچویں صدی میں ان میں ایک بادشاہ یہودی بھی تھا) کے ہاتھوں میں بٹتا چلا گیا۔ طویل جنگ و جدل پر اٹھنے والا خرچ اچھا خاصا تھا۔ یہ خراج مقامی آبادی سے خراج کی صورت وصول کیا جاتا رہا۔ اس کشمکش میں ماریب بند یکسر نظر انداز ہو گیا۔ مناسب دیکھ بھال نہ ہونے، بد انتظامی اور ضروری وسائل کی عدم دستیابی کے باعث بند وقت کے ساتھ کمزور پڑتا رہا۔ آخر کار، ایک دن ایسا آیا کہ یہ بند ٹوٹ گیا۔ بند کے ٹوٹنے کی حتمی وجہ سادہ مگر خاصی مضحکہ خیز تھی۔ اس علاقے میں چھچھوندر بکثرت پائے جاتے تھے۔ چھچھوندروں نے بند کی بنیادوں میں اس قدر گہری سرنگیں کھود لیں کہ بند اپنے وزن کے بے انتہا دباؤ کو سہہ نہ سکا۔ بند ٹوٹنے سے علاقے میں سیلاب آگیا۔ اگلے موسم میں پانی کی عدم دستیابی کے سبب زرعی اراضی بھی بنجر ہو گئی۔ یوں ہر طرف دشت اور بیاباں بن گیا۔ یمن کی یہ عظیم تہذیب دم توڑنے لگی اور تمدن غارت ہو کر رہ گیا۔ خطے کی مقامی آبادی کے پاس ہجرت کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ ایسے حالات میں، دوسرے لوگوں کی ساتھ کئی ایک کنبے قصیٰ کی سربراہی میں بھوک اور بدحالی سے جان بچاتے شمال کی جانب ہجرت پر نکل کھڑے ہوئے۔ قصیٰ عبد المطلب کے پڑدادا تھے۔ یہ کنبے ایک قبیلے کی صورت نکلے اور انہوں نے اپنے لیے قریش کا نام منتخب کیا۔ قریش کا مطلب 'یکجا ہونے والے' ہے۔ ہجرت کے بعد قریش نے نہ صرف یمن بلکہ کھیتی باڑی سے بھی منہ موڑ لیا۔ یہ یمن کے شمال میں پہنچ کر مکہ کی گھاٹی میں مستقل آباد ہو گئے۔ مکہ میں مستقل سکونت اختیار کرنے کے بعد قریش کو احساس ہوا کہ اگر وہ یہاں واقع قدیم درگاہ کا اختیار سنبھال لیں تو پھر دوبارہ کبھی بھوک کا شکار نہیں ہو سکتے۔

مکہ میں جس مامن، جائے حرمت کا انتظام قریش نے سنبھالا، وہ جلد ہی کعبہ کہلایا جائے گا۔ گو حرم اس وقت اونچا، مکعب کی شکل میں، باقاعدہ عمارت کی طرح نہیں تھا۔ (لفظ 'مکعب' عربی کے لفظ کعبہ سے نکلا ہے جس کا مطلب گھریا کوٹھے کے ہیں)۔ یہی حرم آخر کار اسلام کا مرکز بن کر رہے گا۔ جب محمدؐ نے پہلی بار اس حرم کو دیکھا ہو گا تو اس وقت تک یہ بطور عمارت جدید دور کے مقابلے میں خاصا سادہ رہا ہو گا۔ اس وقت تک اس کی پتھر اور ریت سے اٹھائی گئی دیواریں قد آدم جتنی اونچی اور چھت پر کھڈی پر بنا سخت کپڑا بچھا کر کھجور کے پتے پھیلا رکھے تھے۔ بدوؤں کے یہاں سے وارد ایک لڑکے کے لیے یہ کوئی انوکھی تعمیر نہیں تھی۔ خانہ بدوش، ریت اور پتھر کی دیواریں چن کر اور کھجور کے پتے پھیلا کر چھت والی ایسی تعمیر کو عریش کہا کرتے تھے۔ یہ لفظ بھیڑ بکریوں کے باڑے یا مال مویشی باندھنے کی جگہ کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ یہی نہیں، مشرق وسطیٰ کے ہر خطے میں عریش کی اصطلاح کے ساتھ متصوفانہ اور پر اسرار روحانی نسبت مشہور تھی۔ عریش کا لفظ قدیم سامی زبان میں خیموں کے لیے بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ اسرائیلی یہ خیمے موسیٰ کے زمانے سے تعمیر کرتے چلے آرہے تھے۔ عریش یا اس جیسی

کسی بھی تعمیر کو اسرائیلیوں کے ہاں تکریم اور امان حاصل تھی۔ ان کے مطابق عریش سے مراد مقدس اور پاک جگہ ہے جس کے اندر انسان اور جانوروں کو خدا کی طرف سے امان حاصل تھی۔ خود خدا کا تصور صحرا میں انسانوں، جانوروں اور نباتات کے لیے ایک محافظ، پالن ہار کا تھا۔ اسی طرح وہ جگہیں جہاں انسان، مال مویشی، چرند اور پرند کا بسیرا رہتا، ان مقامات کو اس پالن ہار، محافظ کی طرف سے پناہ حاصل ہوتی تھی۔ یہ تصور زمانہ قدیم سے یوں ہی رائج چلا آرہا تھا۔ مثال کے طور پر زبور کی مشہور آیات، 'خداوند میرا چوپان ہے' وغیرہ بھی اسی سمجھ کی غماز ہیں۔ مکہ کے عین وسط میں قائم یہ قدیم حرم خدا کا گھر مشہور تھی۔ یعنی، اس میں خود خداوند مقدس کا مسکن تھا۔ عربوں کے یہاں خداوند کو 'اللہ' پکارا جاتا تھا جس کا مطلب 'سب سے برتر' کا ہے۔ عبرانی زبان میں اس کا مترادف 'الوہیم' یا اس سے بھی پہلے قدیم عراقی تمدن میں لفظ 'ال' استعمال ہوتا تھا جس سے ایک ایسی مقدس، سدبر اور عظیم و برتر ذات مراد تھی جو کہ کسی بھی قبائلی خدا، کل دیوتا یا اوتار سے برتر ہے۔

صدیوں پرانے قدآور استعاروں اور عظیم تشبیہات سے مزین اس حرم کی بابت سوچیں تو ذہن میں ایک انتہائی شاندار اور چمچماتی ہوئی ایسی تعمیر کا خیال ذہن میں آتا ہے جو شہر بھر سے برتر اور اونچائی پر تعمیر کسی یادگار کا نظارہ ہے۔ اس طرح کی یادگاروں کی مثال ایتھنز میں قدیم پورتھی نون کی دیوی کا مجسمہ یا یروشلم میں قدیم گرجا لی جاسکتی ہے۔ مگر حرم کعبہ ایسی کسی بھی یادگار سے مختلف تھا۔ قدیم روایت میں خدائے ذوالجلال کی موجودگی اور اس سے رابطے کا سامان انسانی آبادی سے باہر گوشہ نشینی میں، بلند مقامات جیسے پہاڑ کی چوٹی یا وادی کے دامن وغیرہ سے منسوب تھا۔ اس روایت کے برعکس، کعبہ مکہ کے زیریں علاقے میں، وادیوں اور گھاٹی کے عین بیچ مرکز میں واقع تھا۔ مکہ کی گھاٹی کا یہ مرکز اصل میں سیلابی پانی کی خشک گزرگاہ تھی۔ یہی حقیقت، کعبہ سے متعلق پراسراریت کو تقویت بخشتی ہے۔ گھاٹیوں کے حصار میں واقع کعبہ کے گرد خالی اور قدرے کشادہ میدان بھی گھروں کی تعمیرات سے بھر چکا تھا۔ تب، مکہ شہر کے اطراف میں جس جانب سے بھی داخل ہو رہیں، مرکز میں پہنچ کر حرم اچانک ہی گھروں اور عمارتوں کی اوٹ سے بالکل سامنے وا ہو جاتا۔ اسی طرح گھاٹیوں میں چونکہ سورج کی روشنی قدرے کم ہی پہنچتی ہے تو مکہ کی دھول سے اٹے گلی کوچوں سے بچ کر منعکس ہونے والی مدھم روشنی دیکھنے پر سیدھی کعبہ پر پڑتی ہوئی نظر آتی۔ گویا، کعبہ روشن نظر آتا۔ اونچائی سے دیکھنے پر محسوس ہوتا کہ شہر نے کعبہ کو اپنے حصار میں لے رکھا ہے اور اس کے گرد دل پے ول ایک لپٹا سا گھوم رہا ہے۔ یوں، دوسرے قدیم حرمین کے برعکس کعبہ پر شہر کا تاج نہیں بلکہ مرکز، ناڑ ہونے کا گماں ہوتا تھا۔ یہ ایک لحاظ سے مکہ کی اساس تھا جس کے گرد شہر کی ہر چیز گھومتی، گردش اور رقص کرتی ہوئی محسوس ہوتی۔ یہ صرف تخیل، تصور کا استعارہ نہیں تھا بلکہ اس کی حقیقت بھی یہی تھی۔ مکہ کے لوگ سفر سے واپس شہر میں پہنچتے ہی سب سے پہلا کام کعبہ پر حاضری دیتے اور اس کے گرد مشق خرام عبادت یعنی عمرہ بجالاتے۔ یعنی، بائیں ہاتھ سے شروع ہو کر اندر کی طرف کعبہ کے گرد سات چکر پورے کرتے۔ اس خراماں عبادت کے دوران، وہ لبیک یا حاضری کی صدائیں، جیسے 'میں حاضر ہوں' اور 'میں وہاں حاضر ہوں جہاں سے میرا تعلق ہے' وغیرہ بلند کرتے۔ یہ ریت، عبادت ہر شخص کے لیے چاہے وہ اس شہر میں مستقل سکونت رکھتا ہو یا عارضی قیام کے لیے وارد ہوا ہو، لازم تھی۔

کعبہ کے گرد زائرین کا یہ رش ذوالحجہ کے مہینے میں خاصا بڑھ جاتا تھا۔ ذوالحجہ کا مطلب 'حج سے متعلق' یا 'حج کا مہینہ' ہے۔ یہ ماہ سال میں تین مسلسل مقدس مہینوں میں، دوسرا مہینہ ہوا کرتا تھا۔ ان تین مہینوں کے دوران پورے مکہ شہر کو حرم کا درجہ دے دیا جاتا اور اس کی حدود میں ہر طرح کی لڑائی، جنگ اور جدل حرام قرار پاتی۔ عرب کے طول و عرض سے دیوں ہزار زائرین ذوالحجہ کے مہینے میں یہاں جمع ہوتے، کعبہ پر حاضری اور اس سے نسبت کی صدائیں بلند کرتے جو پوری وادی میں گونجتی رہتیں۔ زائرین کی تعداد اس قدر زیادہ ہوتی کہ شہر کی آبادی عام دنوں کے مقابلے تین گنا ہو جاتی اور حجاج شہر کی گلیوں میں 'لبیک اللھم لبیک' یعنی، 'میں حاضر ہوں۔ اے لوگوں کے خدا، میں حاضر ہوں' اور 'لاشریک لک الاشریکون ہو لک' یعنی، 'تمہارا کوئی شریک نہیں سوائے اس کے جسے تو شریک بنائے' کی صدائیں بلند کرتے ہوئے چاروں اطراف سے مکہ شہر میں داخل ہوتے اور گلی کوچوں میں سے گزرتے ہوئے کعبہ کی طرف گامزن اور متوجہ

رہتے۔ یہ ایک لحاظ سے پر اسرار طریق عبادت تھا۔ اس موقع پر تمام قبائل کی نمائندگی یقینی ہوا کرتی تھی۔ تمام قبائلی اس لیے بھی ذوق و شوق سے حج میں شرکت کرتے تھے کہ تقریباً تمام ہی عرب قبائل کی مخصوص خدائی نشانیوں اور اوتاروں کے لیے کعبہ کے احاطے میں مقام اور رتبہ مختص تھا۔

اوتاروں کے لیے مختص مقام بذات خود کعبہ نہیں بلکہ کعبہ کے گرد کھلا احاطہ تھا۔ ان نشانیوں کی تعداد سے متعلق کوئی ایک رائے نہیں ہے۔ محمدؐ کے زمانے سے تین سو سال بعد ایک شامی مورخ نے یہ مقولہ پیش کیا کہ کعبہ میں تین سو ساٹھ 'بت' ہوا کرتے تھے۔ یہی تعداد اور روایت زبان زد عام ہو گئی اور آج تک عوام اس پر یقین اور جدید مورخین بھی اسے اسی طرح بیان کرتے ہیں۔ حالانکہ، عملی طور پر کعبہ کی مختصر دیواروں کے اندر اتنی بڑی تعداد میں 'خدائی نشانیوں' یا 'بتوں' کا سمانا ممکن نہیں تھا۔ یہ تعداد بھی غالباً سہو ہے۔ نویں صدی میں جب شامی مورخ نے اوتاروں کی یہ تعریف اور تعداد مشہور کی، اس وقت ہر طرف اسلامی تحقیق اور علم و معرفت کا چرچا ہوا کرتا تھا۔ مسلمان سائنس دان، بالخصوص جو حساب کا علم رکھتے تھے، انہوں نے اسی زمانے میں دائرے میں تین سو ساٹھ زاویوں کا نظریہ پیش کیا تھا جو خاصہ مشہور اور قابل عمل تھا۔ چنانچہ، کعبہ، اس کے احاطے کے گرد قائم ہونے والی آبادی اور زائرین کے گول دائرے میں عبادت کی نسبت سے یہ تعداد بھی مقبول عام ہو گئی۔ حقیقت یہ تھی کہ کعبہ کے اندر اور احاطے میں درجن بھر خدائی نشانیوں سے زیادہ کے لیے جگہ نہیں تھی۔ ویسے بھی یہ نشانیاں خود خدا نہیں بلکہ کلدیو تا یا خدا کی نمائندہ، اوتار مشہور تھیں۔ یوں، اگر عملی طور پر دیکھا جائے تو کعبہ کے گرد دائرے میں نصب کیے گئے یہ اوتار اور بت اس بات کی عکاس تھے کہ یہ ایک خدا کے کئی نائب ہیں اور خود اللہ کی بسر کعبہ کے اندر رہتی ہے۔ شرک یا متعدد خداؤں کا دنیا بھر میں عام تصور یہی ہے۔ آج جدید دور میں کئی مذاہب سے متعلق قدیم افسانوی قصے مشہور ہیں اور یہ مغالطہ پایا جاتا ہے کہ آسمان، سمندر اور زمین پر کئی خدا ایک دوسرے سے نبرد آزما رہتے ہیں، شرک کا تصور اس کے بالکل برعکس تھا۔ یعنی یہ ایک خدائی سے جدا نہیں تھے بلکہ اس جہان کی بساط میں تمام ذیلی خدا ایک عظیم تر خدا کے نائب، نمائندہ ہوا کرتے ہیں۔ یہ اس لحاظ سے، بجائے خدا، خدا کے شریک مشہور تھے۔ یہی وجہ ہے کہ عبرانی تورات اور قران میں بھی ان اوتاروں کو خدا یا ذیلی خدا نہیں بلکہ خدا کا شریک کہا گیا ہے۔

جس طرح اوتاروں پر خدا ہونے کا تصور خام ہے وہیں مادی لحاظ سے بت گرداننے کا نظریہ بھی درست نہیں ہے۔ لفظ 'بت' سے ذہن میں سجی دھجی، چمچماتی ہوئی مورتیوں کی شبیہ ابھر آتی ہے۔ حجاز میں کعبہ کے گرد احرام کا مقصد کوئی مورت یا بت کھڑے کرنا نہیں تھا۔ جس طرح عبرانی تورات میں واضح کہا گیا ہے کہ قربان گاہ کے بارہ پتھر ناتراشیدہ تھے۔ یعنی، ان پر انسانی ہاتھوں سے معماری یا مجسمہ سازی نہیں کی گئی تھی۔ اسی طرح مکہ کے جو کلدیو تا تھے وہ بھی زیادہ سے زیادہ ایک پر اسرار طاقت کے نمائندہ کہلائے جا سکتے ہیں۔ ان میں بھی، کم از کم انسانی ہاتھوں سے تراشی ہوئی کوئی مورت شامل نہیں تھی۔ اگر کسی پتھر پر ایسی کسی شبیہ یا نشانی کا گماں ہوتا بھی تھا تو اس میں انسانی عمل دخل کارفرما نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ یہ قدرتی طور پر گڑھے ہوئے نشان تھے۔ جیسے ان میں تیز ہواؤں سے کٹ جانے والے پتھر، وقت اور موسم کے باعث چھر جانے والے ریتلے پتھر، آتش فشاؤں سے برآمد ہونے والے چھریرے مگر قیمتی پتھر، ملائم اور قدرتی تراشیدہ معدنی فلسپار یا آسمان سے گرتے ہوئے رگڑ کھا کر گول ہو جانے والے شہابیوں کے ٹکڑے وغیرہ شامل تھے۔ ان اوتاروں میں چھوٹے اور بڑے ہر طرح کے پتھر شامل تھے۔ مثال کے طور پر فٹ بال جتنا سیاہ پتھر اگر کعبہ کی ایک طرف تو وہیں درمیانے درجے کے گول مٹول، 'خدا کی بیٹیوں' کے نام سے تین ایک جیسے منات، لات اور عزا دوسرے اور نسبتاً چپٹا اور قد آدم سے اونچا ہبل کا پتھر، کعبہ کے تیسرے کونے پر نصب تھا۔ شاید ناپ، شکل یا چمک دمک کی وجہ سے یہ خاصے پر اسرار نظر آتے تھے۔ اس قدر کہ عین ممکن ہے، آج جدید دور کا کوئی منکر سے منکر اور سیکولر شخص بھی ان میں روحانیت تلاش لاتا، ان میں اسرار دیکھ پاتا اور نسبت جوڑنے کی کوشش کرتا۔ ان پتھروں کو اپنے گھر کی زینت بنانے، اپنانے کی تدبیریں سوچنے لگتا۔

پس، ان پتھروں سے لوگوں کی عقیدت بھی بہتیری تھی۔ وہ ان کے گرد ہار اور مالائیں سجاتے، منتیں نچھاور کرتے اور بھینٹ چڑھاتے مگر کوئی ان کے سامنے جھکتا یا ان کے حضور دعا نہیں مانگتا تھا۔ ان کے نزدیک پتھروں کی اپنی کوئی طاقت نہیں تھی بلکہ یہ اس عظیم طاقت کی نمائندگی کرتے تھے جس نے یہ پتھر تخلیق کیے تھے۔ یہ قوت، ذات جو کعبہ کے اندر بستی ہے۔ جس کا گھر، یہ حرم ہے۔ لوگ اللہ کو دیکھ نہیں دیکھ سکتے تھے مگر ان پتھروں کو ضرور تاڑ، چھو سکتے تھے۔ کعبہ اور یہ پتھر خدا کی موجودگی کا مظہر تھے، ایک انسان کی جبلت کو تسکین دینے کے اہل تھے۔ وہ خدا سے ان کے ذریعے مخاطب ہو سکتے تھے، خدا کی ذات کو محسوس کر سکتے تھے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ ہر شخص کے لیے خدا سے خالصتاً ذاتی تعلق رکھنے کی سہولت جیسا تھا۔ یہ پتھر ہر آدمی کے لیے انفرادی طور پر اس پوشیدہ، پراسرار اور عظیم قوت کی نمائندگی کے قابل تھے جس نے یہ سارا جہان بچھا رکھا ہے۔

کعبہ کے اندر کا حال بھی باہر کی طرح خاصا بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا ہے۔ اوائل تاریخ اسلام کے چند مورخین کا اصرار ہے کہ کعبہ کے اندر صرف اس مینڈھے کے سینگ آویزاں تھے جس نے قربان گاہ میں ابراہیم کی چھری تلے اسماعیل کی جگہ لے لی تھی۔ اسی طرح کئی یہ روایت کرتے ہیں کہ کعبے کے اندر صرف ایک، خالص سونے سے بنی فاختہ کی مورت سجا رکھی تھی۔ وہیں کچھ یہ بھی کہتے ہیں کہ کعبے کے اندر بتوں کی بہتات تھی۔ بتوں کی یہ تعداد عرب قبائل جتنی تھی، یعنی کعبہ میں ہر قبیلے کی نمائندگی موجود تھی۔ بتوں کے علاوہ، عیسائیوں کی نمائندہ عیسیٰ اور مریم کی تشبیہات بھی آویزاں تھیں۔ پھر قیمتی جواہرات کے ذخیرے، قدیم تلواروں کی بھرمار اور انتہائی قدیم مسودات کی موجودگی کی بھی روایت ملتی ہے۔ ان تمام حوالہ جات میں راویوں نے حلف اٹھایا ہے کہ ایسا انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا یا پھر کسی ایسے شخص کی گواہی دی جو ان کے انتہائی قریب تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان میں سے ہر روایت دوسری کی نفی کرتی ہے۔ بہرحال، ان تمام روایت سے سوا یہ بھی ممکن ہے کہ جیسے یروشلم کے قدیم یہودی مندروں میں ہوا کرتا تھا، کعبہ بھی اندر سے خالی ہو۔ یعنی، اللہ کی ذات کی جس طور تعریف بیان کی جاتی ہے تو اس لحاظ سے کسی بھی دنیاوی، مادی شے کے اندر اس کے تصور کا سمانا ممکن نہیں ہے۔ یوں کعبے کے اندر اس خالی پن سے ایک برتر اسرار کا اظہار ہو سکتا تھا جو شاید خزانے کے ڈھیر، بتوں کی بہتات، تشبیہات یا تحریری و بصری مسودات سے ممکن نہیں تھا۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ نویں صدی عیسوی کے مورخین، جو نسبتاً جدید دور سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی بسر دمشق اور بغداد (بغداد شہر چھٹی صدی عیسوی میں قائم بھی نہیں ہوا تھا) جیسے علم پسند اور اس دور کے حساب سے جدید شہروں میں رہا کرتی تھی۔ اسی طرح یہ اپنے دور میں مغز اور معلم بھی مشہور تھے۔ اس سب کے باوجود، آخر وہ زمینی حقائق کو یکسر فراموش کر کے اسلام سے قبل مکہ شہر میں بت پرستی کا پرچار کیوں کرتے تھے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے قران میں 'جہلاء' کی اصطلاح سے ایک مخصوص تصور اخذ کر لیا تھا۔ عربی میں 'جہلاء' کے کئی مطلب جیسے 'بت پرستی'، 'بربریت'، 'تاریکی' یا 'بے علمی یا جہالت' وغیرہ نکلتے ہیں۔ ان محققین نے تمام معنوں کو یکجا کر کے کفر یا الحاد کے تصور میں مجتمع کر دیا۔ یوں، جہلاء یا کفار سے مراد انسانوں میں ایک ایسی بے خدا اور بے توقیر مخلوق کی لی جانے لگی جو کسی بھی مقدس و معبد قوت، ذات سے منکر یعنی، 'انحراف' پر مائل تھی۔

لیکن مکہ میں کفر بے دین نہیں تھا۔ اس کے برعکس، یہاں خدا کے مضبوط تصور اور اسی خدا کے اوتاروں کی بہتات تھی۔ یعنی، شرک یا کثرت پرستی کا دور دورہ تھا۔ اب مبالغہ آرائی اور تشریحات کے باعث مکہ شہر کی ایک ایسی شبیہ بن گئی ہے جس میں اخلاقیات اور اقدار کا کوئی تصور نہیں، یعنی سمجھا گیا کہ یہاں کلی انتشار، بد انتظامی، قبائلی جنگ و جدل، بربریت اور عیاشی، الغرض ہر طرح کی قباحت عام تھی۔ اسی بات کو بنیاد بنا کر کہا جانے لگا کہ اس معاشرے میں ساری کجی کا خاتمہ کرنے کے لیے ایک خدا اور اخلاقیات کے تصور کا پنپنا لازم، ناگزیر ہو چکا تھا۔ مگر، اس طرح تو مذہب اسلام کا معاملہ ایک تاریخی حقیقت کی بجائے ایک سیاسی اصلاح بن کر رہ جاتا ہے۔ یہاں ایک اور مثال بھی ملاحظہ ہو۔ قدیم دور کے تقریباً ہم منکر ملحد، کافر یا لامذہب رہے ہیں۔ وہ کفر یا الحاد کی طرف جھکاؤ رکھتے تھے مگر اس کے باوجود

روح سے عاری تھے اور نہ ہی تقدیس کی حس سے خالی ہوا کرتے تھے۔ بلکہ مشہور معروف یونانی فلسفی تو آخری حربے کے طور پر بھی خود کو کافر یا منکر کے طور پر متعارف کروانے سے بوجوہ باز رہتے تھے۔ جیسے آج، تب بھی کفر کی اصطلاح سخت انحراف یا انتہائی تخفیف کے معنوں میں ہی استعمال ہوا کرتی تھی۔

اسلامی تواریخ میں مکہ کی جو قبل از اسلام تصویر پیش کی جاتی ہے وہ اقوام اسرائیل کی اس حالت سے مشابہت رکھتی ہے جو عبرانی پیغامبروں کی آمد سے قبل، یعنی ایک خدا کے تصور سے پہلے کی ہے۔ یسعیاہ، یرمیاہ اور حزقیل نامی عبرانی پیغامبروں نے استعارہ کے طور پر یروشلم میں جاری اور اقوام اسرائیل کے بارے 'فاحشہ کھیل' کی اصطلاح استعمال کی تھی۔ مراد قدیم اسرائیلیوں کے یہاں جسم فروشی نہیں بلکہ روحوں کی سوداگری سے تھی اور وہ جانتے تھے کہ بدکاری کی اس اصطلاح سے ان کا کیا مطلب تھا اور وہ اس سے کیا مقاصد حاصل کرنا چاہتے تھے۔ جیسے تب، آج بھی جنسیت بکتی ہے۔ 'فحاشی' یا 'بدکاری' کی اصطلاح آج بھی اشارتاً استعمال کریں تو لوگ فوراً متوجہ ہو جاتے ہیں۔ تاہم، جلد یا بدیر یہ اشارہ اور اصطلاحات لفظ بہ لفظ، حقیقی معنوں میں ڈھل جاتی ہیں۔ یہ لغوی معنوں میں سمجھی جانے لگتی ہیں۔

ستم ظریفی یہ ہے کہ اوائل اسلامی مورخین نے، قدیم عبرانی پیغامبروں کی مانند خود کو ویسا ہی مستشرق یا ماہرین مشرقی علوم ثابت کیا ہے جس طرح کے انیسویں صدی کے مستشرق محققین اور مصنفین کی ایڈورڈ سیڈ نے اپنی کلاسیکی تنقید کی کتاب 'استشراق' میں علمی چیر پھاڑ کر رکھی ہے۔ استشراق یا مشرقی علوم کی ابتدا بھی مشرق وسطیٰ سے ہوئی تھی۔ یہ یورپی شہنشاہیت سے بھی خاصے پہلے کی بات ہے۔ ان علوم کی داغ بیل اور پروان کا ایک ہی مقصد تھا، یعنی ان علوم کی مدد سے مشرق کی علمی و عقلی گھمنڈ کا پرچار کیا جا سکتا تھا۔ آٹھویں اور نویں صدی عیسوی کے یہ شہری محققین اسلامی سلطنت کی علم، تحقیق اور تمدن میں کارنامہ ہائے تمام اور متاثر کن کامیابیوں میں سے عجب رنگ کا فخر کشید کرتے نظر آتے ہیں۔ کئی کارنامے، مثال یروشلم کی قبتہ الصخرہ کی معماری سے لے کر علمی قابلیت جیسے جدید سائنس اور علم الادویات کی بنیاد اور اس طرح کئی دوسری کامیابیوں بارے استشراقی کتب اور حوالہ جات میں بے انتہا فخریہ اور گھمنڈی انداز مل جاتا ہے۔ یہ محققین صاف طور پر مشرق کی قدیم ترین معتبر اساس اور سادگی پسند تہذیبی نفاست جو کے برعکس، رقم تاریخ کی اسلام سے قبل تاریکی و جہالت اور بعد میں روشن خیالی اور آگہی کا نقشہ کھینچتے نظر آتے ہیں۔ یہ طریق خود ان محققین کی اپنی علمی و عقلی قابلیت، روایات، تہذیب اور تمدن سے میل نہیں کھاتا۔ کم و بیش یہی معاملہ آج مغرب کے ساتھ بھی درپیش ہے۔ جیسے تب، آج مغرب میں بھی اسی خیال کو تقویت دی جاتی ہے کہ مغربی اور ان کے ہم عصر تہذیب یافتگی کی چوٹی پر براجمان ہیں۔ وہ خود کو جہالت کے دور سے طویل علمی اور تحقیقی سفر کے بعد یہاں تک پہنچنے والی نفیس خلف سمجھ کر فخر محسوس کرتے ہیں۔ جس طرح یہ قباحت آج مغرب میں عام ہے، بالکل ویسے ہی اس دور میں بھی یہ استشراقی محققین ماضی کو خود اپنی کامیابی کے عدسے تلے دیکھنے سے باز نہیں رکھ سکے۔ جیسے تب، ویسے ہی آج بھی اس عمل میں تاریخ کا چہرہ مسخ ہو کر رہ گیا ہے۔ اس بگاڑ کی سادہ مثال ایسے ہی ہے کہ جیسے کوئی ماضی کے خلا میں جھانکنے کے لیے ٹیلی سکوپ کی الٹی طرف بیٹھ کر مشاہدہ کر رہا ہو۔

یوں ان مورخین نے ایک قرانی حوالے، جس میں کعبہ میں رائج رواج کو لے کر 'کراہت' کا اظہار کیا گیا تھا، سے مراد عریانی یا برہنگی لے لی۔ یہ مغالطہ مقبول عام بھی ہو گیا کہ جاہل کفار یا اجڈ ملحدین سے اسی قماش، قبیح حرکات متوقع تھیں۔ یہ بعینہ عبرانی پیغامبروں کی استعمال کردہ اصطلاحات کے حشر جیسا معاملہ ہے۔ یعنی پڑھنے والے 'فاحشہ کھیل' یا 'فحاشی' کے لغوی معنوں میں پھنس کر رہ گئے مگر اس کے پیچھو کار فرما پیغام کو یکسر فراموش کر دیا۔ بے شک کعبہ کا طواف اور حج کی غرض سے آئے زائرین اپنے روزمرہ کے کپڑے تقدیس میں اتار دیا کرتے تھے۔ مگر وہ انہیں بدل کر، روزمرہ کپڑوں کی بجائے جسم کو چھوٹے چرخے پر کاتے ململ کے کپڑے کی دو چادروں میں لپیٹ لیا کرتے تھے۔ اسی طرح کا لباس آج بھی حج اور عمرہ کے موقع پر زیب تن کیا جاتا ہے اور اسے احرام کہتے ہیں۔ عام روزمرہ کے کپڑے، جن کو پہن کر جسم میں ہاتھ اور پاؤں کے سوا سب ڈھکا رہتا ہے۔ یہ مختصر، سادہ لباس برہنگی اور عریانی کے زمرے میں گنا جانے لگا۔ جیسے تب، آج بھی احرام پہن کر زائرین خدا کے حضور دانستہ بے دست و پائی کا اظہار کرتے ہیں۔ یعنی اس طرح نہ صرف سادگی اور عاجزی کا اظہار ہو رہتا بلکہ ساتھ ہی ساتھ یک رنگی احرام رتبے اور قبائلی تفریق کو بھی ختم کر دیتا تھا۔ مقدس ترین ذات کی موجودگی میں تمام زائرین برابر اور بلا تفریق، حاضر شمار ہوتے۔ خدا کی نظر میں تمام

انسان، شہر مکہ میں چند لوگوں کے سوا بر ابر تھے۔ یہ لوگ حرم کے والی تو تھے مگر ساتھ، چرخوں پر کاتے ململی لباس کا کاروبار بھی کرتے تھے۔ یہ شہر مکہ کے قبیلہ قریش کے لوگ تھے۔

یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہے کہ مذہب بیچ کر بے تحاشہ دولت کمائی جا سکتی ہے۔ چھٹی صدی عیسوی کے قریش اس بات کو اتنی ہی اچھی طرح سمجھتے تھے جتنا کہ آج جدید دور کے ناشر اور مبلغ اپنے کاروبار سے جڑے نفع کو جانتے ہیں۔ جیسے آج وال سٹریٹ مارکیٹ کے کرتا دھرتا مشہور ہیں، تب مکہ کی اشرافیہ بھی شہر کو ایک لحاظ سے امر شاہی کے انداز میں چلایا کرتے تھے۔ یہاں بھی دولت، اختیار اور طاقت چند امراء کے ہاتھ میں بند تھی۔ اس شہر میں چاہے کسی بھی قسم کی، کوئی بھی رسائی درکار ہوتی، اس کی راہ میں یہ اشرافیہ حائل تھی۔ اس دسترس پر یہ لگان، محنتانہ وصول کرتے تھے۔

مذہب کے اس وسیع کاروبار میں حج کا خصوصی لباس، یعنی احرام صرف ایک جز تھا۔ ورنہ زائرین کو مکہ میں پانی اور خوراک کے حصول، جانوروں (جیسے اونٹ، گھوڑوں اور گدھوں) کے لیے چارے وغیرہ کے لیے بھی اچھا خاصا بھاری معاوضہ ادا کرنا پڑتا تھا۔ اسی طرح تقریباً ہر معاملے کی باقاعدہ ترتیب تھی۔ مکہ میں قریش رہنما اس بات کا فیصلہ کرتے کہ کون سا کنبہ کیا کاروبار کرے گا اور یوں اس کاروبار پر نامزد کنبے کی اجارہ داری قائم رکھی جاتی (محمدؐ کے کنبے بنی ہاشم کا کاروبار پانی کا تھا، عبد المطلب زمزم چشمے کے مالک تھے)۔ حج سے متعلق ہر جز کو تجارت کے زمرے میں شمار کیے، اس میں کمائی جا سکنے والی آخری کوڑی تک کا تعین کیا جاتا تھا۔ مثلاً، خیموں کی نوعیت اور جگہ، کعبہ کے احاطے میں داخلہ، ہبل کے سامنے نیزے گرانے کی تحویل داری، قربانی کے جانوروں کے گلے پر چھری چلانے، گوشت کو برابر تقسیم کرنے وغیرہ اور ان کے علاوہ دیوں دوسرے معاملات پر بھاری محنتانہ اور فیس لاگو تھی۔ ان سب معاملات سے حاصل ہونے والا سارا منافع قریش وصول کرتے تھے۔ قصہ مختصر، قریش مذہب اور عقیدے کا کاروبار کیا کرتے تھے اور خود ان کا واحد ایمان، یہ کاروبار تھا۔

ایک ایسا لڑکا جو بد و زندگی کی اساس یعنی مساوات انسانی کے گاڑھے رنگ میں رنگا ہوا تھا، اس کے لیے یہ سب ایک دھچکے سے کم نہیں تھا۔ اس کے اپنے خاندان کے لوگ عقیدے کے گھناؤنے کاروبار میں برابر کے شریک تھے۔ جس مقدس عقیدے کا وہ پرچار کیا کرتے تھے، یہ اس توحیدی سوچ کی بنیادی اصولوں کے سراسر خلاف بھی تھا۔ چونکہ یہ کم سن لڑکا اس کاروبار کا صرف ایک تماشائی تھا، بے شک وہ اس سے جڑی سماجی ناانصافی کو بھی خاصا صاف دیکھ سکتا تھا۔ آج جس طرح افریقہ اور ایشیاء کے تقریباً شہری علاقے، مقامی دیہی آبادیوں کے لیے امید اور ناامیدی دونوں کا موجب ہیں، مکہ بھی دور دراز پسماندہ علاقائی باشندوں کے لیے پر کشش ذرائع معاش اور ترقی کی نوید تو تھا مگر یہی شہر ان خستہ حال طبقات کی شہری علاقوں میں انتہائی غربت کی چکی میں پس رہنے کی وجہ بھی بن چکا تھا۔ مکہ کی معاشی کامیابی کا انحصار شہر میں ہمیشہ سے بڑھتی ہوئی پسماندہ طبقے کی آبادی پر بھی تھا۔ بہتر زندگی اور ذرائع معاش کی تلاش میں مکہ پہنچنے والے یہ پسماندہ لوگ غربت کی دلدل میں گہرے سے گہرے دھنستے جاتے تھے۔

محمدؐ دولت مند اشرافیہ کی طرح اس سارے روح فرسا حالات سے آنکھیں نہیں چرا سکتے تھے۔ وہ اپنے شہر میں اپاہجوں، معذوروں، یتیموں اور مسکینوں کو گداگر بنتا ہوا نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ان کے سامنے صحرا کے خود پسند اور آزاد منش خانہ بدوش لوگ حالات زندگی سے مجبور ہو کر خود کو دولت مندوں کے ہاتھ بیچ ڈالتے۔ یوں وہ صرف نوکر نہیں بلکہ عمر بھر کے لیے غلامی کا طوق پہن لیتے تھے۔ محمدؐ جب بھی کعبہ کے احاطے میں موجود ہوتے تو ان کا دھیان قاصدوں اور نامہ بروں کی طرف رہتا۔ یہاں انہوں نے سیکھا کہ معاملات ریاست کیونکر چلائے جاتے ہیں۔ وہ دیکھتے کہ کس طرح طاقتور ہمیشہ آگے اور کمزور اس کے پیچھے چلتا ہے۔ امراء کے چہروں پر ٹمانیت صاف نظر آتی۔ یہی نہیں، یہ دولت مند امارت کو راست بازی کی نشانی بھی سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک یہ امر شاہی اور مال و دولت گویا خود خدا کی عطا کی دین ہے۔ آپؐ حکام اور ثالثوں کو جائیداد اور استحقاق کے فیصلے کرتے ہوئے غور سے سنتے۔ بدو قبائل میں جائیداد انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی ملکیت ہوا کرتی تھی۔ بدوؤں کے برعکس شہریوں کے معاملات خاصے پیچیدہ تھے۔ وہ ثالثوں کی قابلیت کو خاصا سراہتے کہ یہ کمال مہارت سے دو افراد، قبائل وغیرہ کے بیچ

انفرادی معاملات کو چٹکیوں میں حل کروا دیتے۔ وہ بھی یوں کہ دونوں ہی فریق مطمئن اور راضی رخصت ہوتے۔ وہ لوگوں کو حلف اٹھاتے، مابین تجارت، آپسی معاہدے، معقول قیمتوں اور اس طرح کئی دوسرے معاملات کو طے پاتا ہوا دیکھتے رہتے۔ وہ یہ بھی دیکھتے کہ بھلے کوئی بھی معاملہ ہو، چاہے اس کی نوعیت انتہائی کیوں نہ ہو، یہاں ایک خدا کے نام پر باآسانی طے پا جاتا تھا اور لوگ کعبہ کے احاطے میں، اس مقدس جگہ کے احترام میں کوئی چوں چراں کیے بغیر بڑے سے بڑا سمجھوتہ بھی کر لیتے تھے۔

گو مکہ شہر کے اندر اور بالخصوص کعبہ کے احاطے میں ہو رہے اس سب کی وجہ سے وہ یقینی طور پر سمجھ سکتے تھے کہ یہاں عقیدہ اور کاروبار خاصا گڈمڈ ہو کر رہ گیا ہے مگر پھر بھی شہر مکہ میں مواقع آتے کہ یہ نسبتاً بھلا طریقہ معلوم ہوتا۔ ایسی جگہیں تھیں کہ جہاں عقیدہ اور کاروبار ایک ساتھ بکتا تھا مگر وہاں معاملات الگ رکھے جاتے۔ گویا، ان موقعوں پر خالص کاروباری رنگ نظر آیا کرتا تھا۔ مثلاً، مکہ شہر سے باہر عکاظ کے مقام پر ہر سال میلے کا انعقاد ہوا کرتا تھا۔ یہ میلہ حج کے دنوں میں، حج کی عبادت کے متوازی منعقد کیا جاتا تھا۔ شہر کے اندر، بالخصوص کعبہ کے احاطے میں جس طرح تجارتی و سماجی معاملات سکون اور مذہب کی لیپ سے طے پایا کرتے تھے، اس کے برعکس یہ خاصہ تند و تیز اور ہنگامہ خیز موقع ہوا کرتا۔ حج کے دنوں میں مکہ نائرین کی منزل تو تھا ہی، وہیں عمومی حالات کے برعکس یہ صرف تجارتی مرکز نہیں بلکہ باقاعدہ تجارتی منزل بھی بن جاتا تھا۔ قریش یہاں بھی، اس حقیقت کا بھرپور فائدہ اٹھایا کرتے تھے۔ عکاظ کے مقام پر منعقد ہونے والے تجارتی میلے میں عارضی عیش و عشرت کا سامان، بازار، تجارتی مراکز، دکانچے، اصطبل، خیمے اور کئی دوسری منڈیاں کھجور کے درختوں تلے، سائے میں قائم کی جاتیں۔ یہاں ہر چیز بکنے کے لیے تھی اور ہر طے پانے والے سودے پر قوی کھجور کی شراب اور گھوڑی کے دودھ کے خمیر سے بنے مشروب کیومس سے تواضع کی جاتی اور قریش، ہر سودے پر طے شدہ فیس وصول کرنا نہیں بھولتے تھے۔

دکانچوں پر کئی طرح کے عرق، مرہم، ضعیف اونٹوں کے جگر کو کئی دوسرے اجزا سے ملا کر یا صرف اس کی کاڑھی، بچھوؤں کے ڈنک اور مکڑی کے جالے جو دھوپ میں سکھانے پر خمیر بن جاتے تھے، چھوٹی بڑی بوتلوں میں متوازن مقدار میں پیچھوندی میں جما کر بیچے جاتے۔ یہاں بیماروں کے لیے شفا بخشنے والی بوٹیاں بھی دستیاب تھیں اور چھپا کر زہر بھی بک رہا ہوتا تھا۔ کالا جادو کرنے والے جادوگر بھی آیا کرتے۔ یہ جانوروں کے اعضاء، بالوں اور چرمی کاغذوں پر تعویذ لکھ کر بیچتے تھے۔ اسی طرح عطائیوں سے نایاب جھاڑیاں اور پتے، قیمتی پتھر اور سونے کی دھاتی تاریں بھی مل جاتی تھیں، جن کے مخصوص استعمال سے مردانہ کمزوریوں اور امراض نسوانی کا تشفی علاج ممکن تھا۔ شیاطین سے محفوظ رکھنے اور چاہیں تو دشمنان کو زیر کرنے کے لیے دور دراز سے آئے عاملین کے یہاں ہر طرح کی کرشماتی دھاتیں اور قیمتی پتھر مل جاتے تھے۔ ان میلوں میں ہندوستان سے آئے جوگی اور ملنگ بھی شرکت کیا کرتے تھے۔ یہ جوگی اور فقیر کوئلوں پر پیدل چلنے کے کرتب دکھاتے اور جوگ، بے خودی بیچتے۔ افریقہ سے سپیرے اپنے ساتھ طرح طرح کے رنگ برنگے سانپ لے کر ہر سال لازمی موجود ہوتے۔ ان کے یہاں ہر طرح کا سانپ اور زہر، سانپ کے دانت اور کینچلیاں تک بک جایا کرتی تھیں۔ پھر مداری بھی ہوتے تھے۔ ان کے پاس ناچنے والے بندر اور لڑ بھڑ کر مر جانے والے اصیل مرغ اور کئی نسلوں کے پرندے دستیاب ہوتے۔ پھر نجومی بھی تھے جو ہتھیلیاں پڑھ کر اور ستاروں کی چالیں دیکھ کر مستقبل کا حال مہنگے داموں بیچتے نظر آتے۔ یہیں، عکاظ کے میلے میں باقاعدگی سے چھٹی صدی عیسوی کے مشہور عرب شاعر، فنکار اور شعبدہ باز بھی کثیر تعداد میں شرکت کرتے۔ ان کی ہر طرف دھوم رہتی اور مجمع کا زیادہ تر دھیان انہی کی طرف مبذول رہا کرتا تھا۔ کئی مورخین، ان فنکاروں کی مقبولیت کے سبب عکاظ کے میلے کو زیادہ تر صرف ان ہی سے منسوب کرتے آئے ہیں۔ عکاظ کے میلے میں ہر طرح کا رنگ نظر آتا تھا۔ اگر ایک طرف دور دراز علاقوں سے آئے مبلغین تبلیغ کا کام کر رہے ہیں تو دوسری طرف فاحشائیں جسم بیچنے میں مشغول رہتیں۔ ان میلوں میں شامنی بھی شامل ہوا کرتے تھے جو وجد اور بے خودی کے عالم میں غرق رہتے یا اکثر دھول اور مٹی میں لوٹتے روحانی علاج بیچ رہے ہوتے۔ کہیں حکماء چوکس بیٹھے تشخیصی نسخے اور دوسری جانب جادو ٹونا کرنے والے عیاری سے بے کار ٹوٹکے بیچتے پھرتے۔ یہی ٹونے اور

ٹوٹکے بیچنے والے بیماروں کے اجسام میں بغیر کوئی جراحی چیرا لگائے، معجزانہ طور پر خون میں لتھڑے بے کار اعضاء نکالنے کا دعویٰ بھی کرتے تھے۔ اس ہجوم میں اکثر، الہامی پیشن گو اور پیغامبری کے دعویداروں سے بھی سامنا ہو جاتا تھا۔

عکاظ کے میلے میں یہ دعویدار تو مل جاتے تھے مگر پھر کیا؟ دنیا میں تو پہلے ہی بہت سے پیغامبر تھے۔ محمدؐ نے ان پیغامبروں کے قصے مدینہ کے نخلستان اور خیبر سے آئے یہودیوں سے سن رکھے تھے۔ اسی طرح یمن اور نجران سے شرکت کرنے والے عیسائی تاجران اور کلیسا کے مشن کار بھی پیغامبروں کی داستانیں بیان کرتے تھے۔ ان یہودیوں اور عیسائیوں کو اہل کتاب کہا جاتا تھا۔ یعنی، ان میں سے ہر ایک فریق کے پاس ایسی الہامی کتاب تھی جو انہیں امتیازی حیثیت بخشتی تھی۔ یہ عربوں کی زبانی کلامی، سینہ بہ سینہ یاد رکھی جانے والی گھڑی ہوئی شاعری اور داستانیں نہیں تھیں بلکہ چرمی کاغذ پر باقاعدہ تحریر کی ہوئی الہامی کتابیں تھیں۔ یوں، ان کتابوں کا اس کم سن لڑکے پر خاصا گہرا اثر ہوا کرتا جو خود پڑھ اور نہ ہی لکھ سکتا تھا۔ وہ دیکھ سکتا تھا کہ اہل کتاب کے ہاتھ میں خدا کا ان سے، یا کہو ان کے پیغامبروں کی وساطت سے خود ہم کلام ہونے کا جیتا جاگتا مادی ثبوت موجود تھا۔ مگر، ان کتابوں میں ایک ہی خدا کی طرف سے نازل کردہ الہامی پیغامات میں اچھا خاصا تضاد پایا جاتا تھا یا پھر یہ سوال اس کم عمر لڑکے کو پریشان کرتا کہ آخر ایک ہی خدا کے پیغامبر کی قوم دوسرے کی نفی کیسے کر سکتی ہے؟ اہل کتاب کو تو چھوڑو، یہ کیونکر تھا کہ عرب میں ہر قبیلہ کعبہ میں نصب صرف ایک، اپنے خدائی اوتار کو مانتا تھا اور اس کے لیے باقی سارے نشان قابل احترام تو تھے مگر بہر طور بے مقصد اور نا قابل قبول تھے؟ یہ کیسے ممکن تھا کہ ہر طرف کئی سچائیوں کا دور دورہ تھا؟

ایک کم سن لڑکا جس کی دنیا میں خود اپنی سماجی حیثیت غیر یقینی تھی۔ اس کے لیے یہ شور و غل اور ہنگامہ خیز حالات، واقعات اور خیالات جہاں ایک طرف خاصے پریشان کن رہے ہوں گے، وہیں دوسری طرف وہ اس میں سحر، دلربائی بھی پاتا ہو گا۔ یقیناً محمدؐ کے دل میں یہیں، پہلی بار وضوح اور صراحت کی خواہش نے انگڑائی لی ہو گی۔ ایسی وحدانی کیفیت نے جنم لیا ہو گا جس میں لوگ بجائے یہ کہ ایک دوسرے سے الگ تھلگ، کٹ کر رہیں۔ انہیں جوڑ کر رکھنے کا محور کن خیال آیا ہو گا۔ بہر طور، اگر کسی ایسی خواہش نے جنم لیا بھی ہو تو اس عمر کا لڑکا اس بابت کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ بالخصوص، جب آمنہ کی فوتیدگی کے صرف دو سال بعد ہی آپؐ کے دادا عبد المطلب بھی انتقال کر گئے۔ محمدؐ کے سرپرست چل بسے ہیں تو بعد اس کے زندگی ایک بار پھر منقسم ہو کر رہ جائے گی۔

باب:5

عبد المطلب کے بعد محمدؐ کی یتیمی، تاثیر میں تین گنا ہو گئی۔ صرف آٹھ سال کی عمر میں آپؐ ایک بار پھر کنبہ بنی ہاشم کے کئی گھرانوں میں بٹ کر رہ گئے۔ بالآخر، آپؐ کی ذمہ داری ابو طالب کے گندھوں پر آن پڑی۔ عبد المطلب کی وفات کے بعد ابو طالب نے بنی ہاشم کے نئے سربراہ کے طور پر ترکے میں پورے کنبے کے اثاثہ جات اور اختیارات تو پا لیے مگر ساتھ اس کے، بھاری بھر کم ذمہ داری بھی ملی۔ اپنے کنبے کی کفالت اور مفادات کا دفاع ابو طالب کے لیے بطور سربراہ اولین ترجیح ٹھہری۔ ہم دیکھیں گے کہ انہوں نے یہ فرض ایک غیرت مند اور اصول پرست شخص کی طرح پوری ذمہ داری سے ادا کیا۔ بحیثیت سربراہ اور محمدؐ کے سرپرست ہونے کے ناطے، آنے والے برسوں میں ابو طالب نہایت اہم کردار ادا کرنے والے تھے۔ یاد رہے، 578ء میں بنی ہاشم کی سربراہی اپنے پیش روؤں کے مقابلے میں آسان نہیں تھی۔ محدود اختیارات، قبیلہ قریش پر کمزور پڑتی ہوئی بنی ہاشم کی گرفت اور سکڑتی جائیداد کے ساتھ ایک بڑے کنبے کی کفالت جیسا مشکل فرض نبھانا، پھر مثال محمدؐ کی صورت گھر میں ایک اضافی فرد کو جگہ دینے جیسی کوفت سے آخر انہیں کس قدر خوشی ہوئی ہو گی؟ محمدؐ کے نام پر بھی تو کوئی وراثت اور شاید ان کا کوئی مستقبل بھی نہیں تھا۔

پہلے پہل محمدؐ کی حیثیت ابو طالب کے یہاں اضافی فرد کی سی تھی۔ یعنی، وہ اس گھرانے کا لازمی حصہ نہیں تھے۔ آپؐ کو یہاں بسر رکھنے اور وجود کو منوانے کے لیے اچھی خاصی مشقت اٹھانی پڑی۔ گو روایات میں مشہور یہی ہے کہ چچا نے اول دن سے ہی بھتیجے کی خصوصی کفالت کا انتظام کر رکھا تھا۔ مگر اس کے برعکس، تاریخ میں واضح بیان ہے کہ محمدؐ کو کم عمری میں ہی اونٹوں کو سنبھالنے جیسے دشوار کام پر لگا دیا گیا تھا۔ اس طرح صرف دو سال کے قلیل عرصے میں آپؐ مکہ کے تجارتی قافلوں کے ساتھ باقاعدہ ایک مزدور کی حیثیت سے اونٹوں کی رکھوالی کا انتہائی سخت کام سرانجام دے رہے تھے۔

بدوؤں کے یہاں گزارے کئی سالوں کا انہیں اس مرحلے پر بھرپور فائدہ ہوا۔ چونکہ اونٹ ایک کینہ پرور اور بگڑا ہوا جانور مشہور ہے۔ اسی لیے، اس کو بخیل ڈال کر رکھنا اور سنبھالنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ محمدؐ اس گر میں طاق تھے۔ اونٹ سنبھالنے میں مہارت جیسے، منہ سے مخصوص آوازیں نکالنا، بخیل میں ڈالے چھلے پر رسی کو درست طریقے سے کھینچنا، اونٹ کی پسلیوں اور کولہوں کے بیچ اس طرح ہاتھ سے دباؤ ڈالنا کہ یہ خود بخود اگلی ٹانگوں پر جھک جائے یا لد کر پیچھو کی طرف بوجھ ڈال کر سیدھا کھڑا ہو رہے وغیرہ، آپؐ کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ دوسرے لوگ جو اونٹ سنبھالنے میں مشاق نہیں تھے، وہ جانور پر چیختے، ریوں کو بے دردی سے کھینچتے اور غصہ دکھاتے جس سے اونٹ مزید بگڑ جاتا اور یوں سنبھالنا مشکل ہو جاتا۔ ایسے جانور کو ہتھیانا بھی ایک سلیقہ ہے۔ یہ کم عمر لڑکا جو اس اسلوب میں بھی ماہر تھا مگر اس بابت، آپؐ پر کبھی کسی کی نظر نہیں ٹھہری۔ وجہ یہ تھی کہ محمدؐ کو کبھی جانور کے سامنے زمین پر غصے سے پاؤں پٹختے یا کپو کے لگاتے ہوئے نہیں دیکھا گیا۔ انہیں کبھی اونچی آواز میں چیخنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ بلکہ، وہ اونٹوں کو سدھارنے، اپنی مرضی پر چلائے رکھنے کے لیے منہ سے جو آوازیں بھی نکالتے تو وہ بھی اس قدر باریک اور خرخری سیٹی جیسی ہوا کرتیں کہ ان پر شور کی بجائے سانس چلنے کا گماں ہوتا۔

سب سے پہلے محمدؐ نے صرف دودھ دینے والے اونٹوں کی نسل کو سنبھالنے اور نسل کشی وغیرہ کا تجربہ حاصل کیا۔ اونٹنیوں کی دیکھ بھال نسبتاً آسان کام تصور کیا جاتا تھا۔ جب ایک بار اس ہنر میں طاق ہو گئے، تب ہی انہیں تجارتی قافلوں میں مال برداری کے لیے استعمال ہونے والے مضبوط، خصی اونٹوں کو سنبھالنے کی اجازت دی گئی۔ مال برداری کے لیے مشہور یہ ایک کوہان والے ڈرومڈری اونٹ خطہ حجاز میں تیسری صدی عیسوی میں، ایتھوپیا سے لائے گئے تھے جو یہاں کے شدید موسم اور انتہائی سخت مشقت کے بیگار میں خاصے کار آمد ثابت ہوئے تھے۔ یہ اونٹ نہ صرف موسم کے مطابق جسم کے درجہ حرارت کو متوازن رکھ سکتے تھے بلکہ خون کے سرخ خلیوں میں ضرورت سے کہیں زیادہ پانی ذخیرہ رکھنے کے بھی اہل تھے۔ پھر، ان کوہان میں عام اونٹ کی نسبت کہیں زیادہ چربی جمع ہو سکتی تھی۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ قدیم افسانوی داستانیں، جن میں صحرا کی گرمی سے جھلسے، پیاسے، تاجر یا جنگجو مسافروں کی بابت مشہور ہے کہ وہ اونٹ کے کوہان میں چھرا گھونپ کر اسے کھول دیتے اور پھر اس میں سے غٹاغٹ پانی پیتے، سریحاً مغالطہ ہے۔ یہ قصے سننے میں تو دلچسپ ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ اونٹ کے کوہان میں پانی کی بجائے صرف چربی جمع ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ لچک دار سرخ خلیوں میں زیادہ پانی کی مقدار کے باعث یہ اونٹ پانی پیے بغیر اور کوہان میں جمع شدہ چربی کو کلاکر بھوکے بھاگ، کئی دن تک صحرا میں سفر کی مشقت اٹھانے کے قابل تھے۔ انہی اونٹوں کی بدولت، تجارتی قافلوں کو دور دراز کنوؤں یا چشموں کے بیچ بوجھ لاد کر سفر کرنے میں قطعاً مشکل پیش نہیں آتی تھی۔ وقت کے ساتھ اونٹوں کی یہ نسل اب حجاز میں انتہائی گرم صحرا کے مزاج کے عین مطابق ڈھل چکی تھی مگر دوسری جانب انسان ابھی تک اس مشقت کے قابل نہیں ہو پائے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اکثر تجارتی قافلوں کے مسافر، بشمول آپؐ کے والد زندہ گھر واپس نہیں پہنچ پاتے تھے۔ اس بات کا اندازہ کہ حجاز عرب میں تجارت کے لیے لوگ کس قدر خطرہ مول لیتے تھے، یوں لگایا جا سکتا ہے کہ قریش قبیلے کی محمدؐ کے زمانے تک چار نسلوں کے سربراہان میں سے صرف ایک نے مکہ شہر کی حدود کے اندر طبعی موت پائی تھی۔ باقی کے تین سربراہان، جن میں محمدؐ کے کنبہ بنی ہاشم کے آباء ہاشم بھی شامل تھے، گھر سے دور غزہ، عراق اور یمن جیسے دور دراز علاقوں میں وفات پا چکے تھے۔

اس تجارتی سفر میں بیماریوں اور حادثات کے علاوہ بھی کئی دوسرے خطرات درپیش رہتے تھے۔ باغی اور ڈاکو (جو اکثر عرب بدو ہوا کرتے تھے) ہمیشہ دردِ سر بنے رہتے۔ اسی طرح موسم اور جغرافیہ، جیسے صحرا میں شدید گرمی، جلد کو جھلسا دینے والی تیز اور روشن دھوپ، سخت رگیزریں اور ریت کے طوفانوں جیسی کئی دوسری مشکلات بھی راہ میں حائل تھیں۔ الغرض، تجارتی قافلوں کا سفر بچوں کا کھیل نہیں تھا۔ اچھی خاصی مہارت، مضبوط اعصاب اور نکیلے حواس درکار ہوا کرتے تھے۔ علاوہ ازیں، صحرا میں ڈرومڈری اونٹوں کے سوا دوسری کسی بھی نسل کے اونٹ کارآمد نہیں تھے اور ان سانڈنیوں پر اچھا خاصا خرچ اٹھتا تھا، اسی لیے سفر کے دوران صرف بھاری بھر کم سامان لادا جاتا تھا یا صرف اور صرف دولت مند تاجروں کو ان پر سوار رہنے کی اجازت ہوتی۔ وہ جو دیکھ بھال اور بدوؤں کی طرح پر مشقت مزدوری کرنے والے، جیسے محمدؐ خود تھے، انہیں تمام سفر اونٹوں کی مہار تھامے پیدل ہی طے کرنا پڑتا تھا۔ صرف یہی نہیں، بلکہ دن بھر پیدل سفر کی مشقت کے بعد جب شام میں پڑاؤ ڈالتے تو ان کی مصیبت کم نہیں ہوتی تھی۔ سب سے پہلے تو اونٹوں پر لدا سامان اتار کر سنبھالنا پڑتا۔ پھر اونٹوں کو چارہ کھلانے کا مرحلہ آجاتا اور بعد اس کے بقایا دیکھ بال جیسے اونٹوں کی مالش، ان کے پیروں کو نرم رکھنے کی خاطر گرم تیل اور مرہم ڈال کر، لنگراہٹ کا علاج وغیرہ کرنے میں جٹا رہنا پڑتا۔ سازگار حالات میں یہ تجارتی قافلے عام طور پر ایک دن میں تیس میل کا سفر طے کر لیتے تھے۔ دوسری صورت، یعنی ناگوار موسم اور اوپر بیان کردہ کئی وجوہات کے باعث صرف بیس میل دور تک ہی جا پاتے۔ سفر کے دوران بھی ان کا کام صرف مہار تھام کر آگے چلتے رہنا نہیں تھا بلکہ انہیں راستے بھر میں اونٹ کا فضلہ اٹھا کر سنبھالنا پڑتا اور پھر اس گوبر کے تھاپ بنا کر اس قدر سکھا لیے جاتے کہ بو جاتی رہتی۔ یہی خشک تھاپے شام پڑتے ہی آگ جلانے کے لیے ایندھن کے طور پر استعمال کیے جاتے۔ دوسرے کئی گھریلو کام جیسے، مالکان کے لیے کنویں یا چشمے سے پانی نکال کر لانا یا پھر اگر چشمہ وغیرہ نہ ہوتا تو اونٹوں پر لدے مشکیزوں سے پانی نکال کر مناسب انتظام کرنا بھی انہی مزدوروں کے ذمے تھا۔ علاوہ اس کے، ذمہ داریوں میں اونٹوں کے علاوہ تاجروں کی دیکھ بھال بھی شامل تھی۔ یہ بیگار کرنے والے یقینی بناتے کہ قافلے کا امیر اور دوسرے تاجر اچھی طرح سیر ہو کر کھانا کھالیں اور ان کے حصے میں بچا کھچا کھانا ہی آیا کرتا۔ رات گئے، جب فارغ ہو چکتے تو پھر بھی، لمبی راتوں کا سامنا ہوتا۔ یعنی شب بھر اپنی باری آنے پر شکاری جانوروں جیسے بھیڑیوں، لگڑبگڑوں اور صحرائی شیروں سے قافلے کی حفاظت کا کام بھی یہی مزدور سرانجام دیتے۔

انتظامی لحاظ سے اونٹوں کے قافلے بنا کر، اکٹھ کی صورت تجارتی سفر خاصا مشکل تھا مگر اس کے کئی فائدے بھی تھے۔ سب سے بڑا فائدہ حفاظت اور سیکورٹی کا تھا۔ صحرا میں تن تنہا سفر کرنے والا دلیر مسافر یا تاجر جو راہ میں آنے والی مشکلات کا بہادری سے سامنا کرتا ہو، ایک رومانوی بدو داستان یا کسی افسانوی صحرائی قصے کا کردار تو ہو سکتا تھا مگر حقیقت میں اس کا درپیش حالات میں جانبر ہو پانا تقریباً ناممکن تھا۔ تن تنہا، دور دراز علاقوں میں سفر کے شاعرانہ، ہوائی تصور اور تجارتی قافلوں کی صورت اجتماعی سفر کی زمینی حقیقت کے بیچ زمین اور آسمان کا فرق تھا۔ تجارتی نفع، انتظام اور حفاظت کی سہولت کو نظر میں رکھتے ہوئے عام کلیہ یہ تھا کہ ایک قافلے کا کم از کم بارہ اونٹوں پر مشتمل ہونا لازم تھے۔ مکہ کے تاجران، سال میں دو دفعہ چھوٹے اور بڑے اس طرح کے کئی قافلے روانہ کیا کرتے تھے۔ مکہ بھر کی تجارتی سرگرمی میں ہر موسم کے دوران روانہ کیے جانے والے قافلوں میں لگ بھگ دو ہزار سدھائے ہوئے اونٹوں کا شمار کم از کم رہتا ہی تھا۔ بہار کے موسم میں یہ قافلے شمال کی جانب شام میں شہر دمشق اور خزاں کے دوران جنوب کی جانب یمن کی طرف رخت سفر باندھا کرتے تھے۔ محمدؐ کو شمال کی طرف جانے والے قافلوں میں مزدوری کے کام پر لگایا گیا اور انہی میں سے ایک سفر آپؐ کے بچپن میں رونما ہونے والے مشہور و معروف، اس واقعے سے تعبیر ہے۔

تجارتی قافلہ دریائے اردن کے مشرق میں واقع قدیم اور مشہور، 'شاہراہ ملوکیت' پر رواں دواں تھا۔ قافلے کے امیر نے پہلے ہی رات کے لیے نزدیک ہی واقع ایک متروک بازنطینی قلعے میں پڑاؤ کا حکم دے دیا تھا۔ اس قلعے میں عیسائی راہبوں کی رہائش تھی۔

شاہراہ ملوکیت کے ارد گرد اس خطے کے طول و عرض میں قائم لاتعداد فوجی قلعے اب ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھے۔ صحرا میں یہ آثار اب انسانی مکان کی بجائے زمانے کی میراث معلوم ہوتے تھے۔ وقت کے ساتھ جیسے جیسے سیاسی ڈھانچہ تنزلی کا شکار ہوا، ساتھ عمارات بھی کھنڈرات میں تبدیل ہوتی چلی گئیں۔ بازنطینی اور فارسی سلطنتوں کے بیچ گہری چپقلش کا نتیجہ آٹھ سو سالہ طویل جنگ اور گاہے بگاہے چھڑنے والی خونی جھڑپوں کے نتیجے میں برآمد ہوا تھا۔ دونوں سلطنتوں کے بیچ یہ قضیہ سکندر اعظم کے زمانے سے جاری تھا۔ اس طویل رقابت میں اب تک دونوں فریقین کے بے تحاشہ وسائل اور توانائیاں برباد ہو چکی تھیں۔ مشرق میں فارسیوں کا تعمیر کردہ وسیع نظام آب پاشی جو دریائے فرات اور دجلہ کے بیچ واقعہ عراق کے میدانوں کو سیراب کرتا تھا، اب تباہی کا شکار تھا۔ اس کا حال بھی ماریب بند جیسا ہو چلا تھا، جو ایک صدی قبل ہی یمن میں جنگ و جدل کے باعث نظر انداز ہونے کے بعد ٹوٹ چکا تھا۔ وہیں، بازنطینی سلطنت کے صوبے شام (جس میں آج کے دور کے ملک شام، اردن، لبنان، اسرائیل اور فلسطین وغیرہ شامل تھے) سے اب افواج وسائل کی کمی کے باعث نکل چکی تھیں اور اپنے پیچھے شمال اور جنوب کے خط دفاع پر واقع کئی فوجی قلعے متروک چھوڑ دیے تھے۔ یہ قلعے، سخت موسم میں ریت اور دھول کے طوفانوں کے باعث بتدریج شکست و ریخت کا شکار تھے۔ اب ان قلعوں کی لرزتی دیواروں کے اندر اکثر خانہ بدوش بدو سرد موسم میں ریوڑ سمیت راتوں میں پڑاؤ ڈال لیتے یا پھر یہاں راہبوں کا بسیرا ہوا کرتا تھا۔ یہ راہب اکثر گروپ کی شکل میں یا پھر تن تنہا ہی یہاں رہائش رکھتے تھے۔ گوشہ نشین زاہدوں، مبلغین، فقیروں، جوگیوں، مسافروں اور بسا اوقات دور دراز علاقوں سے ہجرت کر کے تارک دنیا ہو جانے والے پر اسرار اشخاص کو قبائلیوں کے یہاں بے انتہا تعظیم کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ یہ قبائلی، متروک قلعوں میں ان غیر معمولی افراد کے لیے کھانے کا سامان اور پینے کے لیے پانی پہنچا دیا کرتے تھے۔ کیسے تو یہ قبائلیوں کی خدا کی راہ میں منت تھی۔ صحرا کے باسیوں کے لیے یہ وہ لوگ تھے جو اپنے اندر مقدس روح کے مالک تھے۔ مثال، زمین پر انسان کے روپ میں آسمان اور زمین کے قادر مطلق رب کی شبیہ تھے۔

راہبوں کی صحرا میں بسر کا احوال، 'جاگتی رات کے پچھلے پہر، دمکتے تاروں کی کہکشاؤں کی سنگت میں، اپنے آپ کے ساتھ تنہا۔۔۔' جیسی قبل از اسلام مشہور عرب شاعری میں انتہائی رومانوی انداز میں بیان کیا جاتا تھا۔ اسی طرح، ان سے منسوب تقدیس اور پر اسراریت کو روشنی کے تصور، 'زاہد نے ایک دیا بنایا۔ نازک جام کے پیندے پر شراب کی بجائے قلیل تیل، جس کے بیچ تیرتا ہوا بتی کا فتیلہ بہت مہین ہے مگر اس کی روشنی تاریکی سے کہیں بڑھ کر، زیادہ روشن ہے۔۔۔' جیسے استعاروں میں واضع کیا جاتا۔ تارکِ دنیا راہبوں کے بارے یہ شاعری تنہا پند مسافروں اور جنگجوؤں کے لیے مشعل راہ کا کام کرتی تھی۔ راہبوں کا طریق، یعنی دنیا کو ترک کر کے انسانوں سے دور گوشہ نشینی میں بسر کرنے کی ابتداء مصر میں ہوئی تھی۔ اس کے بانی چوتھی صدی عیسوی کے زمانے میں گزرنے والے سینٹ اینتھونی ہیں، جنہیں صحرا کے راہبوں کا باپ' بھی کہا جاتا ہے۔ سینٹ اینتھونی نے نیل کے ساحل پر واقع متروک قلعوں میں تقریباً بیس سال تن تنہا، گوشہ نشینی میں بسر کیے تھے۔ گو، عملی طور پر وہ اس عرصے کے دوران مکمل طور پر تنہا نہیں تھے۔ سینٹ اینتھونی کی سوانح لکھنے والے سکندریہ دور کے مورخ ایتھانیس نے لکھا ہے کہ سینٹ کے اس انوکھے طریق کے باعث، جس قلعے میں ان کی بسر ہوتی، وہاں سیاحوں اور زائرین کا رش لگا رہتا۔ ان میں سے اکثر کا تعلق خطہ عرب کی تاجر برادری سے بھی ہوا کرتا تھا۔ یہ تاجر اپنے سفر میں سے وقت اور راستہ نکال کر یہاں پہنچ جایا کرتے تھے۔ مقصد اس برگزیدہ رشی کی قربت میں کچھ وقت گزار کر تقدیس کا احساس اور کاروبار میں برکت پانا ہوتا تھا۔ رفتہ رفتہ، اینتھونی کے گوشہ نشین ہونے کی یہ مثال چہار طرف اس قدر مقبول ہو گئی کہ مورخ لکھتا ہے، 'ہر طرف خانقاہوں کی اس طرح بھرمار ہو گئی جیسے وادیوں میں بہار کے موسم میں جنگلی پھول کھل کر ہر طرف بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔۔۔ بے شمار خانقاہوں کا جال اس قدر وسیع ہو گیا کہ ایک کونے سے دوسرے تک، یہ دنیا زاہدانہ روش کی غماز سلطنت کی تصویر پیش کرنے لگی'۔

ایسی ہی ایک خانقاہ جو شاہراہ ملوکیت پر واقع متروک قلعے میں قائم تھی۔ اس خانقاہ میں ایک گوشہ نشین راہب کی بسر تھی۔ جس کا نام بحیرہ تھا۔ بحیرہ عربی کے لفظ بحر سے نکلا ہے اور بحر کے معنی سمندر کے ہیں۔ صحرا میں بسر رکھنے والے ایک شخص کے لیے یہ خاصا اجنبی نام تھا۔ شاید، بحیرہ نامی یہ راہب کبھی ملاح رہا ہو گا یا غالباً اس کا

یہ نام اس لیے مشہور تھا کہ اس کو علم کے سمندر پر عبور حاصل تھا۔ اس کے علم کا ماخذ ایک ضخیم کتاب تھی۔ یہ کتاب، یادداشت انسانی سے موجود تھی اور نسل در نسل راہبوں اور مشنریوں کے یہاں منتقل ہوتی چلی آ رہی تھی۔ ایسے زمانے میں جب صرف چند ہی لوگ پڑھ اور لکھ سکتے تھے، ایک کتاب کا وجود نسلوں تک برقرار رہنا بذات خود کرشمہ تھا۔ مشہور تھا کہ یہ کتاب آسمانی صحیفہ ہے اور اس کی تمام تر الہامی طاقت اسے پڑھ، سمجھ پانے والے شخص کے پاس مجتمع رہتی ہے۔ بحیرہ کی یہ کتاب دراصل چرمی کاغذ پر ہاتھ سے تحریر شدہ انجیل کے کئی مشہور نسخوں میں سے ایک تھی۔ چونکہ چرم وقت کے ساتھ ضائع ہو جاتا ہے، بحیرہ بھی ان لوگوں میں سے ایک تھا جنہوں نے اب اپنی زندگی اس نسخے کو اگلی نسل کے لیے، جوں کی توں تازہ چرم پر نقل کرنے کے لیے وقف کر رکھی تھی۔ یہ نقل پوری توجہ سے حرف بہ حرف تیار کی جاتی اور ہر آیت کو اس قدر احتیاط سے مکمل کیا جاتا کہ آنے والی نسل کے لیے نہ صرف چرم بلکہ الہامی پیغام بھی محفوظ رہے۔

ابن اسحاق نے اپنے روایتی شبہ، 'گماں ہے کہ۔۔۔' کے ساتھ رقم کیا ہے کہ، اس دن سے قبل بحیرہ نے قلعے کے آس پاس گزرنے، پڑاؤ ڈالنے والے اونٹوں کے تجارتی قافلوں پر توجہ نہیں دی۔ لیکن جب ابو طالب کی سربراہی میں دمشق جانے والا یہ مختصر قافلہ اس قلعے کے نزدیک پہنچا تو بحیرہ نے نیلے آسمان پر بادل منڈلاتا ہوا دیکھا۔ بادل کی یہ ٹکڑی قافلے کے اوپر چل رہی تھی، بلکہ دور سے دیکھنے پر محسوس ہوا کہ یہ قافلے میں ایک مخصوص مقام پر قدرے نچلی سطح پر مرکوز تھی۔ بحیرہ نے اس کو شگون سمجھا اور اپنی عادت کے برخلاف قلعے سے باہر نکل آیا۔ اس نے قافلے کو قلعے میں رات میں قیام کی دعوت دی اور آؤ بھگت کی غرض سے، جو کھانے کا سامان دستیاب تھا، پیش کر دیا۔ ابو طالب نے بحیرہ کی دعوت قبول کر لی اور دس سالہ محمدؐ کو اونٹوں اور تجارتی مال پر نظر رکھنے کے لیے قلعے سے باہر ہی روک دیا۔ جب سب لوگ قلعے میں داخل ہو چکے تو بحیرہ نے محسوس کیا کہ مہمانوں میں کوئی ایک شخص کم ہے۔ بحیرہ نے اس بابت پوچھ گچھ کی تو معلوم ہوا کہ اونٹوں کی رکھوالی کرنے والا لڑکا باہر ہی رہ گیا ہے۔ بحیرہ نے اس لڑکے کو بھی قلعے کے اندر رات بسر کرنے کے لیے بلانے پر اصرار کیا۔ تاجروں کو اس بات پر خاصی حیرت ہوئی کہ بحیرہ کی دعوت میں، اونٹ کی رکھوالی کرنے والا بھی شامل تھا؟

یقیناً بحیرہ نے سب کو دعوت دی تھی اور اونٹوں کی رکھوالی کرنے والا بھی اس دعوت میں شامل تھا۔ یوں، بحیرہ نے لڑکے کو قلعے کے اندر بلانے پر اصرار کیا۔ جب محمدؐ کو اندر بلا لیا گیا تو بحیرہ نے انہیں سیدھا کھڑا رہنے کو کہا اور پھر آپؐ کے سر اور دھڑ کا قریب سے جائزہ لیا۔ جسم پر 'نبوت کی مہر' تلاشنے لگا۔ اس 'مہر' کی پیشن گوئی بحیرہ نے اپنی پر اسرار مجلد ضخیم کتاب میں پہلے سے پڑھ رکھی تھی۔ اس بابت کئی حوالوں میں سینے پر سرپستان تلاشنے کی روایت بھی ملتی ہے۔ سرپستان کی نشانی بدھ مت میں دلائی لامہ کے ہر نئے جنم میں شناخت کے لیے کافی مشہور ہے یا اسی طرح گندھوں کے بیچ ایک گول مہر جس کی شکل پیالی کے منہ جتنی گول ہوتی ہے، مقبول عام ہے۔ بہر حال، بحیرہ کو یہ مہر، نشانی یا جو بھی پیشن گوئی اس نے پڑھ رکھی تھی، محمدؐ کے جسم پر مل گئی۔ تبھی، اس نے ابو طالب کی جانب مڑ کر اعلان کیا، 'تمہارے بھتیجے کے لیے ایک شاندار مستقبل انتظار کر رہا ہے۔'

ایک لحاظ سے یہ بھرپور اور مکمل کہانی ہے۔ اس میں ہر طرح کی، ایک سے زائد نشانیاں، شگون اور کرشمات کی پیشیں گوئیاں مل جاتی ہیں۔ سر کے اوپر منڈلاتی ہوئی بادل کی ٹکڑی اور جسم پر ایک پوشیدہ مہر کی گواہی وغیرہ سے بلا شک و شبہ اس بچے کے لیے شاندار مستقبل کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ مگر، یہاں ایک بار پھر حقیقی واقعات میں کرشماتی کہانی کا افسانوی رنگ بھر دیا گیا ہے۔ گو اس واقعہ کی روایت سے کم عمر محمدؐ کی رتبے میں اضافہ ہو جاتا ہے مگر باقی اور بالخصوص اس واقعہ کے فوراً بعد کی تفصیلات میں ہمیں ان کی تجارتی قافلوں میں برقرار رہنے والی حیثیت کا بھی بخوبی پتہ چلتا ہے۔ روایات صاف بتاتی ہیں کہ محمدؐ کو بحیرہ کی دعوت سے قصداً باہر رکھا گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اگر اس طرح کا واقعہ وقوع پذیر ہوا بھی تھا تو شاید یہ معاملہ محمدؐ کی ابو طالب اور دوسرے تاجروں کے ہاتھ جگ ہنسائی کا باعث بن گیا ہوگا۔ شاید وہ بحیرہ کی پیشن گوئی کو ہذیان میں مبتلا ایک بوڑھے شخص کی بڑ سمجھ رہے ہوں جو اب تک اچھا خاصہ وقت تنہائی میں گزار چکا تھا۔ اس پر گوشہ نشینی اور صحرا کے بیچ شدید

گرمی کا اثر ہو گیا تھا۔ بحیرہ کو وہ مجنوں سمجھتے ہوں گے، جس پر کسی جن کا اثر تھا یا شاید اس کا دماغ جواب دے چکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس مختصر قیام کے بعد بغیر کسی تبدیلی کے، قافلے نے دمشق کی جانب اپنا سفر جوں کا توں معمول کے مطابق جاری رکھا اور محمدؐ بدستور اونٹوں کی رکھوالی پر فائز رہے۔

آج بھی یہ قصہ محمدؐ کی منزل کے تعین کا نشان سمجھا جاتا ہے۔ جیسے، کہا جاتا ہے کہ اپنے قبیلے، لوگوں کے برعکس، اس گمنام اور غیر تسلیم شدہ ہیرو کو دوسرے مذاہب کے راہب اور مقدس لوگ فوراً پہچان گئے تھے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ، اس کو پہچاننے والا شخص بازنطینی شام میں بسر کرنے والا ایک عیسائی راہب تھا۔ یعنی، اس سے مستقبل میں نازل ہونے والی الہامی کتاب قران کی اس پیشن گوئی کو ثابت کر دیا گیا جس کی بابت انجیل اور تورات میں واضح پیشین گوئیاں موجود تھیں۔ یہ نکتہ رفتہ رفتہ اتنا اہم ثبوت بن گیا کہ تاریخ میں اسی نوعیت کی ایک اور روایت بھی مل جاتی ہے۔ اس روایت میں پہلی کی طرح ایک گوشہ نشیں راہب، دمشق کے راستے، خاص الخاص کی نشاندہی جیسی مماثلتیں صاف ملتی ہیں۔ اب کی بار روایت میں محمدؐ کی عمر پچیس برس ہے اور آپ تجارتی معاملات میں اونٹوں کی رکھوالی کرنے والے ایک لڑکے سے ترقی کر کے ایک آزاد آڑھتی بن چکے ہیں۔ اونٹوں کے رکھوالے سے ایک عزت دار تجارتی آڑھت تک کی ترقی کا سفر آسان نہیں ہے۔ یہ خاصا دشوار اور پر مشقت معاملہ ہے۔ اس ترقی کے دوران انہوں نے بہت کچھ سیکھا اور یہ سب سیکھنے کے لیے آپ کو ایک پوری دنیا دستیاب تھی۔ اس وسیع اور متنوع دنیا میں آپ کی تربیت کا سفر کٹھن ضرور تھا مگر یہ خوب رہی۔ یہ دنیا اپنے اندر ربلا کے رنگ سموئے ہوئے تھی۔

ہمیشہ کی طرح، آج بھی کاروباری اخبار جیسے 'وال سٹریٹ جرنل' اور 'فنانشل ٹائمز' وغیرہ کی اہمیت برقرار ہے۔ یہ اخبارات اس لیے مقبول اور اہم ہیں کہ ان پر کامیاب تاجران کا ہمہ وقت انحصار رہتا ہے۔ تاجروں کو ہمیشہ معلومات درکار ہوتی ہیں اور انہیں حالات پر قریبی نظر رکھنی پڑتی ہے۔ بعینہ، مکہ کے تاجران کے لیے بھی ضروری تھا کہ وہ اپنے زمانے میں، خطہ بھر کے سیاسی، معاشی اور سماجی احوال سے باخبر رہا کریں۔ انہیں بھی تازہ ترین خبروں، حالات حاضرہ اور تجارتی منازل کی پوری معلومات درکار رہتی تھی۔ یہی نہیں بلکہ ان کے لیے اس سے بھی بڑھ کر یہ ضروری تھا کہ وہ اس جانکاری کو صحیح استعمال کر سکتے ہوں اور سفارت کے داؤ پیچ میں طاق ہوا کریں۔

انتہائی ضروری مگر درست معلومات تک رسائی اور کامیاب سفارت کی ابتدا خطے میں نیک نامی اور قبائل کے ساتھ خوشگوار تعلقات سے ہوا کرتی تھی۔ ان خوشگوار تعلقات کی بنیاد قبائل کو ادا کیا جانے والا بیمہ ہوا کرتا تھا۔ یعنی، ہر طرح کے معاملات کو پوری توجہ، مہارت اور خوش اسلوبی سے طے کرنا تو پڑتا ہی تھا مگر یہ کافی نہیں تھا۔ اس مقصد کے لیے خراج، یعنی صحرائی علاقوں میں ٹکسال یا محنتانہ ادا کرنا پڑتا تھا۔ یہ ٹکسال دراصل تجارتی قافلوں کی حفاظت کو یقینی بنانے کی مد میں قبائل کو ادا کیا جانے والا معاوضہ تھا۔ اسی طرح، صحرا میں سفر کے دوران مقامی چشموں اور کنوؤں کے استعمال کے لیے بھی اجازت درکار ہوتی تھی۔ سفر اور پانی کے استعمال کی یہ اجازت، مجاز شیوخ اور قبائلی سرداروں کو تحائف اور خراج ادا کر کے حاصل کی جاتی تھی یا ان کے ذریعے ان سہولیات کی فراہمی کو یقینی بنایا جاتا تھا۔ اس ناگزیر انتظام کے لیے انتہائی ضروری تھا کہ ایک کامیاب تاجر یا آڑھتی نہ صرف پورے خطے میں قبائلیوں کے ساتھ اچھے تعلقات، روابط قائم رکھے بلکہ اسے قبائلی سیاست کا بھی بھرپور علم ہو۔ مثال کے طور پر، قبائل کے اندر طاقتور، ابھرتے اور کمزور پڑتے ہوئے سرداروں اور ان کی آل اولاد کی پہچان ہو۔ ہر دم بنتے اور بگڑتے ہوئے اتحادوں کے بارے پوری جانکاری رکھنی پڑتی۔ ان نت نئے، بنتے اور بگڑتے اتحادوں کی وجہ سے پیدا ہونے والے حالات، بالخصوص چراہ گاہوں پر قبضے کے اصول اور پانی پر اجارہ داری اور تقسیم سے متعلق معاملات کی سمجھ ہو۔ تجارتی قافلے کے امیروں کے لیے لازم تھا کہ وہ ہر طرح کی معلومات جمع رکھیں۔ وہ جانتے ہوں کہ صحرائی قبائل میں کس پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے اور کون سا شخص ناقابل اعتبار ہے۔ پھر اس دور میں شخصی پہچان اور معلومات اس لیے بھی اہم تھیں کہ یہ تمام معاملات زبانی کلامی طے پایا کرتے تھے۔ معاہدے تحریر نہیں کیے جاتے تھے بلکہ یہ صرف ہاتھ ملا کر، زبان پر ثبت ہو جاتے تھے۔ منہ پر وعدے کیے جاتے اور مل کر قسمیں اٹھائی جاتی تھیں۔ ان زبانی معاہدوں، قسموں اور وعدے کی پاسداری بہر حال ہر آدمی، چاہے وہ تاجر تھا یا قبائلی سردار، سب کے لیے اس لیے بھی ضروری

تھی کہ اس زمانے میں کسی بھی شخص کی زبان اور ساکھ سب سے اہم سمجھی جاتی تھی۔ مگر یہ ساکھ اور نیک نامی سب لوگوں کے لیے، ہر معاملے میں ضروری نہیں تھی۔ بعض معاملات میں یہ نہایت اہم اور دوسروں میں اس کی چنداں ضرورت محسوس نہیں ہوا کرتی تھی۔ چھوٹے موٹے معاملات میں لوگ وعدہ خلافی اور غلط بیانی پر سمجھوتہ کر لیتے تھے مگر زیادہ تر، خاص طور پر تجارتی اور مالی معاملات میں زبان کی پاسداری، گویا زندگی اور موت کا مسئلہ رہا کرتا تھا۔

معاہدہ طے پا جانے کے بعد ایک بار قافلہ کسی شیخ یا قبائلی سردار کی حفاظت میں چلا جاتا تو پھر اس قافلے کے تاجر ان علاقائی حدود میں مہمان تصور کیے جاتے تھے۔ ان کی حفاظت شیوخ اور سرداروں کے لیے لازم ہوتی اور، یقینی ہو تا کہ وہ راہ میں اس طرح محفوظ ہیں کہ جیسے وہ میزبان کے محل یا خیمے میں محفوظ تصور کیے جا سکتے ہیں۔ اسی طرح مفادات کے تحفظ میں، کسی بھی قافلے پر معمولی یا جان لیوا، ہر طرح کا مخالف فریق کی جانب سے کیا جانے والا حملہ خود سردار یا شیخ پر حملہ قرار پاتا۔ اس طرح کے قضیوں سے نبٹنے کی مکمل ذمہ داری شیخ یا سردار پر ہوا کرتی تھی۔ یہ مقامی سردار قافلوں کے ساتھ اپنے کھوجی بھی روانہ کیا کرتے تھے۔ کھوجی، صحرا کی ہر ایک تفصیل سے یوں آگاہ تھے کہ جیسے یہ سب ان کی ہتھیلی پر رقم ہو۔ صحرا کی ریتلی وسعتوں، سنگلاخ کوہستانوں، میل در میل پھیلاؤ اور بظاہر نہ ختم ہونے والے صحرائی سلسلے کا بھرپور علم رکھتے تھے۔ انہیں صحرا میں ہر نشانی، سنگ میل اور یادگار ازبر رہا کرتی تھی۔

اسی طرح اپنا کام کرنے کے لیے ان کھوجیوں کو کسی بھی قسم کے نقشے کی ضرورت نہیں رہا کرتی تھی، یعنی صحرا کا پورا نقشہ ان کے ذہنوں میں محفوظ رہا کرتا تھا۔ مثال کے طور پر انہیں چشموں کے بارے بالکل درست معلومات رہتی تھی۔ جیسے، موسم کے لحاظ سے کون سے چشمے میں، کس وقت کے دوران تازہ پانی مل جاتا ہے یا پھر سرد موسم میں ترائیاں کہاں ہو سکتی ہیں؟ ترائیاں، صحرا میں نشیبی علاقے کو کہا جاتا ہے جہاں بارشوں کا پانی بہہ کر جمع ہو جاتا ہے اور ریت میں جذب ہونے اور گرمی سے اڑ جانے سے قبل کئی ہفتوں تک استعمال کے لیے دستیاب رہتا ہے۔ جس طرح ناخدا سمندر میں کشتیوں کو ہواؤں کے دوش پر سفر کے عندیہ دیتے ہیں، اسی طرح یہ کھوجی صحرا میں اونٹوں کے قافلوں کو ساتھ لیے، پانی کے ایک ذخیرے سے دوسرے تک رہنمائی کرتے تھے۔ آبی ذخائر تک یہ سفر عام طور پر ایک دن میں طے کر لیا جاتا یا پھر زیادہ سے زیادہ دو یا تین دن کی مسافت در پیش رہا کرتی۔ عام طور پر یہ قافلے طویل مسافتیں طے کر کے زیر زمین چشموں کے پاس آباد خانہ بدوشوں کی عارضی بستیوں تک پہنچ جاتے یا پھر کنوؤں کے گرد غیر آباد مگر چند شاداب درختوں اور سنگ میلوں کے پاس پڑاؤ ڈالتے۔ بعض مقامات پر باقاعدہ نخلستان آباد تھے۔ یہ مستقل نخلی آبادیاں جیسے مدینہ، خیبر، تیما اور تبوک وغیرہ ہوا کرتی تھیں جو تجارتی راہدری میں مکہ کے شمال میں، نقشے پر ایک ترتیب میں واقع تھیں۔ ان نخلستانوں میں پانی وافر مل جاتا تھا بلکہ ہر طرف ہریالی ہوا کرتی۔ کھجور کے باغات، تازہ میٹھے پانی کے چشمے کئی میل تک پھیلے تھے اور ہر طرف سبزہ اور شاداب وادیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ صحرا کے بیچ یہ چند نخلستان، ان قافلوں کے لیے بے حد ضروری تھے۔ یہاں پڑاؤ میں انہیں کوئی مشکل پیش نہیں آتی تھی اور وہ یہاں طویل سفر کی تھکان اتار سکتے تھے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ہے کہ کئی مہینوں پر محیط اس کٹھن سفر کے نتیجے میں کمایا جانے والا منافع خاصا معقول اور صعوبتوں کے مقابلے میں بہت زیادہ ہوا کرتا تھا۔ محمدؐ کے زمانے تک، مکہ کے تاجر ان نے اپنا کاروبار عرب کے طول و عرض میں پھیلا رکھا تھا۔ یہ کاروبار جغرافیائی لحاظ سے دیکھیں تو برِ اعظم یورپ سے کہیں بڑے علاقے میں پھیلا ہوا تھا اور اس کا حجم شمال اور جنوب، الغرض ہر طرف ایک سی بڑھ کر تھی۔ اس خطے میں شام، عراق، مصر، یمن اور ایتھوپیا کے تقریباً تمام ہی شہر، بستیاں اور تجارتی مراکز اس راہدری کا بھرپور فائدہ اٹھاتے تھے۔ یہ مراکز اس کاروبار کا کلیدی حصہ تھے۔ اس خطے میں تاجر ان کی آمد و رفت اس قدر عام تھی کہ انہیں کہیں بھی اجنبیت محسوس نہ ہوتی۔ اس کی وجہ یہ تھی تاجر اپنی بنیادیں ہر اس شہر اور قصبے، خطے میں مضبوط بناتے جہاں ان کا کاروبار یا مفاد ہوا کرتا تھا۔ اس زمانے میں ایک تاجر کی مثال ایک مسافر کی سی تھی اور یہ مسافر گویا اس خطے میں ہر شہر اور قصبے کا نسبت کے لحاظ سے عارضی مگر کاروبار کی رو سے مستقل مقیم ہوا کرتا تھا۔

چھٹی صدی عیسوی میں طرز تجارت اور کاروبار کا طریق آج کے دور سے انتہائی مختلف ہوا کرتا تھا۔ یعنی، ایسا نہیں تھا کہ آپ فٹ ہوائی جہاز پر سوار ہو کر آٹھ سو میل کا سفر پلک جھپکتے میں طے کر لیتے ہیں اور دمشق کے ائیر پورٹ پر ہی بیٹھے بٹھائے، چائے کی پیالی پر ہاتھ ملا کر، فوراً سے پہلے معاہدہ طے کر کے واپس ہو لیتے ہیں۔ اس زمانے میں اعتماد قائم کرنے کے لیے اچھا خاصہ وقت درکار ہوا کرتا تھا۔ ایک دوسرے کو مہمان نوازی کے مواقع فراہم کیے جاتے تھے۔ کئی طرح کے تقاضے پورے کرنے پڑتے تھے اور یوں ایک عرصہ گزارنے کے بعد ہی کہیں جا کر اعتماد، تاجر کا نام قائم ہوا کرتا تھا۔ جب یہ ہو رہتا تو صرف اور صرف تب ہی تجارت یا کاروبار ممکن ہوا کرتا تھا۔ ساکوں کی محنت اور باہمی اعتماد کے بعد دو طرفہ تعلقات اس نہج پر پہنچتے تھے کہ رفتہ رفتہ بات چیت شروع ہو سکتی تھی یا پھر بالآخر معاملات طے پاتے۔ تاجران کو اپنے مطلوبہ کاروباری خطے میں طویل قیام کرنا پڑتا تھا اور اس کے لیے، اس شہر یا قصبے کو اپنا گھر بنانا ضروری ہوا کرتا تھا۔ یہ خاصہ طویل مرحلہ اور صبر آزما کام ہوا کرتا تھا اور جب تک محمدؐ نے تجارتی قافلوں کے ساتھ کام شروع کیا، تب تک مکہ کے تاجران مصر میں کاروباری مراکز، دمشق میں مستقل گھر، فلسطین میں زرعی فارم اور عراق میں کھجور کے باغات کے مالکان بن چکے تھے۔

صبر آزما محنت اور انتظار کے بعد اعتماد پر مبنی تجارت اور اس کے ساتھ جب اثاثے اور جائیدادیں بھی شامل ہو جائیں تو پھر ان تاجران کے لیے ہر اس پہلو پر نظر رکھنا ضروری ہو جاتا تھا جس کی وجہ سے مفادات پر ضرب پڑ سکتی تھی۔ بالخصوص اس طرح کے حالات، جب کہ بازنطینی اور فارسی سلطنتیں ہر وقت ایک دوسرے سے نبرد آزما رہا کرتی تھیں، یہ ناگزیر ہو چکا تھا۔ چھٹی صدی عیسوی میں، جب آٹھ سو سالہ قدیم جغرافیائی سیاسیات اور ریاستی معاملات پر ہر طرف سے سوال اٹھ رہے تھے، اس وقت بڑے شہروں، جیسے دمشق میں بازنطینیوں کا اختیار اور ریاست پر گرفت تیزی سے کمزور پڑتی جا رہی تھی۔ یہاں ہر طرف افواہوں، اندازوں اور متضاد دعوؤں کا دور دورہ تھا۔

محمدؐ کے لیے علم حاصل کرنے کے لیے دمشق سے زیادہ موزوں جگہ کوئی دوسری نہیں تھی۔ یہ بہر حال، آج ایک طالب علم جو کہ ایک پر تعیش کمرے میں کمپیوٹر کی سکرین کے سامنے، آرام سے علم حاصل کر سکتا ہے، اس کے مقابلے میں تب یہ خاصا مہنگا اور مشکل کام تھا۔ یہاں پہلی بار محمدؐ کو اندازہ ہوا کہ مکہ جس قدر بھی بڑھ کر تجارتی اور سیاسی معنوں میں پھیل رہے، اس کی اہمیت شمال میں واقع اس وسیع اور ہر لحاظ سے جدید دنیا کے مقابلے میں ایک صوبائی مرکز سے زیادہ نہیں ہے۔ محمدؐ کے آبائی شہر کی مثال خود ان کے اپنی مثال جیسی تھی۔ یعنی، جس طرح وہ مکہ سے تعلق رکھتے ہوئے بھی اس شہر میں غیر متعلق تھے، اس سارے سیاسی اور معاشی سلسلے میں ان کا شہر بھی ایک ہی وقت میں خاصا متعلق اور ہر لحاظ سے انتہائی غیر متعلق تھا۔ گو مکہ کی حیثیت شمال سے جنوب میں یمن تک اور بحر ہند تک کے علاقوں تک ایک مرکزی تو تھی مگر وہیں اچھی بات یہ تھی کہ یہ بازنطین اور فارس کی سلطنتوں کے بیچ جاری چپقلش سے خاصا دور بھی واقع تھا۔ وجہ، بیچ میں وسیع صحرا حائل تھا۔ مگر اس خوبی کا نقصان یہ تھا کہ مکہ اتنی بڑی سیاسی اور جغرافیائی تاریخ کے بیچ، بہر حال ایک طرف ہٹ کر جی رہا تھا۔ یعنی اس پیمانے پر مکہ، دمشق کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھا۔

دمشق چھٹی صدی عیسوی میں بھی قدیم شہر مشہور تھا۔ تب بھی اس کی تاریخ لگ بھگ پندرہ سو سال پرانی تھی۔ یہ ایشیاء میں مغرب کی جانب وسط ایشیاء کی مشہور شاہراہ ریشم پر واقع غالباً سب سے بڑا تجارتی مرکز تھا۔ اس شہر کی گلیوں میں ہر طرح کے لوگوں کا بسیرا تھا۔ یہاں شمال میں بحیرہ قزوین سے تعلق رکھنے والے اور دور دراز ہندوستان سے آئے لوگ بھی آباد تھے۔ ان کے علاوہ یونانی، فارسی، افریقی، ایشیائی، ہر طرح کی رنگت، گورے اور کالے، میٹھی نرم بولیوں اور ترش سخت زبانیں بولنے والے الغرض ہر طرح کے لوگ اس زرخیز خطے میں آن کر آباد ہوا کرتے تھے۔ یہ نہ صرف یہاں تجارت کی غرض سے موجود رہتے بلکہ دمشق میں ان کی بدولت تہذیب اور تمدن کا بھی دور دورہ تھا۔ یہاں کئی مذاہب کے پیروکاروں کی بھی آمد رہتی تھی۔ ان مذاہب نے کسی زمانے میں دنیا بھر کی تہذیبوں کو ان کی مخصوص خاصیتوں سے نوازا تھا اور آج دمشق، دنیا بھر میں ان خصوصیات اور تہذیبوں کا مرکز، ہر طرح کے تمدن سے مالا مال تھا۔

یہاں، سامیوں کی مخلوط جگت بھاشا یعنی زبان پورے عرب میں، معمولی رد وبدل اور لہجوں کے فرق سے بولی اور سمجھی جاتی تھی مگر محمدؐ کا سامنا قدیس کے عکس نماؤں سے تھا۔ دمشق میں آپؐ کی ملاقات ان لوگوں سے رہا کرتی تھی جن کے پاس سنانے کو طویل داستانیں تھیں۔ ان قصائص میں سنانے والوں کی تاریخ اور شناخت کا تذکرہ رہتا تھا۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ وہ یہ کہانیاں گوش گزار کرتے ہوئے، کسی بھی طرح جھجھک محسوس نہیں کرتے تھے۔ یہ قصے بار بار سننے کو ملتے۔ جیسے، کلیساؤں اور کنیساؤں کے احاطوں، بازار اور کاروان سراؤں، دمشق شہر کے بیچ میں سے گزرتی ہوئی انہار کے کنارے سایہ دار درختوں کے نیچے بیٹھے، (عرب کے صحرائیوں کے لیے یہ انہار خاصہ دلچسپی کا سامان ہوا کرتی تھیں، یعنی گلی کوچوں اور باغات میں بہتے ہوئے پانی کا تصور جو کہ بعد میں اسلامی طرز تعمیر میں بہت مقبول ہوا)۔ الغرض یہ داستانیں دمشق میں ہر جگہ گونجتی رہتیں۔ پھر داستان گو بھی کئی لوگ تھے۔ ان میں نرم خو بوڑھے، جوان شعلہ بیان مبلغ، شاعر اور باقاعدہ داستان گو، پادری، خوابیدہ قصہ خواں اور ہر طرح کے فلسفی شامل تھے۔ سامعین ان کے سامنے مگن بیٹھے، سر دھنتے اور دم بخود ہو کر عیسائی، یہودی، آتش پرست اور ہندو دیومالائی داستانیں سنتے رہتے۔ یہ داستانیں انسان اور خدا کے ڈرامائی تعلق پر مبنی ہوا کرتی تھیں اور ان طویل قصوں کا محیط معلوم تاریخ کے دور تلک کونے کھدروں میں پھیلا ہوا ہوتا تھا۔ ان میں سے ہر شخص اس دنیا کو اپنے طریقے سے بیان کیا کرتا تھا اور پھر ہر آدمی کا اصرار رہتا کہ غالباً وہ اور صرف وہ، اصل حقیقت سے آگاہ ہے۔ یہاں تک کہ ایک ہی فرقے سے تعلق رکھنے والوں کے بیچ بھی، آفاقی سچ کو لے کر شدید اختلاف پایا جاتا۔

مثال کے طور پر، جو داستان اور قصے مدینہ کے یہودی سنایا کرتے تھے وہ دمشق کے یہودیوں میں مشہور داستانوں سے خاصے مختلف تھے۔ اسی طرح عیسائیوں کے بیان کردہ واقعات میں بھی تضاد پایا جاتا تھا اور یہ فرق خاصا واضح بھی ہوا کرتا تھا۔ مثال کے طور پر، جب عیسیٰ نے بدکرداری کے الزام میں گھری عورت کا دفاع کیا تھا۔ ایک روایت میں کہا جاتا کہ عیسیٰ نے آگے بڑھ کر کہا، 'وہ جو گناہ سے پاک ہے، صرف وہی شخص پہلا پتھر پھینکے'۔ مگر دوسری روایت، جو آج بھی مشرق وسطیٰ میں خاصی مشہور ہے، اس کے مطابق عیسیٰ خود آگے حفاظت کی غرض سے بڑھے اور اس عورت پر جھک گئے۔ یہاں صرف دو انتہائی اہم الفاظ، جو شدید اختلاف کا باعث تھے، اضافہ کر کے کہنے لگے، 'وہ جو گناہ سے پاک ہے، صرف وہی شخص پہلا پتھر مجھ پر پھینکے'۔

اسی طرح کی ایک داستان اصحاب کہف کی بھی تھی۔ سات لڑکے، جن پر گماں تھا کہ وہ رومیوں کے قدیم دور میں، جب عیسائیت کی ابھی ابتدا تھی، مر چکے تھے۔ مگر بجائے مرنے کے، یہ لڑکے (ایک روایت میں، ان کے ساتھ ایک کتا بھی تھا) کرشماتی طور پر دو سو سال تک گہری نیند میں چلے گئے اور جب جاگے تو انہیں معلوم ہوا کہ عیسائیت کو شکست ہو چکی ہے۔ (مسلمان آج اس قصے کو زیادہ تر عیسائیوں سے بہتر جانتے ہیں کیونکہ اس کا تذکرہ قران میں آیا ہے)۔ اصحاب کہف کا قصہ پورے خطے میں اس قدر مقبول تھا کہ چاہے وہ کہیں سے بھی تعلق رکھتے ہوں، ہر شخص ان کی نسبت اپنے قبیلے، نسل اور علاقے کا تعلق نکال لایا کرتا تھا۔ ایک لحاظ سے ان اصحاب کو لے کر دوسروں پر اپنی فوقیت جمانے کی کوشش کی جاتی تھی۔ اصحاب کہف کے مشہور غار کو کھینچ تان کر اپنی جغرافیائی حدود میں ثابت کرنے کی سعی ہوتی۔ جس طرح آج جدید زائرین کے یہاں مقبول ہے کہ یحییٰ کا سر مشرق وسطیٰ میں کم از کم تین مقامات پر دفن ہے اسی طرح اصحاب کہف کے غار کی زیارت کے لیے بھی زائرین کے لیے کئی مقامات دستیاب ہیں۔ ان میں سے ایک مبینہ مقام ترکی میں افسس کے شہر میں، دوسرا شام میں دمشق شہر سے چند میل شمال کی جانب اور تیسرا مقام اردن میں شہر عمان کے باہر واقع ہے۔

یہ اور اس طرح کے کئی دوسرے تضادات صرف قصے میں زبانی کلامی اور اصولی اختلافات تک محدود نہیں تھے۔ عیسائی اور یہودی، دونوں ہی انجیل سے عقیدت رکھتے تھے مگر اس کے باوجود ان کے بیچ اس کے مسودوں میں اختلاف پایا جاتا تھا۔ بالخصوص، جب ان کتابوں کے فرمودات کی تشریح کی بات آتی تو اس بابت نہ صرف مذاہب بلکہ ہر مذہب کے اندر فرقوں کے مابین بھی تضاد مل جاتا۔ یوں، اس بابت اکثر اچھی خاصی گرما گرمی بھی ہوتی رہتی تھی۔ یہودی کئی فقیہوں کی تعلیمات کے بیچ بٹے ہوئے تھے۔ مثلاً، یروشلم کے تلمودی اور جدید بابلی فقہ ایک دوسرے یا پھر ضابطہ پرست اور مسیح موعود کے ماننے والے، آپس میں گتھم گتھا

رہتے۔ دوسری طرف عیسائی بھی خاصے منقسم تھے۔ یہ اختلافات اس قدر شدید تھے کہ زیادہ تر تلخی پر منتج ہو رہتے اور بسا اوقات پر تشدد دشمنیوں کی صورت شاخسانہ بھی بھگتنا پڑتا۔ بظاہر دقیق سوالات جیسے، عیسیٰ خدا تھے یا آدمی؟ یا پھر انسان کے روپ میں خدا تھے؟ یا آیا کیا وہ دونوں تھے؟ وغیرہ بے انتہا درجہ پر سیاسی شکل اختیار کر چکے تھے اور یوں بازنطینی سلطنت حقیقت میں، بیرون میں اگر فارس سے نبرد آزما تھی تو وہیں اندرون، ان اختلافات کے باعث خانہ جنگی کا سماں بن چکا تھا۔ یہی نہیں بلکہ یہ اختلافات اس قدر شدید ہو چکے تھے کہ بعض اوقات سلطنت میں صوبائی حکام بھی ریاستی وسائل اور اختیار تھامے، ایک یا دوسرے فرقے کی سیاسی و ریاستی حمایت میں کود پڑتے۔ یوں، ابتری بڑھتی جاتی۔

ایک نوجوان لڑکا جو ابھی تک اپنی منقسم زندگی میں سے محرومیاں چن رہا تھا۔ اس کے لیے ان حالات میں وحدانیت کا تصور انتہائی قوی رہا ہو گا۔ وحدانیت وہ حقیقت تھی جس کا تجربہ اور مشاہدہ محمدؐ بہت پہلے ہی صحرا میں کئی سال زندگی بسر کر کے حاصل کر چکے تھے۔ مراد، ایک ایسی قوی طاقت کا وجود تھا جو کسی بھی انسان اور انسانی تشریح سے بڑھ کر تھی۔ آفاقی حقیقت کا یہ تصور، علمی معنوں کے علاوہ، خود محمدؐ کے دل میں عملی اتحاد کی خواہش کا ترجمان بھی تھا۔ اس طرح متعلق اور غیر متعلق ہونے کا جو فرق انہوں نے اپنے بچپن میں شدت سے محسوس کیا تھا، وہ بھی مٹ رہتا تھا۔ یہ خیال اس قدر جامع تھا کہ ہر شخص، کنبے اور قوم کے لیے موزوں تھا۔ اس تصور تلے لوگوں کے پاس موقع تھا کہ وہ ہر طرح کا اختلاف، رنگ و نسل کا فرق اور بگاڑ بھلا کر ایک بڑی طاقت کو مان لیں جو بذات خود انسانی عقل و فہم اور ادراک سے کہیں بڑی تھی اور بلاشبہ تمام تر انسانی اختلافات کو ضم کرنے کے بعد فوری طور پر زائل کرنے کا نتیجہ دینے کے قابل تھی۔ محمدؐ جس طرف بھی دیکھتے انہیں سراسر تضاد نظر آتا۔ یعنی، جس طاقت کے تصور پر اتحاد اور قربت کو پنپنا چاہیے تھا، انسان اسی طاقت کے نام پر ایک دوسرے کا دشمن، دور ہو تا جا رہا تھا۔ انبیاء کی تعلیمات، جیسے موسیٰ سے عیسیٰ تک ہر نبی کے بیانات کو دہرایا جاتا، تبلیغ کی جاتی تھی۔ مگر معلوم ہو تا کہ بالآخر وقت گزرنے کے ساتھ رفتہ رفتہ مبلغ اور ان کے پیروکار، انہی برگزیدہ نبیوں کی تعلیمات پر کم سے کم عمل پیرا ہوتے جاتے ہیں۔ ایک مقدس اتحاد کا تصور یوں کیونکر پاش پاش ہو کر انسانی نااتفاقی کا باعث تھا؟ آخر واحدنیت کا جامع نظریہ، فرقہ پرستی کو ہوا کیسے دے سکتا ہے؟ جس حقیقت کے سائے تلے انسانوں کو مل جل کر اتحاد سے بسر کرنی چاہیے تھی، کیا اسی کے ہاتھوں تفریق کا شکار ہو جانا انسان کی قسمت میں لکھ دیا گیا تھا؟

چاہے آپ اسے بحیرہ کی پر اسرار پیشن گوئی سے تعبیر کریں یا ابو طالب کی تیز طرار تاجر نگاہ سے موسوم کر رہیں، چچا نے بہت جلد بھانپ لیا کہ ان کا بھتیجا نہ صرف بلا کا مشاہدہ رکھتا ہے بلکہ بہت جلد سیکھنے کی صلاحیت سے بھی مالا مال ہے۔ محمدؐ بھی ابو طالب کی ضرورتوں کو پورا کرنے میں پہل کرتے، پیش پیش رہتے۔ خوبی یہ تھی کہ جب ضرورت پیش آتی تو موجود ہوتے ورنہ پس منظر میں ہی رہا کرتے تھے۔ چچا کے ساتھ مل کر تجارتی مال کا حساب رکھتے اور سارے اسباب کا چٹھہ انہیں ازبر رہتا۔ یوں، یہاں محمدؐ نے نوجوانی میں قدم رکھا، وہاں ابو طالب کا آپؐ پر انحصار بڑھ گیا۔ یوں، ابو طالب محمدؐ کو تجارتی معاملات کے دوران ہمیشہ اپنے ساتھ رکھنے لگے۔ اس طرح، شام کے سفر اور تجارتی قافلوں میں خدمات محمدؐ کی سماجی اور مذہبی درسگاہ کے ساتھ پیشہ ورانہ تربیت کا سامان بھی بن گئیں۔

محمدؐ دیکھتے کہ کس طرح ابو طالب میل جول میں پہل کرتے ہیں۔ ملنے والے کی حیثیت اور رتبے سے بالاتر ہو کر پہلے ہی اپنا ہاتھ آگے بڑھا کر مصافحہ یا معانقہ کر لیا کرتے۔ یہ خالصتاً سیاسی چال ہوا کرتی تھی۔ اس طرح وہ دوسرے آدمی کو عزت بخشتے تھے اور اس کو خاص بالخاص ہونے کا تاثر دیا کرتے۔ وہ دیکھ سکتے تھے کہ تاجر وقت اور حالات کے مطابق مہمان نوازی برتا کرتے، آؤ بھگت کی جاتی اور اسی طور عزت وصول کی جاتی۔ کس طرح دو فریق کے لوگ اکٹھے بیٹھ کر چائے پیتے، ایک دوسرے کو شہد ملا دودھ اپنے ہاتھ سے پیش کیا جاتا اور انار کا رس سامنے لایا جاتا، کھجوروں کا مربہ کھلاتے یا انگوروں کے خوشے نفاست سے خدمت میں پیش کرتے، ساتھ معاملات کو طے کرتے جاتے۔ اسی طرح، اکثر تاجر ساتھ مل جل کر، ایک ہی تھالی سے کھانا کھاتے۔ یہ تاجروں کے بیچ گہرے تعلق اور اعتماد کی نشانی ہوا کرتی تھی۔ محمدؐ گھنٹوں پر محیط مباحثوں اور مذاکرات کا حال دیکھتے رہتے۔ وہ داؤ پیچ اور گر سیکھ رہے تھے جن کی مدد سے کسی کو بھی قائل کیا جا سکتا تھا، معاملے میں

پیچھو ٹتے ہوئے شخص کو واپس اپنے مقصد کے دائرے میں لایا جاسکتا تھا اور معاملات کا دور رس جائزہ پیش کیا جاسکتا تھا۔ لین دین پر گھنٹوں بحث میں شامل ہونے سے جہاں محمدؐ کی قائل کرنے کی صلاحیت پروان چڑھ رہی تھی تو وہیں اوقات یاد دلانے کے اشارے بھانپ کر انہیں سماجی طریق سمجھ آ رہے تھے۔ سب سے بڑھ کر یہ تھا کہ یہ بحث مباحثے اس وقت تک جاری رہتے جب تک کہ اعتماد بحال ہو جاتا اور فریقین قائل نہ ہو جاتے۔ حتمی نتیجہ، بالآخر معاہدہ طے پا جاتا۔ یعنی، یہاں محمدؐ نے لوگوں کو مائل اور پھر قائل کرنے کا گر بھی اچھی طرح ازبر کر لیا۔

اسی طرح ابو طالب کے ساتھ تجارتی معاملات میں شامل ہونے کے باعث محمدؐ نے اس مال کی قیمت بھی سمجھی جو وہ مکہ سے لے کر جایا کرتے تھے۔ اس تجارتی مال میں ہر طرح کا سامان ہوا کرتا تھا۔ جیسے بھاری مقدار میں کم قیمت مگر ہر طرح کے مقصد کے لیے استعمال ہونے والا چمڑا اور اون، کم مقدار مگر بیش قیمت سونا اور چاندی جو حجاز کی پہاڑیوں سے کھود کر نکالا جاتا تھا۔ یہ سونا اور بھی قیمتی ہو جاتا جب اس پر دمشق کے سنار اور فنکار اپنی کاریگری آزما چکتے تھے۔ تجارتی مال میں سب سے ہلکا اور آسانی سے ترسیل ہو سکنے والا مال، لوبان اور مرکلی کی گوند تھا۔ ان نباتاتی رالوں سے بیش بہا منافع کمایا جاتا تھا۔ یہ گوند بظاہر معمولی اور فرومایہ جھاڑ سے بڑی محنت اور تردد کے بعد کھرچ اور پکا کر حاصل کی جاتی تھی۔ مرکلی کی جھاڑی، یمن، ایتھوپیا اور صومالیہ کے صحرائی علاقوں میں عام تھی اور اس کی کاشت کے لیے موسم اور حالات موزوں تھے۔ شہری امراء میں مرکلی کی گوند سے نکالی گئی عطر اور دافع بدبو بہت مقبول تھیں یا پھر میت کو کفن میں لپیٹنے سے پہلے اس پر مرکلی کی گوند مل دی جاتی تھی۔ اسی طرح، لوبان کی بے حساب مقدار چرچوں میں جلانے کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ لوبان کے دھوئیں سے ہوا معطر ہو جاتی اور عیسائی اس کی خوشبو کو تقدیس جانتے۔ لوبان کے خریدار صرف عیسائی ہی نہیں تھے، بلکہ فارس کے آتش پرستوں کے یہاں بھی لوبان کا استعمال کثرت سے کیا جاتا تھا۔ عبادت کے دوران آتش پرست مٹھی بھر کر لوبان کو آگ میں جھونک دیا کرتے۔ اس سے نہ صرف ہر طرف خوشبو پھیل جاتی بلکہ آگ میں کئی رنگوں کے شعلے بلند ہوتے جو کہ آتش پرستوں کی عبادت میں اتنا سمجھی جاتی تھی۔ ابو طالب اور دوسرے تاجر لوبان کی کم از کم نو قسمیں اور ٹھوس یا مائع تیل کی شکل میں مرکلی گوند کی وسیع کھیپ سے جمع خرچ نکال کر اصل قیمت سے تین اور بسا اوقات چار گنا تک منافع کمایا کرتے تھے۔

مکہ کے تاجران کا حال بھی ملاحظہ ہو۔ مکہ کے تجارتی قافلوں کا معاملہ عارضی یا ایڈہاک نہیں تھا۔ یہ باقاعدہ ایک اتحاد تجار تھا جس کو چلانے کے لیے شراکت داروں کی باقاعدہ انجمن قائم تھی۔ سرمایہ کاری کا نظام خصوصی اصولوں کے تحت لاگو تھا۔ ان انتظامات کے باعث مخصوص طبقے کو ہی تجارت کی اجازت تھی۔ اس نظام کا صریح فائدہ صرف یہی طبقہ اٹھایا کرتا اور حقیقت میں، یہی طبقہ حاکم اور مجاز تھا۔ جن برسوں میں محمدؐ ابو طالب کے یہاں کام کیا کرتے تھے، اس تجارت سے ملنے والا منافع کا بڑا حصہ قبیلہ قریش کے چار کنبوں میں برابر تقسیم کیا جاتا تھا۔ مکہ میں قریش کے علاوہ بھی کئی تھے جن کا بس محدود سا حصہ ہوا کرتا تھا۔ ان حصہ داروں میں چند قبائل کے علاوہ کئی افراد بھی شامل تھے۔ ٹکسال، بھتہ، صوبوں کے بیچ کسٹم اور سرکاری محنتانے وغیرہ تاجروں کی یہ انجمن ادا کیا کرتی تھی۔ یہ اخراجات شراکت داروں کے منافع سے پورے کیے جاتے تھے اور خود اس مجاز تنظیم کے انتظامی خرچے بھی سرمایہ داروں کی ذمہ داری تھے۔ شراکت داروں کے بیچ معاملات، جیسے منافع کی تقسیم، ذمہ داریوں کا تعین اور اکٹھ قائم رکھنے کے لیے بھی سفارت کی اشد ضرورت رہا کرتی تھی۔ چنانچہ، محمدؐ نے یہ سفارت بھی بہت جلد سیکھ لی اور آپ محدود عرصے میں فریقوں کے بیچ ثالثی اور اختلافات پر کسی کہنہ مشق سفارت کار کی طرح معاملات طے کروانے لگے۔ بیس سال کی عمر تک پہنچے تو آپؐ ابو طالب کے تجارتی سفروں کے دوران پر اعتماد خلیفہ بن چکے تھے۔ اب ابو طالب محمدؐ پر اس قدر اعتماد کیا کرتے کہ آپؐ کو ابو طالب کے یہاں تقریباً بیٹے کا رتبہ حاصل ہو گیا۔ مگر، یہ رتبہ صرف قریباً بیٹے جیسا تھا۔

اگر ابو طالب اور محمدؐ اس قدر قریبی اور ان کے بیچ برسوں پلنے والا نسبت اور اعتماد کا رشتہ نہ ہوتا تو شاید آپؐ کبھی بھی یہ بھول نہ کرتے۔ ان دونوں کے بیچ آپسی قربت، محبت اور تعلق خاصا بڑھ چکا تھا۔ اس قدر کہ شاید محمدؐ بھول گئے کہ یتیمی کا سایہ ابھی تک ان کا پیچھا کر رہا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ محمدؐ کے اندازے اور امید کے برعکس، جب انہوں نے ابو طالب سے ان کی بیٹی فاخیتہ کا ہاتھ مانگا تو انہوں نے اس رشتے سے صاف انکار کر دیا۔

ویسے بھی یہ جوان محبت اور ستاروں کے میل کا قصہ نہیں تھا۔ چھٹی صدی عیسوی میں بیاہ عملی اور باہمی مفاد کے تحت طے پایا کرتے تھے۔ تاریخی حوالہ جات میں ہم فاخیتہ کے نام کے سوا، ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔

محمدؐ نے فاخیتہ کا ہاتھ، خود فاخیتہ کی بجائے ابو طالب سے مانگا تھا۔ ایک لحاظ سے وہ ابو طالب سے اس بات کا تقاضا کر رہے تھے کہ وہ آپؐ کے ساتھ اپنے قریبی رشتے اور باہمی اعتماد اور تعلق کو باقاعدہ تسلیم کر لیں۔ یوں آپ 'تقریباً بیٹے' کی بجائے اس گھرانے کا باقاعدہ، لازم حصہ بن جاتے۔ آپؐ اس طرح ایک یتیم اور سماجی طور پر بے حیثیت نہ رہتے بلکہ وہ قبیلہ قریش میں اپنے کنبے، بنی ہاشم کے سربراہ کے یہاں، داماد ہوا کرتے۔

اسی طرح ابو طالب کے اس فیصلے کی بنیاد بھی یہ نہیں تھی کہ محمدؐ اور فاخیتہ چچازاد ہیں۔ تاریخ میں گریگر مینڈیل اور جینیات کے علم کو منظر عام پر آنے میں ابھی گیارہ صدیاں باقی تھیں اور چھٹی صدی عیسوی میں عرب اور باقی دنیا میں بھی تقریباً ہر جگہ جیسا کہ ہمیشہ سے ہوتا آیا تھا، عم زادوں کے بیچ شادیاں عام بات تھی۔ بلکہ، اس طرح کی شادیاں مقبول بھی تھیں کہ یوں کنبوں کے بیچ آپسی تعلق اور رشتے مضبوط رہ سکتے تھے۔ یورپ میں بیسویں صدی کے دوران رونما ہونے والی خاندانی تعلقات اور سماجی ڈھانچے میں تبدیلی اور تنزلی کی سب سے بڑی وجہ خاندان کے اندر شادیوں کا فقدان بھی ہے۔ اس لحاظ سے ابو طالب کے انکاری فیصلے کا جائزہ لیا جائے تو اس کی صرف ایک ہی وجہ نظر آتی ہے۔ انہیں اپنی بیٹی کی اس شادی میں کسی بھی طرح کا کوئی فائدہ نظر نہیں آیا۔ وہ محمدؐ پر حد درجہ اعتماد اور ان سے بے تحاشہ محبت کر لیں، وہ بہر حال اپنی بیٹی کی شادی ایک یتیم کے ساتھ طے نہیں کر سکتے تھے، جس کا اپنا ذاتی ذریعہ معاش اور اپنے نام پر وراثت بھی نہیں تھی۔ ابو طالب اپنی بیٹی کو مکہ کے امراء میں بیاہنا چاہتے تھے اور جلد ہی انہوں نے اپنی حیثیت کے مطابق، ایسا کر بھی دیا۔

یوں، کئی برس پہلے اگر بحیرہ نے محمدؐ کے لیے شاندار مستقبل کی پیشن گوئی کی بھی تھی تو صاف طور پر ابو طالب نے اس بات کو سنجیدہ نہیں لیا تھا۔ اسی طرح، اگر محمدؐ نے یہ سمجھ لیا تھا کہ شاید وہ اپنے محروم بچپن اور یتیمی کے طوق کو کہیں پیچھے چھوڑ آئے ہیں تو اب ان کا یہ خیال خام بھی دم توڑ گیا۔ ابو طالب کا محمدؐ کو رشتے سے انکار کا مطلب ایک حد کا تعین تھا۔ یعنی، وہ محمدؐ کو اپنا جانتے تھے مگر حقیقت میں انہیں اپنانے لائق نہیں سمجھتے تھے۔

وقت آئے گا کہ ابو طالب کو اس رشتے سے انکار پر پچھتاوا ہو گا۔ محمدؐ نے اس انکار کو نہایت مدبرانہ انداز اور صبر سے قبول کر لیا اور یوں جلد ہی اپنے چچا ابو طالب سے متعلق دل میں خلش کو مٹا دیا۔ اس طرح ان کے بیچ قربت اور اعتماد کا رشتہ مزید پختہ ہو گیا۔ جس طرح محمدؐ کے ساتھ اب تک پوری زندگی ہوتا آیا تھا اور مستقبل میں بھی یہی طرز رہے گی، رد کر دیا جانا خود ان کے لیے طویل مدت میں فائدے کا سبب بنتا رہا۔ ابو طالب کا محمدؐ کو رشتے سے انکار آپؐ کی زندگی کا وہ موڑ بن گیا جس نے تاریخ کا دھارا طے کیا۔ آپ اس معاملے کو اپنی تسکین کے لیے قسمت کا لکھا یا قدرت کا فیصلہ کہہ سکتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ اگر محمدؐ ابو طالب کے یہاں شادی کر لیتے تو شاید آنے والے سالوں میں، جب حالات ابتر ہوتے جائیں گے، تاریخ میں دین اسلام اور نام محمدؐ کو پنپنے کے لیے جس ناگزیر ساتھ کی ضرورت تھی، اپنی چچا زاد کی صورت وہ رفاقت میسر نہ ہوتی۔ ابو طالب کے یہاں رشتے سے انکار کے بعد، محمدؐ نے جب شادی کی تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس خاتون کے بغیر آپؐ کو ہرگز وہ حوصلہ اور عزم میسر نہیں آ سکتا تھا جس کے بل پر آگے چل کر محمدؐ دنیا میں اتنا بڑا کردار ادا کرنے والے تھے۔

باب:6

یہ انوکھی شادی تھی۔ وہ آپؐ سے عمر میں بڑی تھیں۔ کتنی بڑی؟ یہ معلوم نہیں مگر مقبول روایت یہی ہے کہ شادی کے وقت محمدؐ پچیس اور ان کی عمر چالیس سال تھی۔ بیشتر مغربی محققین کے نزدیک یہ شادی اس وجہ سے نرالی ہے کہ میاں اور بیوی کی عمروں میں خاصا فرق ہے۔ یہی محققین اپنے تئیں اس شادی کو 'سہولت' ،بالخصوص 'معاشی سہولت' سے تعبیر کرتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ اس دلیل سے بجائے محمدؐ خود ان محققین کی اصلیت اور سوچ عیاں ہو جاتی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ شاید محمدؐ نے خدیجہ سے یہ شادی 'معاشی تحفظ' حاصل کرنے کی خاطر کی تھی۔ ان کے ہی مطابق، آپؐ کو غالباً صرف خدیجہ کے مال اور دولت سے سروکار تھا۔ ان کا یہ خیال بھی ہے کہ سوائے اس کے، ایک خوبرو جوان آدمی کا قدرے بڑی عمر کی عورت کی طرف مائل ہونے کی دوسری کوئی معقول وجہ نہیں ہو سکتی۔ یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ یہ مغربی محققین خاصے تنگ نظر واقع ہوئے ہیں۔ پھر، اکاد کا تاریخ دان ایسے بھی ہیں جنہوں نے اس معاملے کا نفسیاتی طور پر تجزیہ کر رکھا ہے۔ اس تجزیے سے جو نتیجہ بر آمد کیا جاتا ہے، وہ بھی ایک مغالطہ ہے۔ ان معدودے محققین کے مطابق، اس شادی کی وجہ یہ تھی کہ شاید محمدؐ بڑی عمر کی خاتون سے شادی کر کے بچپن میں در پیش، مادرانہ محرومی کا ازالہ کرنا چاہتے تھے۔ چھ سال کی عمر میں یتیم ہو جانے والا بچہ، اب تک ماتا کی تلاش میں تھا۔ پھر، ان سب کے علاوہ کئی محققین ایسے بھی ہیں جو واقعی یہ سمجھتے ہیں کہ در اصل محمدؐ خدیجہ سے گہری محبت کرتے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ ایک ایسے معاشرے میں، جہاں کثیر شادیاں کرنا عام ہو، وہاں عمروں میں فرق کوئی اتنی بڑی بات نہیں تھی۔ یہ شادیاں عام طور پر زوجین میں واقع ہو جانے والی اموات یا طلاق کی وجہ سے کی جاتی تھیں۔ پھر یہ بھی تھا کہ امراء شہر میں ایک سے زیادہ شادیاں کرنا معمول تھا۔ ان شادیوں کے نتیجے میں اکثر دیکھنے کو مل جاتا کہ چچی، بھتیجے سے کم عمر ہے یا پھر سوتیلے بھائیوں کی عمروں میں پوری ایک نسل کے برابر فرق ہوتا تھا۔ یا پھر ہم زادوں میں ایک کی عمر، دوسرے کے مقابلے میں چچا کی عمر جتنی زیادہ یا کم ہوا کرتی تھی۔ الغرض، یہ معاملہ عمر کا نہیں تھا۔ ہاں، یہ ضرور تھا کہ ایسی کئی شادیوں میں سے چند ایک واقعی محبت کی بنیاد پر بھی کی جاتی تھیں۔ ورنہ، عام طور پر شادیاں معاشی یا سیاسی وجوہات کی بناء پر ہی طے پایا کرتی تھیں۔ شادی بیاہ کی اس خاندانی روایت کے سبب، سماج میں ایک کنبہ یا قبیلہ دوسرے سے بندھا ہوا تھا اور پورے معاشرے کی بنیاد یہی طریق تھا۔ مگر اس کا قطعاً یہ مطلب نہیں ہے کہ اس معاشرے میں رومانوی محبت کا کوئی وجود نہیں تھا۔ قبل از اسلام، محبت کی یہ داستانیں عام ہوا کرتی تھیں۔ مگر، رواج اور ریت، انتہائی سخت سماجی رویوں کی وجہ سے لوگوں کے نزدیک اس طرح کی انسیت اور رغبت، شادی اور بیاہ، رومان سے زیادہ جہالت کا معاملہ رہا کرتا تھا۔

انہی رنگ برنگی تشریحات کے نتیجے میں محمدؐ اور خدیجہ کے بیچ پنپنے والی انسیت کا یہ معاملہ غیر منطقی معلوم ہوتا ہے۔ اور، یہی وجہ ہے کہ بیشتر مغربی محققین اس بابت مغالطے کا شکار ہو گئے۔ انسانی پیمانوں پر غور کیا جائے تو محمدؐ اور خدیجہ کی طویل، خوشحال اور یک زوجگی کی شادی کی ایک ہی معقول اور سادہ سی وجہ نظر آتی ہے۔ وہ یہ کہ، ان دونوں کے بیچ گہری محبت اور انسیت تھی۔ آپ دونوں کا یہ ساتھ چوبیس سال کے عرصے پر محیط ہے۔ تمام لوگوں میں، خدیجہ واحد شخصیت تھیں، جنہوں نے محمدؐ کے عوامی کردار میں آنے سے قبل اور دوران، انتہائی اہم اور مرکزی کردار ادا کیا ہے۔ مگر، آپ کا یہ کردار اس قدر خاموش، عاجزانہ اور بے غرض ہے کہ بعد ازاں جب محمدؐ کی سوانح اور اسلام کی تاریخ رقم ہوئی تو اس میں، خدیجہ کے اس کردار کا تذکرہ بمشکل ملتا ہے۔ شاید، اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ خدیجہ محمدؐ کے وسیع پیمانے پر عوامی حمایت حاصل ہونے سے قبل ہی انتقال کر چکی تھیں۔

خدیجہ کی موت کے بعد، طویل عرصہ گزر جانے پر بھی، جب محمدؐ کے نکاح میں کئی بیویاں تھیں، آپؐ تب بھی خدیجہ کو اپنی تمام بیویوں پر فوقیت دیا کرتے تھے۔ وہ اس بات کا برملا اظہار بھی کرتے کہ بعد از خدیجہ، انہیں کسی بیوی سے دوبارہ اس قدر محبت نصیب نہیں ہوئی۔ اگر یہ خدیجہ سے بے انتہا، گہری محبت نہیں تھی تو

پھر آخر کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ کئی سالوں بعد بھی، جب محمدؐ ابھرتے ہوئے نظریے کے رہنما، محترم رسول، پیغمبر خدا اور لوگوں میں مقبول و محبوب ہونے کے باوجود بھی اس محبت کا یوں کھلے عام اظہار کر گزرتے تھے؟ خدیجہ نے آپؐ سے صرف آپؐ کے لیے محبت کی۔ ان کی محبت میں محمدؐ کے مستقبل میں اتنے بڑے اور اہم کردار سے متعلق غرض کا معمولی شائبہ بھی نہیں تھا۔ یہ بے غرض محبت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ کئی سال گزرنے کے بعد بھی، محمدؐ جب بھی خدیجہ کا ذکر کیا کرتے تھے یا کسی کی آواز میں خدیجہ کی معمولی سی بھی مماثلت محسوس ہوتی تو آپؐ کی آنکھیں اشکبار ہو جایا کرتی تھیں۔

چنانچہ، اس شادی کے انوکھے ہونے کی وجہ محمدؐ اور خدیجہ کی عمروں کا فرق نہیں بلکہ ان دونوں کے بیچ گہری نسبت، محبت اور انسیت تھی۔ وہیں، دونوں میں برابری بھی کمال درجے پر تھی۔ بالخصوص، جب اس معاشرے میں میاں اور بیوی کے رتبے میں بہت فرق ہوا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ، یہ بات بھی غیر معمولی تھی کہ بجائے محمدؐ، خدیجہ نے شادی کا پیغام بھجوایا تھا۔

ابن اسحاق نے خدیجہ کا احوال اس طرح بیان کیا ہے، 'خدیجہ ایک مضبوط، پر وقار اور دولت مند خاتون ہونے کے ساتھ تجارت میں بھی دلچسپی رکھتی تھیں۔ آپ نہایت شریف، ذہین اور دور اندیش خاتون تھیں۔' خیال رہے، اس زمانے کی کسی بھی عورت کے تعارف میں، 'مضبوط'، 'ذہین' اور 'دور اندیش' جیسے الفاظ کا استعمال انوکھی بات ہے مگر خدیجہ کے معاملے میں یہ خصوصیات سو فیصد درست تھیں۔ خدیجہ اس شادی سے قبل دو دفعہ بیوہ ہو چکی تھیں اور اپنے دوسرے شوہر کی وراثت میں آپ کو مکہ کے تجارتی کاروبار سے اچھا خاصہ حصہ ترکے میں ملا تھا۔ گو، آپ معاشی طور پر مکہ کے دوسرے تجار کی مانند وسائل سے مالا مال تو نہیں تھیں مگر ضروریات زندگی اور معاشی و سماجی حیثیت میں ہر طرح خود مختار ہو چکی تھیں۔ اب آپ کے پاس دو راستے تھے۔ پہلا یہ کہ آپ اپنا تمام حصہ کسی دوسرے تاجر کو فروخت کر دیتیں یا پھر دوسری صورت میں آپ اپنا کاروبار خود مختاری سے جاری رکھتیں۔ قباحت یہ تھی کہ کاروبار جاری رکھنے کے لیے آپ کو ایسے شخص کی ضرورت تھی جو مکہ کے تجار میں آپ کے مفادات کا بھرپور تحفظ اور نمائندگی کر سکے۔ یعنی، ایک ایسا آڑھتی جو تجارت کی اچھی سمجھ بوجھ رکھتا ہو اور بجائے اپنے ذاتی، خدیجہ کے مفادات کو مقدم رکھ سکے۔

سن 695ء میں خدیجہ نے محمدؐ کو دمشق جانے والے ایک تجارتی قافلے میں اپنے مال و اسباب کی ترسیل کے لیے نمائندہ مقرر کر دیا اور آڑھت کا تمام کام بھی آپؐ کو سونپ دیا۔ ایک روایت میں یہ بھی مشہور ہے کہ خدیجہ نے اس سفر کے دوران اپنا ایک قابل اعتماد کارندہ بھی آپؐ کے ہمراہ کر دیا۔ اس کارندے کے ذمہ سفر کے دوران مال و اسباب کی حفاظت، آپؐ کے طریق کاروبار کی نگرانی اور اس بابت خدیجہ کو پوری صداقت سے احوال پہنچانے کا کام شامل تھا۔ یہ کارندہ، جس کا نام میسرہ تھا، خدیجہ کا غلام تھا۔ میسرہ نے سفر سے واپس آن کر بعینہ ویسا ہی احوال بیان کیا جو محمدؐ کے ساتھ پندرہ برس پہلے بحیرہ کے یہاں پیش آ چکا تھا۔ یہ حال کچھ اس طرح سے تھا کہ محمدؐ نے ستانے کے لیے ایک درخت کے سائے تلے ستانے کی غرض سے پڑاؤ ڈالا۔ میسرہ کے مطابق یہ درخت ملک شام کی حدود میں، ایک عیسائی راہب کے جھونپڑے کے پاس ہی واقع تھا۔ راہب نے جب محمدؐ کو اس درخت کے نیچے آرام کرتے پایا تو خاصی حیرت کا اظہار کیا۔ اس نے میسرہ کو بتایا کہ 'اس درخت کے نیچے آج تک کسی شخص، سوائے خدا کے پیغمبروں نے آرام نہیں کیا۔' میسرہ پر راہب کی اس بات کا گہرا اثر ہوا۔ منقول روایت میں مزید بتایا گیا ہے کہ میسرہ نے یہ دعویٰ بھی کیا کہ مکہ کی جانب واپسی کے سفر کے دوران، جب دن کے وقت درجہ حرارت خاصہ بڑھ جاتا تھا۔ اس نے اپنی آنکھوں سے دو فرشتوں کو محمدؐ پر سایہ قائم کیے دیکھا۔

ایک لحاظ سے دیکھیں تو جس طور ابن اسحاق نے اخذ کیا ہے، یہ خدیجہ کی توہین معلوم ہوتی ہے۔ انہی وجوہات کی بناء پر کئی لوگوں کو گماں ہوتا ہے کہ میسرہ کی زبانی، سفر کی اس رپورتاژ کو سننے کے بعد ہی شاید خدیجہ نے رواج کے برعکس خود ہی محمدؐ کے لیے رشتہ بھیج دیا ہو۔ معجزات سے بھرپور واقعات کی روایات کے ساتھ یہی مسئلہ ہے۔ اگر آپ ان روایات کا باریک بینی سے جائزہ لیں تو معلوم ہو گا کہ ان کی بازگشت ہمیشہ باقی رہتی ہے۔ مثال کے طور پر میسرہ کی زبانی اس معجزاتی روداد میں

صاف ظاہر ہوتا ہے کہ شاید راہب کی پیشن گوئی اور فرشتوں کے بغیر، خدیجہ آپؐ کے ساتھ شادی کرنے کے بارے میں کبھی بھی نہ سوچتیں۔ حالانکہ خدیجہ کی رضا مندی کے لیے صرف اتنا کافی تھا کہ محمدؐ امانت دار اور بلند کردار کے مالک ہیں۔ یا پھر، یہ معاملہ اس سے بھی کہیں بڑا تھا۔ شاید، خدیجہ کے لیے محمدؐ اس سے بھی بڑھ کر تھے؟

محمدؐ نے ابو طالب کے ساتھ تجارتی قافلوں میں خدمات سرانجام دینے کے دوران اچھی خاصی نیک نامی کمالی تھی۔ آپؐ مول تول میں غیر ضروری پس و پیش اور قیمت میں بجائے یہ کہ خریدار سے زیادہ ہتھیانے کے چکر میں رہیں، شروع سے ہی مناسب رویہ اختیار کیا کرتے تھے۔ چونکہ آپ کاروباری معاملات میں خاصے طاق ہونے کے ساتھ دیانت دار بھی مشہور تھے۔ اس لیے تقریباً ہمیشہ ہی، لوگ آپؐ کے نام پر اعتبار کرتے ہوئے خود ہی اچھی قیمت ادا کر دیا کرتے تھے۔ آپؐ نے خالص منافع میں اپنے حصے کے سوا کبھی اضافی کٹوتی کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ اسی طرح آپؐ کے بنائے مال کے چٹھے، آمدن اور خرچ کے حساب میں کبھی کسی طرح کا جھول نہیں نکلا۔ حالانکہ، منجھے ہوئے تجار کے طریق کاروبار میں ایسی حرکات خود تجارت جتنی قدیم ہیں۔ ابو طالب کے یہاں رشتے سے انکار کے بعد محمدؐ خاصے مقبول آڑھتی بن چکے تھے اور اب خود مختار رہ کر مناسب معاوضے کے عوض تاجروں کو خدمات فراہم کیا کرتے تھے۔ آپؐ کی مثال، ایسے کاروباری ایجنٹ کی تھی جو ذاتی مفاد سے بالاتر ہو کر کار سرکار سرانجام دیا کرتا تھا۔ آپ کا یہ طریق مکہ میں رائج منافع خوری کے عام اصول کے برخلاف اور قدرے اچھوتا تھا۔ اسی لیے اس کی مانگ بھی بڑھ کر تھی۔

آپؐ خدمات کے عوض جو معاوضہ کماتے، اس میں سے اپنی ضرورت کے سوا باقی سب غریبوں میں بانٹ دیا کرتے تھے۔ دوسرے تاجر آپؐ کو، اس عادت کو سراسر بیوقوفی سے تعبیر کیا تھے۔ ان کے نزدیک، اس طرح کی طبیعت کے ساتھ آپؐ کا گھر گرہستی بنا تقریباً ناممکن تھا۔ لوگ گماں کیا کرتے کہ اس طرح تو محمدؐ کا گھر بسانا تو درکنار، شاید وہ شادی کا خرچ بھی نہیں اٹھا سکیں گے۔ آخر آپؐ اپنے کنبے کی کفالت کیسے کیا کریں گے؟ یا معاشرے میں، بالخصوص مکہ جیسے شہر میں دولت کے بغیر رتبہ کیونکر پا سکتے تھے؟ بعض اوقات، لوگ آپ کی اس روش کا ناجائز فائدہ اٹھالیا کرتے تھے۔ مگر محمدؐ جانتے بوجھتے ہوئے بھی بے نیاز رہا کرتے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آپؐ کی اقدار خاصی مختلف اور سوچ انتہائی بلند تھی۔ چونکہ آپؐ کے اس طریق اور اقدار کے باعث ہر شخص کو مالی اور ذاتی فائدہ رہا کرتا تھا، کسی نے اس بابت مزید جاننے کی کبھی ضرورت محسوس نہیں کی۔ آپؐ کی ہر شے بابت عدم دلچسپی نے آپؐ کو ایک امتیازی مقام عطا کر دیا تھا۔ محمدؐ مکہ کے معاشرے کا حصہ تو تھے مگر آپؐ قطعاً اس شہر کی رائج اقدار کے ترجمان نہیں تھے۔ محمدؐ کی یہ عادات زیادہ تر لوگوں کو عجیب معلوم ہوتی ہوں، خدیجہ انہی اقدار کے باعث محمدؐ کو پسند کرنے لگیں۔

خدیجہ بیوہ تھیں اور محمدؐ سے شادی سے قبل آپ کے یہاں اولاد بھی نہیں تھی۔ وہ بخوبی سمجھ سکتی تھیں کہ معاشرے میں حیثیت اور رتبے سے محروم ہونے سے دراصل کیا مراد ہے۔ پھر وہ آپؐ کے بارے میں ہر بات جانتی تھیں۔ ان کو معلوم تھا کہ محمدؐ نے کس طرح محنت اور مشقت کے بعد ہی اونٹوں کی رکھوالی کرنے والے معمولی لڑکے سے ایک کامیاب آڑھتی بننے تک کا سفر طے کیا تھا۔ وہ دیکھ سکتی تھیں کہ محمدؐ اس عمر میں بھی کئی ادھیڑ عمر مردوں سے کہیں زیادہ پختہ نظر، دانا اور معاملہ فہم ہیں۔ یوں، یہ سمجھنا مشکل نہیں ہے کہ یہ دو لوگ جن کی عمروں اور معاشرتی رتبے میں خاصا فرق تھا، آخر ایک دوسرے کے قریب کیسے آ گئے؟ یا خود خدیجہ نے محمدؐ سے شادی کا پیغام کیونکر بھجوایا؟ اور پھر بیاہ بھی کر لیا؟ یعنی، ہر لحاظ سے ایک غیر متعلق شخص کو متعلق بنا دیا۔

یہ خدیجہ تھیں جنہوں نے محمدؐ کے لیے رشتے کا پیغام بھجوایا۔ کیوں کہ، محمدؐ اپنے تئیں کبھی اس خواہش کا اظہار نہ کرتے۔ بالخصوص، ابو طالب کے یہاں سے انکار کے بعد تو آپؐ نفسیاتی طور پر شاید ایسا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ خدیجہ کا تعلق مکہ کے طاقتور قبیلے اسد سے تھا۔ خدیجہ کے لیے ایک بار پھر سے گھر بسانا کوئی مشکل نہیں تھا۔ مکہ کے کئی دولت مند شرفاء اور تجار خدیجہ کے ساتھ شادی کرنے کی خواہش رکھتے تھے۔ اپنی اس غرض کے لیے خدیجہ کے والد کے یہاں اکثر بیش قیمت

تحائف بھجواتے رہتے۔ مگر، خدیجہ نے ابو طالب کی بیٹی فاختہ کے برعکس اب اس طرح کی کسی بھی مفادات پر مبنی شادی کرنے سے انکار کر رکھا تھا۔ بلکہ، حقیقت تو یہ تھی کہ خدیجہ کو کسی بھی طرح کی روایتی شادی رچانے کی اب کوئی ضرورت نہیں تھی۔ چنانچہ، آپ نے روایت کو توڑتے ہوئے اس شخص سے شادی کرنے کا فیصلہ کیا، جس کو انہوں نے خود منتخب کیا تھا۔ ابن اسحاق نے، 'قصہ مختصر۔۔۔' کا لاحقہ استعمال کرتے ہوئے خدیجہ سے منسوب قدرے سیدھا اور کھرا پیغام یوں رقم کیا ہے کہ، 'محمدؐ، تم مجھے پسند ہو۔ ہمارے آپس میں تعلق اور دیانت داری و بلند کردار کی وجہ سے پسند ہو۔' اس طرح، خدیجہ نے محمدؐ سے شادی کرنے کی خواہش کا دو ٹوک اظہار کر دیا۔

اس روایت شکنی کے باوجود بھی، رسم و رواج نبھانا بہر حال لازم تھا۔ چونکہ ابو طالب نے محمدؐ کو اپنے یہاں رشتہ دینے سے انکار کر رکھا تھا۔ ان کے لیے محمدؐ کی طرف سے سربراہی کرنا خاصا مشکل تھا۔ اسی لیے عبد المطلب کے دوسرے بیٹوں میں سے ایک، آپؐ کے چچا حمزہ نے اس رشتے کو طے کرنے میں آپؐ کی نمائندگی کی۔ گو ایک روایت میں کہا جاتا ہے کہ خدیجہ کے والد نے اس رشتے کو بغیر کسی حیل و حجت، فوراً قبول کر لیا تھا مگر دوسری جانب، خدیجہ کی سماج میں ایک 'کم مرتبہ' شخص سے شادی بارے ان کے ذاتی خیالات قطعی دوسرا معاملہ ہیں۔ خدیجہ سے شادی کے خواہشمند دوسرے حضرات کے یہاں سے ملنے والے تحائف اور جہیز کی پیش کش کے سامنے، شاید خدیجہ کے والد اس رشتے سے خوش نہیں تھے۔ اسی لیے ہمیں تاریخ میں اس بابت ایک عجب روایت پڑھنے کو ملتی ہے۔ ابن اسحاق نے پوری ذمہ داری سے بیان کیا ہے کہ 'خدیجہ نے والد کو اپنے گھر بلایا اور خدمت میں شراب پیش کی۔ اس روز کثرت شراب کے باعث خدیجہ کے والد نشے میں چور ہو گئے۔ خدیجہ نے اسی حالت میں انہیں نئے کپڑے پہنا، عطر لگوائی اور ایک گائے کی قربانی کر دی گئی۔ پھر خدیجہ نے محمدؐ اور ان کے چچا حمزہ کو اپنے گھر دعوت پر بلایا اور خدیجہ نے نشے میں دھت اپنے والد کے ہاتھ سے، محمدؐ کے ساتھ بیاہ کر لیا۔ جب تک خدیجہ کے والد کو ہوش آتا، معاملہ طے پا چکا تھا۔'

غالباً اس طرح کی روایات سے اس شادی کی راہ میں حائل مشکلات اور رکاوٹوں کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔ مثلاً، اس زمانے میں لوگوں کے بیچ کھرا رومان، ہمدردی اور انسیت خاصی نایاب ہوا کرتی تھی۔ مگر پھر اس صورت تو، اس طرح کی روایات سے محمدؐ کی نیک نامی کو بھی ٹھیس پہنچتی ہے۔ یہی نہیں، بلکہ خدیجہ کی طبیعت کو دیکھتے ہوئے بھی کہا جا سکتا ہے کہ شاید وہ محمدؐ کو لے کر اس طرح کی حرکت کی قطعاً جرات نہ کرتیں۔ بلکہ، یہ روایت خدیجہ کے اخلاقی قد کاٹھ کی صریحاً توہین ہے۔ خدیجہ نے سماجی اور مالی رتبے میں کم شخص سے شادی ضرور کی تھی مگر ان کی محمدؐ سے نسبت کی جو وجہ تھی، وہ اس روایت میں بیان کردہ احوال سے بہر حال، کہیں بڑھ کر تھی۔

محمدؐ اور خدیجہ کے یہاں جلد ہی اولاد پیدا ہو گئی جو ان کے بیچ گہری محبت کی نشانی تھی۔ خدیجہ نے چار بیٹیوں اور ایک بیٹے قاسم کو جنم دیا۔ قاسم زیادہ دیر زندہ نہیں رہے اور دوسری سالگرہ سے پہلے ہی انتقال کر گئے۔ بعد ازاں ہم دیکھیں گے کہ قران میں بیٹیوں کی اہمیت اور قدر و منزلت پر زور دیا جائے گا۔ اسلامی تعلیمات میں، بیٹیوں سے منسوب معاشرے میں سماجی اور مالی رتبے ماپنے کے رواج کی بھی حوصلہ شکنی ہو گی۔ یہ قرانی احکامات، دراصل اس غم کی ترجمانی بھی ہیں جو محمدؐ نے قاسم کو کھو دینے کی صورت میں جھیل رکھا تھا اور اب اتنے عرصے بعد بھی، یہ دکھ جوں کا توں ہرا تھا۔ ان قرانی ابلاغیات کا ایک مطلب یہ بھی تھا کہ محمدؐ ہمیشہ ہی لاولد، جن کو عام طور پر ابتر کہہ کر سماج میں تضحیک کا نشانہ بنایا جاتا تھا، رہنے والے تھے۔ ابتر کے لغوی معنی کٹے ہوئے، منقطع یا جدا کیے ہوئے کے ہیں۔ اولاد نرینہ کے بغیر، محمدؐ کے لیے یہ معاملہ یوں ہی تھا۔

قاسم کی موت کا دکھ، گھر میں موجود ایک دوسرے لڑکے کی وجہ سے خاصہ کم ہو گیا۔ یہ لڑکا، جس کا نام زید تھا، خدیجہ نے شادی کی خوشی میں محمدؐ کو تحفے کے طور پر یہ غلام بخشا تھا۔ محمدؐ نے ہمیشہ ہی زید کے ساتھ بیٹوں جیسا سلوک کیا۔ آپؐ کا زید سے رویہ اس قدر شفقت سے پُر تھا کہ جب زید کے شمالی عرب سے تعلق رکھنے والے آبائی قبیلے نے آزادی کے عوض رقم جمع کر لی تو خود زید نے محمدؐ کے یہاں بسر رہنے پر اصرار کیا۔

محمدؐ نے نہ صرف قبیلے سے زید کے بدلے رقم لینے سے انکار کر دیا بلکہ زید کو غلامی سے بھی آزادی دے دی۔ صرف یہی نہیں، انہوں نے زید کو باقاعدہ لے پالک بیٹا بنالیا۔ اس طرح آپؐ نے باقی کے قریش کے لیے مستقبل میں غلاموں کی آزادی کی روایت بھی قائم کر دی۔

زید کے علاوہ ایک دوسرا لڑکا بھی تھا۔ یہ ابو طالب کے فرزند اور محمدؐ کے چچازاد بھائی علی تھے۔ چونکہ ابو طالب سے کاروبار میں علیحدگی کے بعد ان کا کاروبار خاصے مندی کا شکار ہو چکا تھا، آپؐ نے علی کو اپنے یہاں پالنے کی پیش کش کر دی۔ جس شخص کو کبھی چچا نے پال پوس کر بڑا کیا تھا، اب وہی شخص اسی چچا کے بیٹے کو پالنے والا تھا۔ اگرچہ، محمدؐ اور خدیجہ نے علی کو باقاعدہ لے پالک بیٹا نہیں بنایا مگر ان کی اپنے یہاں بھرپور بیٹوں کی ہی طرح کفالت کی۔ وہ علی کو اپنے خاندان کا لازمی حصہ سمجھتے تھے۔ اس قدر لازم کہ بالآخر محمدؐ اپنی سب سے چھوٹی بیٹی فاطمہ کی شادی علی سے طے کر لیں گے۔

تیس کے پیٹے میں، بالآخر محمدؐ ایک خوشحال آدمی تھے۔ آپؐ کی ہمراہی میں خدیجہ تھیں۔ مکہ بھر میں عزت اور تکریم حاصل تھی اور بسر کرنے کے لیے ایک پرسکون اور آرام دہ زندگی میسر تھی۔ بھلا ایک شخص، اس سے زیادہ کیا چاہے گا؟ تمام تر تفاوت کے برخلاف محمدؐ نے ترقی کر لی تھی۔ مگر اس کا قطعاً مطلب یہ نہیں ہے کہ انہوں نے کسر اور انتر کو بھلا دیا ہو۔ نوجوانی میں درپیش رہنے والی مشکلات اور بچپن کی محرومیوں کا اثر، اس کڑیل جوانی میں بھی بھلایا نہیں جا سکتا تھا۔ بلکہ، یہ کمی تو محمدؐ کی شخصیت کا حصہ تھی۔ آپؐ کی شخصیت کے اسی حصہ سے خدیجہ کو محبت تھی۔ خدیجہ آپؐ کی اقدار کو انتہائی قدر کی نگاہ سے دیکھتی تھیں اور جیسے محمدؐ ویسے خدیجہ کو بھی مکہ کے معاشرے میں اس تفریق کے باعث بے چینی رہا کرتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ آپؐ کے گھر میں اب طمطراق کی بجائے سادہ طرز زندگی اپنایا گیا تھا۔ آپ کے یہاں، امراء میں مقبول نمود و نمائش کے برعکس، چمچماتے ہوئے ریشم کی بجائے کھڈی پر بنے ہوئے عام کھدر کپڑا پہنا جاتا تھا۔ روزمرہ نئے کپڑوں کے جوڑے خریدنے کی بجائے پھٹے پرانے جوڑوں میں ہی پیوند لگا کر گزارہ رہتا اور تمام تر آمدن کا بڑا حصہ غریبوں اور مسکینوں میں بانٹ دیا جاتا۔ یہی نہیں، خدیجہ کے چچازاد 'ورقہ' کے ذریعے آپ کے خاندان کو ان اقدار کی پذیرائی کرنے والے مکہ کے چند آزاد خیال مفکرین کی ہمراہی بھی میسر آ گئی۔ مفکرین کے اس چھوٹے سے گروہ کو 'حنفا' کہا جاتا تھا۔

زبان دان مصر ہیں کہ لفظ 'حنیف' جس کی جمع 'حنفا' ہے، اس کی اصل نامعلوم ہے۔ گماں غالب ہے کہ اس لفظ کا ماخذ، 'خم ہونے' یا 'گھماؤ' کے مفہوم سے ہے۔ یعنی، اس سے مراد ایسے شخص یا گروہ کی ہے جو خمیدہ یا جھکنے والا، یا پھر گھوم کر بڑی طاقت بننے کا اہل ہو۔ ہم حنفا میں سے صرف چھ اشخاص کو ان کے نام سے جانتے ہیں۔ ورقہ ان چھ میں سے ایک تھے۔ ورقہ کے بارے میں مشہور تھا کہ انہیں انجیل کے عبرانی اور یونانی نسخوں پر عبور حاصل تھا۔ بعض روایات میں مشہور ہے کہ ورقہ عیسائی تھے۔ دوسری جگہوں میں آپ کو ربی گردانا گیا ہے۔ مگر، امکان یہ ہے کہ ورقہ ان میں سے ایک بھی نہیں تھے۔ اس طرح کی کوئی بھی نسبت دراصل انسانوں کے بیچ درجہ بندی کے لیے ضروری ہے اور اس گردان کی حیثیت اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ حنفا کی تحریک کا اصل مقصد انسانوں کے بیچ تفریق اور کسی بھی طرح کی درجہ بندی سے قطعی انحراف تھا۔ یہ گروہ وحدنیت کی ایسی شکل کی تلاش میں تھا کہ جس میں مشرق وسطی میں عام ہر طرح کی فرقہ وارانہ تفریق کی کوئی گنجائش نہ ہوتی۔ یہ لوگ عمداً کسی ایک مقدس طریق کے پیروکار نہیں تھے۔ بلکہ یہ آفاقی قوت، ایک برتر خدا کو مانتے تھے جس کو قدیم زبان میں ایلوہم، اللہ، یا زرتشی مذہب میں مشہور نیکی کی طاقت 'اہرمزد' یا 'ارمزد' یعنی، 'روشنی اور حکمت کا خدا' کے ناموں سے موسوم کیا جاتا تھا۔ حنفا کی اس سوچ کی جڑیں انجیل کے عبرانی نسخوں میں واضح مل جاتی تھیں۔ یہ سوچ، ابراہیم سے جا کر ملتی تھی۔ ابراہیم، ابو حرام سے نکلا ہے جس کا مطلب 'بہت زیادہ اولاد والا' یا 'گروہ کثیر کا باپ' ہے۔ مفہوم میں ابراہیم سے مراد، 'تمام ماننے والوں کے باپ' سے لی جاتی ہے۔ یہ مفہوم، سینٹ پال نے ابراہیم کے نام سے اخذ کیا ہے۔ ابراہیم، اپنے بیٹے اسماعیل کی اولاد، یعنی مکہ کی تمام نسل کے مورث اعلی، پرکھے یا جد امجد تھے۔

مانا جاتا تھا کہ حاجرہ، یعنی اسماعیل کی والدہ نے مکہ کا رخ کیا تھا۔ ابراہیم اور اسماعیل نے مل کر کعبہ کی بنیاد رکھی تھی۔ کعبہ، یعنی سکینہ یا شیخینہ کی آماجگاہ، یہاں سے مراد اللہ کی برتر ذات، مقدس روح کی موجودگی سے ہے۔ اس طرح حنفا کی صورت، آباء سے منسوب یہ روایت جو قریش کی جدید قبائلی روایت کے برعکس، نہ صرف خاصی بڑھ کر تھی بلکہ یہ قدیم اور معنی خیز بھی تھی، قائم ہو گئی۔

بعد ازاں، لفظ 'حنیف' قران میں ان لوگوں کی مدح سرائی میں استعمال ہوا جو ابراہیم سے لے کر آج تک ایک خدا کو ماننے والے سبھی انسانوں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اور اسی لفظ کی مدد سے ان کے علاوہ باقی تمام، نہ ماننے والوں کو رد کر دیا جائے گا۔ مگر قرانی دور سے پہلے، حنفا کو علم پر عبور کے سبب عزت و تکریم تو حاصل تھی مگر حقیقت میں مکہ کے باسی انہیں تسلیم کرنے کی بجائے، برداشت کیا کرتے تھے۔ تسلیم کرنے اور برداشت کرنے میں فرق ہے۔ اس دور کے مکہ اور آج جدید زمانے میں بھی کسی بھی شے کو برداشت کرنے سے مراد ایک سی لی جاتی ہے۔ یعنی، ہر وہ شے جو برداشت کی جاتی ہے بہر حال، ترش ہوتی ہے، طبیعت پر گراں گزرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ برداشت کی ہمیشہ ایک حد ہوتی ہے۔ جب محمدؐ عمر میں ایک لڑکے تھے، تب ایک حنیف، جس کا نام زید ابن امر تھا، اس کو خود اپنے سوتیلے بھائی نے مکہ سے نکال باہر کر دیا تھا۔ اس ملک بدری کی وجہ زید کی کعبہ میں نصب اوتاروں کی مخالفت تھی۔ بعد اس کے، زید راہب مشہور ہو گئے اور انہوں نے صرا کی پہاڑی پر ایک غار میں پناہ لے لی۔ کچھ عرصہ بعد یہ مستقل ایک درویش کی سی زندگی گزارنے لگے اور مشرق وسطی کے طول و عرض میں تقریباً تمام مشہور روحانی پیشواؤں کو تلاشنے کی غرض سے سفر کی حالت میں رہے۔ کئی سال بعد، جب محمدؐ نے نبوت کا اعلان کیا تو زید نے واپس مکہ کی راہ لی۔ وہ آپؐ کے ہاتھ پر بیعت کرنا چاہتے تھے مگر مکہ سے چند روز کی مسافت پر باغیوں کے ہاتھ قتل کر دیے گئے۔

کیا محمدؐ بھی ایک حنیف تھے؟ حنفا کی طرح وہ بھی مکہ کا حصہ تھے مگر بہر حال ان کی روش اس شہر سے یکسر مختلف تھی۔ وہ اس سماج کو صاف دیکھ سکتے تھے۔ اس معاشرے میں کئی طرح کے تضاد، منافقت اور تناقص کا دور دورہ تھا۔ آپؐ محسوس کر سکتے تھے کہ لوگوں کے قول و فعل میں یہ تضاد ہر گزرتے دن کے ساتھ بڑھتا جا رہا تھا۔ یوں، خود اپنے قبیلے قریش کی جدید روایت کے برعکس جو قطعی طور پر نظریاتی لحاظ سے آویزش کا شکار تھی، محمدؐ کا جھکاؤ یقینی طور پر اس سے کہیں برتر اور قدیم آبائی سلسلے کی طرف بڑھ گیا۔ اس قدیم روایت میں ایک لڑکے کا قصہ تھا جو اپنے باپ کے ہاتھوں قریباً قربان ہو چلا تھا۔ یہ بالکل محمدؐ کے والد کے معاملے جیسا تھا۔ دونوں ہی صورتوں میں یہ قربانی، قادر المطلق خدا کے حضور پیش کی جانے والی تھی۔ گرچہ محمدؐ نے کبھی اپنے آپ کو حنیف نہیں کہلوایا مگر پھر بھی وہ خود کو ان چند برگزیدہ افراد میں سے ایک شمار کر سکتے تھے جنہوں نے باجماعت، رائج العام رواج سے خود کو لاتعلق کر رکھا تھا۔ اس طرح، ان کی نسبت اس خیال سے جڑی ہوئی تھی جس میں صرف ایک خدا کا تصور تھا۔ ایسا خدا جو ہر طرح کی جنس سے برتر، پاک تھا۔ اس کی نمائندگی کسی بھی مادی شے کی شکل میں ممکن نہیں تھی اور اس خدا کا تصور واحد، ناقابل بیان، تعریف سے پرے اور تقدیس کی بے انتہا حد پر منتج ہوتا تھا۔

حنفا کے یہاں ایک عبادت مشہور تھی۔ یہ عبادت در اصل گوشہ نشینی میں کیا جانے والا مراقبہ کا عمل تھا جس کو 'تحنث' کہا جاتا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ محمدؐ اسی غرض سے مکہ شہر سے باہر پہاڑیوں کا رخ کیا کرتے تھے۔ اس عبادت کی روایت خاصی قدیم تھی۔ مراقبے کی کئی اشکال، عبرانی اور یونانی انجیل کے نسخوں کے علاوہ ہندوستانیوں اور چینیوں کی مذہبی تعلیمات میں بھی مل جاتی تھیں۔ پیغمبر، راہب، مبلغین اور گرو، الغرض ہر طرح کے لوگ مراقبے کے ذریعے روزمرہ انسانی معمولات سے کہیں بڑی حقیقت کی تلاش میں سرگرداں رہا کرتے تھے۔ ایسی حقیقت جو بہر حال ایک پتھر اور آگ کے شعلے سے کہیں برتر، پراچین اور قابل اعتبار تھی۔ پھر، اس حقیقت کی تلاش کے لیے حجاز کی پہاڑیوں سے بہتر جگہ کون سی ہو سکتی تھی جہاں انسانوں کے علاوہ چرند پرند، حتیٰ کہ درختوں اور جھاڑیوں کا بھی کال تھا۔

حجاز کی پہاڑیاں سرخ بھربھرے پتھر سے بنی ہیں۔ اس سلسلے کی چٹانیں زین بدھ مذہب میں مشہور گول مٹول، چکنے یا دریائی پتھروں کی طرح ہموار نہیں ہیں۔ بلکہ، یہ دنتیلی چٹانیں ہیں۔ اس قدر نوکیلی کہ اگر ان پر منہ کے بل گریں تو ہاتھ خونوں خون ہو جائیں۔ باوجود اس کے، ان چٹانوں کی سختی میں ایک خوب صورتی تھی۔ گھسے ہوئے کپڑوں کے جوڑے میں لپٹے، محمدؐ جب شام کی بڑھتی ہوئی خنکی میں پہاڑوں پر کھڑے گھاٹی کی جانب دیکھتے ہوں گے تو اس وقت سورج دن بھر روشن رہنے کے بعد اب کے غروب ہونے کی منزل کے قریب ہوا کرتا ہو گا۔ سورج کی تیز چمکتی ہوئی دھوپ اب ٹھنڈی ہو کر پیلی پڑتی ہو گی۔ اس پیلی دھوپ میں حجاز کی بھربھری پہاڑیاں، اب سنہری رنگ اختیار کر لیتی ہوں گی۔ دیکھتے ہی دیکھتے جب آنکھوں کے سامنے سورج پہاڑیوں کی اوٹ میں یکدم ڈوبتا ہو گا تو اس سہانے منظر کو دیکھ کر یقیناً محمدؐ کے دل میں ایک تھرتھری سی مچ جاتی ہو گی۔ سورج کے ڈوبنے سے اب پہاڑیوں کے اوپر مغربی افق پر سرخی پھیل جاتی ہو گی اور پھر آہستہ آہستہ تاریکی اس سرخی میں گھل کر یوں پھیل رہتی ہو گی کہ جیسے کوئی بہت دور آسمان پر سیاہ پردہ گرا رہا ہو۔ ابھی کچھ ہی دیر میں، جب تاریکی چار سو پھیل جائے گی تو ہر طرف چاندنی کا راج ہو گا۔ دن میں سرخ، شام سنہری اور رات میں اب یہ منظر چاندی کے رنگ میں نہا جائے گا۔ اگر یہ چاند کی پہلی تاریخیں ہوتیں تو پھر تک سیاہ آسمان میں تارے جگمگاتے ہوں گے اور ایسے میں ہر طرف تاروں کی ٹھنڈی مگر آکاسی روشنی پھیل رہتی ہو گی۔ ہر دو صورت، رات میں وقت کی ہیئت بدل جاتی ہو گی۔ اس طرح کہ وقت ٹھہرا ہوا محسوس ہوتا ہو گا اور لگتا ہو کہ شاید یہ منظر، سہانا سماں اپنے اندر ہمیشگی لیے ہوئے ہے۔ یہ ٹھہراؤ کئی پہر تک جاری رہنے کے بعد، جب آسمان میں شمال کی جانب روشنی کی ایک مہین سی کرن پھوٹتی ہوئی محسوس ہوتی ہو گی اور اس کے ساتھ ہی بادِ صبا چلنے پر ہی معلوم ہوتا ہو گا کہ وقت، اب لوٹ آیا ہے۔ ٹھہرا ہوا وقت پھر سے رواں ہے۔ یہ رات بھر کی عبادت کے خاتمے کا وقت ہے۔

کیا محمدؐ رات بھر، ٹھہرے ہوئے وقت کے گماں میں، اس عبادت کے دوران سانس کی مشق کیا کرتے تھے؟ سانس کی مشقیں جو ابھی حال ہی میں مغرب میں محققین نے دوبارہ سے دریافت کی ہیں۔ اس طرح کی مشق تاریخ میں تقریباً سبھی خطوں میں روحانیت پسندوں کا خاصہ رہی ہے۔ اگر عبادت مراقبے کی حالت میں سانس کی مشق نہیں تو پھر، اور کیا ہے؟ ایک طویل، مسجع ورد، بے خودی یا نوم کی حالت میں، حلق اور سینے کے بیچ کلام کی مسلسل تسبیح یا ایک رد ھم میں عمل تنفس پر غور۔۔۔ اس طرح کی یہ مشق جس کے دوران، روح سے آشنائی حاصل ہوتی ہے۔ 'روح' عربی کا لفظ ہے۔ اس کے مطلب ہوا کے ہیں۔ روح کے دوسرے مطالب میں سانس، تنفس اور دم وغیرہ شامل ہیں۔ روح سے مراد یہ ہے کہ دم کا بسیرا دراصل ہوا کے دوش پر ہے، یعنی سانس یا جاری عمل تنفس میں ہے۔ کیا محمدؐ رات کے پہروں میں، اس مشق کے دوران نائرین کا مشہور ذکر دہرایا کرتے تھے، یعنی، 'میں حاضر ہوں۔ اے خدا، میں حاضر ہوں' یا انہوں نے تب ہی ایک نیا کلمہ ایجاد کر لیا تھا، یعنی، 'لا الہ الا اللہ۔۔۔' یعنی، 'کوئی خدا نہیں مگر اللہ۔۔۔'؟ آپؐ جو بھی ورد کرتے ہوں، اس کی گردان سے کیا ان کے جسم میں سرسراہٹ نہیں پھیل جاتی ہو گی؟ سانس مدھم ہوتے ہوئے گہرے سے گہرا تر ہوتا جاتا ہو گا۔ رات بھر زبان پر جاری چپکا اور ملائم ورد محمدؐ کے سینے کے اندر، نہاں خانوں سے بر آمد ہو کر رات کی گہری خالی خولی تاریکی میں گھلتا رہتا ہو گا۔ پہاڑی پر تن تنہا، دنیا و مافیہا سے دور جب وہ یہاں عبادت کیا کرتے ہوں گے، کیا انہیں جس حقیقت کی تلاش تھی، وہ جو صراحت چاہتے تھے، کیا وہ انہیں ملی؟ اور کچھ نہیں تو یقیناً، اس عمل سے انہیں سماج سے لاتعلق ہونے کی کڑوی حقیقت کو تسلیم کرنے میں مدد تو ضرور ہی مل جاتی ہو گی یا شاید ایک طرح کا بے نام سکون میسر آ رہتا ہو گا؟

ہم جانتے ہیں کہ محمدؐ گوشہ نشینی میں، اس طرح کی عبادت، مراقبے کی غرض سے کئی راتیں حرا کی پہاڑی پر بسر کیا کرتے تھے۔ اس دوران انہیں کھانے اور پینے کی تنگی رہا کرتی تھی اور جب وہ پہاڑ سے واپس ہوتے تو سب سے پہلا کام، کعبہ کے گرد طواف کیا کرتے تھے۔ باہنے بازو سے اندر کی طرف، سات چکر جو مکہ میں داخل ہونے والے ہر شخص کے لیے لازم تھی۔ محمدؐ کے لیے یہ ایک لحاظ سے واپسی کی ریت تھی۔ یعنی، مڑ کر زمینی حقائق سے بھرپور انسانی دنیا میں ایک بار پھر شمولیت کا اظہار تھا۔ یہ طواف، مثال پہاڑی پر حاصل ہو رہے روحانی تجربے سے خود کو جدا کر کے، اپنے آپ کو ہانک کر روزمرہ زندگی کی تہہ میں بٹھانے کی

کوشش ہوا کرتی تھی۔ اپنے گھر واپس پہنچنے سے قبل، دوڑتی ہوئی اس تلخ دنیا کے بیچ آپؐ کے لیے واحد پناہ گاہ، یعنی خدیجہ کے پاس جانے سے پہلے خود کو سنبھالنے کی سعی ہوا کرتی تھی۔ مگر، پہاڑی سے واپسی کا یہ سفر ہمیشہ آسان نہیں تھا۔

حجاز کی پتھریلی اور دھول سے اٹی پہاڑیوں پر شاذ و نادر ہی بارش برستی تھی۔ مگر جب برسے تو پھر یہ ہلکی نم یا بوندا باندی نہیں بلکہ جکڑ کی صورت، شدید اور تند و تیز طوفان باد و باراں ہوا کرتا تھا۔ طوفان کے نتیجے میں سیلابی پانی، بپھرے ہوئے ریلے کی صورت پہاڑیوں کے بیچ تیزی سے بہتا ہوا گھاٹیوں میں اتر جاتا۔ گھاٹی میں اس ریلے کے شور پر کسی دیو کی آمد یا جن کی ایر کھا کا گماں ہوتا۔ دیکھتے ہی دیکھتے بارش رحمت سے زحمت بن جاتی اور حجاز کی پہاڑیوں سے بہہ کر آنے والا یہ سیلابی پانی، نشیبی علاقوں میں موت کی طرح پھیل جاتا اور ہر طرف تباہی مچاتا۔ تب، جب کہ موسم کی پیش گوئی کی کوئی صورت نہیں تھی، یہ نہایت عجیب معاملہ ہوا کرتا تھا۔ دیکھنے میں آسمان نیلا اور بالکل صاف ہوتا اور اس میں دور دور تک بادلوں کا شائبہ تک نہ ملتا۔ مگر، وہیں آنکھوں سے اوجھل، پہاڑی سلسلے کے دوسری طرف ایک موسمی تغیر شکل اختیار کر رہا ہوتا۔ مکہ جیسے شہر، جو گھاٹی میں واقع تھا، یہاں پہاڑیوں میں برس رہی اس طوفانی بارش کا بالکل پتہ نہ چلتا۔ شہر میں اس طوفان کی واحد نشانی پہاڑیوں سے چلنے والی ہواؤں میں بھیگی ہوئی مٹی کی سوندھ ہوا کرتی تھی۔ سوائے اس کے، انسانوں کے لیے اس کا پتہ چلانا تقریباً ناممکن تھا۔ انسانوں کے برعکس جانور اس خطرے کو بہر حال بھانپ لیا کرتے تھے۔ جانور چلتے ہوئے اچانک ہی رک کر کھڑے ہو جاتے اور کان کھڑے لیتے۔ غیر محسوس انداز میں قریب آ رہے خطرے کو بھانپ کر بعض اوقات یہ جانور بگڑ جاتے اور رسے تڑوانے کی کوشش کرتے۔ پھر، چند ہی منٹوں اور بعض اوقات گھنٹے بھر کے اندر، پاؤں تلے ریت نرم اور نم ہوتی ہوئی محسوس ہوتی۔ اول تو اس پر بس مہین سی سارنی کا گماں ہوتا مگر پھر جیسے یک دم کسی نے زمین پر پانی انڈیل دیا ہو۔ پانی ٹخنوں تک بڑھ جاتا اور تبھی، دور پہاڑیوں میں بپھرے ہوئے سیلابی پانی کا شور سنائی دینے لگتا۔ اس سے پہلے کہ لوگ اس افتاد کو سمجھ پائیں، پانی کا ریلا سر پر آن پہنچتا۔ بڑھتی ہوئی گڑگڑاہٹ اور تھرتھراتی ہوئی زمین کے اوپر، توازن برقرار رکھنا مشکل ہو جاتا۔ راہ میں موجود ہر شے، انسان اور جانور گرتے پڑتے خود کو سنبھالتے اور پھر گر پڑتے۔ وادیوں کی ڈھلانوں میں بہتا ہوا ریتلا پانی اس قدر زور آور ہوتا کہ اس کے سامنے جم کر کھڑا ہونا تو در کنار، ٹھہرنا بھی مشکل ہو جاتا۔ چنگھاڑتا ہوا ریلا اب بالکل سر پر آن پہنچتا اور گھاٹی میں بھاری پتھر چٹانوں سے ٹکراتے، ایک دوسرے کو اوپر تلے کچل کر بھیانک شور پیدا کرتے ہوئے صاف سنائی دیتے۔ جھاؤ، ببول، رغل کی جھاڑیاں اور کیکر کی شاخیں ٹوٹ کر بہتے ہوئے ملبے کا حصہ بن جاتیں۔ اس ریلے میں کئی جانور بھی بہہ جاتے جو ہاتھ پیر مارتے اس کشمکش میں جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے تھے۔ اس دوران، اگر کوئی شخص اس ریلے کی راہ میں ہے یا نشیب میں موجود ہو تو اسے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی اور گرتے پڑتے، پانی اور ملبے کے بیچ بے بسی سے ہاتھ پیر مارتے ہوئے بچ بچاؤ کی تگ و دو میں بندہ رہے گا۔ ذرا سی کوتاہی سے اگر سر پتھر سے ٹکرا جاتا اور بے ہوش ہو گئے تو یقینی ہوتا کہ چند انچ پانی میں بھی ڈوب کر موت واقع ہو سکتی تھی۔

ایسے کوندتے ہوئے سیلاب کے نتیجے میں سب سے بدتر حال مکہ کی وادی میں نشیبی علاقے کا ہوا کرتا تھا۔ اس نشیبی علاقے میں ساری وادیوں کی گھاٹیاں آن کر مل جاتی تھیں اور یہیں، کعبہ واقع تھا۔ بارشی سیلاب گو اکثر سطحی اور اتھلا ہوا کرتا تھا۔ مگر، سن 605ء میں، جب محمدؐ نے ابھی حال ہی میں حرا کی پہاڑی پر عبادت کی ریت شروع کی تھی، حجاز کی پہاڑیوں پر جنوب کی جانب سے ایک شدید طوفان کے سبب سیلابی پانی نے حرم کا رخ کیا۔ اس سے پہلے مکہ شہر کی یادداشت میں اس قدر بدترین سیلاب نہیں دیکھا گیا تھا۔ گو، حفاظتی اقدامات موجود تھے، جیسے حرم میں کعبہ کے احاطے کے گرد نیم چکری دیوار کھڑی کر رکھی تھی مگر اب کی بار ملبے اور سیلابی ریلے کے سامنے یہ ٹھہر نہیں پائی۔ پانی حرم میں گھس گیا اور کعبہ کے احاطے میں ہر چیز کو تہ و بالا کر کے رکھ دیا۔ خدائی اوتار، پتھر اور تمام نشانیاں پانی میں بہہ گئیں اور خود کعبہ کی مٹی اور پتھر کی کچی دیواریں اس زور آور پانی کے سامنے ڈھیلے پڑتی گئیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے کعبہ منہدم ہو گیا، جب تک پانی کا زور و شور ختم ہوتا، پورا احاطہ ملبے کا ڈھیر بن چکا تھا۔

اس بابت کوئی دو رائے نہیں تھی کہ بالآخر کعبہ کی دوبارہ تعمیر بالضرور کی جائے گی۔ اصل مسئلہ یہ تھا کہ یہ تعمیر جلد از جلد کیونکر ممکن بنائی جائے؟ وجہ یہ تھی کہ قریش کو خدشہ لاحق تھا کہ کعبہ کے انہدام کی خبر عرب کے طول و عرض میں پھیل رہنے سے لوگ اس معاملے کو بد شگون جانیں گے اور مکہ کی حرمت پر سوال اٹھنا شروع ہو جائیں گے۔ چنانچہ، قریش نے متفقہ فیصلہ کیا کہ نہ صرف یہ تعمیر نو جلد از جلد مکمل کی جائے بلکہ کعبہ کی بنیادیں اس قدر بلند کر دی جائیں کہ اس کا دروازہ شدید ترین سیلاب میں بھی پانی کی سطح سے خاصا اوپر واقع ہو۔ یہاں، قریش نے اس موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کعبہ کی باقاعدہ شکل بھی طے کر لی۔ یہ ایک بلند عمارت اور قریباً مکعب کی شکل کا ڈیزائن تھا۔ اس مقصد کے لیے جلد از جلد بازیافت کے طور پر بحیرہ احمر سے ایک بحری جہاز کی بھاری بھر کم لکڑی کے برگ منگوا لیے گئے۔ یہ جہاز، حالیہ موسمی تغیر اور وسیع طوفان میں ہی تباہ ہوا تھا۔ مکہ تک اس کی ترسیل نہایت سرعت سے کرا لی گئی اور بھاری عمارتی لکڑی کے یہی برگ کعبہ کی مضبوط دیواروں اور چھت کی تعمیر میں استعمال کیے گئے۔ تعمیر نو کے عمل میں مکہ کے ہر شخص نے بھرپور حصہ ڈالا۔ چونکہ کعبہ کی تعمیر نو میں شمولیت اور بیگار واضح طور پر ایک اعزاز کی بات تھی، اسی لیے یہ کام احتیاط سے تمام قریش کے تمام کنبوں میں برابر تقسیم کیا گیا۔ اس بات کا خصوصی خیال رکھا گیا کہ کسی کنبے کو اس بابت کسی بھی طرح کا گلہ نہ ہونے پائے۔ بہترین انتظام کے سبب، یہ کام نہایت خوش اسلوبی سے طے پاتا گیا تا آنکہ نو تعمیر شدہ کعبہ کے شمال مشرقی حصے میں سیاہ پتھر کی تنصیب کا معاملہ آن پڑا۔

دور سے دیکھنے پر اس سیاہ پتھر (یہ پتھر آج بھی کعبہ کے ایک کونے میں نصب ہے اور اس کے اوپر چاندی کا ایک بڑا خول چڑھا رکھا ہے، اسے حجر اسود کہتے ہیں) پر سنگ سلیمانی کا گماں ہوتا ہے مگر قریب سے تفصیلی جائزہ لیں تو اس میں سرخ، بھوری اور گہری سبز دھاریاں صاف نظر آتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ پتھر کبھی شہابیہ رہا ہو گا۔ اسلامی روایت کے مطابق حرم کی دیواروں میں یہ پتھر پہلی بار خود ابراہیم اور اسماعیل نے اپنے ہاتھوں سے نصب کیا تھا اور بعد اس کے، پے در پے سیلابوں اور زمانے کی ریت میں یہ حرم کی درگاہ کے ساتھ مکہ کی گھاٹی میں کہیں دب گیا تھا۔ بعد ازاں، محمدؐ کے آباء قصی نے اسے دوبارہ دریافت کیا تھا۔ قصیٰ قبیلہ قریش کے جد امجد تھے۔ جس قدر اس پتھر کی دھوم ہے، اس لحاظ سے یہ حجم میں خاصا چھوٹا ہے۔ یہ بمشکل ایک فٹ بال جتنا ہو گا یا اس سے قدرے بڑا ہو گا اور 605ء میں اسے اٹھا کر کعبہ کی دیوار میں نصب کرنا کچھ اتنا مشکل کام نہیں رہا ہو گا۔ کوئی بھی جوان مرد اس کو آسانی سے اٹھا کر نصب کر سکتا تھا مگر یہاں مسئلہ یہ درپیش تھا کہ آخر وہ خوش نصیب شخص کون ہو گا؟

مکہ کا ہر شخص اس پتھر کی دوبارہ تنصیب کا نہ صرف خواہاں تھا بلکہ اس تقاضے سے پیچھو ٹنے پر قطعاً تیار نہیں تھا۔ یوں، یہ معاملہ پیش آنے کے چند ہی منٹوں کے اندر اتفاق اور انتظام کا بہترین نمونہ، یعنی قریش کے کئی کنبوں کی شمولیت سے کعبہ کی سریع تعمیر نو کا عمل ایک دم پر تشدد نہج پر پہنچ گیا۔ خدشہ تھا کہ یہ کشمکش کچھ دیر اور جاری رہی تو مار کٹائی شروع ہو جائے گی۔ ایک کنبے نے تو حد کر دی۔ وہ ایک جانور کے خون سے بھرا پیالہ بھر کر لائے اور کنبے کے تمام افراد نے اپنے ہاتھ اس میں ڈبو کر خون سے رنگ دیے۔ سرخ خون سے لتھڑی ہتھیلیوں کو اپنے سروں سے اوپر بلند کر لیا تا کہ ہر شخص انہیں دیکھ لے۔ پھر قسم اٹھا کر اعلان کیا کہ وہ اس سیاہ پتھر کو کعبہ کی دیوار میں تنصیب کا حق پانے کے لیے کسی بھی حد تک جا سکتے ہیں۔ حتیٰ کہ اس کے لیے اپنے کنبے کے افراد کی قربانی سے بھی گریز نہیں کریں گے۔

اسی دوران، جب ہر شخص غصے میں مکے لہرا رہا تھا اور نتھنے پھول رہے تھے۔ کئی لوگ تلواریں سونت کر اور چند دوسرے خنجر سنبھالنے میں اوتاولا ہو رہے تھے۔ خونریزی کا خدشہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ قتل و غارت کے خطرے کو بھانپ کر قریش میں سے ہی، ایک پختہ عمر کے شخص نے سب کے لیے قابل قبول تجویز پیش کی۔ اس نے کہا، 'چونکہ سبھی لوگ شدید مشقت کے باعث تھکاوٹ کا شکار ہیں اور وہ اس بھاری بھر کم فیصلے کو طے کرنے کی سکت نہیں رکھتے، تو کیوں نہ یہ فیصلہ خدا پر چھوڑ دیا جائے؟' چنانچہ، طے یہ پایا کہ بعد اس لمحے کے، جو پہلا شخص، چاہے کسی بھی کنبے سے تعلق رکھتا ہو، کعبہ کے احاطے میں داخل ہو گا، وہی اس بابت فیصلہ

کرنے کا مجاز ہو گا۔ پھر یوں ہوا، یا آپ اپنی سہولت کے مطابق کہہ سکتے ہیں کہ قدرت کے فیصلے کے مطابق، کعبہ کے احاطے میں داخل ہونے والا پہلا شخص کوئی اور نہیں بلکہ محمدؐ تھے۔

حرا کی پہاڑی پر کئی روز کی گوشہ نشینی کے بعد واپس آرہے محمدؐ، جو کعبہ میں طواف کی غرض سے داخل ہوئے تھے۔ بجائے یہ کہ وہ تسلی سے طواف کی ریت نبھاتے، سیدھا ایک جھگڑے کے مرکز میں چلے آئے۔ آپؐ کو اس سیلمانی روپ میں دیکھ کر تقریباً ہر شخص چلا اٹھا کہ، 'محمدؐ امین ہے۔ یہ دیانت دار ہے۔' اور سب ہی لوگ متفق ہوئے کہ، 'ہمیں آپؐ کے فیصلے پر کوئی اعتراض نہیں ہو گا'۔

یوں، محمدؐ اس انتہائی اہم مسئلے کے بیچ ثالث، پنچ بن گئے۔ ایسا ثالث جو اندر کا آدمی تھا اور سمجھ بوجھ رکھتے تھے کہ یہ معاملہ کیسے طے پاسکتا ہے۔ وہیں آپؐ کی مثال ایک ایسے ثالث کی بھی تھی جو اس سب سے اس قدر لاتعلق ہے کہ کھلے دل و دماغ کے ساتھ معروضی انداز میں سوچنے کی سکت رکھتا ہے۔ ایک لحاظ سے محمدؐ اس کردار کے لیے موزوں ترین شخص تھے۔ وہ اس شہر کے کرتا دھرتاؤں میں سے ایک نہیں تھے اور یہی بات ان کو اس مخصوص وقت اور درپیش معاملے کے حساب سے مناسب ترین شخص بنا رہی تھی۔ معاملے کی سنگینی کے باعث، یہ بات بھی خاصی دلچسپ معلوم ہوتی ہے کہ اگر خدا نخواستہ اس وقت کعبہ کے احاطے میں محمدؐ کے سوا کوئی دوسرا شخص داخل ہوتا تو کیا ہوتا؟ اسی سوال اور متوقع جوابات کے بل بوتے پر اوائل اسلام کے تاریخ دان بادِ بادہ، حجت کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کے نزدیک، یہ قدرت کا فیصلہ تھا اور خدا کی مرضی یہ تھی کہ کعبہ کے احاطے میں داخل ہونے والا پہلا شخص، محمدؐ ہی ہوں۔

'ایک چادر لے آؤ' محمدؐ نے کہا۔ جب چادر لے آئے تو آپؐ نے اسے کعبہ کے پہلو میں زمین پر بچھا دیا۔ پھر سیاہ پتھر کو اٹھا کر چادر کے اوپر رکھ دیا۔ پھر حکم دیا، 'ہر کنبے کا سربراہ آگے بڑھے اور اس چادر کو کونے سے پکڑ کر اوپر اٹھائے۔' سربراہان نے ایسا ہی کیا اور جب پتھر ایک معقول بلندی پر اٹھالیا گیا تو خود محمدؐ نے اپنے ہاتھوں سے اسے اٹھا کر کعبہ کی دیوار میں نصب کر دیا۔

محمدؐ کے فیصلے کی خاصی پذیرائی ہوئی۔ اس فیصلے کے تحت ہر کنبے کو برابر نمائندگی مل گئی تھی اور یوں مکہ کے ہر شخص کو عزت بخشی گئی تھی۔ محمدؐ کے نزدیک اگرچہ یہ معمولی مگر اتحاد و یگانگت کا دلچسپ اظہار تو تھا مگر وہیں دوسری طرف اس معاملے کی نزاکت کو بغور دیکھیں تو ایک ذرا سی بھول چوک کے نتیجے میں یہ تقسیم اور نفاق کی گہری مثال بن سکتا تھا۔ اس واقعے کے بعد، جہاں سیاہ پتھر کو اپنے ہاتھوں سے تنصیب کے اعزاز کے باعث محمدؐ کی عزت بڑھ رہی، وہیں ہر طرف آپؐ کی حکمت کا بھی چرچا ہونے لگا۔ ایک شخص کی کمال سمجھ اور معاملہ فہمی کے باعث قریش، کعبہ کے احاطے میں، جہاں خون خرابہ ممنوع تھا، ایک بڑے فساد سے بال بال بچ گئے۔ اس روز، جب محمدؐ یہ گھمبیر معاملہ طے کروا، کعبہ کے احاطے سے رخصت ہوئے تو ان کے دل و دماغ میں یہ خیال ہمیشہ سے زیادہ بڑھ کر کچوکے لگا رہا تھا کہ قریش کے بیچ ان کا مقام بھی عجب تماشہ ہے۔ آپؐ پر صرف اس لیے اعتبار کیا جاتا تھا کہ وہ قریش کا حصہ ہوتے ہوئے بھی بیگانے تھے۔ ان کے خیال میں، اول، ذاتی مفادات نہیں تھے اور دوم وہ مکہ کے قیادتی کردار میں نہیں تھے۔ قیادتی کردار سے متعلق شاید یہ صرف محمدؐ کا ذاتی خیال تھا۔ آنے والا وقت، آپؐ کے لیے کچھ اور ہی کہانی بُن رہا تھا۔

باب:7

شاید، محمدؐ کے ساتھ یہ ماجرا چالیس سال کی عمر میں ہی پیش آنا طے تھا۔ مشرق وسطی میں چالیس کے عدد کو باعث برکت اور نیک شگون سمجھا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر بدوؤں کے یہاں یہ عدد سوفتہ، یعنی بیماری کی حالت میں شفائے کلی کی کنجی سمجھی جاتی تھی۔ بدو چالیس جڑی بوٹیوں کو اچھی طرح پیس کر، پھر خالص مکھن اور زیتون کے تیل میں گھول کر ایک ملغوبہ تیار کر لیا کرتے تھے۔ اس ملغوبہ کو 'ال اربعین' کہا جاتا ہے۔ ال اربعین کی بابت مشہور تھا کہ یہ نسخہ ہر مرض کی دوا ہے۔ اسی

طرح، حکماء کہا کرتے کہ ٹوٹی ہڈیوں کو واپس جڑنے کے لیے چالیس دن درکار ہوتے ہیں (جیسے جدید طب میں بھی فریکچر جڑنے کے لیے چھ ہفتوں کا کلیہ استعمال ہوتا ہے)۔ یا پھر، کسی شخص پر اس کے گھر یا خیمے سے چالیس قدموں کے گھیرے کے اندر حملہ کرنے کی ممانعت ہوا کرتی تھی۔ بعینہٖ، اگر ایک شخص نے دوسرے کے دشمن کو پناہ دے رکھی ہو تو ان دونوں کو ہی گھر یا خیمے کے اندر چالیس قدموں کے فاصلے تک امان حاصل ہوتی تھی۔ ایک اور مثال، عربوں میں ہمسائیگی کے حقوق کا تصور آج بھی چالیس گھروں تک کے لیے مشہور ہے۔

یہی نہیں، عرب معاشرے میں چالیس کا عدد زندگی میں نئی شروعات، ایک نئی ابتداء کی علامت بھی سمجھا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مشرقِ وسطیٰ کے خطے کی تقریباً تمام ہی مقدس کتابوں میں اس عدد کا تذکرہ بارہا ملتا ہے۔ مثال کے طور پر نوح کی کشتی چالیس روز تک سیلاب میں تیرتی رہی۔ بنی اسرائیل مصر سے خروج کے بعد چالیس برس تک صحراؤں میں بھٹکتے رہے۔ موسیٰ نے کوہِ سینا پر چالیس راتیں بیتائی تھیں۔ یونس، چالیس دن تک مچھلی کے پیٹ میں رہے اور عیسیٰ نے بھی چالیس دن اور رات تک جنگل بیابان میں بسر کیے رکھا۔ الغرض، ہر لحاظ سے چالیس کا عدد ایک نشان کے طور پر واضح ہو جاتا ہے۔ ایسا نشان جو مسلسل جدوجہد اور بھرپور سرکاؤ کے بعد نئے آغاز کی علامت شمار کی جا سکتی ہے۔ پھر، اس قدیم دور میں، اگر کوئی شخص خوش قسمتی سے چالیس سال کی لمبی زندگی جی لیتا تو یہ عرصہ زندگی سے بھرپور، وقت اور تجربے سے لبریز ہونے کی نشانی سمجھا جاتا تھا۔ یعنی، بعد اس کے ادھیڑ عمری آرہتی اور منزل قریب سمجھی جاتی۔

یہ سن 610ء میں، ماہِ رمضان کا واقعہ ہے۔ محمدؐ نے گوشہ نشینی میں عبادت اور مراقبے کی غرض سے حرا کی پہاڑی کا رخ کیا۔ شہر کی گہماگہمی سے باہر چونکہ یہاں ہر طرح کے انسانی معمولات سے دوری اور فراغت میسر آجاتی تھی، چہار سو پھیلی ہوئی خامشی میں، آپؐ تسلی سے گہرے سکوت میں غور و فکر کر سکتے تھے۔ چنانچہ، سالہا سال سے آپؐ کے روزمرہ معاملات میں ایک یہ بھی کہ حرا کی پہاڑی پر اس غرض سے باقاعدہ آمد معمول بن چکی تھی۔ آپؐ اس پہاڑی کے تقریباً راستوں اور پگڈنڈیوں سے واقف تھے اور ضروری تفصیلات زبانی ازبر تھیں۔ آپؐ چٹانوں پر اکڑوں چڑھتے، نکیلے پتھروں کو پھلانگ کر، دشوار گزار پگڈنڈیوں پر چلتے ہوئے جب چوٹی کی طرف راستہ سر کرتے جاتے تو پاؤں تلے مکہ شہر دور اور سکڑتا ہوا محسوس ہوتا۔ حرا کی پہاڑی پر کئی قدرتی غار اور روزن تھے۔ آپؐ اب تک حرا کی پہاڑی پر تقریباً ساری دراڑوں، غاروں اور درزوں سے بھی واقف ہو چکے تھے۔ چنانچہ، آپؐ کسی بڑی مشکل سے دوچار ہوئے بغیر، آرام سے شام ڈھلنے سے قبل ہی حرا کی پہاڑی پر اپنی پسندیدہ جگہ پر پہنچ گئے۔

آج بھی معمول کے مطابق آپؐ یہاں پہنچ کر تھوڑی دیر ٹھہر، پانی وغیرہ پی کر غار کے دہانے پر آن آگے کو جھک کر قیام کی حالت میں کھڑے ہو گئے۔ محسوس ہوتا تھا کہ شاید ان کا جسم ہوا کے زور پر آگے کو جھکا ہوا ہے۔ مگر، شام کے دھندلکوں میں، جب اکادکا، غول سے پیچھے رہ جانے والے پرندے بھی اب پناہ گاہوں کے قریب ہو رہے تھے، فضا بوجھل ہوتی جا رہی تھی۔ ایسے میں، ارد گرد ہلکی ہوا کا بھی کہیں نام و نشان نہیں تھا۔ مزید، سورج غروب ہوتے ہی، بڑھتی ہوئی تاریکی کے ساتھ خاموشی بھی گہری ہوتی چلی گئی۔ اس قدر گہری خاموشی جو کانوں کے اندرون میں گھس کر شور مچاتی ہے۔ چپ کی ایسی صدا جو کہنے کو موجود تو نہیں ہے مگر پھر بھی گویا چاروں اطراف میں گونجتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ یہ ایسی کیفیت کا نام ہے جس کے بیچ، آدمی کے گرد آوازیں نہیں بلکہ ارتعاش جنم لیتا ہے۔ اسی ارتعاش میں چہار سو، سارا پیش منظر جو اس میں گھلتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ دن بھر تیز دھوپ میں تپ کر جلتے رہنے والے بے جان پتھر بھی اب شام کی ٹھنڈک میں گرمی خارج کرتے تو ایسا محسوس ہوتا کہ جیسے ان میں زندگی دوڑ رہی ہے۔ یا پھر، تاریک ہوتی ہوئی رات میں سر کے اوپر کھلے آسمان میں تارے ٹم ٹم جگمگانے لگتے تو اس منظر کو بغور دیکھنے پر وسیع، جیتی جاگتی کائنات میں انسان کے تن تنہا ہونے کا خیال بھی عود کر آتا ہے۔ ایسے میں یہ دیوہیکل حقیقت منہ پھلا کر سامنے، راستہ روک کر کھڑی ہو جاتی ہے کہ انسان اس کائنات میں کس قدر اکیلا ہے۔ اس کے ساتھ مبہوت کر دینے والا خیال یہ بھی ہے کہ انسان خود اپنے آپ اور دوسروں کے علاوہ اس دنیا سے بھی کہیں بڑے نظام کا معمولی ہی سہی مگر بہرحال ایک بڑا حصہ ہے۔ تاریک خلا اور سرد کائنات کے خول میں، انسانی زندگی کے وجود کا یہ احساس اس

قدر قدیم اور گہرا ہے کہ اس کے سامنے روزمرہ انسانی معمولات، معاشی و معاشرتی معاملات اور لوگوں کی سطحی بلند نظری ہی نہیں بلکہ پوری تاریخ انسانی بھی ہیچ نظر آتی ہے۔

کیا یہ صرف انہی خطوط پر گہرا غور و فکر تھا یا پھر محمدؐ رات بھر جاگ کر باقاعدہ عبادت کی مشقت اٹھایا کرتے تھے؟ آپؐ اس غار کے دہانے پر جھک کر، خاموش اور مودب کھڑے ہیں۔ کیا قیام کی حالت میں وہ ایک عام آدمی کی طرح زندگی میں میسر آنے والی ساری نعمتوں، مواقع اور جان توڑ محنت اور مشقت کے بعد ملنے والی سہولیات پر شکر گزاری کے جذبے سے سرشار تھے؟ یا بجائے اس کے، بیداری کی حالت میں، چوکنا کھڑے گہری فکر میں مبتلا تھے؟ یا شاید، اب اتنے سالوں کی مشقت اور ریاضت کے بعد وہ واقعی کسی بڑی واردات کے وقوع پذیر ہونے کے انتظار میں تھے؟ ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ اگر محمدؐ حرا کی پہاڑی پر سکون کی تلاش میں جایا کرتے تھے تو اس رات ان کے ساتھ جو واقعہ پیش آنے والا ہے، وہ آپؐ کے سکون اور طمانیت کو اتھل پتھل کر کے رکھ دے گا۔

اس رات، غار حرا پر پیش آنے والے واقعات اصل میں کیا تھے؟ اس بابت تاریخ میں محمدؐ کے اپنے الفاظ، ان کے کئی بیانات مل جاتے ہیں مگر یہ ساری روایات دوسروں نے بیان کر رکھی ہیں، محمدؐ سے صرف منسوب ہیں۔ ان تمام روایات میں واقعات کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے، ہر شخص دوسرے سے مختلف انداز اپناتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس ماورا عقل واقعے کی مادی لحاظ سے بیان کرنے کی کوشش میں، راوی الفاظ سے گتھم گتھا ہو کر اپنی سمجھ کے مطابق سپاٹ مگر افسانوی رنگ دے دیتا ہے۔

ایک روایت عائشہ سے مروی ہے۔ عائشہ، محمد کی تمام بیویوں، جن کے ساتھ آپؐ نے خدیجہ کی وفات کے بعد نکاح کیا، میں سب سے چھوٹی اور بے لاگ تھیں۔ عائشہ بیان کرتی ہیں، "محمدؐ نے کہا، 'جب فرشتہ میرے پاس آیا تو میں قیام کی حالت میں کھڑا تھا مگر اس کو دیکھتے ہی گھٹنوں کے بل گر گیا اور گھٹوا ں چلتے ہوئے اس سے دور ہٹنے لگا۔ میرے گندھے خوف سے کپکپا رہے تھے۔ تب ہی، ذہن میں پہاڑی کی کسی ٹیکری چٹان سے کود جانے کا خیال پیدا ہوا۔ ابھی میں یہی سوچ رہا تھا کہ وہ میرے سامنے ظاہر ہوا اور کہنے لگا، 'محمد، میں جبرائیل ہوں اور تم اللہ کے رسول ہو' پھر اس نے کہا، 'پڑھو!'۔ میں نے سوال کیا، 'میں کیا پڑھوں؟'۔ جواباً، اس نے مجھے اپنی طرف کھینچ کر سختی سے بھینچ لیا۔ میرے سینے پر تین دفعہ اس قدر سختی سے بوجھ ڈالا کہ مجھے گماں ہوا کہ شاید میری جان نکل جائے گی۔ پھر اس نے کہا، 'اپنے پروردگار کا نام لے کر پڑھو جس نے پیدا کیا۔ جس نے انسان کو خون کی پھٹکی سے پیدا کیا۔ پڑھو اور تمہارا پروردگار بڑا کریم ہے۔ جس نے قلم کے ذریعے سے علم سکھایا۔ اور انسان کو وہ باتیں سکھائیں جس کا اس کو علم نہیں تھا۔'"

بیانیہ جاری رکھیں تو اگلی روایت ابن زبیر سے منقول ہے۔ ابن زبیر بھی محمدؐ سے منسوب الفاظ میں روایت کرتے ہیں، "میں نے وہی الفاظ دہرائے اور فرشتہ دست بردار ہو کر رخصت ہو گیا۔ جب میں جاگا تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے یہ الفاظ میرے دل پر نقش ہو چکے ہیں۔ اللہ کی پیدا کردہ ساری مخلوق میں مجھے شاعروں اور جنونیوں سے شدید نفرت رہی ہے۔ میں ان میں سے ایک پر بھی نگاہ ڈالنا گوارا نہ کروں مگر پھر بھی اس لمحے مجھے خیال آیا، 'شاید، میں ایک شاعر ہوں، یا پھر مجنون ہوں۔ میں گوارا نہیں کر سکتا تھا کہ قریش مجھے شاعر یا مجنون کہہ کر بلایا کریں۔ چنانچہ، میں نے سوچا کہ اس ہزیمت سے بہتر ہے، میں پہاڑی پر کسی چٹان سے کود کر جان دے دوں اور موت میں پناہ لے لوں' مگر جب میں اس غرض سے چٹان کے کنارے پر جا کھڑا ہوا تو آسمان میں سے ایک آواز سنی، 'محمد، تم اللہ کے رسول ہو' میں نے آواز کی سمت میں سر اٹھا کر آسمان کی جانب دیکھا تو جبرائیل آدمی کے روپ میں افق پر کھڑے تھے۔ میں دم بخود جبرائیل کو دیکھتا رہ گیا اور میری توجہ خودکشی کے خیال سے ہٹ گئی۔ اب میں آگے اور نہ ہی پیچھو کی طرف حرکت کر سکتا تھا۔ جبرائیل پر سے توجہ ہٹانے کے لیے دوسری طرف نگاہ پھیر دی مگر افق پر جہاں دیکھتا تھا، جبرائیل آدمی کی شکل میں، ہر طرف کھڑے نظر آتے تھے۔"

"یہ صاف، واضح اور سچا منظر تھا" عائشہ نے اپنی روایت میں زور دے کر کہا ہے۔ مگر عائشہ اور دوسرے تمام راوی، ان واقعات کی جس قدر بھی تفصیلی روداد بیان کر لیں، یہ اس واردات کی اصل کے مقابلے میں بری طرح چوپٹ اور یک ساں معلوم ہوتی ہے۔ گو، یہ تمام لوگ پوری نیک نیتی اور ذمہ داری کے ساتھ اس واقعہ کو بیان کرنے کی کوشش میں الفاظ کی تلاش کرتے نظر آتے ہیں، مگر ان کی یہ سعی، اس ماجرا کی ہے جو خود ان کے اپنے ساتھ پیش نہیں آیا۔ لہٰذا، وہ اس عمل میں روداد کو خاصی سادہ مگر انسانی سمجھ کے عین مطابق، بنا دیتے ہیں۔ یعنی، ایک غیر مادی تجربے کو مادی شکل میں ڈھال دیتے ہیں۔ جیسا کہ ہم نے دیکھا، جبرائیل کی ایک شکل پہاڑوں کے اوپر آسمان میں تیرتی ہوئی بیان کی گئی ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ ان لمحات کو بیان کرتے، اپنی سمجھ کا لبادہ اوڑھا دیا گیا ہے یا اس رات جو واقعات پیش آئے، گرچہ وہ انسانی سمجھ سے باہر ہیں مگر بہر حال ان کو انسانی سمجھ بوجھ اور توقع کے عین مطابق اس طرح رنگ دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ گویا، وہ محمدؐ کے ساتھ اسی طرح پیش آئے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس بابت جو بیان محمدؐ سے منسوب ہیں، ان میں اچانک ایک فرشتے سے سامنا ہونے پر حیرت نہیں بلکہ قابل لمس خوف اور دہشت کا عنصر واضح نظر آتا ہے۔ آپؐ کا خوف اور دہشت سے ایک دم گڑبڑا جانا، غیر مرئی چیز سے واسطہ پڑتے ہی دبدبہ اور بے بسی کا اس قدر شدید احساس کہ اس تلے دب کر بالآخر آپؐ موت کی خواہش کرنے لگے۔ پھر، ایک ایسی ذات سے ٹاکرے کا خوف اور ہیبت بھی صاف ہے جو انسانی سوچ اور سمجھ سے کہیں بڑی اور عقل اس کے سامنے دنگ ہے۔ مختصراً، راوین کے چپٹے اور یک رخی بیانات کے برعکس، ذاتی طور پر خود محمدؐ کے لیے یہ ہیبت میں مبتلا کر دینے والا اور صحیح معنوں میں مرعوب و مبہوت کر کے چھوڑ دینے والا تجربہ تھا۔

آج کے جدید دور میں مرعوب ہو جانا، ہیبت طاری ہو رہنا یا مبہوت چھوڑ دینا وغیرہ جیسی عبارتیں اور اصطلاحات تقریباً بے معنی ہیں۔ ہم ان کو اصل معنوں میں کبھی بھی سمجھ نہیں پائیں گے۔ مثال کے طور پر آج کل لوگ نت نئی ایجادات دیکھ کر ہی 'مرعوب' ہو جاتے ہیں یا کسی نہایت عمدہ تخلیق، فلم یا مصوری کے شہ پارے کو دیکھ کر 'مبہوت' رہ جاتے ہیں۔ آج شاید بہت بڑی آفت، مثلاً انتہائی درجہ کے زلزلے یا سونامی کا ذاتی طور پر سامنا کرنے کے سوا شاذ و نادر ہی ہم پر کبھی، صحیح معنوں میں ہیبت طاری ہو پائے۔ یوں، اس لحاظ سے ہم خوف اور دبدبے کو صحیح معنوں میں محسوس کیے بغیر جیتے آ رہے ہیں۔ ہم میں سے چند، گنے چنے لوگ ہوں گے جو یہ سمجھ سکتے ہیں کہ طوفانی جکڑ کے بیچ تن تنہا کھڑا ہونے سے در اصل کیا مراد ہے؟ یا پھر کھلے بیابان میدان میں انتہائی سخت موسم اور مسدود حالات کے بیچ زندگی کی ڈور تھامے رکھنا، بھلا کیا معنی رکھتا ہے؟ اسی طرح سونامی کی صورت میں جب سمندر کی لہریں سینکڑوں میٹر بلند ہو جاتی ہیں اور پاؤں تلے زمین تھرتھرانے لگتی ہے، یہ آخر کیسا تجربہ ہو سکتا ہے؟ اس جدید دور میں تو، سہولیات اور علم اس قدر بڑھ چکا ہے کہ اس طرح کے شدید طوفانوں اور آفتوں کے دوران بھی ہم دروازے مقفل کر کے بیٹھ جاتے ہیں یا مضبوط دیواروں کے پیچھو چوکڑے رہتے ہیں۔ بھلے بدترین زلزلے آ رہیں اور سب کچھ اتھل پتھل ہو جائے۔ ہم سمجھتے رہتے ہیں کہ حالات ہمارے کنٹرول میں ہیں یا کم از کم اس اختیار کا گماں ہمیشہ ہی باقی رہتا ہے۔ آج ہم کسی بھی صورت، اس خوف اور دہشت کا اصل معنوں میں کبھی سامنا نہیں کر پاتے جو خود سے بڑی مصیبت کو آنکھوں کے بالکل سامنے دیکھ کر طاری ہو سکتی ہے۔

پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ، بھلا ہم محمدؐ پر طاری خوف اور ہیبت کی کیفیت اور اس تجربے کو بھلا کیسے سمجھ سکتے ہیں؟ یہ ایسی کیفیت ہے جو سمجھنے میں بیحد دقیق اور پھر مافوق الفطرت بھی ہے۔ یعنی کسی بھی مادی تجربے سے یکسر مختلف ہے۔ تعریف کی رو سے، اس کی کسی بھی طرح سے عقلی بنیادوں پر صفائی پیش کرنا ممکن نہیں ہے۔ اس کے باوجود، کئی لوگ، بشمول اس واقعہ کے راوی بھی اس روحانی تجربے کو بیانیے میں مادی شکل دینے کی بھرپور کوشش کرتے چلے آئے ہیں۔ الفاظ میں بیان کرنے کی سعی تو ہوتی رہی ہے مگر اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ یہ سارا معاملہ بعید القیاس بن کر رہ گیا ہے۔ مگر کیجیے کہ، اس کو بیان کرنا نہ صرف انتہائی ضروری ہے بلکہ یہ مجبوری بھی ہے۔ اس کو انسانی سمجھ کے مطابق ایک صورت، شکل دینا لازم ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اگر ہم ایسی کوشش کرتے ہیں تو شاید اس میں کلی طور پر ناکام رہیں مگر دوسری جانب اس کو بیان کرنے کی کوشش سے کلی اجتناب بھی درست نہیں ہے۔

روڈولف اوٹو نامی سکالر، جو تقابل ادیان کے علم میں نامی گرامی محقق گزرے ہیں، اپنی شہرہ آفاق کتاب 'تقدیس کا تصور' میں اس طرح کے روحانی اور الہامی تجربات کو بیان کرنے کی قدرے بہتر کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔ تاہم یہ کتاب عہد وکٹوریہ کی جناتی زبان میں رقم ہے، جو مرصع نگاری کے لحاظ سے اپنے آپ میں ایک الگ معاملہ ہے۔ اوٹو اس تصنیف میں انجیل کے عبرانی نسخے میں خدا کی ہیبت کو یوں بیان کرتے ہیں، 'یہ غضب آدمی کو مفلوج کرنے کی حد تک اثر کرتا ہے' یا پھر، ایوب نے محسوس کیا، 'دہشت سے بھرپور احساس جو اندر ہی اندر لرزہ طاری کر رہا تھا۔ روح کے اندر تک اس قدر زیادہ تھرتھری مچ گئی کہ شاید اس دنیا میں آج تک پیدا ہونے والی بڑی سے بڑی، دیوہیکل شے بھی اس کے سامنے ٹھہرنے، اس ہیبت کو اپنے آپ میں سمونے کی جرات نہ کرتی۔ گویا، کوئی بھوت دیکھ لیا ہو۔' یہاں بھوت سے اوٹو کی مراد واقعی بھوت تھا۔ وہ مزید لکھتے ہیں کہ بھوت پریت کی کہانیوں میں یہ خوف کا احساس ہوتا ہے جو آدمی پر خوف اور لرزہ طاری کر دیتا ہے۔ یہ احساس اس قدر گہرا ہو سکتا ہے کہ، 'ایسا لگتا ہے کہ شاید خوف سے ریڑھ کی ہڈی میں چھید ہو گئے ہیں اور ڈر گودے میں جا کر بیٹھ گیا ہے۔ اس کو دیکھ کر روئیں کھڑی ہو جائیں اور ٹانگیں دہشت سے کانپنے لگیں۔' یہ تو بھوت پریت کی بات تھی۔ مگر جب اوٹو 'ذی شان روحانی شعور' یعنی مقدس ارواح اور خالص خدائی قوت کا مقابلہ کسی بھوت پریت کے تجربے سے کرتے ہیں تو ان کے مطابق معنوی لحاظ سے بھوت پریت کا سامنا، بچوں کا کھیل ہے۔ اوٹو کے مطابق انت یہ ہو سکتی ہے کہ، 'دہشت جب اس صورت میں، ساری حدوں کو پھلانگ کر، سرفرازی کی انتہا پر پہنچتی ہے تو تب، روح پر بے خودی اور سکوت کا عالم چھا جاتا ہے۔ لرزہ طاری ہو جاتا ہے اور یہ ڈر کے مارے وجود کے آخری اور باریک تر چیتھڑے کی رو تک کانپ کر رہ جاتی ہے'

اوٹو نے اخذ کیا ہے کہ اس طرح کے تجربات میں شادمانی کا دور تک کوئی شائبہ نہیں ہو سکتا۔ اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ شاید کشف کے نتیجے میں شادی مرگ کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے تو وہ ایسے شخص اور تجربے کو صاف عیاری اور چتربازی سے موسوم کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں، 'کشف کے ایسے کسی بھی لمحے میں طاری ہونے والی دہشت اور ہیبت ان لوگوں کے لیے خاصی مایوسی کا باعث ہو گی جو تقدیس کو آج تک اچھائی، نرمی، محبت، معتمد چاہ اور بے تکلفی سے منسوب کرتے آئے ہیں'

یہاں، اگر اس معاملے کو بیان کرنے میں ہمیں اوٹو کی مانند مرصع نگاری اور رنگ برنگے الفاظ کے ہیر پھیر کی ضرورت نہیں تو وہیں ہم عائشہ یا ابن زبیر کی طرح سپاٹ اور لغوی بیانیے کا بھی سہارا نہیں لے سکتے۔ ہمیں اس بات پر اصرار کرنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں کہ محمد نے جبرائیل کو مادی شکل میں دیکھا، بولتے ہوئے سنا اور اس وقت وہ ایک آدمی کا روپ دھار کر آپؐ کے سامنے کھڑے ہو گئے تھے۔ اس طرح کے اصرار سے تو ہم محمد کو رتبے میں اور بھی کم تر بنا دیتے ہیں۔ گویا، آپؐ کی مثال تو صرف ایک ربانی ٹیپ ریکارڈر کی آواز جیسی رہ جاتی ہے جو جبرائیل کے ہاتھوں سدھائی ہوئی ہے۔ چونکہ ہم اکیسویں صدی میں بسر رکھنے والے عقل پسند لوگ ہیں تو ہم اس معاملے کو سمجھنے کے لیے سائنس کا سہارا لے سکتے ہیں۔ علم طب کی شاخ نیورو سائکاٹری یا عصبی نفسیات کے نظریے 'شعوری تغیرات' کا حوالہ دے سکتے ہیں۔

کیا اس رات حرا کی پہاڑی پر محمدؐ واقعی شعور کے تغیر کی حالت میں تھے؟ یقیناً، یہ ایسا ہی تھا۔ مگر اعصاب کے علم کی تحقیق اس بابت صرف اور صرف وہی جانکاری فراہم کرتی ہے جو پہلے سے سادھو اور گوشہ نشین راہب، زاہدین ہمیشہ سے جانتے آئے ہیں۔ یعنی، ریاضت اور مشقت جیسے بھوک، رت جگا اور گہرا مراقبہ وغیرہ شعور کی حالت میں تبدیلی کا باعث بن سکتا ہے۔ شعور میں تغیر پیدا کر سکتا ہے۔ تغیر کی یہ کیفیت دماغ کی کیمیائی سرگرمی میں رد و بدل کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ اس رد و بدل کا نتیجہ یہ ہے کہ کئی مادی اور جسمانی تبدیلیاں واقع ہو سکتی ہیں۔ سننے، دیکھنے، سونگھنے، چھونے اور چکھنے وغیرہ اور ایسے کئی دوسرے مادی تجربات دماغ میں مسلسل جاری رہنے والے کیمیائی عوامل کی بدولت ہی جنم لیتے ہیں۔ مگر معاملہ یہ ہے کہ اگر ہم اسی طرح سختی سے دماغ میں جاری ان کیمیائی عوامل کو محسوس ہونے والے ہر مادی تجربے کا باعث گردانتے پھریں گے تو پھر ہر چیز کو ایک پنجرے میں بند کر دیں گے، جسے ولیم جیمز نے 'طبی مادیت' کا نام دیا تھا۔ طبی مادیت سے مراد یہ کہ، اس کی رو سے ہر طرح کا مادی تجربہ ایک میکانکی عمل ہے اور اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سائنس صرف اور صرف شعور میں پیدا ہونے والے تغیرات

کے نتیجے میں مادی تجربات پر پڑنے والے اثرات کو ایک حد تک جانچ سکتی ہے۔ یہ ان مادی تجربات کی روح، اس کے بیچ جینے، انہیں محسوس کرنے کے تجربے کو سمجھنے اور سمجھا پانے کے قابل نہیں ہے۔

چنانچہ آخر میں، ہمارے پاس لے دے کر ان مادی تجربات کے بارے اس سوال کو عملی توجیہ دینے کی ایک ہی صورت باقی رہ جاتی ہے۔ عملی طور پر یہ صورت باقی تمام توجیہات میں کم تر ہے۔ مگر یہ طریق کسی بھی تجربے کے محسوسات کو بیان کر سکتی ہے۔ تخیل کے بند کواڑ کھول سکتی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جمالیاتی حس سے بھرپور ہے۔ یعنی، ہمیں شاعری اور شاعرانہ طرز کا سہارا لینا پڑے گا۔

مذہبی اور روحانی تجربات کی تہہ میں احساس کا جوہر پنہاں ہوتا ہے۔ شعائر اور کٹر عقائد مذہب کی ایک منظم شکل ضرور ہیں۔ ان کی مثال مذہب کی عمارت میں مضبوط شہتیروں اور قینچی دار کڑیوں جیسی تو ہے، مگر یہ مذہب کے روحانی لمس کو چھو پانے کی صلاحیت سے محروم ہوتے ہیں۔ حالانکہ، یہ روحانی تجربات ہی ہیں جو اپنے اندر مذہب سے متعلق تمام تر پراسراریت سمو کر رکھتے ہیں۔ دوسری جانب، اس طرح کے تجربات ہمیشہ سے ایک معمہ بھی رہے ہیں کیونکہ ان احساسات کو بیان کرنا نہایت مشکل ہوتا ہے۔

شاعری، احساس کے اسی معمے پن کے گرد گھومتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان فنون لطیفہ، بالخصوص شاعری کے ذریعے اس ناقابل بیان معاملے کو بیان کرنے کی کوشش سے چوکتا نہیں ہے۔ والٹ وٹ مین نے نظموں کی خوبصورتی کو 'سائنس کی قطعیت اور طرہ' کہا تھا جو 'طبی مادیت' کو واضح اور دو ٹوک جواب ہے۔ یموئیل کالرج بھی یہاں اور وہاں، 'ایک لمحے کو انکار اور بے اعتقادی کو رد کر کے سوچنے کے بعد شاعرانہ حد تک ایمان کی کیفیت' بارے بیان کرتے نظر آتے ہیں اور رالف والڈو ایمرسن نے شاعری کے بارے کہا تھا کہ، 'یہ کسی بھی شے کی روح کو بیان کرنے کی کوشش ہوتی ہے۔ 'ذرا، ان الفاظ، جیسے 'روح'، 'ایمان'، 'قطعیت'، 'اعتقاد' وغیرہ پر غور کیجیے۔ قصہ مختصر، شاعری کی مناسب ترین لفظوں میں جامع تعریف کسی نامعلوم شخص نے یوں کی تھی کہ، 'وہ کہہ دینا جو کہا نہیں جا سکتا'۔ چنانچہ، ہمیں بھی اس ناقابل بیان تجربے کو بیان کرنے کی کوشش سے چوکنا نہیں چاہیے جس طرح پہلے بھی لوگ، بالخصوص اس واقعہ کے راوی باز نہیں آئے۔ سو، اس معاملے میں اگر ہم محمدؐ کو حرا کی پہاڑی پر پیش آنے والے واقعات کی روایات میں استعمال ہونے والی تشبیہوں اور استعاروں پر غور کریں تو شاید ہم کسی حد تک سمجھنے کے قابل ہو سکتے ہیں۔

سمجھنے کی غرض سے، شروعات مثال شاعری میں 'آمد' یا 'نزول' اور اس معاملے میں محمد پر 'الہام' یا 'وحی' سے کیجیے۔ لغوی معنوں میں نزول، وحی یا الہام سے مراد عمل تنفس کے دوران سانس اندر کھینچنا یا زیادہ مناسب، اندر سانس بھرنا ہے۔ عربی میں لفظ 'تنفس' اور 'نفس' یا اردو میں 'دم' یا 'سانس' سے مراد روح کے ہیں۔ روح، عبرانی زبان کے لفظ 'روچ' سے مشابہت رکھتا ہے۔ وحی یا نزول کا تصور یوں ہی زبانوں میں داخل ہو گیا، طے پاتا گیا۔ الہام کا یہی تصور عبرانی تورات کی کتاب پیدائش' یا 'براشیت' کی دوسری آیت میں بھی استعمال ہوا ہے۔ 'خدا کا دم'، 'خدا کی پھونک' یا 'روچ الوہیم' کا 'پانیوں کے اوپر ہواؤں کی مانند چلنا' وغیرہ استعمال ہوا ہے۔ گویہ تصور محمد پر نازل ہونے والی وحی، الہام سے خاصا مانوس لگتا ہے مگر بہر حال، انسان پانی نہیں ہے۔ ایک انسان کے اندر سانس بھرنے، پھونک بھرنے یا کیے دم کے دخول کا تصور ذہن میں لائیے۔ آمد، نزول، وحی یا الہام کے معنوں بارے سوچیے۔ یعنی، سانس بھرنے کا اس قدر بھرپور اور طاقتور عمل جو ناقابل برداشت حد تک تکلیف دہ ہو سکتا ہے۔ یہ جنت سے چلنے والی نرم اور ملائم ہواؤں کا نہیں ہے بلکہ بے انتہا دباؤ کی حامل ہوا کا کان پھاڑتی ہوئی سیٹی بجاتے پھیپھڑوں میں گھسنا مراد ہے۔ مثال، ایک دیو اپنی پوری قوت سے ایک بے ہوش انسان کو ہوش میں لانے کے لیے، منہ سے منہ جوڑ کر مصنوعی عمل تنفس میں مشغول ہو۔ اس طرح کی کیفیت، مثال مصنوعی عمل تنفس میں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے جسم میں ہر خلیہ پھولتا ہی چلا جا رہا ہے اور مفعول اس بے پناہ دباؤ کی حامل

ہوا کے رحم و کرم پر ہے۔ گویہ عمل زندگی، جلا بخشتا ہے مگر اسی وقت یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ شاید یہ جان نکال کر رکھ دے گا۔ چنانچہ، آمد یا نزول کے دوران بھی ایسا لگتا ہے کہ شاید اس کے بوجھ تلے دم گھٹ جائے گا اور اس کے خلاف ہاتھ پاؤں مارنا، دفاع کی ہر طرح کو شش بے سود ہے۔

محمد کے الفاظ پر غور کیجیے۔ جب وہ کہتے ہیں، 'ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے یہ الفاظ میرے دل پر نقش ہو چکے ہیں'۔ گو آج تو یہ کہنے میں صرف ایک کلیشا، کہاوت لگتی ہے مگر تب، جب محمدؐ نے پہلی بار اپنے لیے یہ الفاظ استعمال کیے ہوں گے تو انہی الفاظ کی مدد سے ہم وحی کے نزول یا الہام کی بے پناہ تاثیر کو سمجھ سکتے ہیں۔ اگر آپ نے کافکا کی مشہور کہانی، 'پینل بستی میں' پڑھ رکھی ہو تو یقیناً آپ کو یک دم اس قیدی کا خیال آئے گا جو اپنے کیے پر ندامت کے اظہار میں ادا کیے جانے والے الفاظ، اپنے جسم پر گوشت میں چیرے لگا کر نقش کرنے کی اذیت میں مبتلا تھا۔

تصور کیجیے جو تصور میں لانا مشکل ہے۔ اس تکلیف اور درد کو محسوس کیجیے، جو ایک تیز دھار خنجر کے پھل سے جسم میں پیوست ہو کر کاٹنے سے ہو سکتا ہے۔ وہ بھی یوں کہ مفعول اس کے نیچے بے بس پڑا رہے۔ اسے ہوش تو ہو مگر وہ اس سے چھٹکارے کی کوئی صورت نہ پاتا ہو۔ محمدؐ کے بچپن میں پیش آنے والے اس واقعے کو خیال میں لائیے جس کے قصے میں ایک پانچ سالہ بچے کے سینے کو دو فرشتے چاک کرتے ہیں اور اس کا دل کھینچ کر باہر نکال، دھو ڈالتے ہیں۔ اس واقعے کو تو سنتے اور پڑھتے ہوئے بھی کسی قسم کی طمانیت، آرام اور سکون محسوس نہیں ہوتا، اس عمل سے گزرنے کا تجربہ تو بہت دور کی بات ہے۔ اس بیان یا روایت میں تو جراحی جیسی تشدید ہے۔ سینے کو چاک کرنا، دل کو کاٹ کر باہر نکالنا، ناقابل بیان درد وغیرہ۔ مگر، جراحی کی ہی طرح، یہ بھی زندگی میں ایک نئی شروعات کے نام پر کیا جانے والا عمل ہے۔

بہر حال، الہام یا نزول کے بعد محمد خاصی دیر وہیں غار میں دھول سے اٹی زمین پر بے ہوش، گویا خوف سے خون سے خالی، اڑی رنگت میں پڑے رہے۔ آپؐ کے پسینے چھوٹ رہے تھے پر سردی اور خوف سے کپکپاہٹ بھی جاری تھی۔ وہ ابھی تک ان الہامی الفاظ کے زیر اثر، بے خود ہو رہے تھے۔ دہرائے گئے الفاظ آپ کے اندر سے بر آمد ہوئے تھے مگر بہر حال یہ آپؐ کے اپنے نہیں تھے۔ گو، کہنے کو آپؐ نے اپنے منہ سے یہ کلمات اس رات کی گہری تاریکی میں جب ہر سو خامشی پھیلی ہوئی تھی، دہرا کر پہاڑ کی تازہ ہوا میں گھول دیے تھے مگر شاید انہیں خیال آیا ہو کہ یہ الفاظ اس وقت تک حقیقت کا روپ نہیں دھار سکتے کہ جب تک ان کے علاوہ، کوئی دوسرا انسان آپؐ کے منہ سے سن نہ لے۔ ان الہامی لفظوں کو سانس کے ذریعے اپنے اندر اتار نہ لے، اس کے معنی نہ تلاش لے۔ اس وقت اگر پوری دنیا میں محمد کے لیے دہشت کی کیفیت سے چھٹکارے کی جا، ایک ایسا انسان جو جنوں کے خوف اور مقدس خدا کی ہیبت سے آپؐ کو امن بخش سکتا تھا، ان الہامی الفاظ کو سہہ سکتا تھا، اپنے اندر جذب کر سکتا تھا، تو وہ صرف اور صرف خدیجہ تھیں۔

آپؐ پر نازل ہونے والی وحی یا الہام بارے یہ ہے کہ شاید شروع میں یہ الفاظ نہیں تھے۔ غالباً، اس مقدس تجربے کو ایک انسانی سمجھ بوجھ کی شے بننے، مثال کے طور پر مکمل اور واضح الفاظ میں ڈھلنے کے لیے ابھی دیر تھی۔ ہم جانتے ہیں کہ اس واردات کے فوراً بعد ہی محمد رات کے اندھیرے میں دشوار گزار راستوں، کھائیوں اور نکیلی چٹانوں سے بے نیاز، گرتے پڑتے، پہاڑ کی پتھریلی ڈھلوان پر لڑھکتے اور پھسلتے ہوئے، ہانپتے اور کانپتے، اور ہر سانس کو پوری قوت سے سینے میں تھام کر سمونے کی ان کہی کو شش میں مکہ کی طرف دوڑتے چلے گئے۔ آپؐ کے کپڑے پھٹ کر لیر و لیر ہو چکے تھے جبکہ جسم پر جا بجا، بانہوں اور ٹانگوں پر خوف کے مارے دوڑنے، راستے کی پتھریلی چٹانوں اور کانٹے لگنے کے باعث خراشیں اور چوٹیں آ گئی تھیں۔

'مجھے اپنی جان کا ڈر ہے' آپؐ نے پہلی بات یہی کہی۔ 'مجھے لگتا ہے کہ شاید میں مجنون ہو گیا ہوں'۔ تقریباً اینٹھن اور تشنج جیسی حالت میں آپؐ خوف سے لرزتے اور کانپتے ہوئے خدیجہ سے ان کو تھامنے اور چادر تلے چھپانے کی التجا کر رہے تھے۔ 'مجھے ڈھک دو۔ مجھے کچھ اوڑھا دو۔' آپؐ نے منت کی اور اپنا سر خدیجہ کی جھولی میں ڈال دیا۔ جیسے، کوئی معصوم بچہ رات کی تاریکی میں کسی انجان شے، سائے کو دیکھ کر خوفزدہ ہو جاتا ہے اور آڑ، پناہ ڈھونڈتا ہے۔ خدیجہ نے جب محمدؐ کو اس خوف اور ہیبت کی حالت میں دیکھا تو وہ آپؐ پر طاری اس قدر لرزے اور کپکپاہٹ کو دیکھ کر ہی قائل ہو گئیں کہ ان کے شوہر کو جو واقعہ پیش آیا تھا، وہ حقیقت ہے۔

خدیجہ نے محمدؐ کو تھام لیا۔ اپنی جھولی میں ان کا سر ڈال کر سہلاتی، دابتی رہیں حتیٰ کہ رات کے تاریک آسمان میں مشرق کی جانب سے دن کی روشنی پھوٹ پڑی۔ پھر کہیں جا کر، پہلی بار محمدؐ کی زبان پر آہستگی سے اور اٹکتے ہوئے وہ الفاظ جاری ہونا شروع ہوئے جو شاید اس سے قبل تک آپؐ نے صرف محسوس کیے تھے۔ گو وہ اب بھی خدیجہ کی جھولی میں لرز رہے تھے مگر اب ہی کہیں جا کر، محمدؐ نے خود اپنی آواز، اپنے کانوں سے سنی اور اپنے علاوہ ایک دوسرے انسان یعنی خدیجہ کے سامنے وہ الہامی الفاظ دہرانا شروع کیے۔ وہ الہام جو حرا کی پہاڑی پر سانس کی مانند محمدؐ کے سینے کے اندر پھونکا گیا تھا، اب سانس کی ہی طرح آپؐ نے واپس، الفاظ کی صورت باہر پھونک دیے۔ گویا دم جاری ہو گیا، سانس چل پڑی۔

محمدؐ اور خدیجہ کو رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئے اب پندرہ برس ہو چکے تھے۔ مگر اس سے پہلے خدیجہ نے محمدؐ کو کبھی بھی اس قدر خوش بیاں زبان میں بولتے ہوئے نہیں سنا تھا۔ عام طور پر آپؐ کا کلام مختصر اور دبا، اکھڑا سا رہتا تھا۔ جیسا کہ کسی ایسے شخص، جس نے بچپن میں بولنے سے زیادہ سننا سیکھ رکھا ہو، اس سے ایسے مسحور کن کلام کی توقع نہیں ہو سکتی۔ یہ الفاظ جب خدیجہ کے کانوں میں پڑے تو وہ سنتے ہی جان گئیں کہ یہ محمدؐ کے منہ سے خلاف معمول اور حیرت انگیز تھے۔ یہی نہیں بلکہ خدیجہ کے لیے یہ چند جملے صرف اس وجہ سے کہ وہ محمدؐ سے محبت رکھتی تھیں، حیرت انگیز نہیں تھے بلکہ وہ ان الفاظ کے سحر کے باعث جانتی تھیں کہ اتنا فصیح اور بلیغ کلام پوری دنیا میں دوسرا نہیں تھا۔ یہ کلام جو بھی تھا، اس کے ساتھ خدیجہ نے فوراً ہی یہ بھی بھانپ لیا کہ یہ اس پرسکون اور انکساری سے بھرپور مگر معتدل زندگی کا بہر حال اختتام تھا جو وہ اب تک اکٹھے جیتے آئے ہیں۔ آج کے بعد کچھ بھی ایک سا نہیں رہے گا۔

گماں یہ ہے کہ خدیجہ کی بجائے یہاں کوئی عام عورت ہوتی تو وہ اس کو غیر منصفانہ اور بے جا جانتی۔ وہ اس تبدیلی، معمول کی زندگی کے یوں اتھل پتھل ہونے کے خدشے سے خوفزدہ ہو جاتی اور اس بابت دور سے ہی نظر آنے والی ممکنہ مشکلات اور مکہ کے لوگوں کے استہزائی ردعمل کو بھانپ کر پیچھے ہٹ جاتی۔ شاید، وہ اپنے تحفظ کے ساتھ، محمدؐ کو بھی ان مشکلات سے بچانے کی کوشش میں الہام کی نفی کر دیتی۔ بجائے یہ کہ وہ حقیقت بیان کرے، اس خیال پر مصر ہو جاتی کہ محمدؐ کا ابتدائی خیال ہی درست ہے۔ یعنی یہ کہ شاید ان پر کسی جن کا سایہ ہو گیا ہے۔ غالباً وہ آپؐ کو بہکانے کی کوشش کرتی، جھوٹے دلاسے اور تسلی دے کر اس بات پر قائل کر لیتی کہ یہ صرف دماغ کا مکر ہے۔ اس بابت پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، صبح ہوتے ہی سب کچھ ٹھیک ہو رہے گا۔

مگر، خدیجہ نے عام عورتوں کی طرح جذباتی ردعمل کی بجائے خاصی پختگی اور بالغ نظری کا مظاہرہ کیا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ شاید ان کے لیے بالآخر اس واردات کا پیش آنا، ہمیشہ سے ہی متوقع چلا آ رہا تھا۔ شاید، وہ پہلے سے ہی اس کے لیے ذہنی طور پر تیار تھیں۔ وہ محمدؐ سے محبت رکھتی تھیں تو وہ ان کو بڑھ کر جانتی تھیں۔ محمدؐ میں وہ خوبیاں دیکھتی تھیں جن سے محمدؐ خود بھی ابھی تک منکسر المزاج طبیعت کے باعث آشنا نہیں تھے۔ اسی لیے جب محمدؐ نے خدشہ ظاہر کیا کہ وہ جنون میں مبتلا ہو چکے ہیں تو خدیجہ نے سر جھٹک کر کہا، 'خدا انہیں جنون سے محفوظ رکھے'۔ مزید کہا، 'اللہ آپؐ کے ساتھ کبھی ایسا کچھ نہیں کرے گا۔ وہ آپؐ کی سچائی، امانت داری اور نرم خو طبیعت سے خوب واقف ہے۔ ایسا قطعاً ممکن نہیں ہے۔' اسی طرح، جب محمدؐ نے خدیجہ کو پوری روداد سنا دی تو انہوں نے جواباً نہایت اطمینان سے زور دے کر کہا، 'وہ ذات جس کے قبضے میں میری جان ہے، مجھے امید ہے کہ آپ لوگوں کے لیے خدا کے پیغمبر مقرر کیے گئے ہیں'

خدیجہ نے صبح طلوع ہونے تلک محمدؐ کو یوں ہی تھامے رکھا۔ کافی دیر کے بعد آپؐ پر طاری لرزہ اور خوف کم ہوتا گیا۔ آپؐ کا سر خدیجہ کی جھولی میں بھاری ہوتا گیا اور تھکاوٹ کے باعث جلد ہی گہری نیند سو گئے۔ خدیجہ نے یہ تسلی کر لینے کے بعد کہ محمدؐ اب کچھ دیر آرام سے سوتے رہیں گے، آپ نے انہیں بستر میں لٹا کر کمبل اوڑھا دیا۔ پھر خود چادر اوڑھ کر منہ اندھیرے ہی گھر سے باہر نکل گئیں۔ آپ کا رخ اپنے چچازاد ورقہ کے گھر کی طرف تھا۔ آپ نہایت اطمینان سے مکہ کی گلیوں میں تنہا ہی گزرتے ہوئے، جب سارا شہر ابھی تک غنودگی میں ڈوبا ہوا تھا، صبح کی پہلی پو کے ساتھ ہی ورقہ کے گھر پہنچ گئیں۔ ورقہ، جو گروہ حنفا میں سب سے عمر رسیدہ تھے، انہوں نے بھی اس بات کی تصدیق کر دی جو وہ پہلے سے جانتی تھیں۔ یعنی، محمدؐ پر طاری ہیبت اور جنون کا خوف دراصل اس بات کی سچائی تھی کہ یہ جنون نہیں

بلکہ الہام ہے۔ اب وہ ایک عام شخص نہیں رہے تھے۔ بلکہ وہ سینکڑوں دوسرے روحانیت پسندوں کی طرح بھی نہیں رہے تھے جو تقدیس کی بو میں لتھڑے لاکھوں عام انسانوں سے کہیں برتر سمجھے جاتے تھے۔ بلکہ، جیسا کہ بعد ازاں قران میں پکارا جائے گا، 'پیغمبر خدا'، 'لوگوں میں سے ہی ایک آدمی' مگر ایک ایسا آدمی جسے اچانک، یکدم ہی اتنی بھاری بھر کم ذمہ داری سونپ دی گئی تھی۔

خدیجہ کے چچازاد کا جواب ان کے لیے غیر متوقع نہیں تھا۔ ورقہ نے کہا، 'اے خدیجہ، اگر تم نے جو احوال بیان کیا ہے وہ سچ ہے تو پھر میں تصدیق کر سکتا ہوں کہ یہ وہی پاک روح، ناموس ہے جو اس سے پہلے قدیم دور میں موسیٰ کے سامنے ظاہر ہوئی تھی اور بے شک محمدؐ لوگوں کے لیے خدا کے پیغمبر ہیں۔ بلاشبہ وہ اچھے دل کے مالک ہیں۔'

جب خدیجہ ورقہ کے یہاں سے واپس اپنے گھر کی طرف جاتی ہوں گی، یقیناً ان کا دل بوجھل ہو رہا ہو گا۔ وہ اس بات سے آگاہ تھیں کہ ادھیڑ عمری میں ایک میاں اور بیوی کے بیچ، جب کہ اب دونوں ہی عمر کے آخری حصے کی طرف گامزن تھے۔ عام حالات میں شاید اکٹھے بوڑھے ہوتے مگر اب ان کے بیچ ایک ایسی چیز آ چکی تھی جو نئے دور کی کنجی ثابت ہو سکتی تھی۔ اب، جبکہ وہ بچے پیدا کرنے، یعنی تخلیق اور پالنے، مراد ذمہ داری کی عمر سے گزر چکی تھیں مگر پھر بھی وہ دیکھ سکتی تھیں کہ ان کے گھرانے میں ایک ایسی چیز جنم لے رہی ہے جو بنیاد کے لحاظ سے نئی تو تھی مگر وہیں اس کی جڑیں اتنی قدیم روایت سے جا کر ملتی ہیں۔ یہ اپنے آپ میں ایک ہیبت ناک بات تھی۔

یہ بات تو طے ہے خدیجہ کو کسی بھی قسم کا کوئی وہم اور نہ ہی خوش فہمی لاحق تھی۔ گو خدیجہ اس خوف کے پیمانے کا تو اندازہ نہیں لگا سکتی تھیں جو پچھلی رات محمدؐ کو پیش آیا تھا مگر بہر حال محمدؐ کے انتہائی قریب ہونے کی وجہ سے اس کے سوا بھی ایک خوف کو آتا دیکھ رہی تھیں۔ خود خدیجہ کے لیے ذاتی طور پر یہ خوف خاصا ہولناک تھا۔ خالصتاً انسانی خوف کہ شاید محمدؐ سے پالی جانے والی یہ بہت بڑی توقع ہے یا پھر خدانخواستہ محمدؐ اس بھاری بھر کم ذمہ داری کو پورا نہ کر پائے، تو کیا ہو گا؟ اسی طرح اگر وہ خود اور ورقہ اپنی رائے میں درست تھے تو پھر محمدؐ نے آج دن تک جتنی بھی عزت و اکرام بیحد محنت اور جان جوکھوں میں ڈال کر مشقت کے بعد کمایا تھا، اس کو بھی شدید خطرات لاحق تھے۔ محمدؐ ایک بار پھر غیر متعلق، بیگانے ہو کر رہ جائیں گے۔ شاید، اب کی بار تو ان کی حیثیت ایک اچھوت کی ہو جائے۔ اس بار وہ صرف نظر انداز نہیں کیے جائیں گے بلکہ ان کو زبردست مخالفت، دباؤ کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ان کا ٹھٹھا اڑے گا اور لوگ آپؐ کی تضحیک اور توہین پر اتر آئیں گے۔ عزت اور مقام تار تار ہو رہے گا اور عظمت و منزلت رد کر دی جائے گی۔ وہ قلیل ہی سہی مگر، عاجزی سے بھرپور سکون جو محمدؐ نے اتنے سالوں کی محنت اور انتظار کے بعد بالآخر پایا تھا، چھن جائے گا اور اس بات کی بھی کوئی ضمانت نہیں تھی کہ آیا وہ یہ سکون اور طمانیت پھر سے حاصل کر پائیں گے؟

حصہ دوم: جلاوطن

باب: 8

بعد اس رات کے، دو سال تک کچھ نہیں ہوا۔ توقع تو یہ تھی کہ شاید اب وحی تواتر سے نازل ہونا شروع ہو جائے گی۔ جس طرح کلیشے استعمال ہوتا ہے کہ چشمہ پھوٹ پڑا ہے یا پھر وہ سانس جو جاری ہوئی تھی، اب مسلسل چلتی رہے گی۔ مگر، توقعات کے برعکس دو سال تک مکمل خاموشی رہی۔ محمدؐ کے لیے ان دو برسوں پر محیط زمانے کی مثال بنجر زمین کی سی تھی۔ اس عرصے کے دوران آپؐ صرف اپنے ساتھ پیش آنے والی واردات بارے صرف سوچتے ہی رہ گئے۔

ایک ایسا شخص جو زندگی کے ابتدائی سالوں میں ہی دو بار یتیم ہو چکا تھا۔ اس کے لیے یہ دو برس گویا ایک بار پھر ترک کر دیے جانے کے مترادف تھے۔ محرومی سے بھرے بچپن کے اثرات مکمل طور پر کبھی ختم نہیں ہو سکتے۔ لاتعلق ہو جانے کا احساس، بھرپور کوشش کے باوجود بھی باقی رہتا ہے۔ اس محرومی کو اندر ہی اندر دھکیل کر دبایا تو جا سکتا ہے مگر اس کا مکمل طور پر خاتمہ ممکن نہیں ہوتا۔ محمدؐ کے لیے اس عظیم الشان رات میں ایک نیا در تو وا ہوا تھا۔ مگر کھلنے کے ساتھ ہی ایک دم پھر سختی سے بند ہو گیا تھا۔ آپؐ کو جو رتبہ عطا کیا گیا تھا، اب ایسا لگ رہا تھا کہ کوئی انکائی آ گئی ہے۔ نتیجتاً، محمدؐ ایک مہیب تنہائی کا شکار ہو گئے۔ الہامی آواز کو ایک بار پھر سننے کی شدید خواہش دل میں لیے، یاس میں مبتلا ہو گئے۔

'یہ روح کے لیے ایک سیاہ رات ہوتی ہے۔' یہ عبارت صدیوں بعد سینٹ یوحان صلیبی نے درد، تنہائی اور شبہ کی کیفیت میں مبتلا ہو جانے والے ان صوفیاء کے لیے استعمال کی تھی جو تقدیس کا تجربہ، روحانیت کے درجات میں مقام حاصل کرنا چاہتے تھے۔ یہاں شبہ پر زور دیا گیا ہے جو کئی لحاظ سے حقیقی ایمان اور یقین کے لیے ضروری ہے۔ گو، ایمان یا یقین کے ساتھ شک اور شبے کی اصطلاح کا استعمال پہلی نظر میں چونکا دینے والا معلوم ہوتا ہے مگر ان خدشات پر غور کریں جو اس کے بغیر مذہب کو لاحق ہو سکتے ہیں۔ مذہب انتہاپسندی، کٹرپن اور بے رحم حد تک غیر انسانی شکل اختیار کر سکتا ہے۔ جس طرح گراہم گرین نے اپنے ناولوں میں ان لوگوں کی طرف اشارہ کیا تھا جو ایمان اور یقین کے ساتھ تگ و دو میں مصروف رہتے ہیں، ان کے لیے اس معاملے میں شبہ، ایمان کا قلب بن جاتا ہے۔ یہ شبہ ہی ہے جو مذہب کو بشری صفات عطا کرتا ہے۔ ایک لحاظ سے کہیے تو اس کی مثال ایمان کی آگ میں حرارت کی ہے۔ اس کے بغیر مذہب میں صرف اور صرف خوفناک قطعیت باقی رہ جاتی ہے۔ آدمی اپنی اصلیت یعنی انسانیت اور خیال سے عاری ہو جاتا ہے۔

مشہور ڈنمار کی فلسفی، سورین کیرکغور نے کہا تھا کہ اندھے یقین کے لیے کسی اعتقاد کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ایک اونچے درخت کی کمزور شاخ پر سوار ہو کر اس کے نہ ٹوٹنے کا یقین رکھنا صرف اور صرف قطعی اجڈ پن اور سادگی سے ممکن ہے۔ مگر دوسری جانب، اسی کمزور شاخ پر یہ جانتے ہوئے کہ اس شاخ کے ٹوٹنے کا امکان موجود ہے، پھر بھی چڑھ جانا در اصل ایمان یا یقین ہے۔ آپ اپنی سہولت کے لیے اسے خدا پر ایمان یا پھر قسمت پر یقین اور اگر کچھ نہیں تو اوسط قوانین قدرت میں ممکنات سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ جہاں قطعیت سے مراد سوچنے، سوال اٹھانے اور استدلال سے انکار ہے، قران بھی حکم دیتا ہے کہ بے اعتقادی یا کفر کے ساتھ بھڑنے، مثال سقراطی مکالمے سے گریز کرو تو وہیں، ایمان سے متعلق سمجھ بوجھ میں غلطی، بھول چوک کے امکانات میں چوکس رہنا، اس بارے آگاہی بھی بنیادی ضرورت بن جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شاید 'عبرانیوں کے نام خط' میں ایمان کی تعریف یوں ہے کہ، 'ایمان کے معنی ہیں کہ جن چیزوں کی امید ہو اس پر یقین اور جو چیز ہم دیکھ نہیں سکتے، اس کی حقیقت کو ماننا'

خود سے متعلق شبہ کے بغیر ایمان صرف ایک جہت بن کر رہ جاتا ہے۔ صادق اور مستقیم ہونے کا قطعی یقین بالآخر لڑھک کر پارسائی کا جن اور خودسری کا دیو بن جاتا ہے۔ بدترین صورت یہ ہوتی ہے کہ آخرکار راستگی کا تکبر آن گھیرتا ہے۔ غور کیجیے، ورقہ نے کہا تھا، 'اے خدیجہ، اگر تم نے جو احوال بیان کیا ہے وہ سچ ہے تو پھر۔۔۔' اسی طرح خدیجہ کے الفاظ، 'مجھے امید ہے کہ آپؐ لوگوں کے لیے خدا کے پیغمبر مقرر کیے گئے ہیں۔۔۔' دونوں ہی صورتوں میں، 'اگر' اور 'امید' وغیرہ کے تخاطب سے ان اصحاب کا بیان مشروط ہے۔ ان کو یقین تو ہے مگر پھر بھی امکانات کو لے کر قدرے تذبذب کا شکار ہیں۔ اگر تو محمدؐ پر اس رات کے فوراً بعد وحی تواتر سے نازل ہوتی رہتی تو یقیناً پہلی کی بھی تصدیق ہو جاتی مگر یہاں ہفتے اور پھر مہینے گزرتے گئے مگر کوئی نیا الہام نہ آیا۔ چنانچہ، تقریباً دو برس تک محمدؐ امید اور ناامیدی کے بیچ معلق رہے۔

اس عرصے کے دوران مکہ کی اشرافیہ بھی حالات کو لے کر شک و شبہ کا شکار تھی مگر ان کے لیے نوعیت مختلف تھی۔ شمال میں دنیا تیزی سے بدل رہی تھی۔ مستقبل کے بارے میں جس طرح محمدؐ ذاتی طور پر بے یقینی کا شکار تھے، بالکل ویسے ہی اہلیان مکہ کو بھی اجتماعی سیاسی اور معاشی مسائل میں اشتباہ کا سامنا تھا۔ بازنطین اور فارس کی سلطنتوں کے بیچ چپقلش اور حکومت ہتھیانے کی کشمکش ایک عرصے سے جاری تھی۔ مگر، اب یہ صورتحال خاصی تیزی سے بگڑ رہی تھی۔ 610ء میں ہرقل نے اپنے پیشرو کو تخت سے الگ کر کے خود کو بازنطینی سلطنت کا نیا شہنشاہ مقرر کر دیا تھا۔ سلطنت کا انتظام سنبھالتے ہی اس نے فارس سے بازنطینی علاقے واپس لینے کا اعلان کر دیا تھا۔ دوسری جانب فارس میں یہ ساسانی شہنشاہ خسرو دوم کا دور چل رہا تھا جو عام طور پر 'پرویز' کے نام اور 'فاتح اعظم' کے خطاب سے مشہور تھا۔ یہ خطاب پرویز کو پے در پے فتوحات کی بناء پر عطا ہوا تھا۔ پرویز کی کمان میں افواج فارس نے پہلے عراق اور قفقاظ، پھر شام اور مشرقی اناطولیہ (آج اناطولیہ میں ترکی اور ارمینیا کے ممالک ہیں) فتح کر لیے تھے۔ شمال سے آنے والے زائرین اور تجار اپنے ساتھ یہ خبریں لا رہے تھے کہ جلد ہی افواج فارس یروشلم اور دمشق پر دھاوا بول دیں گی۔ اگر ایسا ہو جاتا ہے تو پھر مکہ کی تجارت کا سارا نظام درہم برہم ہو کر رہ جائے گا۔ مکہ کے تجار کو دمشق میں قائم ہونے والی نئی حکومت اور حکام کے ساتھ نئے سرے سے روابط اور تعلقات بنانے اور تجارتی راہداری کو متحرک رکھنے میں خاصا عرصہ لگ سکتا تھا۔ محفوظ اور منافع بخش تجارت کے لیے سیاسی استحکام سب سے پہلی ضرورت ہوا کرتی ہے، جو اس سے پہلے بغیر کسی تردد کے ہمیشہ ہی دستیاب رہی تھی۔ مکہ کو تجارت کے لیے صرف سفارت کاری اور اعتماد بحال کرنے کی طویل مشق سے گزرنا پڑا تھا۔ مگر اب چونکہ یہ استحکام مفقود ہو رہا تھا تو شاید ساری محنت اور سفارت اکارت ہو جانے کا اندیشہ لاحق ہو گیا تھا۔

محمدؐ اپنے گرد بڑھتی ہوئی اس سیاسی اور معاشی بے یقینی سے یقیناً آگاہ تھے۔ کعبہ کے احاطے میں حالات حاضرہ کا تذکرہ چوبیسوں گھنٹے جاری رہتا تھا۔ اسی طرح، مکہ کی تجار کو نسل کا تقریباً وقت شمال میں، دمشق کی جانب روانہ کیے جانے والے تجارتی قافلوں کی حفاظت اور منزلت بارے غور و فکر میں صرف ہوتا تھا۔ یعنی، یہ انجمن ممکنہ طور پر بدتر ہو جانے والے حالات سے نبٹنے کی تیاری میں مشغول رہا کرتی تھی۔ لیکن، ان تیاریوں اور غور و فکر میں محمدؐ کو شامل نہیں کیا جاتا تھا کیونکہ اول تو آپؐ اول تو مکہ کے قیادتی کردار میں نہیں تھے۔ پھر، حرا کی پہاڑی پر پیش آنے والے واقعہ کے بعد سے محمدؐ کے لیے ذاتی طور پر بطور آڑھتی تجارتی سرگرمیاں جاری رکھنا تقریباً ناممکن ہو چکا تھا۔ محمدؐ خود کو اس کام کے لیے نہ تو توانا اور قابل پاتے تھے بلکہ آپؐ کی تجارت میں دلچسپی بھی ختم ہو کر رہ گئی تھی۔ بجائے، اب آپؐ حرا کی پہاڑی پر زیادہ سے زیادہ وقت گزارنے لگے۔ ان کو یہ امید تھی کہ وہ آسمانی، الہامی آواز جو گم ہو کر رہ گئی تھی۔ کسی روز، ایک بار پھر آپؐ سے مخاطب ہو گی۔ مشکل یہ تھی کہ آپؐ جس قدر توجہ اور دلجمعی سے تلاش کرتے، عبادت میں مشغول رہتے، موجودگی اور عبدیت کا احساس اتنا ہی کم تر محسوس ہوتا جاتا تھا۔ محمدؐ کو ہر روز طلوع ہونے والی نئی صبح کے ساتھ مایوسی کا منہ دیکھنا پڑتا۔ شدید ناکامی کا احساس اور دل کو توڑ دینے والی آگاہی کا سامنا کرنا پڑتا کہ شاید آپؐ کا اس بابت پہلے پہل گماں، یعنی جنوں کا شکار ہونے والی بات، غالباً درست تھی۔

اگر محمدؐ یہ سمجھتے تھے کہ یہ ان کے استقلال اور مضبوطی کا ایک امتحان تھا تو یقیناً، محمدؐ کو یہ احساس در کر آتا ہو گا کہ وہ اس آزمائش میں بری طرح ناکام ہو رہے ہیں۔ یا شاید، یہ صرف اور صرف ان کے اپنے خوف کا امتحان تھا؟ ریڑھ کی ہڈی میں بیٹھ جانے والا یہ سرد خوف کہ شاید آپؐ کو، وحی اور الہام کا وہ زبردست تجربہ دوبارہ حاصل نہیں ہو سکے گا۔ ان کی قسمت میں یک بار، صرف اور صرف یہی سرسری جلوہ تھا جو وہ پہلے ہی تجربہ کر چکے تھے۔ ڈر یہ تھا کہ جو ناقابل تصور تحفہ عطا ہوا تھا، اب واپس لے لیا گیا ہے۔ یا پھر، آپؐ کو یہ احساس بھی ہوتا ہو کہ شاید، پہلے پہل وحی کی سچائی پر یوں شک کرنے کی سزا دی جا رہی تھی۔ کیونکہ، آپؐ کو یہ گماں ہوا تھا کہ شاید وہ جنوں کا شکار ہو گئے ہیں یا پھر ان پر کسی جن کا سایہ ہو چکا ہے۔ آپؐ کو یہ شبہ بھی ہوا تھا کہ وہ شاعر ہیں یا پھر یہ انسانی ڈر بھی تھا کہ غالباً آپؐ سے بہت بڑی توقع پال لی گئی ہے۔ اس کے علاوہ، یہ خیال بھی تو کوندا ہی تھا کہ شاید مکہ کے بازاروں میں آپؐ کا مذاق بن جائے گا۔ ٹھٹھے اڑیں گے اور جگ ہنسائی ہو گی۔ شاید، چند لوگ آپؐ سے ہمدردی کا اظہار بھی کرتے پھریں، جو انہیں قطعاً منظور نہیں تھا۔ چنانچہ، جس قدر آپؐ اپنے دل میں اس آواز کو ایک بار پھر سننے کی خواہش رکھتے تھے، اسی خواہش سے کئی طرح کے خوف بھی منسلک تھے۔ کیا جس چیز کو حاصل کرنے کی محمدؐ کو بے پناہ چاہ تھی، اسی سے بے انتہا خوفزدہ بھی تھے؟ پھر، یہ ہیبت طاری کر دینے والا تجربہ بھی تو رہا تھا۔ کیا وہ اس درد اور خوف کو دوبارہ سہ پائیں گے؟ محمدؐ اپنی زندگی کے آخری دور میں کہا کرتے، 'ہر بار وحی کے نزول میں مجھے ایسا محسوس ہوا کہ شاید میری روح کھینچ کر نکال لی گئی ہے۔۔۔' بھلا اس طرح کا خوف اور درد، بار بار کون سہنا چاہے گا؟ ورقہ نے کہا تھا، 'بلاشبہ وہ اچھے دل کے مالک ہیں۔ آپؐ سے کہو کہ اپنے دل کو مضبوط رکھے۔۔۔' یہ درست بھی تھا۔ نہ صرف روحانی اور اعصابی بلکہ جسمانی طور پر بھی، وحی جیسے شدید تجربے کا کھنچاؤ اور نفسیاتی دباؤ، ادھیڑ عمر شخص پر دل کا دورے کا باعث بھی بن سکتا تھا۔

بہر حال، محمدؐ کے روز و شب اسی بے یقینی کے ساتھ جوکھم میں گزر رہے تھے۔ وہ الفاظ ان کے اندر سے بر آمد ہوئے تھے یا غالباً وہ یقینی طور پر جیسا کہ انہوں نے محسوس کیا تھا، بیرون سے کسی بڑی ذات کے پڑھائے ہوئے تھے مگر ایک بات طے تھی کہ محمدؐ خود ان الفاظ کو کہنے، ادا کرنے کے قابل نہیں تھے۔ ایک ایسا لڑکا، جس نے خاموش رہ کر، پس منظر میں جینا، بقا قائم رکھنا سیکھ رکھا تھا، اس کو اچانک ایک آواز عطا کر دی گئی تھی۔ لیکن، کیا یہ خود محمدؐ کی آواز تھی جو عطا ہوئی تھی یا پھر یہ خدا کی آواز تھی؟ یا خدا، محمدؐ کے اندر بول رہا تھا؟ کیا خدا محمدؐ کا حصہ بن چکا تھا؟ کیا یہ مقدس الفاظ محمدؐ کے دل پر واقعی نقش کر دیے گئے تھے؟ ڈال دیے گئے تھے یا بجائے اس کے، محمدؐ کے اپنے الفاظ میں اب ربانی ذوالجلال کی جھلک تھی؟ آخر، انسان کہاں ختم ہوا اور خدا کی شروعات کس جگہ پر ہوئی؟ یہ حد کیا تھی؟ یا پھر یہ کس قدر بڑی حد تھی؟ جو بھی تھی، ربط نہ ہونے کی وجہ سے اب یہ مبہم ہو چکی تھی۔

یہ خاصا عجیب معاملہ ہے۔ اس کی روایتی تصویر خاصی لغوی ہے۔ یعنی، خدا نے محمدؐ سے کلام کیا یا من و عن کہیں تو، خدا محمدؐ کے ذریعے بولنے لگا۔ مگر جب محمدؐ وہ تھے جن کے ذریعے خدا بول رہا تھا تو پھر یقیناً آپؐ خود سے پوچھتے ہوں گے کہ کیا جو آواز وہ سنتے ہیں، ان کی اپنی آواز ہے جس کی اندرون ہی ہیئت بدل گئی ہے؟ یا کلام میں اس تبدیلی میں قطعی طور پر کسی بیرون، برتر ذات کا عمل دخل ہے؟ یا پھر، آخر میں، ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے؟ اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا؟ یا اس کو سمجھ پانا انسان کے بس کی بات ہی نہیں ہے؟

مسیحیوں کے فرقے 'عارفین' کی بصیرت نظر پر تاریخ کے تمام ہی لوگ، بالخصوص معرفت کو ماننے والے اور تصوف میں سلوک کی راہ پر گامزن سارے ہی روایتی منکر متفق چلے آ رہے ہیں۔ یہ نظریہ کچھ یوں ہے کہ مقدس روشنی، ہر انسان کے اندر پھوٹ سکتی ہے۔ لیکن اگر کچھ لوگ اس کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ اس قابلیت کے باعث شاید انسان اور خدائے ذوالجلال کے بیچ کوئی حد باقی نہیں رہتی، تو محمدؐ اس گھمنڈ اور زعم سے پوری طرح آگاہ، چوکس تھے۔ یہ گھمنڈ اور تکبر خطرناک حد تک انفرادی طور پر تباہی کا باعث ہو سکتا ہے اور اس کے اجتماعی اثرات سماج میں بگاڑ پیدا کر سکتے ہیں۔

دو برس کے عرصے میں محمدؐ کی ذاتی کوشش، مسلسل تفکر اور جاں گسل کے باعث بالآخر یہ ہوا کہ انہوں نے اس کیفیت کو یوں ہی قبول کر لیا۔ مطلب یہ ہے کہ جب تک یہ مشکل اور دقیق سوال خود ان کے اندر حل نہ ہو جاتے، آپؐ اپنے اندر یہ جواب تلاش لیتے، یہ سکوت، خاموشی یوں ہی رہنا طے تھا۔ کیوں کہ، بعد اس کے آپؐ پیغمبر اور رسول کہلائے جائیں گے۔ خدائے ذوالجلال کا مرسل ہوں گے۔ جو ان کی اپنی انسانی فطرت کے خلاف تھا۔ آپؐ بچپن سے ہی ایک ایسا لڑکا رہے تھے۔ جو پس منظر میں رہ کر حالات کے ساتھ گھلتا ملتا آیا تھا اور ہمیشہ ہی در پیش حالات سے سمجھوتہ کرنا ان کی عادت بن چکی تھی۔ اب ان کو نہ صرف یہ کہ خدا کے یہاں سے عطا ہونے والی اس شخصی قدر و منزلت کو قبول کرنے میں ظرف دکھانا تھا بلکہ پیش منظر میں رہ کر دنیا کی سفاک نظروں کا سامنا کرتے ہوئے بھی صبر، تحمل سے کام لینا تھا۔

چنانچہ، جب یہ ہو رہا تو بالآخر، اگلی وحی آ گئی۔ اس بار جو کلام نازل ہوا، اسے سورۃ الضحیٰ یا صبح کی سورت کہا جاتا ہے۔ اس سورت میں گیارہ مختصر مگر لبھانے والی آیات شامل ہیں۔ یہ کلام کچھ یوں تھا کہ،

'آفتاب کی روشنی کی قسم۔ اور رات (کی تاریکی) جب چھا جائے۔ کہ (اے محمدؐ) تمہارے پروردگار نے نہ تو تم کو چھوڑا اور نہ (تم سے) ناراض ہوا۔ اور آخرت تمہارے لیے پہلی (حالت یعنی دنیا) سے کہیں بہتر ہے۔ اور تمہیں پروردگار عنقریب وہ کچھ عطا فرمائے گا کہ تم خوش ہو جاؤ گے۔ بھلا اس نے تمہیں یتیم پا کر جگہ نہیں دی؟ (بے شک دی)۔ اور رستے سے ناواقف دیکھا تو رستہ دکھایا۔ اور تنگدست پایا تو غنی کر دیا۔ تو تم بھی یتیم پر ستم نہ کرنا۔ اور مانگنے والے کو جھڑکی نہ دینا۔ اور اپنے پروردگار کی نعمتوں کا بیان کرتے رہنا۔'

یقیناً، محمدؐ کو نہ تو ترک کیا گیا تھا اور نہ ہی وہ راہ راست سے بھٹک گئے تھے۔ اور ان آیات کو بغور دیکھیں تو گویا یہ دو سال کی مہیب خاموشی اور تنہائی کی تلافی معلوم ہوتی ہیں۔ یہ چند آیات، مستقبل کی پیشن گوئی بھی کرتی ہیں۔ تسلسل کا وعدہ کرتی نظر آتی ہیں۔ دھیان سے دیکھیں تو یہ تمول، فراوانی اور تغزل، غنائیت سے سرشار اور لبریز معلوم ہوتی ہیں۔ جس طرح کہا جاتا ہے کہ 'یہ حیرت ناک اور مسحور کن ہیں۔ زمین خود خدا کی تجلی معلوم ہوتی ہے اور اس میں انسان خدا کی بس ایک برگزیدہ مخلوق، یعنی اس کی حیثیت ایک خلیفہ، محافظ یا مہتمم کی ہے۔' یہ چند قرانی آیات اور باقی بھی تقریباً، اس دور میں نازل ہونے والے الہامی کلام میں دوسری کسی بھی مقدس کتاب کے برعکس قدرتی دنیا کی مثالوں، ماحول شناسی کا سہارا لیا گیا ہے۔ جس طرح ایک دوسری سورت، سورۃ الشمس میں کہا گیا، 'سورج کی قسم اور اس کی روشنی کی۔ اور چاند کی جب اس کے پیچھو نکلے۔ اور دن کی جب اسے چمکا دے۔ اور رات کی جب اسے چھپا لے۔ اور آسمان کی اور اس ذات کی جس نے اسے بنایا۔ اور زمین کی اور اس کی جس نے اسے پھیلایا۔ اور انسان کی اور اس کی جس نے اس (کے اعضاء) کو برابر کیا۔ پھر اس کو بدکاری (سے بچنے) اور پرہیزگاری کرنے کی سمجھ دی۔ کہ جس نے (اپنے) نفس (یعنی روح) کو پاک رکھا، وہ مراد کو پہنچا۔ اور جس نے اسے خاک میں ملایا وہ خسارے میں رہا'

یا پھر اس پراسرار عنوان والی سورت یٰسین میں کہا گیا، 'اور ایک نشانی ان کے لیے مردہ زمین ہے کہ ہم نے اس کو زندہ کیا اور اس میں سے اناج اگایا۔ پھر یہ اس میں سے کھاتے ہیں۔ اور اس میں کھجوروں اور انگوروں کے باغ پیدا کیے اور اس میں چشمے جاری کر دیے'۔ اسی طرح، مشہور و معروف چوبیسویں سورت، سورۃ النور میں زبردست طریقے سے انسان کے اردگرد کی تشبیہات استعمال میں لائی گئی ہیں، 'اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ (کائنات میں) اس کے نور کی مثال ایسی ہے جیسے ایک طاق میں چراغ رکھا ہو، چراغ ایک فانوس میں ہو، فانوس کا حال یہ ہو کہ جیسے موتی کی طرح چمکتا ہوا تارا، اور وہ چراغ زیتون کے ایک ایسے مبارک درخت کے تیل سے روشن کیا جاتا ہو جو شرقی ہو نہ غربی، جس کا تیل آپ ہی آپ بھڑکا پڑتا ہو چاہے آگ اس کو نہ لگے'

چونکہ تخلیق کی اسراریت ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ اسی لیے، ہر آیت کے بعد دوسری اور یکے بعد دیگر کئی آیات میں قدرتی اور ماحولیاتی اجزاء جیسے پہاڑوں، زلزلوں وغیرہ کی طاقت کا تذکرہ کیا جا رہا تھا۔ اسی طرح، برسنے والی بارشوں اور فصلوں کی عطا، دن اور رات کا سادہ تسلسل، سورج اور چاند، پھلت، زرخیزی اور قحط کا تذکرہ۔

الغرض، خدا کی موجودگی ثابت کرنے کے لیے ہر طرح سے انسانی ماحول، گرد و پیش سے ایک کے بعد دوسری مثال پیش کی جارہی تھی۔ یہی نہیں بلکہ اشاروں سے بھی، یکے بعد دیگرے، آیات کی شکل میں نشانی بیان ہونے لگی۔ قران کے بیان میں استعمال ہونے والی ہر عبارت کو آیت کہا جاتا ہے۔ آیت کا لفظی مطلب نشانی کے ہیں۔ چونکہ، خود یہ آیات بھی خدائے ذوالجلال کی موجودگی کی نشانی تھیں۔ اس لحاظ سے خود قران کو معجزہ قرار دیا گیا ہے۔

اوائل دور کے الہام اور وحی میں نازل ہونے والی آیات کی مثال نہایت عمدہ، نازک اور نفیس نظموں کی سی ہے۔ ان میں سے کچھ بہت ہی مختصر مگر اس قدر گہری ہیں کہ ان پر ہائیکو کا گماں ہوتا ہے۔ بعد ازاں، یہ آیات لمبی ہوتی چلی جائیں گی اور گہرائی کا ماپ در پیش معاملے کے مطابق کم یا زیادہ ہوا کرے گا۔ یہ طویل آیات، قران کو ایک کتاب کی شکل میں ترتیب دیتے ہوئے ان سورتوں کا حصہ بن جائیں گی جنہیں قران کے پہلے حصے میں شامل کیا گیا ہے۔ قران کی موجودہ ترتیب محمدؐ کے وصال کے بعد کی گئی تھی۔ یہ ترتیب تاریخ یا ادوار نزول کے مطابق نہیں بلکہ طویل سے مختصر، یعنی پہلے طویل اور پھر مختصر آیات کو جمع کیا گیا ہے۔ شاید، یہ اس وجہ سے ہے کہ اس طرح اس کلام کا جمالیاتی حسن اور بھی واضع ہو جاتا ہے یا پھر ارادہ یہ تھا کہ ہر آیت کو برابر وزن میں اس طرح ترتیب دیا جائے کہ اس میں بعد کے ادوار میں نزول کی ترتیب کی چنداں ضرورت باقی نہ رہے۔ اس بابت جو بھی وجہ رہی ہو، یہ بات طے ہے کہ قران کی یہ ترتیب عجمی لوگوں کے لیے خاصی مسحور کن ہے۔ اگر عجمی اس کلام کی پر اسراریت کو سمجھنا چاہیں تو ان کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ قران کو آخر سے پڑھنا شروع کریں تو حالیہ ترتیب کے مطابق اس کلام کے تراجم میں بھی بہاؤ دائیں سے بائیں جانب اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ جیسے، عربی زبان میں پڑھ رہے ہوں۔

پہلے چند برس تک محمدؐ کو وحی کے نزول سے قبل، اس کی آمد بارے اندازہ لگانے میں مشکل ہوا کرتی تھی۔ آیات کبھی تو پے در پے، آگے پیچھو نازل ہوتیں یا پھر کبھی کبھار ہفتے اور یہاں تک مہینے گزر جاتے اور کوئی نئی وحی نہ آتی۔ لیکن وحی کے اوقات نزول بارے پیشن گوئی میں ناقابلیت اس عمل کا باقاعدہ حصہ تھی۔ یہ اس کی خوبصورتی تھی۔ اگر تو وحی باقاعدگی سے نازل ہوا کرتی تو یہ گویا کسی مصنف کے روزمرہ معمولات میں سے ایک معلوم ہوتی جو ہر روز لکھنے کی سعی، مشق کرتا ہی ہے۔ یا شاید اس باقاعدگی پر مثال، انسان اور خدائے ذوالجلال کے بیچ ایک ایسی ٹیلی فون ہاٹ لائن کا گماں ہونے لگتا جس پر کبھی اور کسی بھی وقت ضرورت پڑنے پر رابطہ قائم کیا جاسکتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ آیات کے ذریعے ہی محمدؐ کو وحی کے نزول اور اس بابت احتیاط سے کام لینے کی تاکید کی گئی۔ جیسے ایک آیت، 'قران پڑھنے میں جلدی نہ کیا کرو۔ جب تک کہ تمہاری طرف اس کی وحی تکمیل کو نہ پہنچ جائے'۔ یا پھر، 'پس اپنے رب کا فیصلہ صادر ہونے تک صبر کرو' اور 'صبر کرو' اور 'صبر سے کام لو'۔ بلکہ، صبر کی تاکید تو قران میں بارہا کی گئی ہے۔ قرانی آیات کا نزول ایک طرح سے الہام کے ساتھ اس عمل کے دوران خود سپردگی اور اطاعت کا سبق بھی تھا۔ یہ سبق کہ بجائے ردعمل اور عجلت، صبر اور تحمل سے کام لے کر آیات کو کامل، ایک شکل میں ڈھلنے دیا کریں۔

یہاں، صرف وحی کے نزول کو خاطر میں لائیں تو ایک لحاظ سے محمدؐ کی مثال پیغمبر سے زیادہ ایک مترجم کی سی تھی۔ جو، وحی یا الہام یعنی بیان، تعریف اور سمجھ سے باہر شے کو انسانی سمجھ بوجھ کے مطابق شکل یعنی، الفاظ میں ڈھال دیتے تھے۔ مگر اس کے لیے انہیں انتہائی کڑے عمل سے گزرنا، تردد اٹھانا اور تگ و دو کرنی پڑتی تھی۔ پھر، وحی کی بدولت ہی محمدؐ کی شخصیت میں بھی ایک عجب رنگ، نکھار آتا جارہا تھا۔ وہ ایک ہی وقت میں منکسر المزاج مگر مصمم، ناتواں مگر متین و موثر، حیرت زدہ مگر بیدار مغز ہوتے جارہے تھے۔ بعض اوقات وحی کے دوران، سرد موسم میں بھی ان کے پسینے چھوٹ رہے ہوتے اور بسا اوقات وہ شدت سے کانپنے اور لرزنے لگتے۔ کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا کہ محمدؐ گھٹنوں میں سر دے کر گھٹنوں بے سدھ اور گہری سوچ میں ڈوبے بیٹھے رہتے مثال، 'بوجھ تلے دب کر رہ گئے ہوں'۔ کبھی کبھار ان کی آنکھیں اس طرح سکڑنے لگتیں جیسے یہ بے پناہ درد اور غم کا شکار ہوں۔ ایسے مواقع بھی آتے کہ خوف سے روئیں کھڑی رہ جاتیں اور آنکھیں پھیل رہتیں۔ وحی کے نزول کے دوران آپؐ کی کیفیت جو بھی رہا کرتی ہو، بعد اس کے جب الہام الفاظ کی شکل میں ڈھل رہا ہوتا تو وہ شدید ضعف اور کمزوری محسوس کرنے لگتے۔ پھر، جوں ہی یہ مرحلہ طے ہو جاتا تو آپؐ فوراً ہی ان الفاظ کو دنیا کے حوالے کرنے، سنانے کے لیے بیتاب ہو جاتے۔ درد اور تکلیف، وحی کے نزول کا

لازم حصہ تھا۔ اس کی مثال تخلیق یا جنم دینے کی ہے۔ محمدؐ ایک طرح سے خدا کے نازل کردہ الہام کو ایک کے بعد دوسری آیت، الفاظ کی شکل میں، جنم دے رہے تھے۔ آپؐ کے یہاں ایک معجزہ، یعنی قران جنم لے رہا تھا۔

پہلے پہل، محمدؐ یہ آیات صرف خدیجہ کو سنایا کرتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا کہ شاید وہ اس کلام کو دنیا کے ساتھ بانٹنے سے قبل ایک بار کسی سے صائب رائے لینا چاہتے ہوں۔ آپؐ کا یہ طریق اسی طرح پورے ایک سال تک یوں ہی جاری رہا تا آنکہ حکم آن پہنچا کہ خدا کے پیغام کو عوام تک پہنچایا جائے۔ ابن اسحاق کے مطابق، یہ حکم جبرائیل کے ذریعے ہی پہنچا اور اس بابت پوری تاکید اور مکمل راہنما اصول وضع کیے گئے تھے۔ تاکید یہ تھی کہ محمدؐ ایک دعوت کا انتظام کریں گے جس میں گندم، گوشت اور دودھ سے بنے کھانے پیش کیے جائیں گے۔ اس دعوت میں بنی ہاشم کے لوگوں کو بلایا جائے اور جب وہ سیر ہو کر کھالیں تو پھر محمدؐ ان کے سامنے اب تک نازل ہونے والی آیات کی تلاوت کریں۔

چنانچہ، ایسا ہی کیا گیا۔ اس دعوت میں، بنی ہاشم کے تقریباً چالیس مردوں نے شرکت کی۔ ان میں عبد المطلب کے تمام حیات فرزندان جن میں ابو طالب اور ابولہب بھی شامل تھے، شریک ہوئے۔ ابولہب کا مطلب 'شعلے کا باپ' کے ہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ابولہب کا یہ نام اس کی خصلت، یعنی غصہ ناک ہونے کی وجہ سے پختہ ہو گیا تھا۔ کئی لوگوں کا خیال ہے کہ ابولہب کا نام، آخرت میں اس کی جہنم کے شعلوں میں قطعی منزلت کے باعث پڑا ہے۔ جو بھی تھا، اس دعوت میں ابولہب نے اپنے نام کی بھرپور لاج رکھی۔

سب ہی لوگوں نے اس دعوت میں رغبت سے، سیر ہو کر کھانا کھایا۔ پھر جب وہ گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے تو اس دعوت کے میزبان نے تحمل اور سکون سے قرانی آیات کی دہرائی شروع کر دی۔ آپؐ آیات کو اونچی لے میں، 'سجع' نامی عربی نثر کے انداز میں پڑھ رہے تھے۔ تب تک، رائج عربی زبان میں سجع، یعنی شاعری کا تسلیم شدہ، مقبول ترین لہجہ ہوا کرتا تھا۔ اس لہجے میں غیب گوئی کی پراسراریت سموئی رہتی تھی۔ لفظ 'سجع' کے لغوی معنی 'کوک' یا 'غٹکنے' کے ہیں۔ لہجے کے اس نام کی وجہ وہ صوتی اثر ہے جو اس کو ادا کرنے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ زبان دان کسی بھی لہجے میں اس طرح کے صوتی اثر کو 'حتمی گردش آواز' کی اصطلاح سے موسوم کرتے ہیں۔ یعنی، بول چال میں اکثر الفاظ کے اختتام میں ایک حرف علت کا اضافہ کر دیا جاتا ہے جس کی وجہ سے بولنے والے کی سانس میں اور سننے والے کے کان کے پردوں پر اس لفظ کی صوت جھولتی، گھلتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر لفظ، اللہ کو ہی لے لیں۔ سجع کی بدولت لفظ الٰہ، اللہ بن جاتا ہے۔ محمدؐ کے زمانے کے تقریباً ایک صدی بعد زبان میں یہ نثری انداز، لہجہ معدوم ہو گیا کیونکہ تب تک شاعری بھی عملیت پسندی کا شکار ہو چکی تھی اور مشرق وسطی میں اب آرامی زبان کی بجائے، نسبتاً جدید عربی زبان کا دور دورہ تھا۔ عربی اب مخلوط، بین الاقوامی زبان بن چکی تھی۔ ساتویں صدی عیسوی میں بہر حال، قدیم آرامی زبان سے آراستہ اس بولی اور بالخصوص سجع کی خاصی پذیرائی کی جاتی تھی۔ یہ تو عام شاعری کی بات تھی ورنہ جب اس دعوت میں محمدؐ قران کے الہامی، فصیح اور بلیغ آیات کو نہایت ملائم اور شان سے پڑھتے ہوں گے تو اس صوتی اثر پذیری کا حال کئی درجے بڑھ کر رہا ہو گا۔ محمدؐ جیسے کم گو شخص کے منہ سے ان آسمانی آیات کی تلاوت سن کر جہاں باقی سب لوگ دم بخود، مستغرق اور ہکا بکا بیٹھے کے بیٹھے رہ گئے۔ تب بھی، ابولہب اٹھ کھڑا ہوا اور تلاوت میں مداخل ہو کر غضب سے احتجاج کرنے لگا۔ غصے میں چلا کر کہنے لگا، 'اس نے تم سب پر جادو کر دیا'۔ پھر، پیر پٹختے ہوئے وہاں سے رخصت ہو رہا۔

عرب معاشرے میں کسی کی مہمان نوازی، دعوت کو ٹھکرانا اور محفل سے یوں اٹھ کر چلے جانا، نہایت معیوب سمجھا جاتا تھا۔ یہاں تو ابولہب نے کسی عام میزبان نہیں بلکہ اپنے کنبے میں، سگے بھتیجے کی دعوت کے دوران اس قدر بد تمیزی اور بے ادبی کا مظاہرہ کیا تھا۔ روایتی طور پر اس طرح کی حرکت بیر اور دشمنی کا اعلان سمجھی جاتی تھی۔ چنانچہ، ابولہب کے رخصت ہوتے ہی ساری محفل درہم برہم ہو کر رہ گئی اور ہر طرف بڑبڑاہٹ، چہ مہ گوئیاں ہونے لگیں۔ محمدؐ بہر حال پر سکون رہے اور کسی بھی طرح سے حیرانگی یا پریشانی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ آپؐ نے نہایت آرام سے تمام شرکاء کو اگلے روز پھر کھانے کی دعوت پر مدعو کر کے محفل برخاست کر دی۔

اگلے روز، مہمانوں کو پھر وہی کھانا پیش کیا گیا اور محمدؐ نے اسی طرح قرانی آیات کی تلاوت شروع کر دی۔ آج تلاوت کے دوران کسی بھی قسم کا رخنہ نہیں ڈالا گیا کیونکہ ابولہب نے اعلانیہ اس دعوت میں شرکت نہیں کی تھی۔ بعد تلاوت کے، محمدؐ کنبے کے افراد سے یوں مخاطب ہوئے، 'اے عبدالمطلب کے بیٹو!' آپؐ نے توقف کے بعد بیان جاری رکھا، 'میں عربوں میں کسی ایسے شخص کو نہیں جانتا جو اس سے بہتر چیز تمہارے پاس لایا ہو، جو میں لے کر آیا ہوں۔ میں تمہیں اس دنیا کی سب سے بہترین شے پیش کرتا ہوں۔ مجھے خدا نے یہ پیغام تمہارے پاس پہنچانے کی ذمہ داری سونپی ہے۔ تم میں سے کون ہے جو اس کام میں میرا ساتھ دے گا؟'

پوری محفل میں سناٹا چھا گیا اور صرف ایک شخص نے آگے بڑھ کر حمایت کی۔ یہ قصہ ابوطالب کے بیٹے علی جو محمدؐ اور خدیجہ کے گھر کا حصہ تھے، ان کی زبانی آگے یوں بڑھتا ہے کہ، 'سب لوگ پیچھے ہٹ گئے۔ گو اس محفل میں موجود تمام اشخاص میں، میں سب سے چھوٹا، کوتاہ اندیش اور کمزور اور لاغر تھا مگر میں نے کہا، 'اے اللہ کے رسول، میں آپؐ کا مددگار ہوں گا۔' جواباً، محمدؐ نے اپنا ہاتھ میری گردن کی پشت پر رکھا اور گویا ہوئے، 'یہ میرا بھائی ہے۔ میرا نمائندہ اور تم میں میرا وارث ہے۔ اس کی بات سنو اور اس کی اطاعت کرو۔'

محمدؐ کے اس اعلان نے شرکاء پر قرانی آیات کے سحر کو توڑ کر رکھ دیا۔ 'وہ سب ہنس کر اٹھنے لگے 'علی بتاتے ہیں، 'انہوں نے ابوطالب سے کہا، 'محمدؐ نے تمہیں حکم دیا ہے کہ اپنے بیٹے کی بات سنو اور اس کی اطاعت کرو!' واقعی، محمدؐ کے اس اعلان کو آخر کون سنجیدہ سمجھتا؟ ایک باپ کو اپنے کمزور اور کوتاہ اندیش لڑکے کی بات سننے، اطاعت کا حکم بعید القیاس اور اوٹ پٹانگ بات معلوم ہوتی تھی۔ پھر، یہ حکم باپ کو اس کے منہ پر دے دیا گیا؟ سماج میں اس طرح کے مجاز اور اختیار کی کایا پلٹ سوچ سے باہر تھی۔ اس حکم کی مثال رائج الوقت روایات اور طریق کی صریحاً خلاف ورزی، بیوقوفانہ حد تک لکار تھی۔

بنی ہاشم کے افراد یقیناً محمدؐ کے گھر سے رخصت ہوتے ہوئے دماغی مختل سے سر جھٹک رہے ہوں گے۔ وہ سوچتے ہوں گے کہ شاید آڑھتی بن کر تجارت کرنے کی قابلیت کا گھمنڈ اب محمدؐ کے سر میں سما گیا ہے اور شاید، ان کی اوقات ابھی تک اونٹوں کی رکھوالی کرنے والے ایک کم تر لڑکے سے بڑھ کر نہیں تھی۔ انہوں نے محمدؐ کی مہمان نوازی، کھانے کی دعوت قبول کر کے انہیں عزت بخشی تھی۔ ان کو سننے کی حامی بھر کر مروت کا مظاہرہ کیا تھا اور یقیناً قرانی آیات کی تلاوت سن کر دم بخود بھی رہ گئے تھے مگر یہ اطاعت کا حکم تو ہرگز قابل قبول نہیں تھا۔ بلکہ، ناقابل یقین تھا۔

گزشتہ روز پیش آنے والے واقعے، یعنی ابولہب کے ناروا رویے کو بنی ہاشم کے افراد نے چاہے جس قدر بھی ناپسندیدہ نظروں سے دیکھا تھا، اب یہ بھی سوچنے لگے کہ شاید وہ اپنے تئیں محمدؐ کی تضحیک اور نامناسب رویے میں درست تھا۔ ان کے نزدیک محمدؐ کی یہ حرکت یقینی طور پر انہیں خود سے متعلق لاحق بڑائی اور عظمت کا دھوکہ تھا۔ وہ واقعتاً ایک دوسرے کو بتانے لگے کہ شاید محمدؐ مجنون ہے یا اس پر کسی جن کا سایہ ہو چکا ہے۔ اس محفل میں شامل تقریباً سب ہی لوگ اختلاف اور مخالفت پر متفق تھے اور یکساں مایوسی کا اظہار کرتے پھر رہے تھے۔ اپنے تئیں، یہ سوچ رہے تھے کہ اگر وہ محمدؐ کو مزید کچھ وقت دے دیں تو شاید وہ اپنی اوقات، جو اس میں واپس آ رہے گا۔

گو کسی بھی شخص میں بالمشافہ، ابوطالب کے منہ پر یہ کہنے کی جرات تو نہ تھی مگر پیٹھ پیچھے وہ ان سے ہمدردی اور تاسف کا اظہار کرتے کہ انہوں نے محمدؐ کو یتیمی میں پناہ دی تھی اور اچھی کفالت بھی کی تھی، مگر بہر حال وہ آپؐ کو بزرگوں، آباؤ اجداد کی عزت اور تکریم نہیں سکھا پائے۔ آباؤ اجداد کی یہ قدر اور منزلت، عزت اور تکریم عرب معاشرے کا بنیادی جز ہوا کرتی تھی۔ اس سے بھی بڑھ کر وہ ابوطالب پر افسوس کا اظہار کرتے کہ انہوں نے اپنے بیٹے علی کو بھی محمدؐ کے یہاں چھوڑ دیا تھا اور اب یہ کوتاہ اندیش، کمزور مخنی سا لڑکا، باپ کے سامنے کھڑے ہو کر اس بے ادبی کا مظاہرہ کر رہا تھا؟

لیکن، جب محمدؐ کے کنبے میں بڑی عمر کے افراد، بالخصوص چچا وغیرہ ان کی اس دعوت اور حکم کو رد کر کے گونگے بہرے بن چکے تھے وہیں، آپؐ کے چند نوجوان عم زاد اس دعوت پر لبیک کہنے کو تیار بیٹھے تھے۔ یہ بھی علی کی ہی طرح تھے جو قرانی آیات کو سن کر مبہوت رہ گئے تھے۔ چنانچہ، کئی جوان آپؐ کے ساتھ مکہ کے باہر وادی میں چھپ کر ملنے لگے اور عبادت میں شریک ہونے لگے۔ یہ عبادت جلد ہی اسلام کے شعائر میں سے ایک، تاریکی میں چھپ کر ادا کی جانے والی نماز تہجد بن جائے گی۔ گو، یہ لوگ کہنے کو عبادت میں مصروف تھے مگر جب ایک دن ابوطالب نے انہیں ایسا کرتا دیکھا تو وہ حیران و پریشان رہ گئے۔ حیرت سے پوچھنے لگے، 'اے بھتیجے! یہ کیا ہے؟'

محمدؐ نے اپنے چچا کو اس عبادت میں شامل ہونے کی دعوت دی۔ آپؐ ابوطالب کی منت سماجت کرنے لگے کہ عزا، لات اور منات جو کعبہ کے احاطے میں نصب تین اوتار تھے اور خدا کی بیٹیوں کے نام سے مشہور تھے، ان کو چھوڑ کر ایک خدا کی عبادت کریں جو 'بے نیاز' ہے۔ لیکن ابوطالب اگر چاہتے بھی تو شاید وہ ایسا نہیں کر سکتے تھے۔ کہنے لگے، 'بھتیجے، میں اپنے آباؤ اجداد کے طریق کو ترک کرنے سے قاصر ہوں۔'

'آباؤ اجداد کا طریق' در اصل وہ شے تھی جس کی بدولت قریش اب تک جڑے ہوئے تھے۔ ابوطالب کا اس بابت یوں متاسف ہونے کی وجہ وہ روایت تھی جس کو وہ للکار رہے تھے۔ مکہ میں یہ اصطلاح نہ صرف ابوطالب کے والدین بلکہ آباؤ اجداد کی پوری نسل سے جوڑ، ایمان اور طریق سے متعلق تھی۔ یہ آباؤ اجداد سارے قریش کے سانجھے تھے۔ ابوطالب کے لیے یہ شناخت اور وفاداری کا مسئلہ تھا اور ایک لحاظ سے گویا قبیلے اور قبیلے کے خدائی اوتاروں کو ترک کر دینا خود اپنی نفی، ذات کو ترک کرنے کے مترادف تھا۔ بہر حال، ابوطالب کے اندر اس دعوت کو لے کر یقیناً کچھ ہلچل ضرور مچی ہو گی۔ پھر، وہ نوجوانوں کے اس چھوٹے سے گروہ کی راست بازی اور خلوص سے بھی خاصے متاثر نظر آتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے محمدؐ اور ان کے گروہ کی کبھی بھی تردید، نفی حتیٰ کہ سرزنش تک بھی نہیں کی۔ ابوطالب نے محمدؐ کی دعوت تو قبول نہیں کی مگر بہر حال انہیں یہ یقین دہانی ضرور کرا دی کہ بھلے وہ آباؤ اجداد کے طریق سے ہٹ رہیں یا بہک جائیں وہ پھر بھی ان کی بطور بنی ہاشم کے سربراہ پناہ میں رہیں گے۔ ابوطالب نے کہا، 'بخدا، میرے ہوتے ہوئے تمہیں کوئی شخص بھی کسی بھی قسم کا حزن، نقصان نہیں پہنچا سکتا'۔ ابوطالب کا یہ اعلان اور وعدہ، ایک طرح سے یہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ وہ لاشعوری طور پر آنے والے وقت بارے کم فہم واقع ہوئے تھے۔ انہیں بگڑتے ہوئے حالات کا قطعاً اندازہ نہیں ہو سکا تھا۔

اس واقعے کی روداد ابن اسحاق اور ال طبری نے ایک ہی طرح سے بیان کی ہے مگر پھر بھی اس بیانیے کو پڑھ کر یہ خیال ضرور ہی آتا ہے کہ آخر ابوطالب اپنے بیٹے کو اس نئے طریق عبادت میں مشغول دیکھ کر کیسا محسوس کرتے ہوں گے؟ گو، ابوطالب نے خود ہی علی کو محمدؐ کے یہاں رہنے کی اجازت دی تھی اور یقیناً وہ اپنے بیٹے کی بہتری چاہتے تھے مگر وہ آخر کار باپ تھے۔ ایک باپ ہونے کے ناطے ان کو اس بابت فکر تو ضرور رہی ہو گی کہ ان کا بیٹا ایک ایسی طرف چل نکلا ہے جو اسے رائج رواجوں اور معاشرے کے طریق سے دور کر دے گا؟ اس کا کیا بنے گا؟ یہاں تو آباؤ اجداد کا طریق مکرم تھا، معاشرے میں اس یہ تکریم گہری سرایت کر چکی تھی اور سماج میں رتبے، حیثیت کا تعین بھی تو حسب اور نسب کی بنیاد پر طے ہوتا تھا۔ آخر، ان کا بیٹا یک دم ہی اس سماجی ڈھانچے سے کیونکر متنفر ہو سکتا ہے؟ ایک توجیہ یہ ہے کہ، ابوطالب کے لیے اپنے قبیلے، باقی کے کنبے اور تعلق داروں سے ربط، تعلق قائم رکھنا مجبوری تھی۔ وہ اپنے تجارتی معاملات کو لے کر مشکل سے دوچار تھے اور پھر کنبے کی سربراہی بھی ان کی ذمہ داری تھی۔ ایسے میں، بیرونی عوامل، جو ان کو روایت سے جوڑ کر رکھ سکتے ہوں، ابوطالب کے لیے انتہائی اہم تھے۔ بنیادی کلیہ تھے۔ چنانچہ، انہوں نے وہی کیا جو ان کے کنبے کی ضرورت تھی۔

دوسری طرف، ابوطالب کے لیے یہ حقیقت انتہائی تکلیف دہ رہی ہو گی کہ سگا بیٹا، اب ان کا نہیں رہا۔ وہ محمدؐ کا ہو چکا ہے۔ باوجود اس پریشان خیالی کے، ابوطالب نے یہ حقیقت تسلیم کر لی تھی۔ کیا اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ محمدؐ کو اپنے یہاں، رشتے سے انکار پر پشیمان تھے اور اس طرح ازالہ کرنا چاہتے تھے؟ یا پھر ان کے نزدیک محمدؐ اور

ان کے بیٹے کا یہ طور کسی بھی طرح سے سنجیدگی کا متقاضی نہیں تھا اور وہ وقت سے متعلق اس عام مقولے، 'یہ بھی گزر جائے گا' پر قائم تھے؟ ویسے بھی، مکہ اور گردو نواح میں ہر وقت مبلغوں اور نت نئے نظریے پالنے والوں کا آئے روز تانتا بندھا رہتا تھا۔ سب سے بڑی مثال خود حنفا کی تھی۔ یہ حنفا محمد ودہی سہی، مگر مکہ کی روایت میں شر انگیز ہی کہلائے جاسکتے تھے مگر ان کو پھر بھی بے ضرر شمار کیا جاتا تھا۔ مکہ کے ایوان اقتدار کو حنفا سے آج تک کوئی سنجیدہ خطرہ پیش نہیں آیا تھا۔ محمدؐ اور علی بھی شاید، ان کی ہی طرح بے ضرر رہیں گے۔ یا پھر، ابو طالب نے ایک باپ کی حیثیت سے سمجھوتہ کر لیا تھا؟ وہ اس بات کو بخوبی سمجھتے تھے کہ اگر وہ علی کو محمدؐ کا ساتھ نہ دینے پر مجبور کریں گے تو عین ممکن ہے کہ بیٹا صاف انکار کر دے۔ یہ صورتحال ایک باپ کے لیے اچھی خاصی ہزیمت کا باعث ہو سکتی ہے اور ویسے بھی کون نہیں جانتا کہ ایک نوجوان، نابالغ بیٹے سے زیادہ ہٹ دھرم اور ضدی دوسرا کوئی نہیں ہوتا۔ اگر علی ضد میں آکر بگڑ جاتے تو ابو طالب کے ہاتھ کیا رہ جاتا؟

پھر بھی، ابو طالب محمدؐ کے گروہ کو اس طریق میں دیکھ کر خاصے بے چین ہو گئے تھے۔ یہ نوجوان نہ صرف قران کی تلاوت کرتے تھے بلکہ ان آیات کو زبانی یاد کرتے رہتے۔ ابو طالب نے ان کو عبادت کرتے ہوئے بھی دیکھ لیا تھا۔ انہوں نے دیکھا کہ یہ نوجوان 'سلم' کی حالت یعنی اطاعت اور بندگی میں جھک کر کھڑے ہیں۔ 'سلم' سے ہی لفظ اسلام نکلا ہے جس کے معنی اطاعت، فرمانبرداری کے ہیں اور عربی زبان میں اسی لفظ کے کئی دوسرے معنی جیسے امن اور سلامتی وغیرہ کے بھی نکلتے ہیں۔ مگر عام معنی، اطاعت یا تسلیم کے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ یہ نوجوان کسی بھی طور زبردستی اطاعت یا تسلیم کرنے، فرمانبرداری پر مجبور نہیں کیے گئے تھے بلکہ وہ اپنی خوشی سے محمدؐ کے پیروکاری پر اتر آئے تھے۔ مگر پھر بھی، اس عبادت کا آسن ہر طرح سے انوکھا اور نرالا تھا۔ ماتھا زمین پر ٹیکے، بازو باہر کو پھیلا کر پشت ہوا میں بلند کیے ہوئے یہ عجب، اجنبی طریقہ تھا۔ اس کو دیکھ کر لگتا کہ جیسے کوئی جنگی قیدی، فاتح کے سامنے سربسجود ہے۔ جھکنے کا یہ انداز آج بھی قدیم آشوری فتح پریڈ کے تصویری نمونوں میں دیکھا جاسکتا ہے، جس میں قیدی بالکل اسی طرح فاتح بادشاہ کے قدموں میں گرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہاں بھی، سلم کا یہ آسن دراصل برتر ذات کے سامنے قطعی سپردگی اور دست برداری کی علامت ہے۔ اس طرز عبادت سے صاف اشارہ ملتا ہے جو اس لفظ یعنی، 'سلم' یا 'اسلام' کی روح اور اصل ہے۔ اس لفظ کے لغوی معنی یعنی اطاعت یا تسلیم سے عملی مراد عبادت کا یہی آسن ہے۔ چنانچہ، ابو طالب یہ طریق دیکھ کر ہکا بکا رہ گئے۔ اس وقت، ابو طالب کی بجائے کوئی دوسرا شخص بھی ہوتا تو یقیناً اسی طرح چونک جاتا۔ عرب میں کسی بھی شخص کے لیے، جو کہ سر اٹھا کر چلتا آیا ہو، معاشرے میں عزت و تکریم کا حامل ہو، فخر سے چوڑا پھرتا ہو، اس کے لیے ماتھے کو یوں ٹیک دینے سے بڑھ کر غیر عرب، غیر روایتی، انوکھی، نرالی بات کوئی دوسری نہیں تھی۔

بہر حال، اب ایک سال کے اندر ہی قرانی احکامات کے لہجے میں تاکیدی اور بے صبری کا عنصر واضح تھا۔ مثلاً یہ آیت، 'اے اوڑھ کر لیٹنے والے۔ اٹھو اور خبر کرو!'۔ یعنی، اب سوچ بچار، احتیاط اور رازداری کا وقت ختم ہو چکا تھا۔

اب محمدؐ کھلے عام یہ پیغام لے کر نہ صرف اپنے عزیز و اقارب بلکہ عام عوام سے مخاطب ہونے والے تھے۔ مکہ میں اس طرح کی تقاریر، خطاب اور ڈھنڈورا عام طور پر کعبہ کے احاطے میں کی جاتی تھی۔ پھر، اب کی بار محمدؐ جن آیات کی تلاوت کرنے والے تھے، وہ مدح سرائی اور خدائی نشانیوں سے کہیں بڑھ کر تھیں۔ یہ آیات، ساتویں صدی عیسوی میں مکہ کی حالت، آج کے وال سٹریٹ جیسی بن چکی تھی۔ یعنی، یہ آیات اس معاشرے میں رچی لالچ، مایوسی اور سماجی روکھے پن پر کڑی تنقید پر مشتمل ہوں گی۔ اب کی بار خدائی کلام اس معاشی اور معاشرتی تفریق پر ضرب ہوگا جو روز بروز مکہ کی اشرافیہ اور نچلے طبقے کے بیچ بڑھتی جارہی تھی۔

یہ نئی آیات بالآخر اشتعال انگیز حد تک سماج میں پھیلی ناانصافی اور بگاڑ کے خلاف شدید احتجاج بن جائیں گی۔ ان میں واضح طور پر غرباء، مساکین اور پسے ہوئے طبقات کی نمائندگی کی گئی ہے اور ان کے فلاح، بہبود اور حقوق کی ادائیگی کا مطالبہ پیش کیا جائے گا۔ پھر، انہی آیات میں دولت اور نفع، اختیار کے جھوٹے خداؤں کے ساتھ کعبہ میں نصب او تاروں اور نشانیوں کی پوجا کو بھی ترک کرنے کا حکم بھی سامنے لایا جائے گا۔ اسی طرح معاشرے میں بیٹوں کی بطور دولت اور میراث سمجھنے اور بیٹیوں کے حق سلب کرنے، انہیں جیتے جی زندہ گاڑنے کی بھی شدید الفاظ میں مذمت کی جائے گی۔ سب سے بڑھ کر، مکہ کے دولت مند طبقے کے تکبر اور

دولت سے رغبت کی طرف اشارہ کیا جائے گا۔ جیسے یہ آیت صاف بتاتی ہے کہ،'جس نے مال جمع کیا اور گن گن کر رکھا' یا وہ،'جو مال کی محبت میں بری طرح گرفتار ہو۔۔۔'اسی طرح ایک اور جگہ پر،'اور وہ مال و دولت کی محبت میں بری طرح مبتلا ہے۔۔۔'یا پھر یہ انتباہ کہ،'اور اس کا مال آخر اس کے کس کام آئے گا جبکہ وہ ہلاک ہو جائے؟'

اسی دور کی ایک اور آیت میں کچھ یوں بھی کلام ہوا کہ،'خوب جان لو کہ یہ دنیا کی زندگی اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک کھیل اور دل لگی اور ظاہری ٹیپ ٹاپ۔۔۔'یا پھر کہا گیا کہ صرف،'یہ تمہاری دولت اور تمہاری اولاد نہیں ہے جو تمہیں ہم سے قریب کرتی ہو،ہاں مگر جو ایمان لائے۔۔۔'مثال،ایک دوسری آیت،'یہ اللہ کا فضل اور اس کی مہربانی ہے کہ یہ چیز اس نے بھیجی،اس پر تو لوگوں کو خوشی منانی چاہیے۔ یہ ان سب چیزوں سے بہتر ہے جنہیں لوگ سمیٹ رہے ہیں۔'انجیل کے نسخے میتھیو یا متی میں یہ اعلان کہ،'مبارک ہیں وہ جو حلیم ہیں کیونکہ وہ زمین کے وارث ہیں'،تو قران کی اس آیت میں اٹھائی گئی واضح گونج معلوم ہوتا ہے کہ،'ہم یہ ارادہ رکھتے ہیں کہ مہربانی کریں ان لوگوں پر جو زمین میں ذلیل کر کے رکھے گئے تھے اور انہیں پیشوا بنا دیں اور انہی کو وارث بنائیں!'

مندرجہ بالا پیرے میں تمام ہی الہامی پیغامات اور اعلانات کو بغور دیکھا جائے تو اگر یہ انقلاب کا اعلان نہ بھی ہوتا،کم از کم اصلاحات کا مطالبہ ضرور تھا۔ ان آیات میں واضح اشارہ دیا گیا تھا کہ مکہ جس گمراہی اور تباہی کی جانب گامزن تھا،وہاں سے واپسی ممکن تھی۔ ابھی تک کچھ بھی بگڑا نہیں تھا۔ لوگوں کو اور کچھ نہیں بلکہ صرف سوچنے اور راست طریقے سے عمل کرنے کی ضرورت تھی۔'انہیں یاد دہانی کراؤ!'یعنی،محمدؐ کو حکم دیا گیا کہ انہیں وہ یاد دلائیں جو وہ کبھی جانتے تھے۔'انہیں کہو کہ غور کریں۔۔۔'یعنی،ان سے قبل مٹ چلی تہذیبوں کے آثار اور کھنڈرات پر غور کریں جو ان سے پہلے اپنی بد اعمالی اور بگاڑ کی وجہ سے زیر ہو چکے تھے۔'ان سے کہو کہ یاد کریں۔۔۔'یعنی ان اقدار کو یاد کریں جو اب عمل میں مفقود ہو چکی تھیں،اصل،'آباؤ اجداد کا طریقہ۔۔'تو وہ ہے جس کو یہ مکہ والے بھلا کر بیٹھے ہیں۔

ایک لحاظ سے یہ آیات انتباہ کے ساتھ،دعوت بھی تھیں۔ اہل مکہ کو سدھرنے کی اپیل کی گئی تھی اور انتباہ یہ تھا کہ الہامی پیغامات کو نظر انداز کرنے کے بھیانک نتائج بھی برآمد ہو سکتے ہیں۔ یہ بلاشبہ ایک پیغمبر کے ذریعے دیا جانے والا واضح پیغام تھا جو محمدؐ سے قبل تقریباً تمام ہی پیغمبروں،جیسے موسی سے لے کر عیسی تک ہر ایک کی روایت رہی تھی۔ جیسے یہ آیت کہ،'مسلمانو! کہو کہ:ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس ہدایت پر جو ہماری طرف نازل ہوئی ہے اور جو ابراہیم،اسماعیل،اسحاق،یعقوب اور اولاد یعقوب کی طرف نازل ہوئی تھی۔ اور جو موسی اور عیسی اور دوسرے تمام پیغمبروں کو ان کے رب کی طرف سے دی گئی تھی۔'در حقیقت،یہ رسالت مکہ کے باسیوں کے لیے اپنے آباؤ اجداد کے اصل پیغام کی طرف لوٹ جانے کے بارے تھی۔'مثال کے طور پر،ایک دوسری آیت میں کہا گیا،'حالانکہ اس سے پہلے موسی کی کتاب رہنما اور رحمت بن کر آچکی ہے،اور یہ کتاب اس کی تصدیق کرنے والی زبان عربی میں آئی ہے۔۔۔'یا پھر،'یہ اس سے پہلے تمام کتابوں میں بیان ہو چکا ہے۔ ابراہیم اور موسی پر نازل کردہ صحیفے میں۔۔۔'۔ الغرض،یہاں ہر طرح سے مکہ کے لوگوں کو منانے،ڈرانے کی کوشش کی گئی ہے۔ آیات میں اصل طریق خداوندی کی طرف واپس لوٹ جانے کی تاکید،سعی نظر آتی ہے۔

جس طرح پہلے کی الہامی کتابیں ہیں،یہاں بھی وہی ہوا۔ انصاف کے مطالبے پر شروع ہونے والا یہ احتجاج اسی طرح پر تشدد ہو گیا جس طرح اس سے پہلے پیغمبروں کے دور میں،جیسے عیسی کے ساتھ ہوا تھا۔ اس تحریک کے ساتھ یہ سلوک بھی کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی اور نہ ہی یہ کوئی حسن اتفاق تھا۔ جس طرح اس سے پہلے یہودیت اور اوائل دور میں عیسائیت کے ساتھ ہوا تھا،اوائل دور میں اسلام کو بھی اسی طرز اور شدت سے سماجی اور سیاسی نظام کی جانب سے مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ ناانصافی کے خلاف یہ احتجاج لازمی طور پر اس برتر مطالبے کا حصہ تھا جس میں ہر طرح کے لوگوں کی شمولیت،اتفاق،یگانگت،اور برابری کے ساتھ واحدانیت کی چھتری تلے بغیر کسی نسل،دولت،عمر اور صنفی امتیاز کے جمع کرنا تھا۔ یہی وہ عوامل،نظریات تھے جن کے سبب جلد ہی یہ تحریک محروم اور پسے ہوئے طبقات میں مقبول ہو گئی۔ یہ وہ طبقہ تھا جو مکہ کے شاہانہ انتظام میں مقام حاصل کرنے سے بوجوہ قاصر تھا۔ ان گروہوں میں ہر طرح کے لوگ جیسے غلام،آزاد کردہ غلام،بیوائیں،یتیم،

معاشرے سے کٹ چکے افراد اور سماجی تشدد کا نشانہ بننے والے افراد شامل تھے۔ پھر یہ پیغام نوجوانوں اور مثالیت پسندوں میں بھی برابر مقبول تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جو ابھی تک اس معاشرے کے کا پوری طرح نہ تو حصہ بن سکے تھے، (بلکہ انہیں اپنا مقام بنانے میں مشکلات کا سامنا تھا اور ان کے لیے مواقع بہت کم تھے) اور نہ ہی انہیں اس معاشرے کے طریق کا کچھ خاص علم، سمجھ تھی۔ پھر یہ قرانی آیات کی فصاحت اور بلاغت سے اچھے خاصے متاثر بھی تھے۔ اس تحریک میں ایک خدا کے سامنے سب لوگ برابر تھے اور تیرہ سالہ علی کا مقام مکہ کے باریش، عمر رسیدہ بزرگوں جتنا ہی اہم تھا۔ بیٹیوں کے حقوق، بیٹوں کے برابر تھے۔ افریقی غلام اور مکہ کے اشرافیہ میں جنم لینے والے کسی بھی نجیب الطرفین میں کوئی فرق نہیں تھا۔ الغرض، یہ تحریک ہر لحاظ سے بدلاؤ لانے کے اہل تھی اور یہ سماج میں بنیادی تبدیلیوں کا پرچار کرکے، اسے دوبارہ اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے کا نعرہ لے کر بلند ہوئی تھی۔

عملی طور پر دیکھا جائے تو یہ ایمان کے ساتھ سیاسی معاملہ بھی تھا۔ تینوں بڑے مذاہب کی الہامی کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک کی ابتدا اسی طرح اہل اقتدار اور اشرافیہ کے خلاف مقبول تحریکوں سے ہوئی تھی۔ چاہے یہ 'عبرانیوں کے نام خطوط' میں بیان کردہ بادشاہوں کا تذکرہ ہو، گرجا کے انجیل خوانوں کے قصے میں رومی سلطنت کا بیان ہو یا اب قران میں قبائلی اشرافیہ بارے کلام ہو۔ تینوں ہی مذاہب میں ابتدا انصاف کے تقاضے، ظلم اور عدم مساوات سے انکار اور وحدانیت کے پرچار سے ہوئی تھی۔ چنانچہ، ان مذاہب کی یہ ابتدائی دور کی تحریکیں کسی بھی طرح سے انتشار کا شکار ہو رہیں یا بنیادی مطالبے سے ہٹتی ہوئی محسوس ہوں بالآخر وقت کے ساتھ اصل مقصد کو لے کر منظم ہوتی چلی گئیں۔ تاریخی حقائق اس بات کے گواہ ہیں کہ آج جن مطالبوں کو ہم سماجی انصاف اور برابری سے موسوم کرتے ہیں، ایک وقت میں یہ وحدانیت کی بنیاد پر قائم ہونے والے عقائد کی نظریاتی اساس ہوا کرتی تھیں۔

لیکن، اگر قران واقعی اس سے پہلے نازل ہو چکی الہامی کتابوں کی توثیق تھی تو یہ بات صرف آفاقی پیغام کی حد تک درست تھی جو ہمیشہ سے ہی اس طرح کی تحریکوں کا بنیادی مطالبہ چلا آرہا ہے۔ مادی لحاظ سے بہر حال قران باقی کی تمام مقدس کتابوں سے مختلف تھا۔ مطلب یہ کہ، اس بار الہامی پیغام محمدؐ کے ذریعے، مثال یہ آیات کہ، 'عربی بنا کر نازل کیا گیا ہے' یا پھر، 'آسان کر کے تمہاری زبان میں نازل کیا ہے' یا پھر 'صاف صاف عربی زبان میں' یا 'تمہاری زبان میں سہل بنا دیا ہے'۔ اب کی بار، یہ یہودیوں کی عبرانی یا عیسائیوں کی یونانی زبان کے برعکس مکہ کی اپنی بولی، فصیح اور بلیغ عربی میں نازل کیا گیا تھا۔ پھر، اس زبان میں بھی وہ لہجہ اختیار کیا جا رہا تھا جو اس قدر شیریں اور رواں ہے کہ اس کے سامنے بڑے سے بڑے شاعر کا کلام ہیچ معلوم ہوتا تھا۔ دوسری کتابوں کے برعکس قران خود ہی اپنے آپ کو عربوں سے منسوب کر رہا تھا۔

یعنی، اب مکہ کے لوگوں کو 'اہل کتاب' کے سامنے دب کر رہنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اہل کتاب کی طرح اب ان کا شمار بھی اس گروہ میں ہوتا تھا جن کے لیے ان کی اپنی الہامی کتاب نازل ہو رہی تھی۔ نہ صرف یہ کہ یہ کتاب اس سے پہلے تمام کتابوں کی توثیق تھی بلکہ یہ تو ان کو مکمل کرنے کی دعویدار بھی تھی۔ وہ لوگ جنہوں نے اب تک اس کتاب کو تسلیم کر لیا تھا، ان کے نزدیک دوسری تمام وجوہات کے ساتھ، یہ ایک عظیم الشان روایت کا حصہ بننے کا سنہری موقع بھی تھا۔ وہ تاریخ کو رقم ہوتا دیکھ رہے تھے بلکہ اس کا مرکزی حصہ تھے۔ اس زمانے کے بعد ان کی قدر و منزلت بڑھ کر ہو گی۔ ان کا شمار یوں ہوا کرے گا کہ دراصل ان کی نسل اور وہ خود خدا کے چنے ہوئے لوگ ہیں جن پر خدا نے اپنا کلام نازل کیا ہے۔ جس طرح پہلی اقوام کو موقع دیا گیا تھا، اب خدا کی ان سے مخاطب ہونے کی باری تھی۔ نہ صرف یہ کہ خدا ماننے والوں کی اپنی زبان میں ان سے ہم کلام تھا بلکہ یہاں تو وہ ان کی شرائط، تقاضوں اور مطالبات کو سامنے رکھ کر، حمایت میں مخاطب تھا۔ ان کے حق میں بول رہا تھا۔

قران میں کہا جانے لگا کہ قدیم دور کی تمام ہی تہذیبیں ناکامی اور بربادی کا شکار ہو گئیں۔ بربادی کی وجہ یہ تھی کہ وہ انصاف کے بنیادی اصولوں سے بہت پہلے منحرف ہو چکے تھے۔ مثال کے طور پر یہودیوں نے خدائی احکامات سے منہ موڑ لیا تھا اور پیغمبروں کو نظر انداز کرتے آئے تھے۔ اس کے نتیجے میں انہیں اپنی ہی زمین

سے جلاوطن ہونا پڑا۔ یا پھر، عیسائیوں کی مثال سامنے تھی۔ چونکہ انہوں نے عیسیٰ کے پیغام کو بھلا دیا تھا، اسی لیے اب اپنی سلطنت کو بار بار ٹوٹتا اور بکھرتا ہوا دیکھتے چلے آرہے تھے۔ ہر طرف فارس کا چرچا تھا۔ یہ آتش پرست، بازنطینی سلطنت پر اپنی دھاک بٹھا رہے تھے۔ یہ تو دوسری قوموں کا معاملہ تھا۔ خود عرب قبائل انہی حالات سے دوچار ہوتے چلے آئے تھے۔ مثلاً، عاد اور ثمود کی عظیم الشان انباطی تہذیبوں کی جڑیں شمالی عرب میں اور جنوب میں یمن میں ملتی ہیں۔ یہ اقوام پیغمبروں کا مذاق اڑاتے اور انہیں زچ پہنچایا کرتے تھے۔ ان اقوام کو پیغمبروں کے ذریعے غرور اور تکبر سے روکا گیا تھا۔ مگر بالآخر، اسی تکبر کے ہاتھوں وہ تباہ بھی ہوگئے۔ اب، قرانی آیات کی مدد سے ایک بار پھر مکہ کو بھی تنبیہ کی جارہی تھی۔ ان آیات میں، مثال کے طور پر ان سے پہلے کی اقوام کی مثالیں کھول کر، واضح طور پر بیان کی گئی تھیں۔ یہ صرف بیان نہیں تھا بلکہ، قدیم تہذیبوں اور اقوام کی تباہی کے ثبوت بھی موجود تھے۔ یہ ثبوت، انباطی دور کے شہروں کے کھنڈرات تھے۔ مثلاًان میں سے ایک شہر، پترا کے کھنڈرات آج بھی جنوبی اردن میں مل جاتے ہیں۔ ان کا تذکرہ تو قران نے واضح کیا ہے۔ اسی طرح یمن میں صناء شہر کے باہر ماریب بند کی باقیات ایک دوسری مثال ہیں۔

محمدؐ کا یہ الہامی پیغام انفرادی طور خود آگاہی سے کہیں بڑھ کر تھا۔ یہ عرب معاشرے کی اجتماعیت سے بھی متعلق تھا۔ اس پیغام میں، واضح طور پر ان اقدار اور اخلاقیات کا عنصر ملتا تھا جو کبھی عرب کی شان، فخر ہوا کرتا تھا۔ چنانچہ، ان پیغامات میں کہیں نہ کہیں، شاندار ماضی کی مثالیں دے کر مستقبل پر نظر بھی ڈالی جارہی تھی۔ یہ ایک دعوت تھی۔ ایک روحانی دعوت جس کا مقصد، حال کے سماجی اور معاشی مسائل کا حل تلاش کرنا تھا۔ مختصراً، یہ خود آگاہی اور تقویٰ کے ساتھ ہر طور سے سیاسی اصلاح کی تحریک بھی تھی۔ اس تحریک میں پسے ہوئے طبقات کے لیے اختیار اور کئی دوسرے مواقع عیاں تھے۔

یہی نہیں، قران میں بدکاروں اور ظالموں کے محاسبے کا بھی وعدہ کیا جارہا تھا۔ یہ محاسبہ اگر دنیا میں نہ ہوسکا تو پھر قیامت کے دن پر اٹھا رکھا گیا تھا۔ مثال کے طور پر یہ آیت ملاحظہ ہو کہ، قیامت کے روز، 'دولت کسی کام نہ آئے گی۔۔۔' اور اسی طرح قران کی اکیاسویں سورت جو التکویر کہلائی جائے گی، کہا گیا، 'جب سورج لپیٹ دیا جائے گا۔ اور جب تارے بکھر جائیں گے۔ اور جب پہاڑ چلائے جائیں گے۔ اور جب دس مہینے کی حاملہ اونٹنیاں اپنے حال پر چھوڑ دی جائیں گی۔ اور جب جنگلی جانور سمیٹ کر اکٹھے کر دیے جائیں گے۔ اور جب سمندر بھڑکا دیے جائیں گے۔ اور جب جانیں (جسموں سے) جوڑ دی جائیں گی۔ اور جب زندہ گاڑی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا۔ کہ وہ کس قصور میں ماری گئی؟ اور جب اعمال نامے کھول دیے جائیں گے۔ اور جب آسمان کا پردہ ہٹا دیا جائے گا۔ اور جب جہنم دہکائی جائے گی اور جب جنت قریب لے آئی جائے گی۔ اس وقت ہر شخص کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ کیا لے کر آیا ہے؟' اس طرح کی آیات، قران میں جابجا بکھری ہوئی مل جاتی ہیں۔

قصہ مختصر، ہر لحاظ سے یہ آیات اور مطالبہ مکہ میں انتظام اور انصرام، حکام اور اشرافیہ پر بجلی بن کر گریں۔ ان کی وجہ سے مکہ کے صاحبان اختیار، اونچے طبقے میں اشتعال اور غضب پھیل گیا۔ چنانچہ، جس طرح قرانی آیات سے اس نئی دعوت اور تحریک کے پختہ اور رائج نظام کی بنیادوں کو ہلا دینے والے عزائم واضح ہو چکے تھے، خطرے کو بھانپ کر مکہ کی اشرافیہ نے بھی اسی طور اس نئے نظریے، تحریک کو آہنی ہاتھوں سے نبٹنے کا فیصلہ کر لیا۔

باب:9

آج کے جدید دور میں مسلمانوں کے لیے یہ بات سمجھ سے باہر ہے کہ مکہ کی اکثریت نے محمدؐ کا الہامی پیغام عام ہوتے ہی فی النور حمایت کا اعلان کیوں نہیں کر دیا؟ ایسا واقعی نہیں ہوا۔ در اصل جیسے آج ہے، ویسے ہی تب بھی رائج نظام ہی اکثریت کی بے عملی کی بڑی وجہ رہا تھا۔ جب تحفظ یا آسانی کا امکان موجود ہو، اسی انتظام کے ساتھ جڑا رہنا کسی نئے سماجی نظام کی بنیاد کا پتھر بننے کی نسبت آسان ہوتا ہے۔ چنانچہ، پہلے سال کے آخر تک محمدؐ کے پیروکاروں کی تعداد درجن بھر سے زیادہ نہیں

تھی۔ ان میں بھی مکہ کی اشرافیہ کا کوئی شخص شامل نہیں تھا بلکہ یہ چند لوگ نوجوان مرد، عورتیں، غلام اور آزاد کر دیے جانے والے غلام تھے۔ اس وقت تک شاید ہی کوئی کہہ سکتا ہو کہ اس تحریک کو مخالفت کی ضرورت بھی پیش آسکتی ہے۔

یہ شدید مخالفت کی بھٹی تھی جس میں پکنے کے بعد ہی مذہب اسلام گندن بن جائے گا۔ اگر، مکہ کی اشرافیہ نے محمدؐ کی پر زور مخالفت نہ کی ہوتی، اگر وہ نرچ کر دینے کے حربے استعمال میں نہ لاتے اور پر تشدد طریقے اختیار نہ کرتے، بلکہ آخر کار محمدؐ کی زندگی کے درپے ہو گئے تھے، تو شاید آپؐ اس دور کے کئی دوسرے مبلغین کی طرح جو اس سے پہلے اسی طرح کے روحانی تجربات کا دعویٰ کرتے آئے تھے، گمنام رہ جاتے۔ محمدؐ پر نازل ہونے والی وحی، الہامی آیات کبھی بھی زبانی یاد نہ کی جاتیں اور اسلام، ایک باقاعدہ مذہب کا روپ دھارنے کی بجائے وحدانیت کی تاریخ کی طویل داستان میں صرف ایک واقعہ بن کر رہ جاتا۔ یہاں تک کہ وحی میں بھی ابھی تک محمدؐ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا جاتا تھا کہ وہ صرف، 'ایک (اور) رسول'، 'دوسروں کے جیسا ہی ایک بشر'، 'تم میں سے ہی ایک خبردار کرنے والا' ہیں۔ قرانی آیات میں آپؐ کو، 'اول المسلمین' کا درجہ دیے جانے میں ابھی کئی برس، بہت سے مرحلے باقی ہیں۔ فی الحال تو یہ معاملہ کسی بھی طور آپؐ نہیں بلکہ الہامی پیغام کی پذیرائی اور اس کی منادی سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ لوگ جنہوں نے اس پیغام کی مخالفت کی اور انکاری تھے، انہوں نے بہر حال اسے محمدؐ سے متعلق بنا کر رکھ دیا۔ گویا، مخالفت سے انہوں نے آپؐ کے مقاصد کے حصول میں مدد کی تھی۔

ایک وہ وقت تھا جب محمدؐ خود کو لاحق خوف اور شبہ سے دوچار تھے۔ مگر اب شک کرنے والے، آپؐ خود نہیں بلکہ دوسرے لوگ تھے۔ اگلے چند سال، بھلے مایوس کن اور خطرناک صورتحال اختیار کر لیں یا خود محمدؐ کو اس دوران خدشات گھیر لیں، یہ بات یقینی تھی کہ آپؐ کسی بھی صورت پیچھے ہٹنے والے نہیں تھے۔ پہلی وحی کے بعد جس طرح مایوسی چھا گئی تھی اور پھر خدا نے دوسری وحی میں انتہائی دلفریب انداز میں تسلی بھی کرا لی تھی۔ تو اس کے بعد، اب آپؐ اپنے آپ سے کبھی مایوس نہیں ہوں گے۔ یہی نہیں بلکہ اب تو جس قدر مخالفت اور عداوت بڑھتی جائے گی، محمدؐ کے الہامی تعلیمات اور تحریک بارے ارادے مزید پختہ ہوتے چلے جائیں گے۔

مخالفین کا حال یہ تھا کہ اگر وحی میں صرف ارض و سما کی تخلیق بارے محور کن بیانات ہی نازل ہوتے رہتے تو شاید مکہ کی اشرافیہ اور بااختیار لوگوں کو آپؐ سے کوئی مسئلہ پیش نہ آتا۔ وہ اس سارے معاملے کو یکسر نظر انداز کر سکتے تھے۔ ان کے نزدیک، اس طرح کے الہامی پیغامات سے کسی کا کچھ بھی نہیں بگڑ سکتا تھا۔ بلکہ، وہ اس طرز الہام کو بے ضرر جانتے تھے۔ اسی طرح، انہیں ایک قادر مطلق خدا سے بھی کوئی مسئلہ نہیں تھا کیونکہ ان کی بسر ایک ایسے شہر میں تھی جہاں پہلے سے ہی برتر خدا کی تقدیس کی نشانی، جیتی جاگتی علامت، یعنی حرم کی شکل میں موجود تھی۔ مگر، قبائل سے منسوب انفرادی خدائی اوتاروں کی مثال شافع، خدا کے نمائندگان جیسی تھی۔ ان کی حکم برآری اور خدا سے نسبت تو ان کے ناموں میں بھی واضح تھی۔ مثال کے طور پر لات، منات اور عزا کو ملا کر 'خدا کی بیٹیاں' قرار دیا جاتا تھا۔ ایک خدا تک تو بات ٹھیک تھی، مگر اس کے سوا کوئی دوسری خدائی نشانی نہیں؟ یہ مکہ میں قبائلی شناخت پر حملہ تھا۔ یہ، 'آباؤ اجداد کے طریق' کے خلاف کھلی جنگ تھی۔

جس طرح لوگ خدا کے نام پر صفائیاں پیش کرتے اور قسمیں اٹھاتے تھے۔ بعینہ خدائی نشانات کو بھی خدا کی بارگاہ میں اپنا ضامن سمجھتے تھے۔ یہی نہیں بلکہ ان کی وجہ سے ہی اپنے باپ دادا کا نام لے کر بھی قسمیں اٹھایا کرتے تھے۔ شاید سننے میں عجیب لگتا ہو مگر کئی لوگ اس طرح کی قسمیں آج بھی اٹھاتے ہی ہیں۔ جیسے، 'میری ماں کی قسم' یا پھر، 'مرے ہوئے باپ کی قسم' وغیرہ۔ عملی طور پر نہ سہی مگر ان قسموں میں، جذباتی اور فلمی انداز دیکھنے کو مل ہی جاتا ہے۔ تب، محمدؐ کے زمانے میں خطہ حجاز و عرب میں یہ قسمیں صرف قسمیں نہیں تھیں بلکہ باپ دادا کی لازمی عزت و غیرت سے بھی کہیں بڑھ کر معاملہ رہا کرتا تھا۔ اس زمانے میں آباؤ اجداد سے گہری نسبت اور ان کے ناموں کو بارہا، ہر طرح کے بہانے سے دہرانے کی کوشش کی جاتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آج جدید دور کے انسان، بالخصوص مغرب کے لوگ اوائل دور اسلام کی اسلامی تصنیفات اور حوالہ جات کو سمجھنے میں شدید مشکل سے دوچار رہتے ہیں۔ تب شجرہ نسب اور آباؤ اجداد کے نام لے لے کر پکارے

جانے، مخاطب کرنے کا معاملہ، حالیہ دور کے روسی ناولوں میں استعمال ہونے والے مشکل اور طویل ناموں سے بھی کہیں زیادہ پیچیدہ ہوا کرتا تھا۔ مشرق وسطی میں مکمل شناخت کے لیے صرف باپ یا خاندانی نام کافی نہیں ہوتا بلکہ اس میں ساری پشت کا حوالہ شامل کیا جاتا ہے۔ باپ، دادا، پردادا، یہاں تک کہ کنبے کے اولین سربراہ یا پھر اس سے بھی پہلے اس شخص تک نام گنوائے جاتے ہیں جو قبیلے کا بانی رہا تھا۔ (جس طرح میتھیو یا متی میں عیسیٰ کو ابراہیم اور داؤد تک کی نسل تک شناخت کیا جاتا ہے)۔ تاریخ شناخت کا لازمی حصہ ہوا کرتی تھی۔ اس طرح ایک شخص کی انفرادیت سے کہیں بلند ہو کر نسل در نسل کا حساب ہی تاریخ کے زمانوں میں ماضی اور حال کے حوالہ جات قائم کرنے کا سبب ہوا کرتا تھا۔ چنانچہ، اس بات کا یقینی خیال رکھا جاتا کہ ہر نسل اس بابت آگاہ رہے کہ اس حوالے کے بغیر، شاید ان کی تاریخ گم ہو کر رہ سکتی تھی۔

گمشدہ تاریخ کا تصور قرانی آیات میں بھی جوں کا توں مرکزی نکتہ تھا جیسا یہ کبھی قبل از اسلام قصیدہ گوئی میں رہا کرتا تھا۔ ماضی کے کھنڈرات ایک سبق تھے۔ نہ صرف یہ کہ جو کچھ بیت چکا تھا، اس کی یاد دہانی تھی بلکہ یہ ایک طرح سے انتباہ بھی تھا کہ آج بھی ایسا پیش آنا عین ممکن تھا۔ مثلاً زلزلے، قحط، طاعون یا مفتوح ہو جانا۔ کوئی بھی تہذیب، چاہے وہ کتنی ہی عظیم ترین کیوں نہ ہو، آنکھ کے جھپکے میں ہی تاریخ کے منظر سے مٹ سکتی تھی۔ چنانچہ، نسل در نسل شجرہ یاد رکھنے کی مثال اس لحاظ سے انسانی یادداشت میں مدافعتی نظام کی تھی۔ یہ تو اجتماعی بات تھی مگر ایک اکیلے شخص کے لیے بھی وقت کے دھارے میں آباؤ اجداد، نسب، نسل کے نام اور کارناموں کے ذریعے، اپنی انفرادیت کو برقرار رکھنے کا یہی ذریعہ تھا۔ اس طرح ہر شخص اپنی شناخت قائم رکھ سکتا تھا۔ بلکہ، باپ دادا سے یہ نسبت، اس کے لیے نئے زمانے میں تازہ کارنامے سرانجام دینے کے لیے حوالہ اور تقریباً ہمیشہ ہی، تحریک بھی بن جاتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ خدا اور خدائی اوتاروں کے ساتھ آباؤ اجداد کی بھی پوجا کی جاتی تھی۔ ان کے نام کو زندہ رکھا جاتا تھا، امر کرنے کی بہتیری کوشش کی جاتی تھی۔ تاکہ مردہ ماضی کے یہ کردار، حال کے جیتے جاگتے بایسوں کو حوصلہ، جلا بخش سکیں۔ تاریخ کے طاقتور کرداروں کے مزارات تعمیر کیے جاتے تھے اور ان کے مقبروں کو مزین، معطر رکھا جاتا تھا۔ بے شمار ربیوں، ولیوں اور کئی اماموں کے مزارات اور مقبرے آج بھی شمال افریقہ، مشرق وسطیٰ اور جنوب اور وسط ایشیاء میں عام مل جاتے ہیں۔ حالانکہ، یہ واحدانیت کے تصور کے سراسر خلاف معلوم ہوتا ہے۔ باوجود اس کے، یہ آج تک ہو رہا ہے۔ صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ یہودیوں اور عیسائیوں میں بھی یہ روایت مقبول ہے۔ شاید، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان مذاہب کی پیروکار عام انسان ہیں اور بحیثیت انسان ان میں ایک ضرورت سانجھی ہے۔ ان حرمین، مزارات، مقبروں، خانقاہوں اور کئی دوسری تاریخی نشانیوں کی پتھریلی دیواریں انسان کی ان اندرونی کیفیات، چاہ کو سیر کرتی ہیں جن کو پورا کرنے کے لیے نشان، مخاطب کا قابل لمس ہونا ضروری ہے۔ لوگ پتھروں کو چھو سکتے ہیں، چوم سکتے ہیں۔ دیواروں کے ساتھ لگ کر گریہ کر سکتے ہیں اور ان کے سائے میں کھڑے ہو کر دعا مانگ سکتے ہیں۔ ان کی زیبائش کی جا سکتی ہے اور پھول نچھاور کر کے عقیدت، محبت کا اظہار کر سکتے ہیں۔ یہاں، صدقات، تحائف اور خطوط، مراسلے بھی جمع کرائے جا سکتے ہیں۔ مثال، کسی پیارے کو اپنے سامنے بٹھا کر دل کا حال بیان کیا جا سکتا ہے۔

تو، جب قرانی آیات میں پہلے پہل قیامت اور روز حساب مردوں کو زندہ کیے جانے کا تذکرہ ہونے لگا تو اس میں کوئی اتنے اچنبھے کی بات نہیں تھی۔ روز حساب، سبھی روحوں کو موت سے واپس زندہ اٹھایا جائے گا اور ان کے اعمال کا حساب لیا جائے گا۔ یہ بات پہلے ہی عام تھی، سب یہ مانتے آئے تھے کہ یہ دنیا، ارواح سے بھری پڑی ہے۔ ان ارواح کی نشانیاں ہر طرف بکھری ہوئی تھیں۔ ان میں نہ صرف وہ زندہ انسان جو ابھی اس میں بسر کر رہے تھے بلکہ ان لوگوں کی ارواح بھی شامل تھیں جن کے اجسام بہت پہلے مر چکے ہیں۔ یعنی، ان کے لیے آباؤ اجداد ابھی بھی، ارواح کی شکل میں زندہ تھے۔ مگر اس کے باوجود، محمدؐ پر تنقید کرنے والوں نے قیامت کا تصور لغوی معنوں میں لیا اور اس معاملے کو بھی لے کر طعنہ زن ہو گئے۔ آیات میں اس کا تذکرہ یوں ہے کہ کہتے ہیں، 'کیا جب ہم مر کر خاک ہو جائیں گے اور ہڈیوں کا پنجر رہ جائیں گے تو پھر اٹھا کھڑے کیے جائیں گے؟' اور 'کیا ہمارے باپ دادا بھی اٹھائے جائیں گے جو پہلے گزر چکے ہیں؟' حقیقی طور پر یہ

قیامت کا تصور نہیں تھا جس سے وہ نالاں تھے۔ بلکہ، وہ اس کو اپنے آباؤ اجداد کی تضحیک، بے عزتی سمجھنے لگے تھے اور یہ ان کے لیے یہ سارا معاملہ ناقابل برداشت ہوتا جارہا تھا۔

یہاں یہ بات دلچسپ ہے کہ اب وحی میں یہ بھی کہا جانے لگا کہ قبائلی آباؤ اجداد ناداں اور جاہل تھے۔ یہ جملا کے سیاہ تاریک دور سے تعلق رکھتے تھے۔ یہی نہیں بلکہ، باور کرایا جانے لگا کہ انہیں روز قیامت اپنے کیے کا حساب بھی دینا پڑے گا۔ تاریخ میں عقیدہ واحدانیت پر قائم آباء جیسے ابراہیم کو حنیف کہا گیا اور پیغمبروں سی عزت بخشی گئی مگر ان کے علاوہ تمام لوگ جو ایک خدا کے تصور سے منکر تھے، انہیں جنت میں، 'باغوں کے رہائشی' کی بجائے جہنم میں 'آگ کے ساتھی' کہا جانے لگا۔ چونکہ، اب بعد از موت کوئی ایسی صورت نہیں تھی کہ اہلیان مکہ کے 'منکر' آباؤ اجداد واحدانیت کو مان لیتے، تو محمدؐ کے مخالفین نے اس کا مطلب یوں لیا کہ اس طرح ان کے باپ، دادا کو قطعی رد کیا جارہا ہے۔ آگ کا ساتھی قرار دے کر ان کی ہتک کی جارہی ہے۔ چنانچہ، انہوں نے اسے شدید بے عزتی سمجھا اور لغوی معنوں میں محمدؐ اور الہامی پیغام کو یکسر مسترد کر دیا۔

یہ کہا جاسکتا ہے کہ ایک شخص جو پیدائش سے پہلے ہی یتیم ہو چکا تھا، شاید اس کے لیے 'آباؤ اجداد کے طریق' کو ترک کر دینے میں کوئی خاص قباحت نہیں تھی۔ محمدؐ کو واقعی کوئی مشکل نہیں تھی مگر یہ بھی تو سچ ہے کہ ایک وقت میں، غیر ارادی طور پر محمدؐ کے براہ راست آبا اور اقربا نے انہیں بددل کر دیا تھا۔ آپؐ کو لاتعلق چھوڑ دیا تھا جبکہ اس معاشرے کا اصل مدعا ہی جوڑ کر، یعنی متعلق بنا کر رکھنا تھا۔ بہر حال، اب جس دعوت کا وہ پرچار کر رہے تھے وہ ان کی اپنی انفرادی اور ذاتی شناخت سے کہیں بڑھ کر معاملہ بن چکا تھا۔ آپؐ کی مثال ان کے زمانے سے چھ صدی قبل آنے والے ایک دوسرے نبی کی مانند ہی تھی۔ وہ دور دراز شمال میں گرجا کے برآمدوں میں آج بھی گونجنے والی ان صداؤں کی ہی طرح لوگوں کو دعوت دے رہے تھے کہ وہ گھرانے، کنبے اور قبیلے کی روایتی بندھن سے بلند ہو کر ایک خدا کے نام پر اکٹھے ہو جائیں۔

چھ صدیوں قبل، عیسی نے کہا تھا اور یہ میتھیو یا متی میں رقم ہے کہ، 'یہ نہ سمجھو کہ میں زمین پر صلح کروانے آیا ہوں، میں تو تلوار چلوانے آیا ہوں۔ میں تو اس لیے آیا ہوں کہ آدمی کو اس کے باپ سے، بیٹی کو اس کی ماں سے اور بہو کو اس کی ساس سے جدا کر دوں۔ اور آدمی کے دشمن اس کے گھر کے ہی لوگ ہوں گے۔ جو کوئی باپ کو یا ماں کو مجھ سے زیادہ عزیز رکھتا ہے، وہ میرے لائق نہیں۔ اور جو کوئی بیٹے کو یا بیٹی کو، مجھ سے زیادہ عزیز رکھتا ہے، وہ میرے لائق نہیں۔ اور جو کوئی اپنی صلیب نہ اٹھائے اور میرے پیچھو نہ چلے، وہ میرے لائق نہیں۔۔۔ 'اب، محمدؐ بھی کم و بیش یہی کہہ رہے تھے۔ یعنی، مکہ کے لوگ بالآخر سب کچھ کھو دیں گے۔ یہ آیت کہ محمدؐ سے کہا کہ کہو ان سے، 'اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارے عزیز اور تمہارا وہ مال جو تم نے کمایا ہے اور تمہارا وہ کاروبار جس کے ماند پڑ جانے کا تم کو خوف ہے اور تمہارے وہ گھر جو تم کو پسند ہیں، تم کو اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد سے عزیز تر ہیں تو انتظار کرو۔۔۔ 'وہ جنہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا، اب صحیح معنوں میں بہن اور بھائی تھے۔ یہ ایک نیا خاندان تھا جو پرانے پر ترجیح رکھتا تھا۔ تمام تر حدود کو توڑتا ہوا ایسا رشتہ جو اپنے اصل آباؤ اجداد میں شناخت کا متلاشی تھا۔ آباؤ اجداد سے مراد قبائلی اور نسبی باپ دادا نہیں بلکہ واحدانیت کے بانی یعنی، ابراہیم اور موسی سے تعلق جوڑتا تھا۔

چنانچہ وہی نکتہ جو ابو طالب کو اپنے طریق پر جمے، اس سے چمٹے رہنے پر مجبور کر رہا تھا، مکہ کی اشرافیہ کے لیے بھی درد سر بن چکا تھا۔ ایک ایسے معاشرے میں، جہاں باپ اور دادا کی عزت اور تکریم قائم رکھنا، بذات خود عزت اور غیرت کا مسئلہ تھا۔ اب سمجھا جانے لگا کہ شاید لوگوں سے اپنے آباؤ اجداد کو مکمل طور پر ترک کرنے کا کہا جارہا ہے۔ لیکن اگر اس بات کو برداشت بھی کر لیا جاتا اور نتیجے میں سارا معاملہ نظر انداز ہو جاتا۔ تب بھی، محمدؐ کا پیغام تو صرف یہیں تک محدود نہیں تھا بلکہ وہ تو اشرافیہ کے آسائش و آرام، شاہانہ طرز زندگی کے درپے تھے۔ یہ معاملہ اصول کا نہیں بلکہ مفادات کا بنتا جارہا تھا۔ اگر روایتی اقدار کو اس نئے طریق کے تابع کر بھی

دیتے پھر بھی قرانی احکامات کے ذریعے مال و دولت جمع کرنے کی حوصلہ شکنی تو مکہ کے پر اثر حلقے کی پکی مہاری تھی۔ اس طرح تو اشرافیہ کے ہاتھ میں کچھ بھی باقی نہ رہتا اور ان کی ناانصافی بھی لوگوں کے سامنے کھل کر آشکار ہو جاتی۔ یہی نہیں، ان امراء کے یہاں، یہی غیر منصفانہ طریق انتظام راست بھی سمجھا جاتا تھا۔

چنانچہ، مکہ کے کرتا دھرتاؤں کی جانب سے اس مختصر گروہ کو سخت اور حقارت میں لپیٹ کر جواب دیا جانے لگا۔ ایک مغرور آدمی کہنے لگا، 'ذرا محمدؐ کے ساتھیوں کو تو دیکھو! کیا یہ وہ لوگ ہیں جو خدا نے چن رکھے ہیں؟ اور یہ ہیں سیدھا راستہ دکھائیں گے؟ سچائی کا پرچار کریں گے؟ اگر یہ لوگ واقعی اس قابل ہوتے تو خدا ہماری بجائے انہیں عزت اور اختیار بخشتا۔۔۔'

اسی طرح، خود محمدؐ کے بارے میں کئی دوسرے مخالفین کہتے کہ وہ صرف اور صرف ہجوم کو اکسانے والا ہے۔ یہ حقیر بازاری لیڈر ہے جو بیوقوفوں اور نادانوں کے ذہنوں پر آسانی سے اثر انداز ہو جاتا ہے۔ نوجوان لونڈے جنہیں قیادت ملنے کا کوئی امکان نہیں۔ کمی کمین، جن کا اپنا کوئی حال نہیں۔ ایسے لوگ جو مکہ کے ہیں بھی نہیں اور انہیں کبھی قریش نے پناہ دیے رکھی تھی۔ یہ کون لوگ ہیں؟ غلام، آزاد کیے ہوئے غلام اور عورتیں؟ باوجود اس سب کے، مخالفین میں سے ہی چند نئے لوگ محمدؐ کے پیغام اور اس چھوٹے سے گروہ کی ہمت دیکھ کر بہر حال متاثر ہو ہی گئے۔ انہی میں سے ایک، اور اس وقت خاصے پر اثر شخص عتیق ابن عثمان بھی تھے۔ آج آپ کو ابو بکر کے نام سے جانا جاتا ہے اور آخر کار آپ اسلام میں پہلے خلیفہ، یعنی محمدؐ کے جانشین مقرر ہوں گے۔

ابو بکر مکہ میں خاصے مقبول اور کامیاب تو تھے ہی، مگر بطور نسل داں ان کی عزت بڑھ کر تھی۔ ایک ایسے معاشرے میں، جہاں نسل کی اہمیت ہر شے سے برتر ہو، ابو بکر کی نسل دانی خاصی اہم سمجھی جاتی تھی۔ اسی کی وجہ سے آپ مکہ کے نامی گرامی تاریخ دان مشہور تھے۔ یعنی، وہ شخص جو حسب و نسب کا پورا حساب اور رشتوں، ناطے کا درست شمار رکھتا تھا۔ چنانچہ، جب ابو بکر اسلام قبول کر کے ایمان لے آئے، یعنی کلمہ شہادت 'اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمدؐ اللہ کے رسول ہیں' پڑھ لیا تو گویا آپ نے مخالفین کی اس دلیل کو سرعام جھٹلا دیا کہ محمدؐ باپ اور دادا کی بے عزتی کر رہے ہیں۔ ابن اسحاق لکھتے ہیں کہ، 'بعد اس کے، مکہ میں اسلام کا تذکرہ عام ہونے لگا اور ہر شخص اس بابت بات کر رہا تھا۔'

ابو بکر کے اسلام قبول کرنے کے بعد جہاں محمدؐ اور ان کے گروہ کے حوصلے بڑھ گئے، وہیں مکہ کی اشرافیہ بھی اپنے ارادوں میں مزید پختہ ہو گئی۔ انہوں نے ہر طرح سے کوششیں شروع کر دیں کہ محمدؐ اور ان کے پیروکار ہر صورت ادنی، بلکہ خطرات میں گھر کر رہنے والی اقلیت ہی رہیں۔ چنانچہ، ابو طالب پر اپنے بھتیجے سے قطع تعلق کرنے کے لیے دباؤ بڑھ گیا۔ ان سے مطالبہ کیا جانے لگا کہ وہ آپؐ کو بنی ہاشم سے نکال باہر کریں اور یوں ان کی حفاظت سے دست بردار ہو جائیں۔ یہاں تحفظ سے ہاتھ کھینچنے کا مطلب سمجھانے کی کسی کو بھی ضرورت نہیں تھی۔ کنبے سے اس بے دخلی، خروج کا مطلب یہ تھا کہ محمدؐ کا 'خون جائز' ہو جاتا۔ 'خون جائز ہونا' کی اصطلاح سے مراد یہ تھی کہ آپؐ کو قانونی طور پر قتل کیا جا سکتا تھا اور اس فعل کی پاداش میں قاتل پر بدلے کا قانون بھی لاگو نہیں ہو سکتا تھا۔ یعنی، محمدؐ کا معاملہ قانون سے بالاتر ہو جاتا۔

یہاں بدلے کے قانون سے مراد 'خونی انتقام' ہے جو نہ صرف آج بلکہ تب بھی سننے میں خاصا وحشیانہ معلوم ہوتا تھا۔ یہ اور اس طرح کی کئی دوسری اصطلاحات در اصل آٹھویں اور نویں صدی عیسوی میں مسلمان تاریخ دانوں کے یہاں عام ہونے لگیں جب وہ دمشق اور بغداد جیسے جدید اور مہذب شہروں میں رہ کر مکہ کی تاریخ رقم کر رہے تھے۔ ان کے نزدیک، اسلام سے قبل مکہ میں کچھ ایسی ہی صورتحال رہی ہو گی۔ آخر، جہلا سے سیاہ دور کے سیاہ اعمال میں علاوہ اس کے کیا امید ہو سکتی ہے؟ وہ دیکھ سکتے تھے کہ اسلام میں اس خون آلود انتقام، آشام کی صاف ممانعت کی گئی تھی۔ اگرچہ قران میں کہا گیا کہ، 'جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان، دانت کے بدلے دانت اور تمام زخموں کے لیے برابر کا بدلہ۔۔۔' مگر قران اس کو قدیم زمانوں سے جوڑ کر کہتا ہے کہ،

'تورات میں ہم نے یہودیوں پر یہ حکم لکھ دیا تھا۔۔۔'لیکن، جہاں پورا بدلہ لینے کا حکم ہے، وہیں یہ بھی تو کہا گیا ہے کہ، 'پھر جو قصاص کا صدقہ کر دے تو اس کے لیے کفارہ ہے اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں، وہی ظالم ہیں'۔

یہ 'آنکھ کے بدلے آنکھ' کا تصور تورات سے آیا ہے۔ الہام میں پہلی بار یہ 'کتاب خروج' میں ظاہر ہوا اور پھر تفصیل سے اس کا تذکرہ تورات کی تیسری 'کتاب کہانت' میں مل جاتا ہے۔ مگر، تب بھی یہ کسی صورت خالصتاً، صرف الہامی کلام نہیں تھا۔ یہ قانون تورات سے بھی پہلے، تقریباً ہر قدیم دور میں اس قانون کی اساس تھی جس کے لیے لاطینی زبان میں ایک اصطلاح 'Lex Talionis' یا 'قانون الانتقام' استعمال کی جاتی تھی۔ جس کا عربی زبان میں 'قصاص' مشہور ہے۔ مگر لاطینی لفظ، 'Talionis' کا تصور بعد ازاں جدید زبانوں، جیسے انگریزی وغیرہ میں داخل تو ہو گیا مگر اس کا مفہوم اپنے اصل معنوں میں برقرار نہیں رہا۔ مثال کے طور پر، انگریزی میں آج بھی Talon کا لفظ شکاری پرندے کے پنجے سے موسوم ہے یعنی جس کی نکھ اور پنجا شکار کے خون سے آلودہ ہوں۔ یعنی، اس بابت خون ریزی کا گماں عام ہو گیا۔

اوائل دور کے اسلامی تاریخ دان اور جدید مغربی محققین، دونوں ہی ساتویں صدی عیسوی میں عرب کا نقشہ کچھ اس طرح کھینچتے ہیں کہ اس تصویر میں قبائل ایک دوسرے سے ہر دم گتھم گتھا نظر آتے ہیں۔ یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ شاید ان کی آپس میں ہمیشہ ہی جنگ رہا کرتی تھی اور ہر نئے قتل کے ساتھ خونی انتقام کا نہ ختم ہونے والا، دہائیوں تک دشمنیوں کا لامتناہی سلسلہ جاری رہتا تھا۔ ایک انفرادی قتل کے بدلے، پہلے کنبہ اور پھر پورا قبیلہ خونی انتقام میں بھڑ جاتا اور یوں تشدد کی ایک ایسی لہر پیدا ہوتی ہے جس کی کوئی انتہا نہیں۔ اس طرح کی دشمنی میں تو دیکھتے ہی دیکھتے کئی لوگ، پوری نسلیں برباد ہو جائیں۔ طویل دشمنی کی بھینٹ چڑھ جائیں۔ مگر، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر واقعی ایسا تھا تو آخر یہ معاشرہ، اتنی طویل مدت تک، اس قدر صحت افزا معاشی اور مذہبی ماحول میں کیسے پنپتا رہا؟ حقیقت تو یہ ہے کہ ساری انسانی تاریخ اور آج بھی دنیا بھر میں قبائل کے بیچ تصادم اور آویزش کی اصل وجہ انتقام کی ہوس نہیں بلکہ طاقت کا حصول رہا ہے۔ اس دور کے خطہ عرب میں اس طاقت اور اختیار کا مطلب پانی کے ذخائر پر قبضہ، چراگاہوں کے حقوق اور تجارتی قافلوں کے قبائلی علاقے میں سے گزرنے پر ٹکسال کی وصولی لی جا سکتی ہے۔ خونی انتقام، جنگ و جدل اور خون ریزی کو شاذ و نادر ہی، اس وقت استعمال میں لایا جاتا تھا کہ جب اس کے بغیر امن قائم رکھنا مشکل ہو جاتا تھا۔ ایک مرکزی با اختیار حکومت کے نہ ہونے کی وجہ سے یہ ایسا ہتھیار بن چکا تھا جس کو قبائل تحفظ اور مفادات کے حصول کے لیے سنبھال کر رکھتے تھے اور اس کا واقعی استعمال صرف اس کا ڈر تھا۔ اس کی وجہ سے قبائل کے بیچ تصادم یا جھڑپ کا احتمال رہا کرتا تھا مگر بذات خود خون بہانا مقصود نہیں تھا۔ یعنی، اس کے ذریعے دشمنی کو دوام نہیں بلکہ تشدد اور خونریزی کا خوف دلا کر مطالبات منوائے جاتے تھے یا اس ڈراوے کو استعمال میں لا کر کسی بڑے تصادم سے باز رہا جاتا تھا۔

قبائل میں تمام ہی گروہ یہ اچھی طرح جانتے تھے کہ 'قصاص کا قانون'، انتقام یا بدلہ لینا تب ہی کارگر ہو سکتا ہے جب یہ انتہائی ناگزیر ہو چکا ہو۔ اگر کسی کنبے یا قبیلے کا کوئی فرد قتل ہو جاتا تو اس صورت میں اس کے رشتہ داروں پر اس کا بدلہ، انتقام لینا لازم تصور کیا جاتا تھا۔ اگر کوئی مقتول کا بدلہ نہ لیتا تو مشہور تھا کہ ایک الو، اس کی قبر میں سے نکل کر چلاتا رہے گا، 'مجھے پلاؤ، مجھے پلاؤ!' یعنی، خون پلاؤ تاکہ بدلے کی پیاس بجھ سکے۔ کسی بھی قبیلے یا کنبے کا اس 'فرض' کا دباؤ، نہ صرف بیرون بلکہ اندرون بھی یکساں اور خاصا گہرا ہوتا تھا۔ یعنی، اس کے سبب گروہ کے اندر یہ اتفاق پایا جاتا تھا کہ ان میں سے ہر شخص کسی دوسرے شخص کے اعمال، افعال کا ذمہ دار ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ اس طرح یہ قبیلے کے اندر اور باہر پورے معاشرے میں پہلے تو دافع طیش رہا کرتا مگر جب معاملہ آن پڑے تو پھر یہی فرض کاری ہتھیار بن جاتا۔ یعنی یہ کہ، ہر قبائلی اچھی طرح سمجھتا تھا کہ کسی دوسرے قبائلی یا کنبے کے فرد کا قتل خود اس کے اپنے سگے بھائیوں کو شدید خطرات سے دوچار کر سکتا ہے۔ چنانچہ، ہر شخص پر سماجی طور پر جان لیوا تشدد سے باز رہنے کا دباؤ ہمیشہ برقرار رہتا تھا۔ صحراؤں میں، بدو قبائل اونٹوں پر لدے تجارتی قافلوں پر حملے کیا کرتے تھے۔ ان حملوں میں بھی ان کی حتی الامکان کوشش یہ رہتی کہ وہ کسی شخص کو قتل کرنے سے باز رہیں۔ ایک آدمی کے قتل کے نتیجے میں خونی انتقام اور طویل دشمنی کا یہی خوف

انہیں ہر طرح سے باز رکھتا تھا۔ چنانچہ، سب ہی جانتے تھے کہ یہ حملے عام طور پر مال لوٹنے کی غرض سے کیے جاتے ہیں اور عام حالات میں یہ جان لیوا نہیں ہوتے۔ یا کہیے، کم از کم اصولی طور پر ایسا ہی سمجھا جاتا تھا۔

چاہے یہ قصداً ہو رہے یا پھر صرف جذبات میں بہہ کر سرزد ہو جائے۔ تلوار سونت لینے سے اکثر ہی جان لیوا واقعات جنم لے لیا کرتے تھے۔ اسی وجہ سے 'قصاص' یا 'خونی انتقام' کے ساتھ ہرجانے کا نظام بھی موجود تھا۔ بابل اور روم کے قانونی نظام کی ہی طرح، عرب میں بھی یہ شرعی طور پر جائز تھا۔ عرب میں ہرجانے کو 'دیہ' کہا جاتا تھا۔ اس سے مراد خون بہا کی ہے۔ یہ خون بہا عام طور پر سونے یا مال مویشی کی صورت ادا کیا جاتا تھا اور اس کو طے کرنا 'حاکم' کی ذمہ داری ہوتی تھی۔ 'حاکم' سے مراد سیانے شخص یا ثالث، یا جج ہے۔ عام طور پر ایک قتل کا خون بہا دس دودھ دینے والے اونٹ ہوا کرتے تھے مگر بعض دوسری صورتوں میں، جیسے ہبل کے قدموں میں محمدؐ کے والد عبداللہ کے سر کی قیمت سو اونٹ طے ہوئی تھی۔ چنانچہ، جب شدت پسند اور فتنہ پرور لوگ دوسروں کو بزدلی کے طعنے دیا کرتے تو عام طور پر انہیں 'خون کے بدلے دودھ' جیسی ذلت یاد کرایا کرتے تھے۔ اس طنز کے باوجود، قبائلی لوگ چونکہ موت سے زیادہ زندگی کو عزیز رکھتے تھے اور انہیں معاشی مسائل بھی درپیش رہتے تھے تو زیادہ تر خون کی بجائے دودھ پر راضی ہو جایا کرتے تھے۔

یہ سارا نظام صرف اس وجہ سے قائم تھا کہ سماج میں اس کی بابت ایک جھکاؤ موجود تھا۔ ایک کنبہ یا قبیلہ اپنے فرد کا بھرپور تحفظ کیا کرتا تھا اور اس کے دائرے میں غلام اور آزاد کردہ غلام بھی شامل سمجھے جاتے تھے۔ غلاموں کو اپنے مالکان اور آزاد ہو جانے والوں کو اپنے گزشتہ مالکان کی ہمیشہ ہی سرپرستی حاصل رہتی تھی۔ مگر، وہ شخص جو کسی قبیلے یا کنبے سے تعلق نہ رکھتا ہو یا جس طرح اب قریش محمدؐ کے لیے یہ مطالبہ کر رہے تھے، کسی شخص کو کنبے یا قبیلے سے بے دخل کر دیا جاتا تو اس صورت میں اسے کسی بھی قسم کے قبائلی تحفظ سے باہر سمجھا جاتا تھا۔ لغوی معنوں میں، ایسا شخص قانون کے دائرے سے خارج، باغی قرار پاتا۔ اس کے ساتھ نبٹنا قانون سے مبرا ہو جاتا تھا۔

ابو طالب عجب کشمکش میں مبتلا تھے۔ گو وقت کے ساتھ ان کے دل میں محمدؐ کی عزت بڑھ گئی تھی مگر ان کا اثر رسوخ دولت کی کمی کے ساتھ گھٹ گیا تھا۔ باوجود اس کے، وہ اب بھی ایک غیرت مند شخص تھے۔ بنی ہاشم کے سربراہ کی حیثیت سے اس کنبے کی کفالت اور حفاظت یقینی بنانا ان کی ذمہ داری تھی۔ یہ فرض باپ دادا کے طریق میں بنیادی جز تھا جس پر وہ آخر تک قائم رہے۔ چنانچہ، جب دوسرے کنبے کے سربراہان نے اس معاملے کو لے کر ابو طالب سے زبانی مڈھ بھیڑ کی تو گویا آپ بند گلی میں لا کر کھڑے کر دیے گئے۔ ابو طالب ایک طرح سے محمدؐ کے مقروض تھے۔ کیونکہ، انہوں نے پہلے تو تجارت میں ہاتھ بٹا کر ابو طالب کو متمول کر دیا اور پھر ان کے بیٹے علی کی اپنے گھر میں کفالت کی ذمہ داری بھی سنبھال لی۔ بظاہر ابو طالب اپنے بھتیجے کی تعلیمات سے متفق نہیں تھے مگر ان کے لیے یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں تھی۔ ایک طویل عرصے کی نسبت اور قربت کے دوران ان دونوں اشخاص کے بیچ انس اور اعتماد کا رشتہ بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا۔ دیرینہ تعلقات میں ایک آدمی کی دوسرے کے لیے عزت اور منزلت بڑھتی جاتی ہے۔ ابو طالب کے لیے مشکل یہ تھی کہ آپ سے اسی نسبت اور محمدؐ کی قدر و منزلت سے دست بردار ہونے کا مطالبہ کیا جا رہا تھا۔

ابو طالب سے محمدؐ کی بابت باز پرس کرنے والا یہ وفد قبیلہ قریش کے کنبہ مخزوم کے سردار کی سربراہی میں آیا تھا جس کا شمار بعد ازاں محمدؐ کے بدترین، ثوری اور متشدد مخالف کے طور پر کیا جائے گا۔ اس شخص کا خاکہ بعد ازاں اس قدر بگڑ جائے گا کہ یہ اپنے اصل نام، ابو الحکم کی بجائے ابو جہل کے نام سے مشہور ہونے لگے گا۔ ابو الحکم کے معنی 'دانائی کے باپ' اور ابو جہل سے مراد 'جہالت کا باپ' ہے۔ ابو الحکم نے اپنا یہ نیا نام، یعنی ابو جہل بنانے میں ذرا دیر نہیں لگائی اور اسی ملاقات کے دوران ابو طالب کو دھمکانے لگا۔ کہنے لگا، 'خدا کی قسم! ہم کسی طور بھی اپنے باپ دادا کی مزید تذلیل اور بدگوئی برداشت نہیں کریں گے۔ یہ ہماری روایتی اقدار کی تضحیک ہے اور ہمارے خدائی اوتاروں کی بے حرمتی ہے۔' پھر وہ ابو طالب کو اشارہ کر کے گویا ہوا، 'یا تو تم محمدؐ کو خود روک لو وگرنہ ہمیں خود اس سے نمٹنا پڑے گا۔

چونکہ تم بھی اسی حیثیت میں ہو جس میں ہم ہیں اور تم بھی اس کی مخالفت کرتے ہو، ہم اس سے چھٹکارا حاصل کر سکتے ہیں' مطلب یہ تھا کہ اب ابو طالب خود ہی محمدؐ کو خاموش ہو جانے پر قائل کر لیتے ورنہ دوسری صورت میں محمدؐ کو طاقت کے زور پر ہمیشہ کے لیے خاموش کیا جا سکتا تھا۔

ابو طالب جیسے غیرت مند شخص کے لیے یہ مطالبہ، بلکہ دھمکی انتہائی گھناؤنی حرکت تھی۔ وہ قطعاً ایسا نہیں کر سکتے تھے۔ وہ ایسا کوئی بھی قدم اٹھانے سے باز رہتے۔ بلکہ، وہ چاہتے ہوئے بھی، ایسا نہیں کر سکتے تھے۔ اس کی وجہ ان کے اپنے سماجی اور سیاسی وجود کے معاشرتی اصول تھے۔ یعنی، اگر ابو طالب محمدؐ کو بنی ہاشم سے بے دخل کرتے ہیں تو یہ اپنی موت کے پروانے پر خود ہی دستخط کرنے کے مترادف تھا۔ بطور سربراہ، وہ اپنا فرض اور ذمہ داری پوری کرنے سے معذور کہلاتے اور آپ پر کنبے کے تقریباً افراد کا اعتماد اٹھ جاتا۔ پورا کنبہ عدم تحفظ، ٹوٹ پھوٹ اور ریشہ دوانی کی بھینٹ چڑھ جاتا۔ کوئی بھی غیرت مند شخص، اپنے کنبے کے ساتھ ایسا کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ ابو طالب نے ابو جہل کی اس حرکت، مطالبے کو مکہ کی شاندار روایت اور غیرت کے سراسر منافی سمجھا۔ انہیں یہ خیال بھی عود کر آ رہا تھا کہ شاید محمدؐ مکہ کی ٹوٹ کر بکھرتی ہوئی سماجی اقدار بارے درست ہی کہتے ہیں۔ آخر، قبیلہ قریش کے سردار ان اس حد تک کیسے گر سکتے ہیں؟ پھر، ابو طالب کے لیے صرف یہی نہیں بلکہ اس کے علاوہ بھی ایک بات تھی۔

وہ بات یہ کہ ابو طالب نے محمدؐ کے پیغام، اس دعوت کو باضابطہ قبول تو نہیں کیا تھا مگر اس کے باوجود دل میں اس کو مان لینے کی خواہش تو پیدا ہوتی ہی تھی۔ اس کی واضح مثال اس وفد سے ملاقات اور پیش کردہ تجویز پر آپ کا ردعمل ہے۔ وہ اگر اور کچھ بھی نہ بن پڑتا تو بجا طور پر فوراً محمدؐ کی تعلیمات پر کنبے کی روایت اور اقدار کی خلاف ورزی کا بہانہ بنا کر، قریش کی ایما پر اسے روکنے کا حکم دے سکتے تھے۔ وہ نہ صرف محمدؐ کو خاموش کر سکتے تھے بلکہ اس بنیاد پر تو آپؐ کو کنبے سے بے دخل بھی کیا جا سکتا تھا۔ مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ بجائے، انہوں نے صورتحال کو چکما دے دیا۔ وہ جانتے تھے کہ ابو جہل کی دھمکی ان کی حمایت کے بغیر ایک بے پر کی اڑائی ہوئی بات سے زیادہ کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ شاید یہ سوچتے ہوں کہ ابو جہل کی اس حرکت کی حیثیت غصے میں نتھنے پھلانے سے زیادہ کچھ بھی نہیں ہے۔ ویسے بھی، خون ریزی کوئی اتنا آسان نہیں تھا۔ چنانچہ انہوں نے ابو جہل کی دھمکی کو یکسر نظر انداز کر دیا اور وفد کو، بقول ابن اسحاق، 'نرم لہجے میں لپیٹ کر صاف جواب دے دیا'

ہاں یہ ضرور تھا کہ محمدؐ کے ساتھ اس معاملے کو لے کر بات چیت کی جا سکتی تھی۔ ابو طالب چاہتے تو یقینی طور پر محمدؐ کو اپنی تعلیمات میں اس قدر درشتی سے تبلیغ کرنے سے روک سکتے تھے، مگر یہ صرف اور صرف ذاتی سطح پر ممکن تھا۔ ہم جانتے ہیں کہ ابو طالب نے یہ کوشش کر کے بھی دیکھ لیا اور بجائے محمدؐ، وہ خود قائل ہو گئے۔ انہوں نے بھتیجے سے درخواست کی کہ وہ اپنی تبلیغ کو پھیلانے میں اور کچھ نہیں تو، دھیرج سے کام لیا کریں۔ لیکن، محمدؐ کی مجبوری یہ تھی کہ ایک طرف چچا کو شدید دباؤ کے نتیجے میں پیش آنے والی کوفت کا سامنا تھا تو وہیں دوسری جانب الہامی پیغامات کا اصرار، بے لچک تقاضا دھرا ہوا تھا۔ بہر حال، محمدؐ اور ابو طالب دونوں ہی جانتے تھے کہ بالآخر جھکاؤ کس طرف زیادہ رہے گا۔

محمدؐ اور ابو طالب کے بیچ ہونے والی بات چیت میں سخت تناؤ بتایا جاتا ہے۔ محمدؐ نے مضبوط لہجے میں کہا، 'چچا، اللہ کی قسم! اگر وہ میرے دائیں ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند بھی لا کر رکھ دیں اور یہ مطالبہ کریں کہ میں اپنا راستہ چھوڑ دوں گا تو میں ہرگز ایسا کرنے والا نہیں ہوں۔ چاہے، اس کے لیے مجھے جان سے ہاتھ ہی کیوں نہ دھونا پڑے!'۔ ابو طالب کے لیے محمدؐ کو کنبے سے بے دخل کرنے کے لیے یہ جواب کافی تھا۔ بلکہ اس قدر ترش جواب پر تو وہ بحیثیت سربراہ محمدؐ کے قتل کا حکم بھی جاری کر سکتے تھے۔ محمدؐ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور وہ باہر نکلنے کے لیے دروازے کی جانب بڑھے ہی تھے کہ ابو طالب نے انہیں روک لیا۔ مڑ کر دیکھا تو ابو طالب بھی زار و قطار رو رہے تھے۔ ابو طالب بے انتہا جذباتی لہجے میں محمدؐ سے کہا، 'اے بھتیجے، واپس آ جاؤ۔ جو تمہارا دل چاہتا ہے، کہا کرو۔ خدا کی قسم، میں کبھی تمہاری حفاظت کی ذمہ داری سے دست بردار نہیں ہوں گا۔'

اگرچہ ابو جہل کو محمدؐ اور ابو طالب کے بیچ ہوئی بات چیت کی تفصیلات کا تو علم نہیں ہو سکا تھا مگر چونکہ اس کے بعد بھی، محمدؐ کعبہ کے احاطے میں بدستور تبلیغ کا کام جاری رکھے ہوئے تھے۔ اس سے باور ہو گیا کہ دھمکی کا وار خالی چلا گیا ہے۔ ابو جہل کا غصہ آسمان چھونے لگا اور اب وہ محمدؐ کے ساتھ ابو طالب کا بھی بیری بن گیا۔ وہ کھلے عام پورے بنی ہاشم کو اس 'فتنے' کو اپنے یہاں پناہ دینے کی پاداش میں سزا دینے، ان سے جنگ کرنے کے اشارے، مشورے دینے لگا۔ مگر ابو جہل کے برعکس دوسرے سربراہان ابھی تک اس معاملے کا کوئی پرامن حل تلاش کرنے کے حق میں تھے۔ اس بات پر تو مکہ کی اشرافیہ میں کوئی دو رائے نہیں تھی کہ بہرحال محمدؐ کو خاموش ہونا ہی پڑے گا۔ مگر، اس کے لیے ضروری تھا کہ ابو طالب خود انہیں کنبے سے بے دخل کر دیں۔ یوں کھلے عام جنگ چھیڑنے کا مطلب شہر کو تباہی سے دوچار کرنا تھا۔ جو، یقیناً کسی کے لیے بھی قابل قبول نہیں تھا۔ چنانچہ انہوں نے ایک اور حل سوچا۔ وہ ابو طالب کے پاس ایک اور وفد لے کر گئے اور محمدؐ کے بدلے میں ایک بیٹا پیش کر دیا۔

اب کی بار وفد کی سربراہی ابو جہل نہیں بلکہ ابو سفیان کر رہے تھے۔ ابو سفیان عبد الشمس کنبے کے سربراہ تھے۔ یہ وفد اپنے ساتھ عمارۃ کو بھی لایا تھا۔ عمارۃ قبیلہ قریش میں، 'بہادر، ذہین اور وجیہا' مشہور تھا۔ اس وفد نے عمارۃ کو ابو طالب کی خدمت میں پیش کیا۔ ابو سفیان نے عمارۃ کے گندھے پر ہاتھ رکھ کر ابو طالب سے کہا، 'ہم تمہیں ایک آدمی کے بدلے آدمی پیش کرتے ہیں' مزید کہا، 'تمہیں عمارۃ کی ذہانت اور حمایت میسر رہے گی۔ اس کو اپنا بیٹا بنالو اور بدلے میں اپنے بھتیجے کو ہمارے حوالے کر دو۔ اس بھتیجے کو، جس نے تمہارے اور باپ دادا کی روایت کو جھٹلا دیا ہے۔ وہ جس نے مکہ کے لوگوں کے اتحاد کو شدید خطرے سے دوچار کر رکھا ہے اور ہمارے طریق زندگی کی تضحیک کرتا پھرتا ہے۔ اس کو ہمارے حوالے کر دو تاکہ ہم عمارۃ کے بدلے میں اسے قتل کر سکیں۔'

یہ سن کر ابو طالب ہکا بکا رہ گئے۔ ابو طالب کی بجائے کوئی اور شخص بھی ہوتا تو وہ اسی طرح حیران و پریشان ہو جاتا۔ انہوں نے برہم ہو کر جواب دیا، 'یہ سراسر شیطانی فعل ہے، جو تم مجھ پر تھوپ دینا چاہتے ہو۔ تم اپنے بیٹے کو میرے حوالے کرنا چاہتے ہو کہ میں اس کو کھلاؤں، تمہارے لیے اس کی کفالت کروں اور بدلے میں، اپنے بھتیجے کو تمہیں دے دوں، تاکہ تم اسے قتل کر سکو؟ خدا کی قسم، ایسا نہیں ہو سکتا۔'

ابو طالب کی جانب سے اختیار کیے جانے والے نرم لہجے کی یہ آخری بار تھی۔ جس طرح قریش کے سربراہان اوچھی اور گری ہوئی حرکات پر اتر آئے تھے، اس کے بعد آپ کے لیے برداشت کرنا مشکل ہو گیا۔ چنانچہ، ابو طالب نے اپنے کنبے اور اتحادیوں کو جمع کر لیا اور محمدؐ کی کنبے سے بے دخلی کے مطالبے کے خلاف اکٹھا ہونے کا حکم دے دیا۔ بنی ہاشم نے باقی کنبوں کے سربراہان کی جانب سے کیے جانے والے مطالبات یکسر رد کر دیے۔ ابو جہل نے جو جنگ اور کھلی عداوت کی تجویز پیش کی تھی، اب اس کے امکانات بڑھتے ہی چلے جا رہے تھے۔ لوگ مکہ کے گلی کوچوں، بازاروں، گھروں اور کعبہ کے احاطے میں اس بابت خدشات کا اظہار کرنے لگے۔ گو، زیادہ تر لوگ اس طرح کی صورتحال کے حق میں نہیں تھے مگر اس کے باوجود ممکنات کو رد نہیں کر پا رہے تھے۔

جب کہ مکہ شہر میں لوگ اس مسئلے کو لے کر بحث مباحثے میں مصروف تھے، مکہ کے سربراہان نے بند دروازوں کے پیچھے ایک آخری کوشش کرنے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے تیسرا وفد بھیجا۔ اب کی بار، یہ وفد ابو طالب کی بجائے سیدھا محمدؐ سے ملنے آیا۔ اس ملاقات میں انہوں نے بظاہر نہایت لبھا دینے والی تجویز پیش کی۔ مکہ کی اشرافیہ محمدؐ کو خریدنے کی کوشش میں تھے۔ تجویز یہ تھی کہ اگر محمدؐ قبائلیوں کے خدائی اوتاروں کی بے حرمتی اور آباؤ اجداد کو بے دین کہنا چھوڑ دیں تو ان کے قدموں میں پوری دنیا نچھاور کی جا سکتی تھی۔ کہنے لگے، 'اگر تمہیں دولت چاہیے تو ہم تمہیں اتنی دولت جمع کر کے دے دیں گے کہ تم ہم سب میں سے مال دار ہو گے۔ اگر تم عزت چاہتے ہو، تو ہم تمہیں مکہ کا سردار بنا دیں گے اور کوئی بھی فیصلہ تمہاری رائے کے بغیر طے نہیں کیا جائے گا۔ اور اگر وہ 'بھوت' جس کا تم پر سایہ ہے اور تم پر پیش آتا ہے، اگر تم اس سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتے تو ہم ایسے طبیب یا وید کو تلاش لائیں گے اور جتنی قیمت درکار ہوئی، خرچ کر کے تمہارا علاج کروا دیں گے۔'

بظاہر تو یہ تجویز صاف طور پر اشرافیہ کی مایوسی کو عیاں کر رہی تھی مگر حقیقت میں، یہ ایک دھوکہ اور فریب تھا۔ مکہ کی اشرافیہ آپؐ کو دولت اور نہ ہی اختیار دینے والے تھے۔ بلکہ وہ تو اس طرح محمدؐ کو جھانسا دلا کر عوام میں یہ مشہور کرنے والے تھے کہ آپؐ ایک ریاکار، منافق سے زیادہ کچھ نہیں ہیں۔ یعنی، ایسا شخص جو لوگوں کے منہ پر ایک بات اور بند دروازوں کے پیچھے کچھ اور تانے بانے بنتا رہتا ہے۔ اس تجویز کے جواب میں محمدؐ کی استہزائیہ ہنسی کی تو کوئی شہادت نہیں ہے مگر روایت یہ ہے کہ انہوں نے جواب میں خود سے تو کچھ نہ کہا مگر چند قرانی آیات سنا دیں۔ ان قرانی آیات میں، 'دلوں پر غلاف چڑھانے' کا تذکرہ تھا۔ ان کی ہٹ دھرمی اور کتنی ہی کوشش کر رہو، بے دینی سے نہ مڑنے کا ذکر تھا۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر اور کچھ نہیں تو محمدؐ بھی اندر ہی اندر مکہ کی اشرافیہ کے اس بھولے پن اور انتہائی بھونڈی کوشش پر ضرور مسکرا اٹھے ہوں گے۔ مگر، مکہ کی اشرافیہ کے لیے یہ جواب آنکھیں کھولنے کو کافی تھا۔ وہ اب تک یہ بات سمجھنے سے قاصر تھے کہ محمدؐ کو ذاتی مفاد کے سوا بھی کوئی شے، اس قدر بغاوت پر مجبور کر سکتی ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے نزدیک، ذاتی مفادات کے تحفظ کے سوا کوئی بھی شے اس قدر اہم نہیں تھی۔ ان کی اپنی مثال، خود ان کے اپنے سامنے تھی۔

مکہ کے کرتا دھرتاؤں میں بڑھتی ہوئی بے چینی کو سمجھنا کوئی مشکل نہیں ہے۔ ان کا مقصد محمدؐ کو خاموش کرنا تھا مگر اب تک جتنی کوشش وہ کر چکے تھے، ہر طرح کے حربے استعمال کرنے کے باوجود بھی محمدؐ اور محمدؐ کے پیغام کی بازگشت بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ اب مکہ میں صبح شام، کم و بیش ہر محفل میں اس تحریک کا تذکرہ کیا جانے لگا تھا۔ یہی نہیں بلکہ دن بدن ان کی بے چینی اور بھی بڑھ رہی تھی۔ وہ جلد از جلد اس معاملے کا حتمی حل تلاشنے کے لیے مجبور ہو گئے۔ اس بے چینی کی وجہ یہ تھی کہ حج کی تاریخ نزدیک آ رہی تھی۔ نہ صرف یہ بلکہ حج کے ساتھ عکاظ کے سالانہ میلے میں شرکت کے لیے دیہوں ہزار لوگ اور زائرین مکہ کا رخ کرنے والے تھے۔ عام خیال یہ تھا کہ محمدؐ اور ان کی تحریک کا چرچا پھیل جائے گا اور یہ خبر پکی تھی کہ اس برس محمدؐ کے پیغام کی ہی وجہ سے معمول سے زیادہ لوگ مکہ پہنچیں گے۔ اس طرح تو محمدؐ کو اپنے نرالے، بنیاد پرست خیالات کا پرچار کرنے کے لیے آسان موقع ہاتھ آ جائے گا اور اس سے بھی بڑھ کر، اہلیان مکہ کو قطعاً منظور نہیں تھا کہ محمدؐ اس موقع کا فائدہ اٹھا کر شہر مکہ سے باہر بسنے والے زائرین اور قبائلیوں کے اذہان کو اپنی تعلیمات سے آلودہ کریں۔ اتنے اہم موقع پر آخر، اشرافیہ محمدؐ کے اثر و رسوخ کو کیسے کم کر سکتی تھی؟ وہ کونسا طریقہ تھا کہ جس کے ذریعے 'سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے'، یعنی اس تحریک کو اہمیت دلائے بغیر اس کا خاتمہ کیونکر ہو؟

اس مقصد کے لیے بلائی گئی اشرافیہ کی بیٹھک کا احوال ابن اسحاق نے یوں بیان کیا ہے کہ، "ایک سردار نے کہا، 'ہم مشہور کر دیتے ہیں کہ محمدؐ ایک کاہن ہے'، کاہن یعنی فال دیکھنے والا جوتشی، نجومی ہے۔ ابن مغیرہ نے یہ تجویز رد کر دی۔ ابن مغیرہ عمارۃ کا باپ تھا جس کو قریش نے محمدؐ کے بدلے میں پیش کیا تھا۔ کہنے لگا، 'محمدؐ کاہن کی طرح کلام نہیں کرتا۔ کاہنوں کی طرح بڑبڑاتا نہیں اور نہ ہی اس کا کلام بے ربط ہے'۔ 'پھر ہم کہہ دیں گے کہ اس پر کسی جن کا سایہ ہے۔' ابن مغیرہ نے اس تجویز کو بھی مسترد کر دیا۔ کہا، 'محمدؐ کے ساتھ یہ مسئلہ بھی نہیں ہے۔ ہم نے کئی لوگوں پر جن کا سایہ دیکھ رکھا ہے۔ محمدؐ پر نہ تو مرگی کے دورے پڑتے ہیں اور نہ ہی اسے بیٹھے بٹھائے پھندنے لگتے ہیں۔ پھر، وہ دورہ پڑنے پر بڑبڑاتا بھی نہیں ہے'۔

'تو کیوں نہ ہم اسے ایک شاعر مشہور کر دیں؟' ایک اور سردار تجویز پیش کی مگر یہ بھی رد ہو گئی۔ کہا گیا، 'ہم شاعری کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ اس کا کلام شاعری کے زمرے میں نہیں آتا۔'

'تو پھر کیا کیا جائے؟ کیا ہم اسے ساحر یا جادوگر بھی نہیں کہہ سکتے؟' تجویز پیش کرنے والے نے بے بسی سے پوچھا تو ابن مغیرہ نے اس پر سر جھٹک دیا۔ کہنے لگا، 'محمدؐ نہ تو چالیں چلتا ہے اور نہ ہی کوئی جادو ٹونا پیش کرتا ہے۔ وہ تو منتر بھی نہیں پڑھتا۔'

بالآخر، وہ ایک بات پر متفق ہو گئے۔ طے یہ پایا کہ پراپگنڈہ کے لیے یہی موزوں رہے گا کہ وہ محمدؐ کی بابت یہ مشہور کر دیں کہ، 'یہ صرف پرانے زمانے کے بے سروپا قصے ہیں جو وہ سناتا پھرتا ہے۔ افسانوی داستانوں سے زیادہ کچھ نہیں'۔ مگر اس حربے کا الٹا اثر ہوا۔ جس جوش و خروش سے وہ کوشش کر رہے تھے کہ شاید لوگ محمدؐ پر توجہ دینا چھوڑ دیں گے، اس پراپگنڈہ کے بعد تو آپؐ بارے لوگ اور بھی بڑھ چڑھ کر تذکرہ کرنے لگے۔ آخر کار، جس شخص نے مکہ کی اشرافیہ کو یوں ناکوں چنے چبوا دیے تھے، اس کو اس قدر آسانی سے نظر انداز کرنا لوگوں کے لیے بھی ممکن نہیں رہا تھا۔

سہل پسند اور اقتدار کے نشے میں طاقت اور اختیار کا بے دریغ اور ناجائز استعمال کرنے والے حکمرانوں کو اکثر یہ ادراک نہیں رہتا کہ یہ فیصلے انہیں کس قدر غیر مقبول کر سکتے ہیں۔ قبیلہ قریش کے کرتا دھرتا بھی مختلف نہیں تھے۔ مکہ میں آنے والے قبائلی خانہ بدوشوں کے گروہ، تجارتی قافلوں اور زائرین کے جھمگٹے اس بات سے باخبر تھے کہ قریش کئی معاملات میں ان کی مجبوریوں کا ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ ان کے پاس سوا اس کے کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ قریش کے من مانے ٹکسال، امراء شہر کی جانب سے لاگو کیے جانے والی بے جا وصولی یا مکہ شہر کی حدود میں پانی اور جانوروں کے چارے کی مہنگی قیمتیں ادا کریں۔ ان کی ذخیرہ اندوزی، مصنوعی مہنگائی بھگتا کریں۔ وہ مجبوراً ناقص سہولیات کی بھاری بھر کم قیمت تو ادا کر دیتے تھے مگر اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ اس سے خوش ہیں۔ قریش کی اختیار پر اجارہ داری کے سبب ان کے خلاف تقریباً سب ہی لوگوں کے دل میں کدورت بھری ہوئی تھی۔ یوں، ایسے شخص کی ان زائرین اور خانہ بدوشوں کے یہاں خاصی پذیرائی ہوئی جس نے آگے بڑھ کر قریش کے اس نظام کو للکارا تھا۔ محمدؐ کے خلاف شروع کی جانے والی قریش کی اس مہم کا بھی وہی حال ہوا جو عام طور پر ایسی کھوکھلی مہمات کا ہوا کرتا ہے۔ یعنی، بازی واپس قریش پر ہی پلٹ گئی۔ ابن اسحاق لکھتے ہیں کہ، 'اس برس عرب حج اور عکاظ کے میلے سے جتنے بھی لوگ واپس ہوئے تو ان میں سے ہر شخص محمدؐ کا نام جان چکا تھا۔ آپؐ کا تذکرہ اب مکہ سے باہر، خطہ حجاز و عرب کے طول و عرض میں کیا جانے لگا۔'

ناکامی کا منہ دیکھ کر مکہ کے سربراہان غصے سے تلملا اٹھے۔ چنانچہ، اس طیش کا نتیجہ یہ نکلا کہ بجائے فراست سے کام لیتے، رفتہ رفتہ ان کا ردعمل مزید بوکھلاہٹ کا شکار ہو گیا۔ مکہ کے سردار غیر منطقی انداز میں سوچنے لگے۔ ابھی تک تو صرف، ابو طالب کے محمدؐ بابت رویے اور بے دخلی سے نکلے انکار کی وجہ سے یہ دن دیکھنا پڑا تھا۔ مگر، جن اصولوں کی بنیاد پر ابو طالب نے انکار کیا تھا، انہی اصولوں کی بنیاد پر ان سرداروں کے مطابق معاملات ان کے حق میں چلتے رہنے چاہیے تھے۔ اسی نکتے پر، اشرافیہ کے ردعمل اور ناکامی نے ان کے فہم، فراست کا پول بھی کھول کر رکھ دیا۔ سب کے سامنے ان کی تنگ نظری اور منافقت کھل کر سامنے آ گئی۔ جس طرح آج بھی جدید دور میں کئی نااہل حکومتیں، جب اس طرح کے حالات سے دوچار ہو جائیں تو عام طور پر بھونڈے پن سے طاقت کا بے دریغ استعمال اور جذباتی فیصلے کرتی ہیں۔ انہوں نے بھی ایسا ہی ایک انتہائی سخت فیصلہ کر لیا۔ ابو جہل کے اکسانے پر، قریش نے بنی ہاشم کے مکمل بائیکاٹ کا اعلان کر دیا۔

باب:10

بائیکاٹ کا عام اعلان بھیڑ کی چمڑی پر تحریر کیا گیا تھا۔ اس پر قریش کے دو بڑے کنبوں، مخزوم اور امویہ کے سربراہان بالترتیب ابو جہل اور ابو سفیان کی مہریں ثبت تھیں۔ عوام کے ملاحظہ کے لیے اس اعلان کو کعبہ کے دروازے پر میخ بند کر دیا گیا۔ حکم دیا گیا تھا کہ مکہ میں کوئی شخص بنی ہاشم کے ساتھ لین دین، حتیٰ کہ خوراک کی خرید و فروخت سے بھی گریز کرے گا۔ ان کے لیے تجارتی قافلوں میں شمولیت، بازاروں میں کاروبار، بیوپار اور باہمی شراکت داری پر مکمل پابندی عائد کر دی گئی تھی۔ اسی طرح، دوسرے کنبوں کے تمام افراد پر لازم قرار دیا گیا تھا کہ وہ بنی ہاشم کے یہاں کسی بھی شخص سے شادی، بیاہ اور قرابت داری سے مکمل اجتناب برتیں گے۔ یوں، مکہ کے اندر رہتے ہوئے بھی بنی ہاشم جلاوطن ہو کر باقی معاشرے سے کٹ کر رہ جائیں گے۔ ان کے ساتھ ایسا سلوک روا رکھا جائے گا کہ گویا، وجود ہی نہیں رکھتے۔ یہ اپنے ہی گھر میں بیگانے ٹھہرائے جائیں گے۔

اس سخت فیصلے کا مقصد یہ تھا کہ ابو طالب کو محمدؐ کی حوالگی پر مجبور کر دیا جائے۔ اگر ایسا ہونا ممکن نہ بھی ہوتا تو اس فیصلے کے تحت بنی ہاشم کو معاشی دباؤ اور سماجی پابندیوں سے اس قدر محتاج بنا دیا جائے کہ وہ بالآخر ابو طالب کو کنبے کی سربراہی سے علیحدہ ہونے پر قائل کر لیں اور اپنا نیا سردار چن لیں۔ اس نئے سردار کو ابو طالب کے مقابلے میں دھمکانا آسان ہوتا یا وہ اشرافیہ کا ہم خیال ہونے کی وجہ سے ان کی منشا کے عین مطابق فیصلے کیا کرتا۔ اس بابت توجیہا جو بھی رہی ہو، یہ طے تھا کہ اس طرح کی اجتماعی سزا کی مکہ میں اس سے پہلے کوئی نظیر نہیں ملتی۔

ایک موثر بائیکاٹ وہی ہوتا ہے جو عوام میں مقبول ہو۔ عوام میں مقبولیت کے لیے انتہائی ضروری ہے کہ اس بابت انصاف کے تمام تقاضے پورے کیے جاتے ہوں یا لوگ بائیکاٹ کے اہداف اور مقاصد سے پوری طرح آگاہ ہوں۔ لوگوں نے فوراً ہی بھانپ لیا کہ اس اعلان پر قریش کے صرف دو کنبوں کے سربراہان کے دستخط تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ شاید ابو جہل کی غیر منطقی اور زہریلی مگر نہایت موثر خطابت کے سامنے عام طور پر عاقل اور سمجھدار سمجھے جانے والے ابو سفیان ڈگمگا گئے تھے۔ شاید، یہ جھول عارضی تھا مگر پھر بھی، اس کی وجہ کیا تھی؟ ان کا بڑا ہدف محمدؐ اور ان کے پیروکار تھے جو ابھی تک صرف ایک اقلیت تھے۔ یہ مختصر گروہ خود کو 'مومنین' یعنی 'ماننے والے' کہلواتا تھا۔ بنی ہاشم میں بھی ابھی تک صرف چند ہی لوگ تھے جو اس گروہ کے ساتھ شامل ہوئے تھے۔ مکہ کی اکثریت بھلے محمدؐ کی بابت منقسم ہو مگر بہر حال وہ ابو طالب کے کردار، یعنی بطور بنی ہاشم کے سربراہ کی حیثیت سے اصولی موقف کے ساتھ بھرپور اتفاق رکھتے تھے۔ قریش کے دوسرے کنبوں کی ہی طرح بنی ہاشم بھی تفریق میں وجود نہیں رکھتا تھا۔ ابو جہل چاہے جس قدر بھی خواہش کر لیتا، بنی ہاشم کو یوں یک جنبش قلم علیحدہ کر دینا معروضی حالات میں ممکن نہیں تھا۔ قبیلہ قریش میں کنبے ایک دوسرے کے ساتھ رشتہ داریوں، ازدواج اور غم زا دبند ھن میں اس طرح جکڑے ہوئے تھے کہ یقیناً، کسی ایک کنبے کا بائیکاٹ خود بائیکاٹ کرنے والے کنبے کا اپنا بائیکاٹ بن جاتا۔

مکہ بھر میں اس معاملے کو لے کر، ایک یا دوسرے گروہ کے ساتھ وفاداری اس نہج پر پہنچ چکی تھی کہ یہ آخری حد ہو۔ محمدؐ کے الہامی پیغام کی وجہ سے گھرانوں کے اندر ٹوٹ پھوٹ اور نفاق شروع ہو گیا۔ ایک مثال ملاحظہ ہو۔ ابو بکر کے اسلام قبول کرنے کے بعد، ان کی بیوی اور دو بالغ بچوں نے بھی ان کی پیروی میں ایمان قبول کر لیا مگر ان کا ایک بیٹا بد ستور تندی اور شدت سے مخالفت پر تلا ہوا تھا۔ اسی طرح اگر خدیجہ کا سوتیلا بھائی محمدؐ کے شدید مخالفین میں سے تھا تو اس کے دو بیٹے اس معاملے کو لے کر تذبذب کا شکار تھے۔ ان میں سے ایک تو محمدؐ کا انتہائی پر جوش حامی تھا مگر وہیں دوسرا بیٹا باپ کے ساتھ کھڑا تھا۔ وہ محمدؐ کا داماد تھا اور کنبے کے دباؤ میں آکر اس نے آپؐ کی سب سے بڑی صاحبزادی کو فوراً طلاق بھی دے دی۔

یہ تو دوسرے کنبوں کا حال ہے۔ خود بنی ہاشم میں بھی یہی تقسیم جاری تھی۔ ابو طالب کا سوتیلا بھائی، ابولہب یا 'شعلے کا باپ' جس نے پہلی مجلس میں محمدؐ کی دعوت پر انتہائی ترش رویہ اختیار کیا تھا، اب آپے سے باہر ہو رہا تھا۔ ابولہب نے اپنے کنبے کے اندر رہ کر قریش کے اعلان کی پر زور حمایت کی۔ خود اس کی خواہش یہ تھی کہ شاید اس طرح بنی ہاشم ابو طالب کو کنبے کی سربراہی سے علیحدہ کر دیا جائے گا۔ اس کے نتیجے میں اسے سرداری کا موقع مل جائے گا۔ ابولہب کی اسی مخالفت اور چال بازی کی وجہ سے قران میں اس کا نام لے کر مذمت کی گئی اور سخت وعید سنائی گئی۔

یہ بائیکاٹ بالآخر مکہ میں قدیم اقدار کی تنزلی اور معاشرے میں جاری ٹوٹ پھوٹ کی واضح تصویر بن جائے گا۔ نہ صرف یہ بلکہ یہی بائیکاٹ محمدؐ کے الہامی پیغام کی ترویج اور بنیادی نکتے پر تفصیل سے روشنی ڈالنے کے کام بھی آئے گا۔ اب صورتحال یہ تھی کہ وہ جو بائیکاٹ کے حامی تھی، محمدؐ کو گھرانوں کے اندر تقسیم کا ذمہ دار گردانتے تھے اور دوسرے لوگ جو بائیکاٹ کے مخالف تھے، وہ الٹا بائیکاٹ کا حکم دینے والے سربراہان کے درپے ہو گئے۔ یہ لوگ اب قریش کے سرداروں سے کنی کرنے لگے اور چھپ کر بائیکاٹ کی خلاف ورزی پر اتر آئے۔

بائیکاٹ کے مخالفین رات کی تاریکی میں بنی ہاشم کے گھروں میں خوراک پہنچا آتے۔ ان میں سے اکثر نے کنبے کی تجارتی قافلوں اور بازاروں میں مفادات کی نمائندگی بھی شروع کر دی۔ لیکن، انتقام کے ڈر سے یہ چوکنا رہتے کہ کسی کو اس کی کانوں کان خبر نہ ہونے پائے۔ کوئی شخص ابھی تک عوامی سطح پر بائیکاٹ کی مخالفت میں کھڑا نہیں ہو سکا تھا۔

بائیکاٹ کے نتیجے میں بنی ہاشم کے لیے روزمرہ زندگی ایک جدوجہد بن کر رہ گئی۔ انہیں خوراک کے حصول اور معمولی مگر بنیادی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے بھی اچھی خاصی مشقت کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ اس طرح کٹ جانے سے کنبے کے ہر شخص کی عزت نفس بھی مجروح ہو رہی تھی۔ وہ دن چلے گئے تھے جب گلی کوچوں میں اقربا اور تعلق داروں سے خوشگوار سامنا ہا کرتا تھا، یہ بازاروں میں لین دین اور تول مول کیا کرتے تھے، اور قریش میں بنی ہاشم کا رتبہ اور عزت، کعبہ کے احاطے میں معاشی اور سماجی مسائل پر مباحثے اور رائے کاری۔۔۔ الغرض یہ چھوٹی مگر خاصی اہم باتیں جن کے بل بوتے پر بنی ہاشم کو سماج میں اہمیت کا احساس ہوا کرتا تھا۔ اب ہوا ہو چکی تھیں۔ ہر دن، ہر جگہ اور ہر قدم پر بے عزتی اور تضحیک، بے حرمتی کا احساس کھانے کو دوڑتا۔ ابو طالب چونکہ کنبے کا سربراہ تھے، مکہ کے بزرگوں میں شمار ہوا کرتے تھے، ان کے لیے ذاتی طور پر یہ احساس بڑھ کر تھا۔

ابو طالب کی عمر اب ساٹھ کے پیٹے میں داخل ہو چکی تھی۔ اپنے وقت کے حساب سے وہ عمر رسیدوں میں شمار کیے جا سکتے ہیں۔ مسلسل دباؤ کی وجہ سے آپ کی صحت بگڑتی جا رہی تھی مگر قریش کے نامناسب رویے کے خلاف مزاحمت کے ارادے جوں کے توں پختہ تھے۔ آپ نے قریش کے ناروا سلوک کو شاعری کی صورت میں کچوکے لگانا شروع کر دیا۔ آپ کے لکھے ہوئے اشعار مکہ کی گلیوں، چوباروں، بازاروں اور عوامی مقامات میں زبان زد عام ہو گئے۔

مثلاً آپ لکھتے، 'اگر قریش ہونے کا مطلب یہی ہے تو غیرت فضول ہے۔ آخر کون ہو گا جو ان بزدلوں کی پناہ مانگے گا؟' یا پھر یہ اشعار کہ، 'اپنی پناہ کی بجائے مجھے ایک نوعمر اونٹ دو۔ کمزور، لاغر اور بڑبڑاتا ہوا اونٹ دو۔ جس کی کوکھ اس کے پیشاب سے تر ہو، ایسا اونٹ دو۔ جو چل نہ سکتا ہو، ریوڑ سے پیچھے رہ جائے، ویسا اونٹ دو۔ ایسا اونٹ جو صحرا کے ٹیلے چڑھتا ہو تو اس پر نیولے کا گماں ہو۔' اسی طرح وہ بنو امیہ کے سربراہ ابو سفیان، جن کو وہ اپنا دوست اور اتحادی سمجھتے آئے تھے۔ یوں ادھیڑا، 'اس نے پاس سے گزرتے ہوئے مجھ سے منہ پھیر لیا۔ یوں کنی کترا گویا وہ زمین پر چلتا پھرتا عظیم تر آدمی ہے۔ وہ ہم سے کہتا ہے کہ دوست کی حیثیت سے اسے اس سب پر افسوس ہے۔ مگر اپنے دل میں دیکھو، وہ ساری کدورت، برے ارادے لیے پھرتا ہے۔'

ابو طالب انہی اشعار کے ذریعے باور کرانے لگے کہ یہ بائیکاٹ مکہ کی تمام تر اقدار اور اخلاقیات کی 'قبیح خلاف ورزی' ہے۔ انہوں نے قبائلیوں سے روایات کی پاسداری کا تقاضا کیا اور انتباہ کرنے لگے کہ، 'اگر آج ہم غرق ہو گئے تو یاد رکھو، کل تمہارا بچنا بھی ممکن نہیں ہو گا'

ابو طالب کی اس لفاظی پر ابو جہل نے بھی جل بھن کر عملی طور پر جواب دینا شروع کر دیا۔ بائیکاٹ کا دائرہ کار بڑھا دیا گیا اور دوسرے کنبوں کے سربراہان کو مجبور کیا جانے لگا کہ وہ اپنے یہاں بھی وہی شرائط اور ضوابط کو سختی سے لاگو کریں۔ حکم جاری ہوا کہ ہر کنبہ اپنے گھرانوں میں موجود محمدؐ کے پیروکاروں سے پوچھ گچھ کرے اور انہیں اپنے نظریات سے پسپا ہونے پر مجبور کر دیا جائے۔ اس نئی قباحت پر محمدؐ کے ماننے والوں میں سے چند افراد کا مختصر گروہ مکہ چھوڑ کر چلا گیا۔ اس گروہ نے ایتھوپیا کا رخ کیا اور ارادہ یہ تھا کہ جب تک مکہ میں حالات بہتر نہ ہو جائیں اور بائیکاٹ کے خاتمے کا اعلان نہیں کر دیا جاتا، یہ لوگ وہیں بسر رکھیں گے۔ اس قافلے میں گیارہ مرد اور چار عورتیں شامل تھیں۔ قافلے کی سربراہی محمدؐ کی سب سے بڑی بیٹی اور ان کے نئے شوہر عثمان کر رہے تھے۔ عثمان، محمدؐ کے چند انتہائی متمول پیروکاروں میں سے ایک تھے۔ انہوں نے محمدؐ کی بیٹی کو طلاق ہونے کے فوراً بعد ہی ان سے نکاح کر لیا تھا۔ ایتھوپیا میں نہ صرف اس قافلے کو پناہ مل گئی بلکہ جیسا کہ ابن اسحاق لکھتے ہیں، 'انہیں بادشاہ نجاشی کی طرف سے یہاں رہنے کو کشادہ گھر، تحفظ اور بازاروں میں کاروبار کرنے کی اجازت دی گئی۔'

وقت گزرنے کے ساتھ ایتھوپیائی مہمان نوازی میں اضافہ ہو گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے، مومنین کا ایک دوسرا مگر مختصر گروہ بھی آن پہنچا۔ نجاشی کی یہی اجازت اور مہمان نوازی تاریخ اسلام کے اوائل دور کی ایک انتہائی مقبول روایت مشہور ہو جائے گی۔ اس روایت میں یہ کہا جائے گا کہ چونکہ مکہ کے منکرین نے مومنین کی زندگی دو بھر کر دی تھی، ایتھوپیا کے عیسائیوں نے ان کی اہمیت اور منزلت کو پہچان لیا اور اپنے یہاں خوش آمدید کہا۔ یہ بعینہ ویسی ہی روایت ہے جو اس سے پہلے تارک الدنیا راہب بحیرہ کی نسبت سے مشہور ہے۔ تب بھی، عیسائی راہب بحیرہ نے اونٹوں کی رکھوالی کرنے والے لڑکے کی قدر و منزلت یوں ہی پہچان لی تھی۔ جیسے تب، ویسے اب مومنین کے اس گروہ کو نجاشی کے دربار میں پذیرائی مل رہی تھی۔ بعض جگہ منقول ہے کہ نجاشی نے مومنین کے اس مختصر گروہ کو ذاتی دستوں کی حفاظت میں دے کر اپنے یہاں خصوصی منزلت کی یقین دہانی کرائی تھی۔ تحریر ہے کہ بائیکاٹ اور درپیش آنے والے حالات سن کر نجاشی کے آنسو نکل آئے اور اس نے پادریوں کو محمدؐ کے الہامی پیغامات کی تصدیق کرنے کا حکم دیا۔ علاوہ ازیں، اس نے قریش کے ایک وفد سے سونے اور چاندی کے تحائف لینے سے نہ صرف انکار کر دیا بلکہ ان کے مومنین کی مکہ واپس بھجوانے کے مطالبے کو بھی سختی سے رد کر دیا۔ اس دور کے ایتھوپیا میں ان حالات و واقعات کو ماننے کے لیے ان گنت سوالات کا جواب تلاشنا ہو گا، جو استدلال کی بنیاد پر ممکن نہیں ہے۔ امکان یہی ہے کہ اس وقت کے حالات اور تب ایتھوپیا میں رائج نظام کے تحت مومنین کے گروہ کو بیرونی تجار کی حیثیت سے ملک میں پناہ دی گئی ہو گی۔ اس طرح انہیں یہاں نہ صرف کاروبار کرنے بلکہ عارضی رہائش کی بھی اجازت مل گئی۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ بعد اس قسط کے، نجاشی بہر حال عیسائی ہی رہا۔

جب ابو جہل کو یہ احساس ہوا کہ محمدؐ کے چیدہ پیروکار اس کے پنجے سے نکل چکے ہیں، انتقام میں جل بھن کر اس کا غصہ آسمان کو چھونے لگا۔ اس نے اب مکہ میں باقی رہ جانے والے محمدؐ کے پیروکاروں کو دھمکانے اور تشدد کا نشانہ بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ ابو جہل کی ہدایت پر مکہ میں مومنین کو زچ کرنے کی باقاعدہ مہم کا آغاز کیا گیا۔ شہر بھر کے لفنگوں اور بدمعاشوں کو جمع کر کے محمدؐ اور ان کے پیروکاروں کے پیچھے لگا دیا۔ ابو جہل کی سوچ یہ تھی کہ اگر ان کو پابندی لگا کر قائل نہیں کیا جا سکتا تو کم از کم، تشدد کے ذریعے ان کے ہوش تو ضرور ہی ٹھکانے لگائے جا سکتے ہیں۔

ابن اسحاق اور ال طبری، دونوں نے ہی تشدد کے کئی واقعات کا حال درج کیا ہے۔ مثال کے طور پر ان میں سے ایک واقعہ مکہ کے باہر ایک وادی میں پیش آیا، جب چند شرپسندوں نے مومنین کے ایک گروہ پر اس وقت حملہ کیا جب وہ عبادت میں مصروف تھے۔ اسی ہڑبازی میں ان میں سے ایک کے سر پر اونٹ کے جبڑے کی ہڈی سے وار کیا گیا اور زخمی کر دیا۔ اس کے سر سے خون فوارے کی طرح ابل پڑا۔ یہ منظر اس قدر فصاحت سے بیان کیا گیا ہے کہ بعد ازاں اس پر قبل از اسلام عرب سے منسوب جہالت کے کلیشہ کا گماں ہوتا ہے۔ اگر ہم مان بھی لیں کہ ساتویں صدی عیسوی میں عرب و حجاز جہالت کی تاریکیوں میں ڈوبا ہوا تھا، نویں صدی عیسوی میں بغداد شہر کا کوئی بھی مہذب محقق اس بابت مخمصے کا شکار ہو سکتا ہے کہ اس دور میں یقیناً، اونٹ کے پنجریوں ہی، خواہ مخواہ ہر طرف بکھرے پڑے رہتے ہوں گے؟ یہ اسی طرح ہے کہ جیسے جارجیا اوکیف کی بنائی مصوری کے شاہکاروں میں سنسان اور تعریف کی رو سے پسماندہ شمالی نیو میکسیکو کے مناظر میں ہر طرف مینڈھوں اور بیلوں کے ڈھانچے بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اگر ایسا ممکن بھی تھا تو گماں ہے کہ عملی طور پر اونٹ کے جبڑے کی بجائے ران کی ہڈی بہتر ہتھیار ثابت ہو سکتی ہے۔

اسی طرح، اونٹ کے جبڑے کو ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے کی ایک دوسری روایت بھی مل جاتی ہے۔ اس دفعہ، یہ جبڑا مکہ میں انتہائی غیر حقیقی منظر میں بیان کیا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ خدیجہ کا ایک بھتیجا اپنی چادر میں آٹا چھپا کر بنی ہاشم کے گھروں میں لے جا رہا تھا کہ اسے ابو جہل نے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا۔ اس پر قریب سے گزرتے ایک شخص نے ابو جہل سے کہا، 'کیا تم اس لڑکے کو اپنی چچی کے گھر خوراک لے جانے سے روک رہے ہو؟ اسے جانے دو!' جب ابو جہل نے انکار کیا تو لڑکے نے گلی میں، قریب ہی پڑے اونٹ کے ایک جبڑے کو اٹھایا اور ابو جہل کو اس سے پیٹنا شروع کر دیا۔ جب اس سے اس کی تسلی نہ ہوئی تو اس نے جبڑا

چھوڑ، ابو جہل کی لاتوں اور مکوں سے بھی تواضع کر دی۔ اس کہانی میں بعد دور کے مومنین کے لیے دلچسپی اور محظوظ ہونے کا خاصا سامان ہے مگر بہر حال یہ مبینہ واقعہ اس وقت ابو جہل کی حیثیت اور مکہ میں اس کے مرتبے کے حساب سے خاصا مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے۔

گو ماضی کے ان واقعات میں خاصا تضاد ہے مگر ایذا رسانی بہر حال حقیقتی تھی۔ ابو جہل نے مومنین کو زبان سے زچ کیا اور ہراساں کرنے کے لیے تکلیف اور تشدد کا سامان پیدا کیا۔ اگر مومنین سے گروہ کی شکل میں سامنا ہوتا تو آوازے کسے جاتے، 'تم نے اپنے باپ دادا کے طریقے کو ترک کر دیا ہے۔ جو تم سے بہتر تھے۔ تم کمزور ہو، ذہنیت پتلی ہے اور تم جیسا بیوقوف کوئی دوسرا نہیں ہے۔ ہم تمہاری آبرو تار تار کر دیں گے۔' اسی طرح، اگر مومنین تاجر ہوتے تو انہیں کاروبار سے علیحدہ کرنے کی دھمکی دی جاتی، 'ہم تمہارے تجارتی سامان کی بیچنے سے انکار کر دیں گے۔ اس کا استعمال ترک کر دیا جائے گا اور منڈیوں میں تمہاری کوئی جگہ نہیں ہو گی۔ ہم تمہیں بھکاری بنا دیں گے۔' اور اگر یہ لوگ، 'نیچ اور کمی کمین' ہوتے تو جیسے ابن اسحاق لکھتے ہیں، 'یہ وہ لوگ تھے جنہیں کسی کنبے کی کفالت اور پناہ حاصل نہیں تھی۔ یعنی غلام اور آزاد کیے ہوئے اشخاص، پھیری لگا کر روزی کمانے والے ہنر کار اور مزدور پیشہ لوگ تھے۔' ابو جہل، ان لوگوں کے ساتھ بات کرنا بھی اپنی توہین سمجھتا اور سید حا تشدد پر اتر آتا۔ وہ خود اپنے ہاتھوں سے یا اپنی نگرانی میں ان پر تشدد کروایا کرتا تھا۔ اس طرح کا ایک واقعہ اس لڑکے کے ساتھ پیش آیا، جو ایک آزاد کردہ غلام شخص کا بیٹا تھا۔ اس نے از خود ہی محمدؐ کی پیروکاری میں شامل ہو کر بخوشی محمدؐ کے بعد پہلے شخص کی حیثیت سے کعبہ کے احاطے میں قرانی آیات کی تلاوت کرنے کی ٹھانی تھی۔ ابھی اس نے تلاوت کا آغاز ہی کیا تھا۔ یعنی، 'شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان اور نہایت رحم کرنے والا ہے۔ اس نے قران سکھایا۔۔۔' کہ چاروں اطراف سے اس پر تابڑ توڑ تھپڑوں، گھونسوں اور لاتوں کی بارش شروع ہو گئی۔ اس کو گالیاں دی گئیں اور لوگ حیرت زدہ رہ گئے۔ کہنے لگے، 'یہ غلام اور عورت کا بچہ کیا کہتا پھرتا ہے؟ اس کی ہمت کیسے ہوئی؟'

غلاموں کو بھوکا اور پیاسا رکھا جاتا اور مزدوروں کو کام سے روک دیا جاتا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ان میں سے اکثر کی ہمت جواب دے گئی۔ ان میں سے ایک شخص نے بعد میں اقرار کیا کہ حالات اس قدر بد تر ہو گئے کہ اگر مکہ کے غنڈے تشدد کے دوران اگر کسی رینگتے ہوئے کیڑے کی طرف بھی اشارہ کرتے تو تشدد کا نشانہ بننے اذیت روکنے کے لیے اسے بھی خدا قرار دے دیتا۔ کئی ایسے بھی تھے جو جسمانی تشدد اور ایذا رسانی کے باوجود بھی اڑے رہے۔ ان میں سے ایک، بلال بھی تھے۔ بلال بلند قامت ابیسینیائی غلام تھے۔ آپ کا مالک ابو بکر کا چچازاد بھائی تھا۔ اس نے بلال کو باہر دھوپ میں صحرا کی تپتی ہوئی ریت پر لٹا کر سینے پر ایک بھاری پتھر رکھ دیا۔ گرمی اور پتھر کے وزن کے باعث بلال کو سانس لینے میں سخت دشواری ہو رہی تھی۔ ان کو بتایا گیا، 'تم یہی رہو گے اور ایسے ہی مر جاؤ گے۔ ہاں، اگر تم محمدؐ کی پیروی چھوڑ دو اور لات اور عزا کی پوجا کرو تو بچت ہو سکتی ہے۔'

ابو بکر نے اپنے چچازاد سے بلال کو چھوڑ دینے کی درخواست کی۔ کہا، 'کیا تمہیں خدا کا کوئی خوف نہیں ہے کہ تم اس کے ساتھ اتنا بد تر سلوک کرتے ہو؟ آخر، یہ غیر انسانی رویہ کب تک جاری رہے گا؟'

اس نے جواب دیا، 'یہ تم ہو جس کی وجہ سے اس کے ذہن میں یہ خناس پیدا ہو گیا ہے۔ تم چاہو تو اسے بچا لو!'

بالآخر، جیسا کہ ابن اسحاق نے رقم کیا ہے کہ ان دونوں اشخاص کے بیچ بلال کے عوض 'ایک سخت جان غلام اور منہ مانگی قیمت' کا سودا طے پا گیا۔ ابو بکر نے بلال کو خرید کر آزاد کر دیا۔ دس سال بعد بلال اسلام کے پہلے موذن کہلائے جائیں گے۔ ان کی بھاری اور رعب دار آواز، ہر نماز سے قبل کوٹھوں کے اوپر سے اذان کی صورت ہر طرف گونجا کرے گی۔

جلد ہی ابو جہل کے لیے خود اپنے کنبے میں بھی اپنی مرضی اور منشا چلانا بھی مشکل ہو گیا۔ مثال کے طور پر یہ واقعہ کہ اس میں جس قدر شدت سے وہ اپنے ہی کنبے مخزوم کے ایک نوجوان کو سبق سکھانا چاہتا تھا، اسی طمع سے اس نے اس لڑکے کے بھائی سے ہاتھ اٹھانے کی اجازت طلب کی۔ لڑکے کے بھائی نے جواب دیا، 'اگر ایسا

ہے تو ایسا ہی سہی۔ اس کو سبق سکھاؤ۔ مگر اس کی جان کا خیال رکھنا۔ میں قسم اٹھاتا ہوں کہ اگر تم نے اسے ہلاک کیا تو یاد رکھو میں تمہارے گھر کے آخری فرد تک کو اپنے ہاتھوں سے قتل کر دوں گا۔' یہ دھمکی، ابو جہل کے ارادوں اور شوق پر پانی پھیرنے کے لیے کافی تھی۔

محمدؐ کو اس دوران تشدد اور جسمانی ایذا سے محفوظ رکھا گیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ابھی تک ابو طالب کی پناہ میں تھے۔ ان پر کیے گئے اکثر حملے صرف زبانی کلامی ہوا کرتے۔ اکثر راہ میں گزرتے ہوئے انہیں تضحیک اور گالیوں کا نشانہ بنایا جاتا۔ ایک بار یوں ہوا کہ وہ کعبہ کے احاطے میں سے گزر رہے تھے کہ شرپسندوں کے ایک گروہ نے آپؐ کو گھیر لیا اور لباس کے ساتھ کھینچا تانی شروع کر دی۔ ابو بکر نے دیکھا تو دوڑ کر آپؐ کو بچانے کے لیے پہنچ گئے اور بجائے، ٹھگوں کے ہاتھ مار کھا لی۔ ابو بکر کی بیٹی عائشہ نے روایت کیا ہے کہ اس روز وہ گھر پہنچے تو 'ان کی داڑھی بکھری ہوئی تھی اور سر میں سے خون بہہ رہا تھا۔'

ان سب خطرات کے پیش نظر محمدؐ کے پیروکار چھپ کر ملنے لگے۔ ابو جہل کے ایک قریبی رشتہ دار نے اپنا گھر مومنین کے لیے وقف کر دیا۔ یہاں وہ اپنے سب سے بڑے دشمن کی عین ناک کے تلے جمع ہو رہتے اور باجماعت عبادت کیا کرتے۔ محمدؐ اور ان کے پیروکاروں کو زبردستی اقلیت رہنے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔ مگر جس قدر ان کو دھمکایا جاتا، خوفزدہ کرتے، ان کی آپس میں نسبت اور قرابت اتنی ہی بڑھتی چلی جاتی۔ محمدؐ کی دیکھا دیکھی انہوں نے بھی تشدد کا جواب عدم تشدد سے دینا شروع کر دیا۔ یہ طریقہ نہایت کارگر ثابت ہوا۔ اس طرح دیکھنے والوں کو ناانصافی صاف نظر آنے لگتی اور وہ مومنین کے اخلاق اور صبر کے گرویدہ ہو جاتے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اصل میں محمدؐ اور ان کے پیروکاروں کا یہی طریق تھا جس کی بدولت مکہ کے دو مشہور جنگجو بھی اس مختصر اور اقلیت گروہ کا حصہ بننے پر مجبور ہو گئے۔

ان میں سے پہلا شخص محمدؐ کے چچا حمزہ تھے۔ آپ عبد المطلب کے دس بیٹوں میں سے ایک تھے اور 'قریش میں طاقتور ترین مرد اور ناقابل شکست' مشہور تھے۔ کوئی شخص آپ کے مقابل کھڑے ہونے کی جرات نہیں کر سکتا تھا۔ مکہ سے باہر کئی روز تک شکار کی غرض سے سفر کرنے کے بعد وہ لوٹ کر آئے تو حسب روایت کعبہ کے احاطے میں طواف کی غرض سے داخل ہوئے۔ آپ کے گندھے پر ابھی تک تیر اور کمان لٹک رہی تھی۔ جب آپ نے طواف کر لیا تو دیکھتے ہیں کہ کعبہ کے احاطے میں ایک طرف ہجوم اکٹھا ہو گیا ہے۔ لوگ اس واقعے کی بابت بات چیت کر رہے تھے جو ابھی تھوڑی دیر پہلے پیش آیا تھا۔ محمدؐ نہایت اطمینان سے بیٹھے ہوئے تھے اور ابو جہل ان کے سر پر تن کر کھڑا انہیں کوسنے دے رہا تھا۔ ابو جہل کی اس ہرزہ سرائی کے جواب میں آپؐ نے ایک لفظ تک ادا نہیں کیا تھا۔

کسی کے اکسانے پر یوں بے مزاحمت رہنا، ہرگز حمزہ کا طریقہ نہیں تھا۔ پھر، اپنے بھتیجے کی یوں تضحیک اور بے حرمتی پر آپ کا خون بھی کھول اٹھا۔ آپ تیزی سے ابو جہل کی طرف بڑھے اور اس کو سامنے سے جا لیا۔ کعبہ کے احاطے میں لوگ دیکھ رہے تھے کہ حمزہ نے جاتے ہی ابو جہل کو گندھے سے پکڑ کر جھنجوڑا اور اپنی کمان کے کونے سے ضرب دے ماری۔ پھر، لوگ تو حیرت زدہ رہے ہی مگر خود حمزہ کو اپنے الفاظ پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ ابو جہل سے کہنے لگے، 'کیا تم اس وقت بھی محمدؐ کو یوں ستاؤ گے جب میں بھی اس کے پیروکاروں میں شامل ہو جاؤں گا اور وہی کہوں گا جو وہ کہتا ہے؟ اگر ہمت ہے تو مجھ پر وار کرو!'

یہ اب تک محمدؐ کو حاصل ہونے والی سب سے بڑی حمایت تھی۔ نہ صرف آپ کو طاقت کا سہارا مل گیا تھا بلکہ اس قدر قد آور شخصیت کے قبول اسلام پر الہامی پیغام کو بھی ایک نئی روح مل چکی تھی۔ ایک لمحے کو تو خود ابو جہل بھی سٹپٹا کر رہ گیا۔ مخزوم کے کچھ افراد ابو جہل کی مدد کو آگے بڑھے تو اس نے ہاتھ کے اشارے سے ہی انہیں روک دیا اور قدرے پشیمانی سے کہنے لگا، 'کوئی حمزہ کو ہاتھ نہیں لگائے گا۔ میں نے ہی اس کے بھتیجے کی بے عزتی کی تھی'۔ شاید، ابو جہل اس وجہ سے بھی ہکا بکا رہ گیا تھا کہ حمزہ کے اسلام قبول کرنے کا موجب، کوئی دوسرا نہیں بلکہ وہ خود تھا۔

اس سے مختلف مگر بدستور ڈرامائی انداز میں اسلام قبول کرنے کادوسراواقعہ ایک جنگجو، عمر کے ساتھ پیش آیا۔ عمر اس قدر بلند قامت تھے کہ ان کاقد دیکھ کر ہی لوگوں میں تھرتھری مچ جاتی۔ رقم ہے کہ،'وہ اس قدر بلند قامت تھے کہ ہجوم میں دور سے کھڑے نظر آتے۔ ایسالگتاکہ شاید گھوڑے پر سوار ہیں۔' ابھی آپ کی عمر صرف بیس کی دہائی میں تھی مگر پھرتی اور وار کرنے کی صلاحیت حیران کن تھی۔ پھر، آپ کھجور کی پود شراب کے شوقین بھی تھے، جس کی وجہ سے غصے میں خاصے تیز واقع ہوئے تھے۔ بعد ازاں، آپ تاریخ اسلام میں سب سے مشہور جنگجو اور سپہ سالار مشہور ہوجائیں گے۔ ابوبکر کے بعد دوسرے خلیفہ نامزد کیے جائیں گے۔ مگر ابھی تک آپ کی اسلام دشمنی کا یہ عالم تھا کہ اگر کوئی شخص آپ کے بارے میں یہ گماں رکھتا تو یہ نہایت مضحکہ خیز بات معلوم ہوتی۔ آخر کار، آپ ابوجہل کے بھتیجے تھے۔ آپ کے والد، جن کانام خطاب تھا۔ یہ وہی شخص ہیں جنھوں نے برسوں پہلے اپنے سوتیلے بھائی زید، جو حنفامیں سے ایک تھے، خدائی اوتاروں کی مخالفت پر شہر سے باہر نکال دیا تھا۔ اس وقت تک، ابوجہل کو اگر واحدانیت کے 'فتنے' سے نبٹنے کے لیے اگر مکہ بھر میں کسی سے پوری طرح امید تھی تو وہ صرف عمر تھے۔ جو اس کا خیال خام ثابت ہوا۔

ابن اسحاق نے اپنی تصانیف میں اس شام کا تذکرہ نہایت مفصل انداز میں کر رکھا ہے۔ عمر ایک محفل میں شراب کے نشے میں دھت ہو کر انتہائی غصے کے عالم میں، مکہ میں جاری اختلافات کی ہوا اور نفاق کی وجہ سے خاصے برہم تھے۔ اچانک ہی، انہوں نے تلوار سونت لی اور اعلان کیا،'میں محمدؐ کے پیچھے جارہاہوں۔ وہ غدار ہے۔ اس نے قریش کو تقسیم کر دیا ہے۔ ہمارا مذاق اڑاتا ہے اور اس نے ہماری بے عزتی کی ہے۔ میں اسے قتل کردوں گا۔'

آپ کے ایک دوست نے انہیں متنبہ کیا اور قصاص کا ڈراوا دیتے ہوئے کہا،'عمر، تم خود کو دھوکہ دے رہے ہو۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ بنی ہاشم تمہیں محمدؐ کو قتل کرنے کے بعد زندہ چھوڑ دیں گے؟ پہلے اپنے گھر کی تو خبر لو۔ ان کو راستے پر لاؤ، بعد میں کسی اور کے بارے میں سوچنا۔۔۔'

'اپنے گھر کی خبر لوں؟' عمر نے حیرت سے پوچھا۔ 'ہاں، کیوں نہیں۔۔۔' دوست نے جواب دیا۔ کیا عمر جانتے نہیں تھے کہ ان کی بہن، بہنوئی اور ان کے بھتیجے سمیت پورے گھرانے نے اسلام قبول کر لیا تھا؟

چونکہ ان کے بہن نے کمال سمجھداری سے اس بات کو راز بنائے رکھا، عمر کو بالکل معلوم نہیں ہوا۔ یہ سن کر آپ کا غصہ آسمان کو چھونے لگا اور تلوار سونت کر بہن کے گھر میں جا گھسے۔ آپ کا ارادہ مار پیٹ اور تشدد کا تھا مگر وہاں پہنچ کر کیا دیکھتے ہیں کہ چند لوگوں کا گروہ فرش پر مودب بیٹھا ہے اور قرآنی آیات کی تلاوت کی جارہی ہے۔ اس گروہ نے عمر کی موجودگی کو یکسر نظر انداز کیے، نہایت تحمل سے تلاوت جاری رکھی۔ اس پر عمر بے کلی کا شکار ہو کر وہیں کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ قرآنی آیات کی سریلی اور ملائم آواز شراب کے نشے میں بدحواس عمر کے کانوں تک پہنچی تو وہ بے خود ہو کر بیٹھ گئے۔ نہایت توجہ سے سننے لگے۔ جب آیات کی تلاوت تمام ہوئی تو ایک توقف کے بعد بولے،'یہ کس قدر نفیس اور عمدہ الفاظ ہیں'۔ فوراً ہی آپ نے انہیں خود کو محمدؐ کے پاس لے جانے کو کہا تاکہ وہ کلمہ اسلام پڑھ کر باقاعدہ اسلام میں داخل ہو جائیں۔ بعد اس روز کے، عمر نے پھر کبھی شراب کو ہاتھ نہیں لگایا۔

قبول اسلام کی یہ دونوں ہی کہانیاں،'آنکھیں کھل جانے اور روشنی کی راہ دیکھ لینے' کی مصداق کسی بھی مذاہب کے طالب علم یا روحانیت پسندوں کے لیے انوکھی نہیں ہیں۔ چونکہ، یہ دونوں ہی واقعات اس وقت مکہ میں انتہائی معروف اشخاص یعنی حمزہ اور عمر سے متعلق ہیں تو ان کی اہمیت نہایت بڑھ کر ہے۔ ان شخصیات کے اسلام میں داخل ہونے کے بعد مومنین کا حوصلہ بڑھ گیا اور مکہ میں ان کا جینا نسبتاً آسان ہو گیا۔ وہیں، مکہ کے سربراہان کے یہاں بھی بائیکاٹ اور ہراساں کرنے کی تراکیب بارے شبہات بڑھ گئے۔ ایک بار پھر، ان کے وار الٹا انہیں پر کاری ضربیں لگا رہے تھے۔

چنانچہ، مکہ بھر میں اس بابت حریفانہ رویہ ترک کرنے یا کم از کم مخالفت میں کمی لانے پر زور دیا جانے لگا۔ 'محمدؐ کو اپنے حال پر چھوڑ دو' ایک بزرگ نے کہا،'وہ اکیلا آدمی ہے جس کا کوئی بیٹا بھی نہیں ہے۔ جب یہ مر جائے گا تو یہ لوگوں کی یادداشت سے بھی گم ہو جائے گا اور تمہیں اس سے چھٹکارا مل جائے گا۔' کئی دوسرے لوگوں

نے ایک بار پھر مصالحت کے لیے بات چیت پر زور دیا۔ مشورے دیے جانے لگے کہ اب کی بار محمدؐ کو کہا جائے کہ 'ہم اس کی عبادت کریں گے جس کی تم عبادت کرتے ہو مگر تم بھی اسی کی عبادت کرو گے جس کی ہم کرتے ہیں۔ اگر وہ جس کی تم عبادت کرتے ہو، بہتر ہوا تو ہم بھی اس کو قبول کر لیں گے۔ مگر جس کی ہم عبادت کرتے ہیں، اگر وہ بہتر ہو تو پھر تمہیں بھی اسے قبول کرنا پڑے گا'۔ اس کے باوجود، مخالفین میں کئی لوگ ایسے بھی تھے جو قرانی پیغام کی عظمت اور طاقت کے قائل ہو چکے تھے اور ان کے خیال میں یہ مکہ کی اساس کو بدل کر رکھ دے گا۔

چنانچہ، ایک سردار نے کہا، 'اے قریش، تم کچھ بھی کر لو۔ اس صورتحال سے نبٹنا تمہارے بس میں نہیں ہے۔ مذمت اور نہ ہی طاقت کے استعمال سے کچھ فرق پڑے گا۔ جب تک محمدؐ نے یہ پرچار نہیں کیا تھا، تم سب ہی اس کو پسند کیا کرتے تھے۔ یہ اپنے افعال پر سوچ بچار کرنے کا وقت ہے۔ بخدا، تم پر ایک بڑی آزمائش آن پڑی ہے۔'

دوسری طرف اپنے رشتہ داروں اور ماننے والوں کو یوں تکلیف میں مبتلا دیکھ کر بھی آپؐ بے بس تھے۔ پیروکاروں کو تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا، کئی جلاوطنی پر مجبور ہو گئے تھے اور بدستور ہر شخص کو دھمکایا جا رہا تھا۔ بہرحال، بحیثیت انسان، اس سب کے دوران بھی محمدؐ نے ذمہ داری کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ آپؐ کا اصل سہارا پیروکاروں کا خلوص اور کبھی نہ پسپا ہونے والا حوصلہ تھا۔ اس کے علاوہ بنی ہاشم نے بھی قبائلی سطح پر وفاداری کا انتہائی ثبوت پیش کیا تھا۔ آپؐ اس حقیقت سے بھی اچھی طرح آگاہ تھے کہ ان سب کے ساتھ یہ سلوک صرف اور صرف ان کی وجہ سے کیا جا رہا تھا۔ مگر اس کے باوجود، ہر صورت میں، ابھی تک آپؐ کے پیروکار اور کنبے کے لوگ ثابت قدم رہے تھے اور ان میں سے کسی بھی شخص نے اس بابت ان سے گلہ نہیں کیا تھا۔ جو بھی تھا، مومنین کو درپیش تکالیف آپؐ کے لیے پریشانی کا باعث تھیں۔ آپؐ اس بابت جس قدر اضطراب کا شکار ہوتے، قرانی آیات کے ذریعے حوصلہ بڑھانے کا رجحان بڑھتا چلا جاتا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے الہامی آواز آپؐ کو اندر تک جھانک سکتی ہے اور محمدؐ کے ذہن میں، شعور کے پوشیدہ اور نہاں خانوں میں ان سوالات کے جواب بھی دیے جا رہے تھے جن سے شاید، آپؐ واقف بھی نہیں تھے۔

آپؐ کو بارہا یقین دہانی کرائی جاتی رہی اور جس قدر تضحیک اور مخالفت بڑھ رہی تھی، نئی قرانی آیات تسلی اور تشفی دی جانے لگی۔ اس مشکل دور کے دوران نازل ہونے والی تقریباً تمام ہی آیات میں صبر کی تلقین اور تحمل کا دامن تھامے رکھنے کی تاکید کی گئی ہے۔ قریب سے جائزہ لیں تو اس دور میں، آپؐ کے اس قرانی طریق اور گاندھی کی عدم تشدد تحریک میں کافی مشابہت ہے۔

آپؐ کو بار بار کہا جاتا کہ وہ اس آزمائش میں مبتلا ہونے والے پہلے انسان نہیں ہیں۔ مثال کے طور پر کئی آیات میں کہا گیا، 'اے محمدؐ! تم سے پہلے بھی بہت سے رسولوں کا مذاق اڑایا جا چکا ہے۔۔۔' محمدؐ کی ہی طرح ان پر بھی لوگ شک اور شبے کا اظہار کیا کرتے تھے۔ انہیں بھی چالباز اور مجنوں قرار دیتے تھے۔ موسیٰ سے لے کر عیسیٰ تک، تمام ہی پیغمبروں نے یہی الہامی پیغام پھیلایا تھا اور اس دوران انہیں بھی اسی طرح بے عزتی اور تضحیک کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ انہیں بھی یوں ہی ہراساں کیا گیا تھا۔

ایک آیت میں کہا گیا، 'ہمیں معلوم ہے کہ جو باتیں یہ لوگ تم پر بناتے ہیں، ان سے تمہارے دل کو سخت کوفت ہوتی ہے'۔ پھر، کئی جگہوں پر تاکید کی گئی کہ، 'جو باتیں یہ لوگ تجھ پر بناتے ہیں وہ تجھے رنجیدہ نہ کریں'۔ بارہا کہا جانے لگا کہ، 'دل چھوٹا مت کرو'، 'رنج نہ کرو'، 'رنجیدہ نہ ہو' اور 'دل تنگ نہ ہو' وغیرہ۔

آپؐ کا کردار تو صرف مکہ کے لوگوں کو متنبہ کرنا تھا۔ انہیں ہرگز بچانا نہیں تھا۔ مثال کے طور پر ان آیات میں کہا گیا، 'تم مُردوں کو نہیں سنا سکتے۔ نہ ان بہروں تک اپنی آواز پہنچا سکتے ہو' محمدؐ کو بتایا گیا کہ یہ جو ترش رو، گمراہ لوگ ہیں، 'ان کے دلوں پر اثر نہیں ہوتا، یہ آنکھوں سے دیکھ نہیں سکتے اور کان سننے سے بے بہرہ ہیں'۔ آپؐ بھلے جتنا بھی چاہیں، 'اندھوں کو راستہ بتا کر بھٹکنے سے بچا نہیں سکتے'۔ یا پھر ایک اور مثال اس طرح دی کہ، 'یہ لوگ آسمان کے ٹکڑے بھی گرتے ہوئے دیکھ

لیں تو کہیں گے یہ بادل ہیں جو اڈے چلے آرہے ہیں'۔ چنانچہ، محمدؐ کو انہیں چھوڑ دینا چاہیے، 'تا آنکہ، قیامت کا دن آپہنچے'۔ وحی میں یہ بھی کہا گیا کہ گو ایسا کرنا مشکل ہے لیکن، 'اپنی روح کو تھکاؤ مت اور ان کے لیے ہرگز رنجور نہ ہو'۔

بسا اوقات تو قرانی آیات کا لہجہ ایک شفیق ماں کی تسلی اور تشفی معلوم ہونے لگتا۔ مثلاً، یہ آیات ملاحظہ ہوں۔ 'اچھا تو اے محمدؐ، شاید تم ان کے پیچھو غم کے مارے اپنی جان کھو دینے والے ہو، اگر یہ اس تعلیم پر ایمان نہ لائیں؟'۔ اسی طرح محمدؐ کو چاہیے کہ وہ چند اں ان کی سرکشی کی پرواہ نہ کریں۔ کیونکہ، 'ہم انہیں ان کی سرکشی ہی میں بھٹکنے کے لیے چھوڑے دیتے ہیں۔ یا پھر، 'پس تم انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو کہ اپنی افترابازیاں کرتے رہیں'۔ اور، 'چھوڑو ان لوگوں کو جنہوں نے اپنے دین کو کھیل اور تماشا بنا رکھا ہے۔'

محمدؐ کو تاکید کی گئی کہ، 'ان کو چھوڑ دو اور انتظار کرو۔ 'یہی تاکید، آپؐ سے پہلے بھی ایک پیغمبر کو کچھ اس طرح کی گئی تھی کہ، 'منہ پھیر دو۔ ان کو نظر انداز کرو۔ تم پر کوئی بوجھ نہیں ہے۔ صبر کرو اور اس کا حکم دو جو سچ ہے۔ بیوقوفوں کی باتوں پر دھیان مت دو۔ 'ان آیات میں تو نہایت بے صبری سے صبر کرنے کو کہا گیا ہے کہ، 'اے محمدؐ، صبر سے کام لیے جاؤ اور تمہارا صبر اللہ ہی کی توفیق سے ہے۔ ان لوگوں کی حرکات پر رنج نہ کرو اور نہ ان کی چال بازیوں پر دل تنگ ہو۔'

جہاں قران میں اس لعن طعن اور طنز کو نظر انداز کرنے کی تاکید کی گئی، وہیں یہ یقین بھی دلایا گیا کہ در اصل بے حرمتی اور تضحیک مستقبل میں بھی یوں ہی برقرار اور جاری رہے گی۔ یہ ہمیشہ یوں قائم رہے گی۔ یہی آیات ہیں، جو اسلام کی بنیاد یعنی قران میں، آج جدید دور کے مسلمانوں کو لاحق المیے کی ترجمانی کرتی ہیں۔ آج مسلمانوں کا رویہ کئی لوگوں کو حیرت میں ڈال دیتا ہے۔ جہاں، مغرب میں طنز و مزاح کو بے ضرر سمجھا جاتا ہے، مغرب کے خیال میں شاید یہ ایذا نہیں بلکہ تفریح کا سامان ہے وہیں اہیان مکہ کی محمدؐ کی بے حرمتی اور اسی تضحیک کی وہ چھاپ جو اوائل دور کے مسلمانوں پر ثبت ہو گئی تھی، آج تک کے ماننے والوں کی یاداشت میں پختہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب سلمان رشدی اپنے ناولوں اور ڈینش کارٹونسٹ مزاحیہ اشکال بنا کر طنز و مزاح کا بہانہ بناتے ہیں تو دنیا بھر کے مسلمان غصے سے کھول اٹھتے ہیں۔ حالانکہ، اس بابت قران نے بارہا تاکید کر رکھی ہے۔ اوپر بیان کردہ دونوں ہی صورتوں میں عقلمندی کا ثبوت یہ ہے کہ اس طرح کی حرکات کو یکسر نظر انداز کر دیا جائے۔ جبکہ، انسانی سطح پر سوچا جائے تو سچ یہ ہے کہ ان باتوں کو نظر انداز کر دینا نہایت مشکل ہے اور اس بارے تاریخ بھری پڑی ہے۔

اپنے آپ کو خاندان اور اپنے لوگوں کے بیچ تقسیم کے مرکزی کردار کی صورتں پانا، یقیناً اس شخص کے لیے نہایت تکلیف دہ ہوتا ہے جس نے اپنی پوری زندگی، بچپن سے ہی اکٹھے اور یکجا ہونے کی کوشش میں گزار رکھی ہو۔ محمدؐ کے دل میں ہمیشہ سے امن اور آشتی کی خواہش رہی تھی۔ شخصیت کے اسی پہلو کی بدولت آپؐ نہایت کامیاب آڑھتی اور ثالث بن پائے تھے۔ یہ آپؐ کی طبیعت اور اسی سوچ کا نتیجہ تھا کہ ایک دفعہ کعبہ میں سیاہ پتھر کی تنصیب کا کام نہایت خوش اسلوبی سے طے پا گیا تھا۔ اور اب، چونکہ اس معاملے میں سارا مدعا ان کے سر پر تھا، یقیناً وہ ہمیشہ کی طرح بیچ کا راستہ نکالنے کے اہل تھے۔ کوئی ایسا راستہ، جس کے ذریعے سب لوگ امن سے اکٹھے رہ کر بسر کر سکتے تھے۔

جہاں ابو جہل جیسے لوگ نفرت اور مخالفت کی انتہاؤں کو پہنچ چکے تھے، وہیں محمدؐ دیکھ سکتے تھے کہ قریش کے زیادہ تر سربراہان، بشمول ابو سفیان، سنجیدگی سے آپؐ کے پیغام پر غور و فکر کر رہے تھے۔ اس پیغام نے جہاں مکہ کے سماج کو ہلا کر رکھ دیا تھا وہیں جس چیز کو وہ مقدس سمجھتے آئے تھے، اس کو بھی اس قدر آسانی سے داؤ پر لگا دیا تھا۔ قران میں قریش کو کفار کہا گیا تھا، جس کے لغوی معنی ناشکرے کے بھی نکلتے تھے۔ مراد یہ ہے کہ قریش خدا کی عطا کردہ نعمتوں اور آسائشوں پر ناشکری کر رہے تھے لیکن عام طور پر اسی لفظ کے عمومی معنی منحرف ہونے والے یا بے ایمان ہونے کے بھی ہیں۔ حالانکہ، قریش اپنے طور پر، یعنی 'آباؤ اجداد کے طریق' کو تناظر میں لائیں تو انتہائی وفادار اور ایمان رکھتے تھے۔ انہوں نے خدا کا انکار نہیں کیا تھا۔ حرم میں، کعبہ اسی خدا کی تو نشانی تھا۔ انہوں نے تو صرف اس حرم کے خادم، رکھوالے کا کردار سنبھال رکھا تھا۔ اسی کفالت کے عوض انہیں اچھا خاصا منافع بھی مل جایا کرتا تھا۔ ان کے ایمان کا تقاضا یہ تھا کہ وہ نہ صرف 'اللہ' پر

ایمان قائم رکھیں بلکہ اس کے ساتھ قبائلیوں کے خدائی اوتاروں، مثلاً تین بیٹیوں 'یعنی عزا، لات اور منات پر بھی یقین کریں۔ جس قدر مشہور ہے، قریش کا ایمان اتنا کمزور نہیں تھا۔ ہاں، اگر وہ گمراہ ہو چکے تھے تو پھر اس صورت میں محمدؐ کے لیے بیچ کا راستہ نکالنا ممکن تھا۔ وہ اپنی حکمت کو استعمال میں لا کر، انہیں سیدھی راہ دکھا سکتے تھے۔

چنانچہ، محمدؐ نے ایک بار پھر سے رت جگے شروع کر دیے۔ وہ کئی راتوں تک قیام کی حالت میں کھڑے عبادت اور مراقبے میں مصروف رہنے لگے۔ آپؐ کو امید تھی کہ الہامی آواز اس بابت رہنمائی کرے گی۔ ایک ایسی راہ دکھائے گی، جس کو استعمال میں لا کر اس تقسیم اور فساد کی صورتحال کو تھامنا، اس کا حل تلاش کرنا ممکن ہوتا۔ یقیناً کوئی ایسا راستہ ضرور ہو گا جس کے تحت مکہ کی قدیم روایات کو رد کرنے کی بجائے، ان کو شامل حال رکھا جا سکتا تھا۔ اور، ان کے خیال میں، حالات کی نسبت سے ایسا ہونا ضروری بھی تھا۔ ان کو یقین تھا کہ بالآخر الہام کے ذریعے ایک دیرپا اور قابل قبول حل نازل ہو کر رہے گا۔ بالآخر، ایک دن، انسانی سمجھ کے عین مطابق، ایسا ہی ایک حل تجویز کر دیا گیا۔

ابن اسحاق اس کی روداد یوں بیان کرتے ہیں، 'جب محمدؐ نے دیکھا کہ ان کے اپنے، قریبی لوگ ان سے پیٹھ موڑ رہے ہیں۔ ان کی اس روش کو دیکھ کر وہ دلبرداشتہ ہو گئے۔ انہیں دکھ تھا کہ قریش نے خدائی پیغام کی ذرا بھر لاج نہیں رکھی تھی۔ چنانچہ، اس کیفیت میں انہوں نے خدا سے رجوع کیا۔ انہیں، ایک ایسے حل کی تلاش تھی جس کے ذریعے وہ اپنے لوگوں کے ساتھ مفاہمت کر سکیں۔ انہیں خوشی ہوتی، اگر ان پر رحم کیا جاتا۔ جس طور انہیں اور ان کے آباؤ اجداد کو رد کیا گیا تھا، اس میں نرمی لائی جاتی۔ ان کی یہ خواہش اس قدر بڑھ گئی کہ وہ اسی پر مصر ہو گئے۔ وہ ایک قابل قبول حل چاہتے تھے۔ چنانچہ، خدا نے ان پر سورۃ النجم نازل کی، جس کی ابتداء کچھ یوں ہوتی ہے، قسم ہے تارے کی جبکہ وہ غروب ہوا۔ تمہارا رفیق نہ بھٹکا ہے نہ بہکا ہے۔ وہ اپنی خواہش نفس سے نہیں بولتا۔ 'لیکن جب آپؐ ان الفاظ تک پہنچے کہ، 'اب ذرا بتاؤ، تم نے کبھی اس لات اور اس عزیٰ اور تیسری ایک اور دیوی منات کی حقیقت پر کچھ غور بھی کیا؟۔۔۔ 'بعد اس کے، شیطان نے آپؐ کی زبان پر یہ الفاظ چڑھا دیے کہ، 'یہ تینوں ہی اونچی اڑان اڑنے والے پرندے ہیں اور ان کی وساطت تو لازم ہے'۔

یہ آخری الفاظ ہی وہ انتہائی مشہور مگر قابل معیوب سمجھی جانے والی 'شیطانی آیات' ہیں۔ ان آیات کی رو سے 'خدا کی بیٹیاں' اب جھوٹے خدا نہیں رہے تھے۔ اب یہ لحیم اور ضخیم پرندے تھے جو اپنے پروں تلے پوری دنیا کو سمیٹ کر رکھتے تھے۔ اب ان کی سفارش اور وساطت ان لوگوں کو میسر تھی جو ان کی پوجا کیا کرتے تھے۔

جوں ہی محمدؐ نے کعبہ کے احاطے میں یہ نئی آیات تلاوت کیں تو ہر طرف سے انتہائی مثبت ردعمل سامنے آیا۔ 'جب محمدؐ کو یہ کہتے سنا تو لوگ خوشی سے جھوم اٹھے۔ ان کی حالت شادی مرگ کی سی ہو گئی۔ 'ابن اسحاق مزید لکھتے ہیں کہ، 'وہ لوگ کہنے لگے کہ، 'محمدؐ نے ہمارے خداؤں، یعنی تین بیٹیوں کا ہر لحاظ سے حیران کن اور قابل اعتبار تذکرہ کیا ہے۔ ہم مانتے ہیں کہ ایک خدا، اللہ ہے جو زندگی اور موت بخشتا ہے۔ جس نے ہمیں پیدا کیا اور جو ہمیں قوت اور نعمتوں سے نوازتا ہے۔ لیکن اگر 'تین بیٹیوں' کی وساطت اور سفارش ابھی بھی مطلق ہے، اور اگر محمدؐ ان اوتاروں کو ان کا جائز حق یعنی پوجا کی اجازت دیتے ہیں تو ہم یقیناً، اس کے سارے نئے طریقے ماننے پر راضی ہیں۔'

ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے اس ایک ہی وار میں سارا مسئلہ حل ہو گیا ہے۔ وہ جو دراڑ آئی تھی، یک دم ہی غائب ہو گئی۔ مگر اس کے باوجود، یہ 'شیطانی آیات' کبھی بھی قران کا حصہ نہیں بن سکیں۔

ابن اسحاق قصے کو آگے بڑھاتے ہیں کہ، 'اسی رات فرشتہ، یعنی جبرائیل محمدؐ کے پاس آیا اور تنقیدانہ لہجے میں شکایت کی، 'یہ آپؐ نے کیا کر دیا؟ آپ نے وہ پڑھا جو میں خدا کی طرف سے نہیں لایا تھا۔ اور آپ نے وہ کہا جو خدا نے قطعاً نہیں کہا ہے'۔ چنانچہ، اسی وقت محمدؐ پر یہ حقیقت آشکار ہوئی کہ وہ مفاہمت کی خواہش کے

ہاتھوں زیر ہو گئے ہیں۔ انہوں نے مشکل راستے کی بجائے آسان راہ اختیار کرنے کی کوشش کی ہے۔ مشکل راستہ، یعنی 'کوئی معبود نہیں مگر اللہ۔۔۔'۔ یقیناً خدا کا کوئی بھی شریک نہیں ہو سکتا۔ کوئی اولاد نہیں، بیٹیاں اور نہ ہی بیٹے ہو سکتے ہیں۔ خدا تو بے نیاز ہے۔ نہ تو اس نے کسی کو جنم دیا ہے اور نہ ہی وہ خود جنا گیا ہے۔ وہ سوچنے لگے۔ واقعی، یہ انہوں نے کیا کر دیا؟

محمدؐ کی حالت غیر ہو گئی۔ ابن اسحاق کے الفاظ میں، 'وہ انتہائی رنجور ہو گئے اور خدا کے خوف سے کانپنے لگے۔ چنانچہ، خدا نے آپؐ کی حالت دیکھ کر فوراً ہی ایک دوسری وحی نازل کی۔ اس پیغام میں انہیں تسلی دی گئی اور آسانی کی بشارت سنائی۔ ان کو سورۃ الحج کی ان آیات میں یقین دہانی کرائی کہ، 'اور اے محمدؐ، تم سے پہلے ہم نے نہ کوئی رسول ایسا بھیجا ہے نہ نبی (جس کے ساتھ یہ معاملہ نہ پیش آیا ہو کہ) جب اس نے تمنا کی، شیطان اس کی تمنا میں خلل انداز ہو گیا۔ اس طرح جو کچھ بھی شیطان خلل اندازیاں کرتا ہے اللہ ان کو مٹا دیتا ہے اور اپنی آیات کو پختہ کر دیتا ہے۔ اللہ علیم ہے اور حکیم۔'

یہ یقین دہانی، قران میں شامل ہے۔ اور اس کے ساتھ، ایک دوسری آیت نازل کی گئی جو 'شیطانی آیات' کی جگہ لے گی۔ یہ بعینہ ویسے ہی شروع ہوتی ہیں مگر اس میں ہدایات مختلف ہیں۔ آج، یہ آیات قران کی سورۃ النجم میں ایسے رقم ہیں کہ، 'دراصل یہ کچھ نہیں ہیں مگر بس چند نام جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ لیے ہیں۔ اللہ نے ان کے لیے کوئی سند نازل نہیں کی۔'

یہ اب تک نازل کی جانے والی آیات میں، مکہ میں مانی جانے والی تقدیس کی سب سے سخت الفاظ میں نفی تھی۔ کہا گیا کہ یہ تو صرف نام ہیں اور کچھ نہیں۔ ان کو کوئی اختیار حاصل نہیں تھا، کوئی طاقت نہیں تھی۔ یہ صرف اور صرف تخیل کا شاہکار تھے۔

بعد اس زمانے کے، نسبتاً ماضی قریب میں الہیات سیاست 'شیطانی آیات' کے معاملے کو عجب رنگ دے گی۔ یہ ایک ہی وقت میں مشہور اور مقبول رہے گا مگر دوسری طرف قابل نفرت اور اس کا تذکرہ معیوب سمجھا جائے گا۔ مسلمانوں کے یہاں اس کہانی کو گرچہ محمدؐ کی شان میں گستاخی نہ سمجھا جاتا ہو مگر بہر حال غیر مستند جان کر رد ضرور ہی کیا جاتا ہے۔ یہ طور بالخصوص انیسویں صدی میں اس وقت زور پکڑ گیا جب ایک مستشرق سکالر ولیم موئر نے اس واقعے کی بنیاد پر یہ نظریہ قائم کر لیا کہ شاید محمدؐ اپنی تمام تر زندگی شیطان کے زیر اثر رہے۔ اسی نظریے کی وجہ سے مشہور اخبار 'دی ٹائمز آف لندن' نے بھی ولیم کو 'عیسائیت کا پراپگنڈہ' قرار دے کر تنقید کا نشانہ بنایا۔ دوسری طرف، مسلمانوں کے یہاں علماء اور محققین دفاعی رویہ اختیار کرتے ہوئے اس بابت اس قدر سختی پر اتر آئے کہ سارے معاملے کو ناممکن قرار دینے لگے۔ جواز یہ پیش کیا گیا کہ دراصل محمدؐ کو خدائے ذوالجلال نے ہر لحاظ سے کامل اور غلطی کی گنجائش سے پاک پیدا کیا تھا تو کسی بھی بھول، غلطی کی قطعاً گنجائش نہیں ہے۔ حالانکہ، خدا کی جانب سے اس طرح کا، کسی بھی قسم کا کوئی دعوی قران میں کہیں بھی موجود نہیں ہے۔ اس کے برعکس، قران میں تو انسانی خطا پذیری کو صاف الفاظ میں تسلیم کیا گیا ہے اور یہ صرف محمدؐ نہیں بلکہ تمام ہی رسولوں اور نبیوں کے بارے کہا گیا کہ کبھی نہ کبھی اور کسی نہ کسی موقع پر شیطان نے 'ان کے منہ میں اپنے الفاظ' ضرور ہی ڈال کیے ہیں۔ تاہم کچھ مسلمان سکالر اب بھی ایسے ہیں جو اس واقعہ کی پوری قسط کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ دشمنان اسلام کی سازش تھی جس کا مقصد محمدؐ اور قران دونوں کی ساکھ کو نقصان پہنچانا تھا۔

حالانکہ، اس سارے معاملے کا غیر جانبداری سے جائزہ لیا جائے تو 'شیطانی آیات' کا واقعہ محمدؐ کی ساکھ کو بڑھاوا دیتی ہے۔ اس سے ہمیں وحی کے نزول اور الہام کے طریقہ کار، عمل پر روشنی ڈالنے کا موقع ملتا ہے۔ ہمیں یہ سمجھ آتی ہے کہ یہ 'پہلی نظر میں محبت' جیسا نہیں بلکہ انسان اور مقدس ذات ربانی کے بیچ مسلسل اور جان توڑ تعلق اور سخت محنت کے نتیجے میں قائم ہونے والے رشتے کی طرح ہے۔ یہ ہر وقت جاری رہنے والی بحث اور مکالمے کی طرح ہے جس میں دونوں فریقین کو اپنی منشاء، بات کہنے کا حق حاصل ہوتا ہے۔ یہ افسانوی عشق نہیں ہے کہ جس میں محبوب کو اپنی مرضی تھوپنے کی کھلی اجازت جائز سمجھی جاتی ہے۔ ہم یہاں محمدؐ کے دل میں مفاہمت کی گہری اور خالصتاً انسانی خواہش کی شدت واضح دیکھ سکتے ہیں۔ اس خواہش کی وجہ سے ان کے اندر جمع ہو جانے والے درد کو محسوس کر سکتے ہیں۔

آپؐ یہاں ایک ایسے دل سوز مجروح کی مانند نظر آتے ہیں جو انسانی فطرت اور عادت کے عین مطابق بے نیاز خدائی مرضی میں اپنی گہری اور شدید خواہش کو پورا ہوتا دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس واقعے میں آپؐ ایک خالص انسان بن کر ابھرتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک کمزور لمحے میں یہ انسان لرز گیا ہے اور بالآخر اپنے اندر اس نے وہ سنا، جو وہ سننا چاہتا تھا۔

حقیقت تو یہ ہے کہ انسان خطا کا پتلا ہے۔ اور اسی انسانی خصلت کی وجہ سے یہ واقعہ قابل اعتبار بن جاتا ہے۔ یہی نہیں، بلکہ محمدؐ تو بحیثیت انسان اس وقت بھی شدید رنج اور غم میں مبتلا ہو گئے جب 'شیطانی آیات' نے حسب توقع قریش کو یک دم خوشی سے سرشار کر دیا۔ انہوں نے تو فوراً ہی محمدؐ کو بانہیں کھول کر مرحبا کہنے پر گلے لگا لیا اور انہوں نے اس مبینہ الہامی پیغام کو قبول کرنے میں ذرہ بھر تامل سے کام نہیں لیا۔ اپنے دل میں آپؐ اسی وقت جان چکے تھے کہ انہوں نے اپنی خواہش کے زیر اثر خود اپنے ہاتھوں سے الہامی پیغام میں کھوٹ لگا دی ہے۔ ایک انسان سے یہی توقع کی جا سکتی ہے، یہی اس کی تعریف ہے۔ قران اب تک کئی بار محمدؐ کو حکم دیتا آیا تھا کہ وہ کہا کریں، بلکہ بار بار کہا کریں کہ وہ 'صرف ایک انسان ہیں'۔ یعنی 'تم جیسا ایک انسان' اور 'تم ہی میں سے ایک'۔ اور ویسے بھی، بے عیبی، کاملیت اور ہر طرح سے بے نیاز ہونے کی روادار تو صرف اور صرف اللہ کی ذات ہے۔ محمدؐ سے اس بابت کچھ بھی گلہ ہر لحاظ سے بے جا ہے۔

یقیناً محمدؐ کو عوامی سطح پر غلطی تسلیم کرنے کے لیے بے انتہا جرات درکار رہی ہو گی۔ بالخصوص، اس صورتحال میں تو بڑھ کر ہمت چاہیے تھی، جب یہ آپؐ کی کردار کشی اور مخالفت کا ہتھیار بن جائے گا۔ ساتویں صدی عیسوی میں مکہ کے لوگ ایک ایسے شخص کو کسی قابل نہیں سمجھتے تھے جو سرعام اپنی غلطیاں تسلیم کرتا پھرتا ہو۔ ان کی مثال آج کے دور میں امریکیوں جیسی ہے جو اپنی درستگی کو قابل شرم بات سمجھتے ہیں۔ جیسے تب، آج بھی سہو یا بھول چوک کے بعد درستگی کو طاقت کی بجائے کمزوری سمجھا جاتا ہے۔ کیتھرین سکالز ایک صحافی اور مصنف ہیں۔ ایک کتاب میں لکھتی ہیں، 'بھول چوک کا معاملہ سمجھنے میں ہم ایک تخلیقی غلطی کر بیٹھتے ہیں۔ ہم اس کے بارے غلط ہوتے ہیں جو غلط سمجھا جاتا ہے۔ یہ کسی بھی طور شعوری یا عقلی کمتری سے کہیں پرے ہے۔ بلکہ، غلطی تسلیم کرنا تو انسانی دانش کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ بھول چوک، کسی بھی طور اخلاقی برائی نہیں ہے۔ اس کو تو کئی بہترین بشری صفات کا منبع قرار دیا جا سکتا ہے۔ بلکہ، اسی کی بدولت ہم انسانی شخصیت میں پائی جانے والی کئی پیچیدہ مگر مثبت خصوصیات جیسے ہمدردی، حساسیت، رجائیت، تخیل، ایقان، اعتماد اور جرات کو آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔'

بہر حال، قریش کے یہاں اس معاملے کو توقع کے عین مطابق کیتھرین کی سوچ سے خاصے مختلف انداز میں دیکھا گیا۔ صرف ایک دن پہلے ہی کی بات ہے، یہ جس قدر محمدؐ کی خوشامد اور چاپلوسی پر اتر آئے تھے۔ اب اس سے کہیں بڑھ کر متنفر اور متاسف ہو گئے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ محمدؐ اپنے پہلے مدعا سے پھر گئے تھے۔ ایک ایسے معاشرے میں، جہاں ایک شخص کی زبان اور ہاتھ ملا کر کیا گیا وعدہ کسی بھی تحریری معاہدے سے برتر جانا جاتا ہو، یہ نہایت عجیب بات تھی۔ ایک طرف جہاں محمدؐ یہ سمجھتے تھے کہ ان کے حواس اور نفس نے انہیں دھوکے دے دیا تھا، وہیں دوسری جانب مکہ کی اشرافیہ کا خیال تھا کہ ان کے ساتھ فراڈ کیا گیا ہے۔ یہ ناقابل معافی جرم تھا۔ اپنی خطا تسلیم کر کے محمدؐ نے اپنے ہاتھوں سے مخالفین کے ہاتھ میں وہ ہتھیار تھما دیا تھا جس کے حصول کے لیے وہ اب تک تمام ہی حدود پھلانگتے آئے تھے۔ محمدؐ تو اتحاد اور یگانگت کی بے انتہا خواہش رکھتے تھے۔ ان کے لیے حالات ابتر ہوتے چلے گئے۔ اب ان کے مخالفین مڑ کر وار کر سکتے تھے۔ وہ آپؐ کو جھوٹا قرار دے رہے تھے۔ کہنے لگے، 'یہ جو بھی کہتا ہے وہ جھوٹ کے پلندے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ یہ خود سے گھڑی ہوئی باتیں ہیں۔' محمدؐ نے تقسیم کا حل تلاش کرنا چاہا تھا مگر اب یہ صورتحال تھی کہ نفاق اور بھی گہرا ہوتا چلا گیا۔

گو بنیاد پرست مسلمان اس سے اختلاف کرتے آئے ہیں اور یقیناً اب بھی یہ ماننے سے گریزاں رہیں گے۔ مگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ معاملہ پیش آنا، بہر حال انتہائی ضروری تھا۔ اس کے تحت یہ طے ہو گیا کہ چاہے ہر لحاظ سے معاملات جتنے بھی تکلیف دہ ہو جائیں، محمدؐ کے لیے خود پر یقین قائم رکھنا، اپنے اور الہامی الفاظ پر ایمان برقرار رکھنا انتہائی اہم ہو چکا تھا۔ یہی بات قران نے بھی کھول کر محمدؐ کو سمجھانے کی کوشش کی۔ سورۃ الکافرون کی آیات میں مخاطب کر کے کچھ یوں کہا، '(محمدؐ)

کہہ دو کہ اے کافرو! میں ان کی عبادت نہیں کرتا جن کی عبادت تم کرتے ہو۔ اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی عبادت میں کرتا ہوں۔ اور نہ میں ان کی عبادت کرنے والا ہوں جن کی عبادت تم نے کی ہے۔ اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی عبادت میں کرتا ہوں۔ تمہارے لیے تمہارا دین ہے اور میرے لیے میرا دین'

'شیطانی آیات' نے یہ معاملہ ہمیشہ کے لیے طے کروا دیا۔ بعد اس کے گویا، مفاہمت کی تمام کشتیاں جلادی گئیں۔ اب آگے بڑھنا اٹل ہو گیا۔ یہاں سے واپسی کا راستہ، کوئی امکان باقی نہیں رہا تھا۔

باب:11

ابھی رسمی طور پر بائیکاٹ کی تنسیخ ہونا باقی تھی مگر بھیڑ کی چمڑی، جس پر بائیکاٹ کا اعلان تحریر کیا گیا تھا، اس کے چیتھڑے ہو چکے تھے۔ کعبہ کی دیوار پر میخ بند اقرار نامے پر لکھی تحریر دھوپ، دھول اور دھوئیں سے مدھم ہو کر بمشکل پڑھی جا سکتی تھی۔ قریش کو زمینی حقیقت تسلیم کرنے میں دو سال کا عرصہ لگ گیا۔ جب تک یہ ہو رہتا، اعلان کے پھٹتے ہوئے چرمی کاغذ پر مقامی دستور کے مطابق، کتابت کے ابتدائی الفاظ، یعنی 'شروع خدا کے نام پر۔۔۔' ہی باقی بچے تھے۔ لیکن قبل اس کے محمدؐ، پیروکار اور بنی ہاشم معمولات کی طرف لوٹ کر آتے، آپؐ کی ذاتی زندگی میں ایک المناک سانحہ پیش آگیا۔ خدیجہ انتقال کر گئیں۔

خدیجہ کی موت اچانک واقع ہوئی تھی۔ انہیں کوئی دائمی مرض لاحق نہیں تھا۔ گماں ہے کہ دل کا اچانک اور شدید دورہ جان لیوا ثابت ہوا۔ بائیکاٹ کے دنوں میں درپیش مشکلات اور شدید دباؤ کے باعث جانبر نہیں ہو سکیں۔ یا شاید یہ سادہ حقیقت بھی صاف ہے کہ اب ان کی عمر ساٹھ کی دہائی میں داخل ہو چکی تھی۔ ساتویں صدی عیسوی میں یہ اچھی خاصی طویل اور رسیدہ عمر سمجھی جاتی تھی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ عمر کی زیادتی اور بائیکاٹ کے بعد اعصابی اور نفسیاتی دباؤ، دونوں ہی کے نتیجے میں بالآخر دل جواب دے گیا۔ لیکن، جانبر نہ ہو سکنے والا یہ کوئی عام نہیں بلکہ محبت سے لبریز دل تھا۔

پچھلے چوبیس برس سے محمدؐ کے لیے خدیجہ کی مثال ایک قطب ستارے کی سی تھی۔ وہ آپؐ کے لیے پناہ گاہ تھیں۔ چٹان بن کر ساتھ کھڑی رہیں۔ محرم راز اور ہمدم تھیں۔ وہ محمدؐ کے لیے دم ساز اور وجہ تسکین، جینے کی سبیل تھیں۔ شروع دن سے ہی خدیجہ نے محمدؐ میں وہ جوہر دیکھ لیے تھے جو کسی دوسرے کی نظر میں آنا ممکن نہیں تھا۔ انہوں نے یہ شادی رواج کے برعکس ریت توڑ کر کی تھی۔ محمدؐ کو سماجی عدم تحفظ اور کم حیثیتی سے نکال کر عزت اور رتبہ عطا کیا تھا۔ آپ دونوں کے یہاں چار بیٹیوں اور دو بیٹوں کی پرورش ہوئی۔ بیٹوں میں سے ایک کو انہوں نے باقاعدہ گود لیا تھا جبکہ دوسرا ابھی لے پالک ہی تھا۔ مگر خدیجہ کے یہاں ان دونوں کی ہی پرورش اور کفالت گویا حقیقی بیٹوں کی طرح کی گئی۔ جس رات حرا کی پہاڑی پر پہلی وحی نازل ہوئی، آپؐ کو ہیبت اور خوف کی حالت میں آرام اور سکون کی غرض سے دنیا بھر میں خدیجہ کے سوا کوئی دوسرا شخص یاد نہیں آیا۔ یہ خدیجہ ہی تھیں جنہوں نے اس رات محمدؐ کو سنبھالا تھا۔ اپنے نرم الفاظ سے دلجوئی کی تھی اور آخر میں یقین دہانی کرائی تھی۔ محمدؐ اور خدیجہ نے ایک ساتھ ثابت قدمی کے ساتھ بائیکاٹ اور تحریک کو درپیش سختی اور مشکلات برداشت کی تھیں۔ ہر طرح کی تحقیر، ننداور تضحیک کو برداشت کیا تھا۔ الغرض ان دونوں کا ہر طرح سے نباہ رہا۔ یہ رشتہ جس طرح پہلے روز، آخر تک قائم رہا بلکہ وقت کے ساتھ گہرا ہوتا چلا گیا۔ اور اب، جب طویل مشقت اور سختی کے بعد امن اور آشتی کی ایک موہوم سی کرن پیدا ہوئی تھی۔ خدیجہ سب کچھ چھوڑ کر عدم سدھار گئیں اور اپنے پیچھو محمدؐ کو بے وسیلہ، اندر سے خالی چھوڑ دیا۔

خدیجہ کے بعد آپؐ چاہے جتنی بار شادی کر لیں، انہیں خدیجہ کی سی محبت دوبارہ نصیب نہیں ہو گی۔ بلکہ، یہ محبت ہمیشہ قائم رہے گی۔ یہاں تک کہ کئی سال بعد خدیجہ کے علاوہ دس بیویوں میں سب سے کم عمر اور بے لاگ بیوی عائشہ کے اپنے الفاظ کچھ یوں روایت کیے جائیں گے کہ، 'مجھے محمدؐ کی سب بیویوں میں، خدیجہ

کے سوا کبھی کسی سے حسد محسوس نہیں ہوا۔ حالانکہ، میں خدیجہ کی وفات کے بعد آئی تھی۔ 'حالانکہ، عائشہ کے متعلق یہ بات درست نہیں ہے۔ حقیقت یہ تھی کہ محمدؐ کی بیویوں میں سے اگر کسی ایک کی بھی خوبی بیان کی جاتی تو عائشہ دانت پیسنے لگتیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ خدیجہ کا نام سنتے ہی، وہ بالخصوص حسد میں مبتلا ہو جایا کرتی تھیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ خدیجہ اس معاملے میں ناقابل شکست تھیں۔ مطلب یہ کہ جب عائشہ نا سمجھی میں خدیجہ سے حسد کا اظہار کرتیں تو آپؐ کھلے الفاظ میں انہیں اس بات پر ٹوک دیا کرتے تھے اور ساتھ خدیجہ کے بارے اپنے جذبات کا برملا اظہار بھی کر گزرتے۔

روایت ہے کہ عائشہ محمدؐ کو چھیڑنے کی غرض سے پوچھتیں۔ آخر کیونکر ممکن ہے کہ آپؐ 'پوپلے منہ والی بوڑھی عورت' کی یاد سے اب تک اس قدر جڑے ہیں جبکہ 'خدا نے انہیں اس سے بہتر سے نواز رکھا ہے'؟ اس طرح کی بے روک، طرار زبان یقیناً نوجوان عائشہ کی ہی ہے۔ ان کے سوا محمدؐ سے اس لہجے میں بات کرنے کی کسی میں جرات نہیں تھی۔ یہ ایسا سوال ہے جو ایک نوجوان اور الھڑ لڑکی ہی پوچھ سکتی ہے اور کئی سال بعد، جب وہ خود پختہ عمر اور بالغ نظر عورت ہوں گی۔ اس لہجے، الفاظ اور سوال کے طریق پر پشیمان بھی رہا کریں گی۔ حسد میں بجھے الفاظ جو پوچھنے پر، جواب میں ایک نوجوان کو بے پرواہی اور التفات دلائیں جبکہ یہی حاسدانہ طرز کسی بوڑھے اور مر رہے کے لیے اس کی زندہ دلی اور گہری نسبت کو بھی ظاہر کرتے ہیں۔ حالانکہ، اگر عائشہ اس وقت ذرا برابر سوچ لیتیں تو انہیں عمر اور طبیعت کے حساب سے یقیناً خدیجہ پر فوقیت حاصل ہو سکتی تھی مگر محمدؐ کا جواب، ان کی اس زبان اور خدیجہ بارے یوں بے ادبی کو روک لگانے کے لیے کافی تھا۔

محمدؐ ٹوک کر کہا کرتے، 'بالکل نہیں۔ اللہ نے یقیناً خدیجہ کو کسی بھی طرح سے بہتر سے نہیں بدلا!'۔ وہ شخص جس نے خدیجہ کے بعد کئی بار نکاح کیا، اب مزید کسی بیوی سے اولاد نہیں پائیں گے۔ اس بابت کہا کریں گے، 'اللہ نے مجھے خدیجہ کے بطن سے بچوں سے نوازا ہے مگر دوسری عورتوں کے یہاں اولاد کو روک لگا دی ہے۔'

جب خدیجہ کو دفن کر دیا گیا تو آپؐ غم سے نڈھال تھے۔ وہ اب دوبارہ شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے تھے۔ اس تمام عرصے کے دوران ساتھ دینے کے لیے نوجوان چچازاد علی، قریبی ساتھی ابو بکر، عمر، عثمان اور دو چچا یعنی آتش مزاج حمزہ اور غیرت مند ابو طالب کی ہمراہی میسر تھی۔ ان میں سے ابو طالب بدستور وفاداری کی شاندار مثال بنے کھڑے تھے۔ انہوں نے ابھی تک کنبے اور قبیلے کی روایت کے عین مطابق آپؐ کو تحفظ فراہم کر رکھا تھا۔ بہر حال، یہ ان کے لیے آسان نہیں تھا۔ اس دباؤ اور فرض شناسی کی قیمت انہیں اپنی صحت کی شکل میں ادا کرنی پڑی۔ ابھی آپؐ خدیجہ کے صدمے سے باہر نہیں نکلے تھے کہ وہاں ابو طالب بھی بیمار پڑ گئے۔ وہ اس بیماری سے پھر کبھی جانبر نہیں ہو سکے۔

ابو طالب کی بیماری روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ ہر نئے دن کے ساتھ بگڑتی ہوئی صحت سے واضح ہوتا جا رہا تھا کہ اب ان کا وقت آخر قریب ہے۔ اس حالت کے پیش نظر دوسرے کنبوں کے سربراہان نے عیادت اور خبر کی غرض سے حاضری دی۔ وہ اس موقع پر بھی ابو طالب سے ایک آخری بار اپنے بھتیجے سے بات کرنے، اپنے مطالبات سے پیچھو ٹھنے اور معاملات کو نبٹانے پر اصرار کرنے لگے۔ ان میں تقریباً ہر شخص ابھی تک کسی بیچ کے راستے، باہمی حل کو تلاش کرنے پر زور دے رہا تھا۔ یہاں تک کہ خود ابو جہل کا رویہ وقتی طور پر نرم ہو گیا تھا۔ شاید اس کی وجہ بائیکاٹ میں ملنے والی شدید ناکامی تھی یا پھر یہ ابو طالب کی بگڑتی ہوئی حالت کا اثر تھا۔ جو بھی تھا، اس نے خود بات کرنے کی بجائے ابو سفیان کو آگے کر دیا۔

امویہ کے سردار ابو سفیان نے کہا، 'اے ابو طالب! آپ جانتے ہیں کہ ہم آپ کی غیرت اور حمیت کی دل سے قدر کرتے ہیں۔ اب جب کہ وقت آخر ہے۔ ہم سب ہی اس بابت خاصے پریشان ہیں کہ آپ کے بعد کیا ہو گا؟ کیوں نہ ہم آپ کے بھتیجے کو بھی یہاں بلا لائیں اور مل بیٹھ کر اس قضیے کا حل تلاش کریں؟ ہم چاہتے ہیں کہ وہ ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دے اور ہم اسے، اس کے حال پر چھوڑ دیں گے۔ وہ اپنا دین اپنائے اور ہمیں، ہمارا مذہب ماننے دے۔' عین ممکن ہے کہ ابو

سفیان نے سوچ سمجھ کر تقریباً انہی الفاظ کا چناؤ کیا تھا جو محمدؐ نے 'شیطانی آیات' کے معاملے کی قسط کے آخر میں غلطی تسلیم کر لینے کے بعد الہامی آواز کی صورت ادا کیے تھے۔ اٹل فیصلہ سنایا تھا۔ مگر، ظاہر ہے کہ جو چیز شاید اس وقت اثرانداز ہو سکتی تھی، اب مفاہمت کے لیے کافی نہیں تھی۔ محمد اپنا فیصلہ کر چکے تھے۔

لیکن، محمدؐ کو اس محفل میں بلالیا گیا۔ وہ بھی ابو طالب کے بلانے پر آ گئے۔ ان کے قریب آن کر کھڑے ہو گئے تو ابو طالب نے کہا، 'بھتیجے، یہ نامی گرامی اور عزت دار لوگ تمہارے پاس آئے ہیں۔ یہ چاہتے ہیں کہ کچھ تمہیں دیں اور کچھ تم سے لے لیں۔' گو ابو طالب کی حالت غیر تھی مگر اس صورتحال میں بھی انہوں نے الفاظ کے چناؤ میں پوری احتیاط سے کام لیا۔ گو، ان کا لہجہ غیر جانبدار تھا مگر بین السطور، واضح کر دیا کہ اس قضیے کے حل کی صورت میں محمدؐ کو قیمت ادا کرنی پڑے گی۔ یعنی، اگر آپؐ ابو سفیان کی تجویز کو قبول کریں گے تو ان کی عزت اور منزلت باقی نہیں رہے گی۔ یہ خاصی بھاری قیمت تھی۔ دوسری طرف، خود محمدؐ کا حال یہ تھا کہ 'شیطانی آیات' کے معاملے میں جس طرح کا ردعمل سامنے آیا تھا اور الہامی آواز نے موقع فراہم کیا تھا، بعد اس کے انہیں اس طرح کی تجاویز بارے سوچنے کی ہرگز ضرورت نہیں تھی۔ وہ یوں ہی مضبوطی سے کھڑے رہے اور قریش کے سربراہان پر زور دیا کہ وہ ایک خدا اور صرف ایک خدا پر ایمان لے آئیں۔ اس ایک خدا کے سوا تمام اوتاروں اور خدائی نشانیوں کی پوجا کو ترک کر دیں۔ جس طرح حتمی انداز میں محمدؐ نے جواب دیا تھا، کمرے میں موجود مکہ کے سردار مزید الجھن کا شکار ہو گئے۔ وہ سر جھٹکتے اور ہاتھ نچاتے ایک دوسرے کے پیچھے کمرے سے باہر نکل گئے۔ اب وہاں صرف محمدؐ اور ابو طالب ہی تھے۔

اس وقت ابو طالب نے محمدؐ کے ساتھ جو بھی بات چیت کی، اس کے بارے رائے منقسم ہے۔ ایک روایت یہ ہے کہ انہوں نے سرگوشی میں کہا، 'بھتیجے، تم ان کے ساتھ ان معاملات کو اتنی دور کیوں لے گئے؟'۔ جبکہ ایک دوسری روایت میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے محمدؐ کو تسلی دیتے ہوئے کہا، 'بھتیجے، میں سمجھ سکتا ہوں کہ تم نے ان سے کوئی اتنا عجیب اور انوکھا مطالبہ نہیں کیا۔' یہ دوسری روایت ہے جس کے بل بوتے پر آج بھی مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ وہ شخص جس نے اپنی تمام عمر کنبے اور قبیلے کی غیرت مندی اور فرض شناسی سے کفالت اور حفاظت کی، محمدؐ کو پورا تحفظ فراہم کیا، بالآخر ایک مومن کی صورت موت بھی پائی۔ مگر، آگے چل کر دونوں ہی روایات میں یہ بھی درج ہے کہ محمدؐ نے اپنے چچا کے اکھڑتے ہوئے دم کے بیچ، نزع کی حالت میں ان کا ہاتھ تھام لیا اور کلمہ شہادت ادا کرنے کی درخواست کی۔ نہایت لجاجت سے اسلام قبول کرنے اور ایک خدا کی معبودیت تسلیم کرنے پر اصرار کیا۔ کہنے لگے، 'کہہ دیجیے۔ صرف ایک بار کہہ دیجیے۔ میں خود قیامت کے دن آپ کی گواہی دوں گا۔ کہہ دیجیے۔'

لیکن ابو طالب آخر تک مکہ کی روایت سے جڑے رہے۔ انہوں نے جواب دیا، 'میں نہیں چاہتا کہ یہ میرے لیے شرم کا باعث بن جائے۔ وہ کہتے پھریں کہ موت کے ڈر سے میں نے ایسا کہہ دیا۔ میں تمہاری خوشی کے لیے یہ کہہ بھی دوں گا۔ مگر اے بھتیجے، مجھے آخر تک اپنے باپ دادا کی روایت اور غیرت سے جڑا رہنا ہو گا۔ یہ میرے لیے لازم ہے۔'

یوں، دیکھتے ہی دیکھتے، چند ہفتوں کے اندر پہلے خدیجہ اور اب ابو طالب بھی جا چکے تھے۔ محمدؐ کی زندگی کا محور اور پھر تحفظ کا سایہ، ہوا ہو چکا تھا۔ ایک محبت کا ستون اور دوسرا غیرت کی سیسہ پلائی ہوئی دیوار، یہ دونوں ہی اب باقی نہیں رہے۔ آپؐ کی دنیا لٹ چکی تھی۔

موت کی گونج دماغ میں سنائی دیا کرتی ہے۔ وہ جو اس کا غم مناتے ہیں ان کے لیے موت صرف ایک واقعہ نہیں ہوتا۔ ہر نئی موت پرانی، سب ہی یادوں کو تازہ کر دیتی ہے۔ موت سوکھے ہوئے دکھوں کو ہرا کر دیتی ہے۔ ہوش بدوش ہو جاتے ہیں۔ دل و دماغ میں ایک بار پھر درد بھر جاتا ہے۔ زندگی کے کسی بھی دور میں گزر چکنے والا چھوٹا یا بڑا، قریبی یا دور، ہر پیارا یادوں کی صورت آنکھوں کے سامنے آن کھڑا ہوتا ہے۔ ایسے میں، متروک ہو جانے کا اس قدر شدید احساس جنم لیتا ہے کہ جس سے نبٹنا اعصابی و جسمانی طور پر مضبوط سے مضبوط ترین آدمی کے لیے بھی انتہائی مشکل ہو جاتا ہے۔ اور یہاں، جب ایک نہیں بلکہ آگے پیچھے دو پیارے موت کے منہ میں چلے گئے ہوں۔ ان میں سے ایک زندگی بھر کا رفیق اور دوسرا ہر طرح سے ثابت قدم رہنے والا محافظ ہو تو اندر سے بری طرح ٹوٹ جانا قدرتی امر

تھا۔ مگر پھر، وہیں ایک ایسے شخص کے لیے یہ غم اور بھی بڑھ کر ہے جو یتیم پیدا ہوا تھا اور پھر ابھی اس نے ہوش بھی نہیں سنبھالا تھا کہ ماں بھی چل بسی ہو۔ مدعا یہ کہ آپؐ کے لیے یہ صورتحال خاصی گھمبیر تھی۔ ان کا غم اس عمر میں پہنچ کر بھی ان دو اموات کے بعد دوگنا نہیں بلکہ چوگنا ہو چکا تھا۔ آپؐ پہلے سے کہیں بڑھ کر محرومی شکار ہو گئے۔ مجروح ہو کر رہ گئے۔

ابو طالب کے انتقال کے بعد بنی ہاشم کے لیے فوراً نیا سربراہ چن لینا انتہائی ضروری تھا۔ بنی ہاشم کا اس بابت متفقہ فیصلہ آپؐ کے لیے کوئی اچھی خبر نہیں تھی۔ ابو طالب کی زندگی میں ہی ابولہب نے انہیں سربراہی سے علیحدہ کرنے کی نہ صرف خواہش پال رکھی تھی بلکہ حتی الامکان کوشش بھی کر گزرا تھا۔ اب اس کا راستہ صاف تھا۔ کنبے میں سب سے عمر رسیدہ شخص اور سربراہی کا اصولی حقدار وہی تھا۔ چنانچہ بنی ہاشم کی سربراہی محمدؐ کے محافظ سے نکل کر سب سے شدید مخالف کے ہاتھ میں چلی گئی۔

ابولہب کے سربراہی سنبھالنے کے فوراً بعد ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اب شاید معاملات سنبھل جائیں گے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ شاید یہ دونوں اشخاص ابو طالب کی موت کے صدمے کے باعث ایک دوسرے کے قریب آجائیں گے۔ سربراہ کی حیثیت سے ابو طالب کی روایت اور طریق کو برقرار رکھنے کا عہد کرتے ہوئے ابو لہب نے محمدؐ کو یقین دہانی کرائی تھی کہ وہ ابو طالب کی ہی طرح، کنبے کے ہر شخص، بشمول محمدؐ کی حفاظت کو یقینی بنائے گا۔ مگر یہ یقین دہانی زیادہ دیر تک قائم نہیں رہی۔ ابولہب کی اس غیر متوقع طور کے باعث دوسرے کنبوں کے سربراہان میں بے چینی پھیل گئی۔ چنانچہ انہوں نے ابولہب کے ساتھ مکالمہ، بحث اور مباحثہ شروع کر دیا۔ وہ اسے سمجھانے لگے کہ وہ محمدؐ کو تحفظ فراہم کرنے کا ارادہ باندھ کر بنی ہاشم کا طرہ بلند نہیں بلکہ دراصل کنبے کی غیرت اور حمیت کو مزید پستی میں دھکیل رہا ہے۔ محمدؐ اپنے کنبے کے لیے شرم کا باعث تھے۔ وہ ابولہب سے کہنے لگے کہ ذرا سوچو، محمدؐ کے پیغام کے تحت تو کنبے کے باپ دادا، ہاشم سے لے کر عبد المطلب، حتی کہ ابو طالب بھی اس وقت جہنم کی آگ میں جل رہے ہیں۔ آخر کیوں؟ اس لیے کہ انہوں نے یہ نیا طریق قبول نہیں کیا؟

اس سے پہلے کہ ورغلانے والے اپنی بات پوری کرتے ابولہب کا دماغ ایک مرتبہ پھر گھوم چکا تھا۔ مبینہ طور پر وہ بنی ہاشم کی تضحیک اور بے حرمتی پر سیخ پا ہو گیا۔ وہ بیٹھے بٹھائے غصے میں آپے سے باہر ہونے لگا اور بغیر سوچے، فوراً ہی محمدؐ کی حفاظت سے دستبرداری کا اعلان کر دیا۔ اس فیصلے کا مطلب یہ تھا کہ محمدؐ بنی ہاشم سے بے دخل کر دیے گئے تھے۔ اب ان کے اوپر کیا جانے والا کوئی بھی جسمانی حملہ بنی ہاشم کے کسی شخص کے لیے بدلے کا متقاضی نہیں تھا۔ اس وقت رائج نظام کے تحت، 'خون جائز' ہو گیا تھا۔ اب ان کا معاملہ قانون کے دائرہ اختیار سے باہر تھا۔

قبل از اسلام کے قصائص، مشہور و مقبول روایات کے تحت، شاید یہ معاملہ رومانوی معلوم ہوتا۔ جیسے اس سے پہلے بھی ایک قصہ مشہور تھا۔ یہ داستان ایک 'خانہ بدوش بادشاہ' کی تھی۔ امرالقیس نامی شخص جو اپنی سمجھ بوجھ، دل اور جگر سے، یعنی بل بوتے پر متروک کیے جانے پر تن تنہا، گوشہ نشینی میں بسر رکھا کرتا تھا۔ لیکن محمدؐ اس داستان کے کچھ اتنے خاص پرستار نہیں تھے۔ جب وہ لڑکپن میں تھے، جب کہ انہیں دور کر دیا گیا تھا، تب بھی انہوں نے کبھی یوں گوشہ نشینی اور تن تنہائی میں بسر کرنے کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ وہ اپنے لوگوں سے دور رہنے کے ہرگز قائل نہیں تھے۔ قیس کے برعکس انہوں نے تو اپنی توانائیاں اس نکتے پر صرف کی تھیں کہ وہ ہر طرح سے متعلق بن کر ہی رہیں۔ ان میں سے ایک بن جائیں۔ اب جبکہ وہ اپنے معاشرے اور وقت سے اس قدر جڑ چکے تھے کہ وہ اسے اندر سے تبدیل کر کے، ایک بہتر سماج کی شکل میں ڈھالنے کے خواہاں تھے۔ وہ مکہ کو بدترین تباہی سے بچانے کی کوشش میں خود کو ہلکان کر رہے تھے۔ اپنی پوری زندگی داؤ پر لگا دی تھی۔ ان کی سوچ ایک باغی کی سوچ نہیں تھی۔ وہ تو ایک اصلاح پسند بن کر ابھرے تھے، دل کی اتھاہ گہرائیوں سے مکہ سے جڑے ہوئے تھے۔ اپنے آبائی گھر سے وفادار تھے۔ اپنے لوگوں سے بے انتہا انس رکھتے تھے۔ مگر، جس نہج پر حالات پہنچ چکے تھے، اس کو لے کر ان کے اندر بے انتہا غم نے گھیرے ڈال دیے تھے۔ آپؐ اور مکہ کے درمیان خلیج بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی۔ وہ جس کو اصلاح کہتے تھے، مکہ کے لوگوں کے نزدیک رائج نظام کا انہدام

تھا۔ جن اطوار پر محمدؐ سوچ رہے تھے، اس پر ان سے کہیں بڑھ کر مکہ کے سربراہان نے اس سارے معاملے اور الہامی پیغام پر سوچ بچار کر رکھی تھی۔ چونکہ ان لوگوں کو اپنے مفادات عزیز تھے، انہوں نے فوراً ہی اس پیغام کے ممکنہ نتائج کو بھانپ لیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اس پیغام کی انتہائی شدت سے مخالفت پر اتر آئے تھے۔

بنی ہاشم سے بے دخل کر دیے جانے کے بعد، محمدؐ اب صرف ایک مجنوں نہیں رہے تھے۔ ان پر اب صرف اور صرف کسی شریر جن کا سایہ نہیں تھا۔ ان کے مخالفین کے مطابق، وہ اس سے کہیں بڑھ کر خطرناک ہو چکے تھے۔ ان کے مطابق محمدؐ تو اس کوشش میں تھے کہ وہ مکہ کو 'باپ دادا کے طریق' سے ہٹانے کی آڑ میں پورے معاشرے کو الٹ پلٹ کر رکھ دیں۔ پورے نظام کو تہس نہس کر دیں۔ مکہ کے ابوجہلوں اور ابولہبوں کے نزدیک یہ کھلی بغاوت تھی۔

یہاں اگر مکہ کی سیاسی نفسیات کی بات کریں تو بعینہ ویسے ہی صورتحال آج جدید دور میں بھی دنیا میں کئی جگہوں پر، کئی معاشروں کو درپیش ہے۔ آج بھی مطلق العنان حکومتیں ہمیشہ ہی، بلکہ اکثر جمہوری حکمرانیوں میں بھی وہ شخص جو کھل کر ناانصافی کے خلاف آواز اٹھائے، تو اس پر بھی اکثر و بیشتر نظام کی پائمالی، اس کو تہس نہس کرنے کا الزام لگ جاتا ہے۔ ایسے لوگ تقریباً ہمیشہ ہی غدار کہلاتے ہیں۔ حالانکہ، یہ لوگ ملک و ملت سے انتہائی مخلص ہوتے ہیں۔ بحیثیت ذمہ دار شہری، متفکر رہتے ہیں۔ سوچ جتنی بھی بلند ہو رہے، ایسے لوگوں کو ہمیشہ ہی اپنے وقت کے ہردلعزیز لیڈروں، پرجوش خطیبوں اور پراثر حلقوں کی جانب سے کڑی تنقید اور شدید مخالفت کا سامنا رہتا ہے۔ وہ ایسے اصلاح پسندوں کو نہایت کھلاڑپن سے، تباہی کے خواہاں قرار دیتے پھرتے ہیں۔ ان کے نزدیک، ایسے لوگ نفرت کی پود ہوتے ہیں۔ ان کے اندر جلنے والے نفرت کے بھانبڑ انہیں باغیانہ، سماج کی تباہی کی روش پر گامزن کر دیتے ہیں۔ چنانچہ، پہلے پہل تو ایسے افراد کی خوب کردار کشی کی جاتی ہے اور بعد ازاں جب کچھ نہ بن پڑے تو زیادہ سخت حربے جیسے گرفتاری، تشدد، ملک بدری اور قتل تک کا سامان کر دیا جاتا ہے۔ ایسا ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے اور آج بھی ہم جابجا، دنیا بھر میں کہیں نہ کہیں ایسا ہوتا ہوا، دیکھتے ہی ہیں۔

ابولہب کے فیصلے، یعنی محمدؐ کے تحفظ سے ہاتھ کھینچنے کی خبر ایک دم مکہ اور گرد و نواح میں پھیل گئی۔ اب، ہر طرف سے محمدؐ کو ہراساں کرنے کا سلسلہ نہ صرف بڑھ گیا بلکہ اس میں اعصابی اور جسمانی تشدد کا عنصر بھی شامل ہو گیا۔ اکثر، جب وہ کعبہ کے احاطے میں سے گزر رہے ہوتے، ان کے سر پر مٹی سے بھری بالٹیاں الٹ دی جاتیں۔ وہ یہاں تبلیغ شروع کرتے تو ایک دم چاروں اطراف سے پتھروں کی بارش شروع ہو جاتی۔ یہاں تک کہ اپنے گھر کے اندر بھی انہیں شدید خطرات لاحق تھے۔ مثال کے طور پر، ایک دن وہ اپنے گھر کے اندر، صحن میں بیٹھے تھے کہ باہر سے کسی نے ان پر بھیڑ کی اوجھڑی پھینک دی۔ آپؐ کا جسم خون اور غلاظت سے بھر گیا۔ یہی نہیں، بلکہ جانوروں کے مخصوص اعضاء جیسے بچہ دانیاں آپؐ پر پھینکی جاتیں یا راستے سے گزرتے ہوئے منہ کے سامنے لہرائی جاتیں۔ اس کا مقصد آپؐ کی بے عزتی کرنا ہوتا تھا۔ بالخصوص، جانوروں کے ان نسوانی اعضاء کو لہرانے کا مطلب اس معاشرے میں، جہاں مرد کی غیرت اور حمیت ہی ہر چیز سمجھی جاتی ہو، بے حرمتی اور تضحیک کا شدید ترین اظہار ہوتا تھا۔ یہ طے ہو چکا تھا کہ اب محمدؐ کے لیے اپنے گھر کے اندر، نظربند ہو کر بھی بسر کرنا ممکن نہیں رہا تھا۔ بلکہ، وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ ان کی بقا اور سلامتی کو اب شدید خطرات لاحق ہو چکے ہیں۔ اسی لیے، اگر وہ بقا چاہتے ہیں تو اس کے لیے انتہائی ضروری تھا کہ وہ فی الفور کسی قبیلے یا کنبے کے سردار کی پشت پناہی حاصل کر لیں۔ اس کے تحفظ میں چلے جائیں۔

کچھ روایات کے مطابق، اس مقصد کے لیے پہلے پہل آپؐ نے طائف کا رخ کیا۔ تب طائف مکہ کے جنوب مشرق میں پہاڑوں کے بیچ ایک دن کی مسافت پر واقع چھوٹا سا قصبہ تھا۔ اس قصبے کے باسی لات کو مانتے تھے اور طائف اسی خدائی اوتار کے پجاریوں کا مرکز مانا جاتا تھا۔ لات، کعبہ کے احاطے میں نصب خدائی اوتاروں میں سے ایک دیوی تھی۔ محمدؐ نے تمام خدائی اوتاروں، بشمول لات کو سختی سے جھوٹا قرار دے کر رد کر دیا تھا۔ پھر، طائف کے لوگ مکہ کی اشرافیہ کے انتہائی قریبی سمجھے جاتے تھے۔ ان کے آپس میں دیرینہ تعلقات تھے۔ مکہ کے متمول شہریوں میں سے اکثر نے طائف میں اپنی عارضی رہائش کا انتظام بھی کر رکھا تھا

اور اکثر گرما کا موسم گزارنے یہاں چلے آتے تھے۔ مکہ کی گرم آب و ہوا کے مقابلے میں اس قصبے کا موسم نسبتاً معتدل اور خوشگوار ہوا کرتا تھا۔ یہاں چشمے بہتے تھے اور ہر طرف ہریالی تھی۔ شاید، پناہ اور تحفظ کی تلاش میں محمدؐ کے کے لیے طائف آخری جگہ ہوتی مگر عام روایت یہی ہے کہ وہ اس مقصد کے لیے سب سے پہلے وہ طائف جا پہنچے۔

طائف کے شہریوں کی جانب سے سخت مخالفت اور شدید ردعمل غیر متوقع نہیں تھا۔ ان میں سے ایک نے نہایت مکر اور مصنوئی سے کہا، 'اگر جیسا تم دعویٰ کرتے ہو، تمہیں خدا نے بھیجا ہے تو پھر تمہاری حالت دیکھ کر مجھے تم سے بات کرتے ہوئے بھی کوفت ہو رہی ہے۔ اور اگر تم خدا کا نام استعمال کر رہے ہو تو شاید، مجھے تم سے بات بھی نہیں کرنی چاہیے۔'

ایک دوسرے ایسے ہی پر اثر آدمی نے آپؐ کی جانب دیکھا اور نہایت درشتی سے کہنے لگا، 'کیا خدا کو تمہارے سوا اس مقصد کے لیے کوئی اور شخص نہیں ملا تھا؟'

چند دن کے اندر ہی، طائف شہر کے لفنگوں اور بدمعاشوں نے وہاں کی اشرافیہ کی ایما پر آپؐ کی زندگی اجیرن کر دی۔ وہ ہر وقت پتھر اٹھائے پیچھو پڑے رہتے اور جلد ہی آپؐ طائف شہر سے باہر نکلنے پر مجبور ہو گئے۔ مگر چونکہ اصولی طور پر بغیر کسی کی پشت پناہی اور پناہ کے یوں ہی مکہ واپس لوٹ کر جانا کسی بھی صورت محفوظ نہیں تھا، آپؐ نے شہر سے چند میل دور ہی پڑاؤ ڈال دیا۔ یہاں سے وہ ایک کے بعد دوسرے، مکہ کے سربراہان کے نام پیغام بھجواتے رہے اور ان سے مدد کی درخواست کرتے رہے۔ بالآخر، ایک چھوٹے سے کنبے کے سردار کی جانب سے مثبت جواب آگیا۔ یہ سردار عمر رسیدہ ال مطعم تھے۔ اس شخص اور ان کے کنبے نے کبھی بائیکاٹ کی حمایت نہیں کی۔ مطعم نے آپؐ کی حفاظت کے لیے اسلحے سے لیس ایک چھوٹا دستہ بھجوایا، جس کی حفاظت میں وہ واپس شہر میں داخل ہو گئے۔

ابو جہل نے جب محمدؐ کو مکہ شہر میں، کعبہ کے احاطے میں داخل ہوتے دیکھا تو آگ بگولا ہو گیا۔ اس نے مطعم سے سوال کیا، 'کیا تم اس کی حفاظت کر رہے ہو یا حملے کے لیے للکار رہے ہو؟' مطعم نے نہایت اطمینان سے جواب دیا، 'میں محمدؐ کو اپنی حفاظت میں لے رہا ہوں۔' یہ ایسا جواب تھا، جس کے بارے ابو جہل چاہتے ہوئے بھی کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ پورا قبیلہ قریش، کنبوں کے سربراہان کی جانب سے کیے جانے والے فیصلوں کو ماننے کا پابند تھا۔ چنانچہ، بے دلی سے جواب دیا، 'ہم بھی اس کی حفاظت کریں گے، جس کی تم حفاظت کرتے ہو!'

گو، یہ حفاظت کی وہ صورت تو نہیں تھی جو بنی ہاشم کا حصہ رہتے ہوئے آپؐ کو میسر رہی تھی مگر پھر بھی اس وقت صورتحال کے مطابق کسی حد تک یہ آسانی کا موجب بن گئی۔ اب آپؐ کی حیثیت ال مطعم یا قریش کے کسی بھی شخص کے برابر نہیں بلکہ ان کی کفالت میں ایک عام شخص جیسے تھی۔ مگر، ان حالات میں آپؐ کے لیے یہی دستیاب پناہ گاہ تھی۔ کم از کم اس کی بدولت انہیں عارضی چھٹکارا مل گیا تھا۔ کچھ وقت میسر آگیا تھا، جس کے بیچ وہ تسلی سے سوچ بچار اور آگے کے لائحہ عمل بارے غور و فکر کر سکتے تھے۔ پھر، اس وقت جب آپؐ شدید عدم تحفظ کا شکار تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شاید اب کے بعد انہیں اپنی بقا کے لیے انتہائی خاموشی سے گزر بسر کرنی پڑے گی۔ پس منظر میں رہ کر کوشش کرنی ہو گی۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ آپؐ ایک بار پھر اڑان بھرنے کو تیار تھے۔ انہی دنوں میں، آپؐ کے ساتھ ایک رات عجب واقعہ پیش آیا۔ اس واقعہ کو 'الاسراء' یعنی 'رات کا سفر' کہا جاتا ہے۔ ہم دیکھیں گے کہ یہ واقعہ آپؐ کی زندگی میں پیش آنے والے کئی بڑے واقعات میں سے ایک، علامتی طور پر بھاری بھر کم، اہم ترین معاملہ بن جائے گا۔

سادہ ترین الفاظ میں کہیے تو 'رات کے سفر' کا واقعہ ایک معجزے کی کہانی ہے۔ ایک روز، محمدؐ رات کے پچھلے پہر بیدار ہوئے اور کعبہ کے احاطے میں جا پہنچے۔ آپؐ کا مقصد رات کے اس پہر، جب سارا شہر سو رہا تھا اور کعبہ کے ارد گرد دن کے برعکس خاموشی چھائی ہوئی تھی اور کوئی بھی موجود نہیں تھا، یکسوئی سے عبادت کرنا تھا۔ مگر احاطے میں پہنچے تو ان پر غنودگی چھا گئی اور بیٹھے بیٹھے، آنکھ لگ گئی۔ ایسے میں، آپؐ کو جگانے کے لیے فرشتہ، یعنی جبرائیل حاضر ہوا۔ اس نے انہیں جگایا اور سفید پروں والے گھوڑے پر سوار کرا دیا۔ یہ گھوڑا ہوا میں بلند ہو کر اڑنے لگا۔ رات کی تاریکی میں اس کا رخ شمال کی جانب تھا۔ محمدؐ اور ان کے پیروکار شمال کی

جانب منہ موڑ کر عبادت کرتے آئے تھے۔ شمال میں یروشلم کا شہر واقع تھا۔ اس شہر میں قدیم عبرانی معبد واقع تھا۔ یہ معبد پتھر کی اس صلیب پر تعمیر کیا گیا تھا جس پر کبھی ابراہیم، یعنی سب سے پہلے حنیف نے اپنے بیٹے اسماعیل کو قربان کرنے کے لیے لٹایا تھا اور خنجر بلند کر کے تقریباً خدا کی راہ میں ان کی جان لے لی تھی۔ اس جانب منہ موڑ کر عبادت کرنے کا مقصد یہ تھا کہ وہ ابراہیم کی واحدانیت کے اصل جد امجد کے طور پر حیثیت کو تسلیم کرتے تھے۔ یہ بلاشبہ مکہ میں قریش کے آباؤاجداد سے منسوب روایات سے کہیں قدیم، گہری اور معنی خیز نسبت تھی۔ ابراہیم ہی دراصل 'آباء' تھے اور یوں وہ سب کے، بشمول مکہ کے 'آباؤاجداد' کے بھی جد امجد تھے۔ اور آج رات، محمدؐ کی ملاقات جد امجد، ابراہیم سے ہونے جا رہی تھی۔

راستے میں اور یروشلم پہنچ کر بھی، فرشتوں کے گروہ در گروہ آپؐ کے خیر مقدم کے لیے موجود تھے۔ پھر جب وہ گھوڑے سے اترے تو ان کے سامنے تین کٹوریاں پیش کی گئیں۔ ان میں سے ایک میں شراب، دوسری میں دودھ اور تیسرے میں پانی بھرا ہوا تھا۔ آپؐ کو کہا گیا کہ وہ ان میں سے اپنی مرضی کے مطابق، کوئی ایک مشروب پی لیں۔ محمدؐ نے دودھ کا انتخاب کیا کہ یہ درویشی اور نفس پرستی کے بیچ، اعتدال کا رستہ معلوم ہوتا تھا۔ یہ انتخاب دیکھ کر جبرائیل چہک اٹھے اور کہا، 'اے محمدؐ، بے شک آپؐ سیدھی راہ پر گامزن کیے گئے ہیں۔ اور آپؐ کے ماننے والے بھی سیدھے رستے پر رہیں گے۔'

'پھر۔۔۔' محمدؐ سے منسوب روایت یوں جاری رہتی ہے کہ، 'ایک سیڑھی لائی گئی۔ یہ اس قدر نفیس اور خوبصورت سیڑھی تھی کہ میں نے اس سے قبل، اس قدر بہترین سیڑھی اپنی پوری زندگی میں نہیں دیکھی تھی۔ یہ سیڑھی تب ظاہر ہوتی ہے جب کوئی شخص مرنے والا ہو اور موت اس کی جانب بڑھنے لگتی ہے۔' جبرائیل کے پیچھے محمدؐ سیڑھی پر چڑھنے لگے اور سات آسمانوں کے گھیرے میں اوپر ہی اوپر چڑھتے چلے گئے۔ ان سات آسمانوں میں بالترتیب آدم، عیسیٰ اور یحییٰ، یوسف، ادریس اور نوح، ہارون اور موسیٰ جبکہ ساتویں اور سب سے اونچے آسمان پر، جس کے بعد خدائے ذوالجلال کے مقدس عرش کی حد شروع ہوتی تھی، خود ابراہیم کا بسیرا تھا۔ یہ اصحاب، ان سات آسمانوں کے سردار تھے۔

اوپر بیان کردہ روداد ابن اسحاق کے 'الاسراء' یا 'رات کے سفر' سے متعلق روایات کے مجموعے کا نچوڑ ہے۔ اس بابت جتنے بھی بیانات رقم کیے گئے ہیں، ان کو تحریر کرتے ہوئے ابن اسحاق نے بھرپور طریقے سے یہ بات لکھ دی ہے کہ ہر روایت ان تک فلاں، ابن فلاں اور ابن فلاں سے اس طرح پہنچی ہے۔ ایک ہی واقعے یا واقعے کی ٹکڑیوں کے کئی ماخذ ہیں اور ان میں سے ہر ماخذ کا بیان دوسرے سے میل نہیں کھاتا۔ چنانچہ، ابن اسحاق اس بابت یہ طے کرنے سے بھی معذور نظر آتے ہیں کہ آخر ان تمام روایتوں میں سے کس کو تسلیم کیا جائے، اور پھر ایسا کیوں کیا جائے؟ چنانچہ، ابن اسحاق الفاظ کے چناؤ میں انتہائی احتیاط برتتے ہوئے اس قصے کا آغاز کچھ یوں کرتے ہیں، 'اس واقعے کا بیان، کئی روایات کا مجموعہ ہے۔ یعنی، اس واقعے میں کئی بیانات ٹکڑوں کی شکل میں جمع کیے گئے ہیں۔ ان میں سے ہر ٹکڑا کچھ نہ کچھ معلومات فراہم کرتا ہے۔ اور ہر ٹکڑا کسی ایسے شخص سے پہنچا ہے جس کو خود کسی دوسرے شخص نے واقعہ کی تفصیلات بارے معلومات فراہم کی تھیں۔'

پھر چونکہ یہ معاملہ حقائق سے کہیں زیادہ ایمان سے متعلق رکھتا ہے تو ابن اسحاق اس بابت بھی واضح اشارہ کر دیتے ہیں۔ ساری روداد کے دوران وہ ماخذ کی طرف رجوع کرانے والی عبارتوں کا استعمال کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر، 'مجھے بتایا گیا ہے کہ الحسن نے اپنی بیان کردہ کہانی میں کہا۔۔۔' یا پھر، 'ابوبکر کے گھر کے ایک آدمی نے مجھے بتایا کہ عائشہ کہا کرتی تھیں۔۔۔' یا پھر، 'ایک روایت دان جس نے خود ایک ایسے شخص سے سن رکھا ہے کہ وہ کہتا تھا کہ اس نے محمدؐ کی بابت سن رکھا ہے کہ محمدؐ کہنے لگے۔۔۔' وغیرہ۔

قران میں اس واقعے کی تفصیلات موجود نہیں ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ سترہویں سورۃ یعنی 'الاسراء' کی ابتدائی آیات میں اس بابت صاف حوالہ موجود ہے۔ یہ آیات کچھ اس طرح ہیں کہ، 'پاک ہے وہ جو لے گیا ایک رات اپنے بندے کو مسجد حرام سے دور کی اس مسجد تک جس کے ماحول کو اس نے برکت دی ہے، تاکہ اسے اپنی کچھ نشانیوں کا مشاہدہ کرائے۔' مسجد حرام یعنی کعبہ کے احاطے سے دور کی اس مسجد یعنی یروشلم میں واقع مسجد اقصیٰ کے قریب واقع معبد مراد ہے۔ انہی قرانی

آیات کی روشنی میں ابن اسحاق اپنی محتقانہ معذوری کو بالآخر کچھ یوں لپیٹ دیتے ہیں کہ، 'اس رات، سفر کے مقام اور اس بابت جو بھی کہا جاتا ہے وہ تلاش کا امتحان ہے۔ خدا کی قدرت اور اختیار کا معاملہ ہے۔ اس سب کے بیچ سوچنے والوں کے لیے ایک سبق ہے۔ وہ جو ماننے والے ہیں، ان کے لیے رہنمائی، رحمت اور ایمان کی پختگی ہے۔'

دیکھا جائے تو یہ حکمت اور احتیاط سے کام لیتے ہوئی لکھی گئی، قطعیت سے اجتناب برتتی ہوئی ایک نہایت دلکش عبارت ہے۔ کیا 'سفر کی رات' کے واقعات ایک خواب تھے، یہ ایک دید یا الہام ربانی تھی یا واقعی ایک جیتا جاگتا، مادی تجربہ تھا؟ ابن اسحاق کے خیال میں اہم یہ نہیں ہے کہ یہ واقعہ کیسے پیش آیا بلکہ اصل فکر کرنے کی چیز تو اس کے معنی، قدر اور پیش آنے والے وقت کی اہمیت ہے۔ یہاں ابن اسحاق ایک مسلمان کے فرائض اور بحیثیت محقق اپنی ذمہ داریوں کے بیچ نہایت احتیاط سے چلتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ ان کے لیے نہایت نازک معاملہ ہے جس کو وہ بخوبی، اپنے اوپر پوری طرح قابو رکھتے ہوئے، خلاصہ یوں بیان کرتے ہیں، "میں نے کسی کو کہتے ہوئے سنا ہے کہ رسول خدا کہا کرتے تھے، 'میری آنکھیں سوتی ہیں جبکہ میرا دل جاگتا رہتا ہے۔' صرف خدا جانتا ہے کہ وحی کس طرح نازل ہوا کرتی تھی، الہام کیسے پہنچتا تھا اور پھر ویسے ہی، اس رات محمدؐ نے کیا دیکھا؟ ہاں میں یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ آپؐ اس رات چاہے سو رہے ہوں یا جاگتے تھے، بہر حال یہ سب سچ تھا۔"

اوائل دور اسلام کے تمام تاریخ دان اس سے متفق نہیں ہیں۔ مثلاً، الطبری کی ہی مثال لیں۔ جب انہوں نے تاریخ اسلام لکھی، تب محمدؐ کے زمانے کو گزرے پوری ایک صدی بیت چکی تھی۔ آپ اسلامی دنیا کے نئے، جدید دارالحکومت بغداد میں بسر رکھتے تھے۔ پھر، الطبری معجزوں پر مبنی واقعات سے خاصے چوکنے رہا کرتے تھے اور عقلیت پسند تھے۔ ان کا زیادہ رجحان سیاست کی طرف تھا۔ گو وہ اپنی تصانیف میں جابجا ابن اسحاق کے حوالہ جات دیتے آئے ہیں مگر اس معاملے میں وہ اپنی تصنیف کردہ متعدد جلدوں پر مشتمل تاریخ اسلام سے اس پورے واقعے کو گول کر گئے ہیں۔ یہاں تک کہ سب سے مشہور اور مقبول روایت جو عائشہ سے منسوب ہے، اس کو بھی یکسر نظر انداز کر دیا۔ عائشہ نے محمدؐ کے وصال کے کئی برس بعد کہا تھا، 'رسول خدا کا جسم جہاں تھا، وہیں رہا۔ لیکن خدا نے ان کی روح کو اس رات جسم سے الگ کر دیا تھا۔'

تو کیا 'رات کے سفر' کا واقعہ صرف ایک خواب تھا؟ اگر ایسا ہے تو پھر کیا؟ لیکن یہ کہ اس دور میں بھی 'صرف ایک خواب' کوئی شے نہیں ہوا کرتی تھی۔ خوابوں کے بارے تحقیق اور سگمنڈ فرائڈ کا شہرہ آفاق دور ابھی بہت دور ہے جب وہ خواب کی نفسیات میں علامتی تول کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کریں گے۔ اس کے ہاتھوں ابھی تک خواب کی تعبیر بارے نظریہ بھی ایجاد نہیں ہوا تھا۔ مراد یہ ہے کہ، فرائڈ جو کہ سترہویں صدی کا محقق تھا، اس نے نفسیات کی سائنس میں ایک قدیم نظریے کو از سر نو زندہ کیا تھا، جس کے تحت نیند کو مجہول یا جامد حالت نہیں سمجھا جاتا۔ بلکہ، درست طریقے سے تیاری کر کے سویا جائے تو نیند کی حالت میں روح، خاصے متحرک اور جیتے جاگتے، حقیقی تجربات سے گزر سکتی ہے۔

خوابوں سے متعلق قدیم زمانے سے ہی رومیوں اور یونانیوں کے یہاں ایک مذہبی رسم چلی آ رہی ہے، جس کی تب خاصی مانگ تھی۔ اس رسم میں لوگ جسمانی طور پر پاک صاف ہونے کے ساتھ، روحانی طہارت یعنی بھوکے اور پیاسے رہنے کے بعد سونے سے قبل ایک مندر میں بیٹھ کر مراقبہ کیا کرتے تھے اور اسی حالت میں وہیں سو جاتے تھے۔ اس مشق کا مقصد کسی مخصوص معاملے کے بارے میں مقدس ذات کی رہنمائی حاصل کرنا ہوتا تھا۔ انجیل میں بھی جابجا، خوابوں کی تعبیر سے مراد خدائے ذوالجلال کی منشا اور اشارہ لیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر قدیم خدا، یہوہ یا الہ یہوہ کے یہ الفاظ جو موسیٰ کے بڑے بھائی ہارون اور بہن مریم سے خواب کی حالت میں کہے گئے تھے کہ، 'اگر تم میں کوئی رسول ہو۔ میں خدائے ذوالجلال خود کو الہام اور روشنی (بصری طور پر) کے ذریعے اس پر ظاہر کروں گا اور خواب میں اس سے ہم کلام ہوں گا۔' یوسف کا قصہ تو آج بھی زبان زد عام ہے، جس میں انہوں نے خوابوں کی درست تعبیر بتا کر فرعون کے دربار میں اپنے لیے مشیر خاص کا مقام

حاصل کر لیا تھا۔ جبکہ، قدیم روایت میں عام ملتا ہے کہ ابراہیم، یعقوب، سلیمان، سینٹ جوزف، سینٹ پال اور کئی دوسروں کو نیند کے دوران، خواب کی حالت میں خدا نے خود ظہور بخشا تھا۔

ایسی ہی روایات اور کہاوتیں تلمود میں بھی مل جاتی ہیں۔ تلمود، یہودیت کا مجموعہ قوانین ہے۔ اس مقدس کتاب میں بھی خدا اپنی مقدس حکمت کو خواب کے ذریعے بکھیرتا ہوا بیان کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اس مجموعے میں ایک تدریس کچھ یوں ہے کہ، 'نیند کی حالت میں روح جسم کا ساتھ چھوڑ جاتی ہے اور بلندی کے مقام سے روحانی تازگی حاصل کرتی ہے۔' اس عبارت اور عائشہ سے منسوب، 'رات کے سفر' بارے بیان میں حیران کن مماثلت پائی جاتی ہے۔ بعد ازاں، اس ربانی روایت کا تصور عبرانی میں 'شئیلت الہوم' میں ڈھل جائے گا۔ شئیلت الہوم سے مراد خواب میں خدا سے سوال کرنا ہے۔ مطلب یہ کہ، خواب کی حالت میں جاگنے کی حالت سے متعلق سوال کا جواب تلاشنا ہے۔ خوابوں سے منسوب روحانی پہلو تیرہویں صدی کے دوران، یہودیت میں مشہور 'زوہر' میں تفصیل سے شامل کیا گیا ہے۔ زوہر، یہودی روحانیت پسندوں کی سوچ و سمجھ پر مشتمل مجموعے، 'قبالہ' کا مرکزی خیال ہے۔ زوہر میں جبرائیل کو 'خواب کا بادشاہ' گردانا گیا ہے۔ جبرائیل، خدا اور انسان کے بیچ قاصد یا ایک ربط کار ادا کرتا ہے۔ جیسا کہ، یہ محمدؐ کے لیے بھی یہی کردار ادا کرتا آیا تھا۔

اس قدیم روایت میں مسلمان فلسفیوں اور روحانیت پسندوں نے بھی حسب توقع، اپنا حصہ ڈال رکھا ہے۔ ان میں سے دو خاصے معروف لوگ، بارہویں صدی میں ابن عربی، اور چودہویں صدی میں ابن خلدون ہیں۔ ان دونوں ہی اصحاب نے علم المثل 'یا تخیل کی فعالیت پر اپنی تصانیف میں خاصا زور دیا ہے۔ علم المثل سے مراد یہ ہے کہ انسانوں کے لیے ربانی ظہور، مقدس روشنی یا سچائی کے مظاہر کی انتہا، خواب ہیں۔ ابن خلدون نے لکھا تھا کہ دراصل خدا نے نیند کو اس لیے تخلیق کیا ہے کہ اس کے ذریعے، 'حواس پر پڑے پردوں کو اٹھا سکے'۔ یوں، حواس سے باہر رہ کر، تخیل کے زور پر علم اور آگاہی کے نئے درجے حاصل ہو سکتے ہیں۔ کئی احادیث، یعنی محمدؐ سے منسوب بیانات اور افعال میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ آپؐ اپنے ماننے والوں کو پاکیزگی حاصل کرنے کے بعد، عبادت اور پھر خواب میں بشارت، یعنی 'استخارہ' کی تبلیغ اور طریقے بتاتے نظر آتے ہیں۔ استخارہ میں ملنے والے اشارے جاگتے اور سوتے، دونوں حالتوں میں حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ یعنی، پاکیزگی حاصل کرنے اور عبادت کر چکنے کے فوراً بعد، سونے سے قبل دل جس جانب زیادہ مائل ہو یا پھر دوسری صورت سو جانے کے بعد، نیند کی حالت میں خواب کی صورت خود، خدائے ذوالجلال کی جانب سے اشارہ موصول ہوتا ہے۔

لیکن، 'رات کے سفر' کا واقعہ پیش آنے کے بعد، چند دن کے اندر ہی محمدؐ کے قریبی اور انتہائی کٹر ماننے والوں میں سے بھی اکثر اس بابت پریشانی کا شکار ہو گئے۔ انہیں یہ فکر لاحق تھی کہ آخر، اس سارے معاملے کو، اس سفر کے دوران پیش آنے والے واقعات کو آخر کیسے سمجھا جائے؟ ان میں سے ایک نے تو محمدؐ سے باقاعدہ، اس بابت خاموشی اختیار کر لینے کی درخواست بھی کر دی۔ محمدؐ پر تنقید کرنے والے، یقیناً، جانتے بوجھتے ہوئے بھی اس کو آپؐ کے خلاف لغوی معنوں میں استعمال کرنے والے تھے۔ درخواست کرنے والی مومنہ نے کہا، 'وہ آپؐ کو جھوٹا قرار دیں گے اور تضحیک، بے عزتی کریں گے۔ ہنسی اڑے گی۔' مگر، محمدؐ نے اس طرح کی کسی بھی درخواست اور ممکنہ نتیجے کو خاطر میں نہیں لایا۔ چنانچہ، جب یہ بات عام ہو گئی تو توقع کے عین مطابق، جس طرح اس مومنہ نے خدشہ ظاہر کیا تھا، مکہ میں ویسا ہی ردعمل سامنے آیا۔

آپؐ کے مخالفین میں سے ہر شخص، اس واقعہ کی تفصیلات سنتے ہی تقریباً چلا اٹھا کہ، 'یہ قطعی طور پر اوٹ پٹانگ اور بعید القیاس قصہ ہے۔' جس طرح آج بھی سیاستدان انتخابات کے دوران اپنے مخالفین کی دھجیاں بکھیر دیتے ہیں۔ ویسے ہی اس وقت بھی مخالفین نے اس کو ایک دلیل بنا کر شور مچا دیا کہ، 'ایک قافلے کو شام جانے کے لیے پورا مہینہ درکار ہوتا ہے۔ اس کی واپسی پر بھی تقریباً اتنا ہی وقت لگ جاتا ہے۔ اور محمدؐ کو دیکھو، وہ دعویٰ کرتا پھرتا ہے کہ اس نے یروشلم کا تقریباً اتنا ہی، دو ماہ کا طویل سفر صرف ایک رات میں طے کر لیا؟ ہم پوچھتے ہیں، آخر یہ کیسے ممکن ہے؟'

مخالفین تو رہے ایک طرف، آج بھی اس 'رات کے سفر' بارے خود مسلمانوں کے بیچ شدید اختلاف پایا جاتا ہے۔ ان میں سے ایک گروہ تو اس کو روحانی تجربے کی 'معراج' کے طور پر دیکھتا ہے۔ اسی نسبت سے اسے 'شب معراج' بھی کہا جاتا ہے۔ جبکہ دوسرا اس کو یکسر مختلف انداز میں، صرف بہ حرف، لغوی معنوں میں سمجھتا ہے۔ 'براق'، جس کا مطلب 'بجلی' کے ہیں، یعنی وہ سفید گھوڑی جس پر محمدؐ کے بارے مشہور ہے کہ وہ سوار ہوئے، اس کی شبیہ پر مشتمل رنگین پوسٹر آج بھی ایشیاء، شمالی افریقہ اور مشرق وسطیٰ میں عام مسلمانوں کے گھروں میں ٹنگے ہوئے مل جاتے ہیں۔ ان پوسٹروں میں، گھوڑی رنگ برنگی کاٹھیوں سے سجی نظر آتی ہے جس کی اشکال مقامی رنگ میں رنگی ہوتی ہیں۔ یعنی، ہر پوسٹر دوسرے خطے کے پوسٹر سے مختلف نظر آتا ہے۔ اسی طرح، کہیں پر تو اس گھوڑی کے پر اتنے بڑے ہیں کہ وہ جسامت کے لحاظ سے غیر موزوں، بے ڈھنگے لگتے ہیں اور بعض جگہوں پر اس کے پھیلائے ہوئے پروں پر مور کے لہراتے ہوئے پر کا گماں ہوتا ہے۔ گو بنیاد پرست مسلمانوں کے یہاں انسانی اور حیوانی اشکال بنانے کی ممانعت ہے مگر اس کے باوجود ان تصویروں میں اکثر گھوڑی کا دھڑ تو جانور کا ہوتا ہے مگر سر کسی خوب صورت عورت کا ہوتا ہے، جس کے کالے لانبے بال ہیں اور یہ بال لمبی گردن پر سانپ کی طرح بکھرے، کنڈلی مارتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ان پوسٹروں کو دور سے بھی دیکھیں تو پس منظر میں عام طور پر تاروں سے بھرا آسمان ہوتا ہے اور فاصلوں کو تقریباً مٹایا ہوا یوں دکھایا جاتا ہے کہ 'براق' کے ایک طرف یروشلم میں واقع 'قبتہ الصخرہ' یعنی 'چٹان کا سنہری گنبد' اور دوسری جانب مکہ میں مسجد الحرام کے بلند گنبد بنا رکھے ہوتے ہیں۔ یہ تشبیہ کسی بھی طرح سے اس زمانے کی جغرافیائی اور علم تاریخ یا وقائع نگاری سے میل نہیں کھاتا۔ یعنی یہ کہ جس رات یہ واقعہ پیش آیا، اس وقت تک نہ تو یروشلم میں سنہری گنبد اور نہ ہی مکہ میں حرم کے گرد بلند مینارے تعمیر کیے گئے تھے۔

زیادہ تر، براق کی اس شبیہ سے مراد، اصل نہیں ہے۔ در اصل یہ تو اس شے کو سمجھنے کی کوشش ہے جو سمجھ سے باہر ہے۔ غیر مادی تجربے کو مادیت میں ڈھالنے کی سعی ہے۔ اور یہی بات، ہم بجا طور پر اس رات پیش آنے والے واقعے، رات کے سفر بارے بھی کہہ سکتے ہیں۔ چنانچہ، سوال یہ نہیں ہے کہ کیا محمدؐ نے واقعی ایک رات کے اندر یروشلم تک پرواز کی یا نہیں، بلکہ یہاں، اہمیت اس بات کی ہے کہ در اصل اس تجربے کے معنی کیا ہیں؟ قدر کیا ہے؟

جیسے، یعقوب کو آنے والے خواب میں، جس طرح 'تخلیق کی کتاب' میں درج ہے، ایک سیڑھی نظر آئی تھی۔ یہ سیڑھی سوار کو آسمانوں میں لے جاتی تھی۔ لیکن، جہاں یعقوب اس سیڑھی کے پہلے قدم پر ہی سوتے ہوئے پائے گئے تھے۔ اس کے برعکس، محمدؐ نے اس سیڑھی کو 'جیسے کہ مرنے والے شخص کو نظر آتی ہے' کی مانند دیکھا اور اس پر اوپر چڑھتے گئے۔ کیا محمدؐ واقعی یہ محسوس کر رہے تھے کہ وہ اس رات موت کے منہ میں جا رہے تھے؟ جس طرح، پہلی وحی کی رات ان کو گماں ہوا تھا کہ، 'جیسے میری جان نکل جائے گی'؟ یا اس سے مراد ہم یہ لیں کہ یہ آپؐ کے اپنے آپ کی موت تھی، جس کی خواہش تقریباً ہر مذہب کو ماننے والا، دنیا کا ہر روحانیت پسند اپنے دل میں شدت سے محسوس کرتا ہے۔ یعنی، صرف یہی ایک صورت ہے کہ جس کے ذریعے تقدیس، یعنی خدائے ذوالجلال سے ملاپ، آمنا سامنا ہو سکتا ہے؟ یا پھر ایسا نظر آتا ہے کہ، اور یوں ہی عائشہ نے بھی بیان کیا ہے کہ ان کی روح اپنے جسم سے الگ ہو کر اس کے اوپر پھڑپھڑانے لگی، اور اپنے سامنے، نیچے زمین پر پڑے ہوئے جسم کو تاکنے لگی۔ اس طرح کے تجربات اکثر لوگ آج بھی بیان کرتے ہیں جو قریباً موت کے منہ سے واپس لوٹ کر آجاتے ہیں؟ یا پھر، یہ حال ہی میں موت کی وجہ سے جدا ہو جانے والے دو انتہائی عزیز اشخاص، محبت یعنی خدیجہ اور سرتاسایہ، یعنی ابوطالب سے ملنے کی شدید خواہش تھی؟

بلاشبہ، 'رات کے سفر' کے کئی مطلب نکلتے ہیں۔ یہ نفسیاتی طور پر بھی ایک حیران کن علامت ہے۔ یعنی یہ کہ، اس رات جب محمدؐ کی حالت غیر تھی۔ وہ مجروح ہو چکے تھے۔ ان کے اردگرد محرومی کے سائے ہر طرف سے گہرے ہو رہے تھے۔ وہ اس کیفیت میں شدید بے بسی محسوس کر رہے تھے اور ان کی تحریک کا مستقبل بھی غیر یقینی کی صورتحال سے دوچار ہو چکا تھا۔ انہیں مستقبل بارے یکسوئی سے سوچنے اور سمجھنے میں شدید مشکلات پیش آ رہی تھیں۔ ایسے میں، 'رات کے سفر' کے دوران پرواز اور اوپر ابھرنے کی تشبیہات آزادی اور فضیلت کو ظاہر کرتی ہیں۔ وہ روزمرہ زندگی کے معمولی امور، روٹین سے فرار چاہتے تھے اور یہ چاہتے

تھے کہ وہ ان سے بڑھ کر، اوپر اٹھیں۔ دیکھنے میں ایسا لگتا ہے کہ شاید یہ 'رات کا سفر' محمدؐ کے لیے خدیجہ اور ابو طالب کی وفات کے بعد، سامنے نظر آنے والے نقصان اور محرومی کا الہام کی طرف سے ازالہ ہو۔ ایسے حالات میں، جب آپؐ مہیب تنہائی کا شکار ہو چکے تھے۔ درد ان کے دل میں گہرائی تک اتر چکا تھا اور آپؐ مکہ کے اندر ہمیشہ سے کہیں زیادہ کٹ کر رہ گئے تھے، اس قسط کے ذریعے ان کو یقین دہانی، تسلی اور تشفی ہوئی کہ وہ اکیلے نہیں ہیں۔ ان کا فرشتوں کے یہاں استقبال کیا گیا تھا اور تاریخ کے تقریباً سب ہی عظیم پیغمبروں نے آگے بڑھ کر ان کا خیر مقدم کیا تھا۔ ان کو اس عظیم گروہ میں سے ایک شمار کیا گیا تھا۔

تب اور آج بھی، اس معجزاتی سفر کو سمجھنے کی غرض سے اگرچہ اثبات یا نفی کا معاملہ بنا دیا گیا ہے۔ ہر شخص اس کو ایمان اور کفر کے ترازو میں تولتا پھرتا ہے مگر نفسیاتی طور پر اس کی تشریح ہی اس واقعے کی اصل اہمیت کو اجاگر کرتی ہے۔ یہی موقع ہے کہ جہاں پر ہم بلا کسی شک اور شبہ کے کہہ سکتے ہیں کہ محمدؐ نے واقعی طور پر پہلی بار، جیسا کہ عبرانی انجیل میں کہا گیا، 'پیغامبری کی چادر' اوڑھ لی۔ جس کو آج سے پہلے تک قران میں، 'تم میں سے ایک' اور 'صرف ایک انسان' وغیرہ کہہ کر بلایا جاتا تھا، اب ایک عظیم رتبے پر فائز کر دیا گیا تھا۔ 'تم میں سے ایک' کبھی بھی پرواز کر کے سینکڑوں میل کا سفر، ایک رات میں طے نہیں کیا کرتا۔ اور نہ ہی 'صرف ایک انسان' فرشتوں کے جھرمٹ میں چلتا پھرتا ہے اور نہ ہی اس کی ملاقاتیں دوسرے پیغامبروں کی ارواح سے ہوا کرتی ہیں۔ نہ ہی کوئی 'عام انسان' خدا کے مظاہر، نشانیوں کو یوں کھلے عام دیکھ سکتا ہے۔ محمدؐ اب الہام، وحی کو صرف موصول کر کے آگے بیان کرنے والے نہیں بلکہ اس عظیم سلسلے کا متحرک حصہ بن چکے تھے۔ وہ اڑ سکتے ہیں۔ وہ اوپر بلند ہو سکتے ہیں۔ وہ فرشتوں کے ساتھ مل کر عبادت کر سکتے ہیں اور اب وہ اس قابل ہو چکے تھے کہ پیغمبروں کے ساتھ ملاقات کریں اور ان کی امامت سنبھال لیں۔

مادی لحاظ سے کہیے یا اس کو بصارت کا کمال سمجھیں، جاگتی ہوئی حقیقت یا پھر خواب کی حقیقت کا مظاہر جانیں۔ تعریف کی رو سے اس کو جہاں چاہیں، سمو دیں مگر حقیقت یہ ہے کہ 'رات کے سفر' کی بدولت ایک بنیادی تبدیلی آ گر رہے گی۔ تبدیلی یہ ہے کہ اب محمدؐ اچھی طرح سمجھ چکے ہیں کہ وہ ایک عام انسان نہیں ہیں۔ بلکہ، وہ صرف ایک پیغمبر بھی نہیں ہیں۔ اب وہ ایک رہنما بھی ہیں۔ ان حالات میں، جب مکہ میں ان کا مستقبل بظاہر غیر یقینی تھا، وہ اپنے آپ کو مستقبل میں ابھرتا ہوا صاف دیکھ سکتے تھے۔ اب ان کے دل میں یقین، نئی حدوں کو چھو رہا ہے۔ جس طرح قدیم خدا، یہوہ یا الہ یہوہ یا آج کی زبان میں، اللہ نے یعقوب کو خواب میں بشارت دی تھی کہ، 'تمہاری نسل یوں ہو گی جیسے زمین پر ریت کے ذرات ہیں۔ تمہاری نسل ہر طرف پھیل کر رہے گی۔ یہ مغرب سے مشرق کی جانب اور شمال سے جنوب کی طرف پھیلتی جائے گی'۔ اسی کی مانند جب خود محمدؐ اس بارے غیر یقینی کی صورتحال سے دوچار تھے، 'رات کے سفر' کے ذریعے، اس روحانی تجربے کی صورت آپؐ کے ساتھ ایک شاندار مستقبل کا وعدہ کیا گیا تھا۔

اس سب کے ساتھ، اجتماعی طور پر یہ الہامی تحریک کی بابت، قصد اور عملی طور پر متحرک ہونے کی جانب اگلا قدم بھی تھا۔ اب آپؐ نہایت آسانی سے خود کو کنبے اور قبیلے کی جڑوں سے الگ کر سکتے تھے۔ پوری طرح سے الہامی پیغام کو عام کرنے اور اس کے بنیادی اجزاء کو اپنی بھرپور شکل میں لاگو کرنے کے لیے جدوجہد کر سکتے تھے۔

ان کے انتہائی قریبی رشتے موت کی وجہ سے پہلے ہی ٹوٹ چکے تھے۔ اب وہ اب آزادی سے عطا کردہ عظیم کردار ادا کر سکتے تھے۔ وہ اب بھرپور طریقے سے اپنا دیرینہ خواب پورا کرنے کی طرف قدم بڑھا سکتے تھے۔ گو، اس کہانی میں سنتے ہوئے یہ بات شاید انتہائی ترش اور سرد محسوس ہوتی ہو مگر، خدیجہ جن سے محمدؐ کو بے تحاشا محبت تھی اور ابو طالب جن پر اب تک آپؐ کا ہر لحاظ سے انحصار تھا، دونوں کا ہی مر جانا انتہائی ضروری تھا۔ اس لیے کہ آپؐ اس کے بغیر کسی بھی صورت، گھر کی بندشوں اور بندھن سے آزاد نہیں ہو سکتے تھے۔ اب محمدؐ آزاد تھے اور پوری توجہ کے ساتھ اپنے اس سفر کو مکہ سے باہر، کہیں بڑی دنیا تک، ایک نئے اور مصمم ارادے کے بل بوتے پر آگے بڑھا سکتے تھے۔

باب:12

آج کل یہ سوال کہ 'آپ کہاں سے ہیں؟' سے مراد مقام پیدائش کی لی جاتی ہے یا وہ جگہ ہوتی ہے جہاں پرورش پائی ہو۔ تھوڑی یا زیادہ، کسی نہ کسی حد تک ہم پر آبائی علاقے کی چھاپ باقی رہتی ہی ہے۔ ایک یا دوسری صورت، بخوشی یا خفگی سے ہماری شخصیت کے کچھ حصے کا اس جگہ سے تعلق ہمیشہ قائم رہتا ہے۔ مگر ساتویں صدی عیسوی میں، خطہ عرب و حجاز میں آبائی علاقہ صرف شناخت نہیں ہوا کرتا تھا بلکہ اس سے نسبت ہر شے اور معاملے کا تعین کرتی تھی۔ مثال یوں کہ تب جغرافیہ اور شخصی شناخت کا ریشہ دار دھاگا پیچ در پیچ بل کھا کر ایک دوسرے میں کچھ اس طرح کھب چکا تھا کہ ان کو ایک دوسرے سے جدا کرنا مشکل تھا۔ مکہ سے تعلق رکھنا صرف مکہ سے تعلق رکھنا نہیں بلکہ مکہ کا ہو کر رہنا تھا۔ محمدؐ کے لیے یہ معاملہ اس لیے بھی خاصا پیچیدہ تھا کہ یہ صرف مکہ یا آبائی خطے سے متعلق نہیں تھا۔ بلکہ، یہ اس جگہ، یعنی مکہ اور مکہ کے لوگوں، قریش سے بھی تعلق رکھتا تھا۔ مزید براں، قریش سے، جو نسبت تھی وہ صرف آباؤ اجداد یا قبیلے کی وجہ سے نہیں بلکہ ساتھ ہی کعبہ اور حرم کی وجہ سے ان کی یادداشت میں گہری چھپ چکی تھی۔

الہامی آواز نے بھی جب محمدؐ کو پکارا، ان سے مکہ کے لوگوں تک کوئی نہ کوئی پیغام پہنچانے کی تاکید کی گئی تھی۔ پیغام کے علاوہ، انتباہ کی صورت میں تو یہ آواز سیدھی لوگوں سے مخاطب ہوا کرتی تھی۔ محمدؐ نے الہامی پیغام ایک مکہ کے باشندے، مکین کی صورت پہنچایا۔ آپؐ کا تعارف، قران میں 'تم میں سے ایک' کے الفاظ سے کیا گیا۔ یہی وجہ تھی کہ آپؐ کے لیے مکہ کو ترک کرنا، ناممکنات میں سے ایک تھا۔ لیکن اب، جب آپؐ کی عمر لگ بھگ پچاس برس ہو چکی تھی، ناممکن صورتحال در پیش تھی۔ آبائی شہر، یہاں تک کہ ذاتی گھر بھی غیر محفوظ ہو چکا تھا۔ ہر لحاظ سے یہ ناممکن تھا مگر بہرحال، مکہ سے رخصت لینا ان کے لیے ناگزیر ہو چکا تھا۔

مہاجرت اختیار کرنے والا ہر شخص اچھی طرح جانتا ہے کہ گھربار چھوڑنا صرف جغرافیائی لحاظ سے جگہ بدلنا نہیں ہے۔ چاہے، یہ دیہات سے شہر کی جانب منزل ہو، ایک شہر سے دوسرے شہر میں، یا ایک ملک سے دوسرے بلکہ ایک براعظم سے دوسرے میں بھی کیوں نہ جانا ہو، یہ نہایت دل خراش تجربہ ہوا کرتا ہے۔ اس کی مثال اپنی جڑیں اکھاڑ دینے جیسی ہے۔ اس دوران کچھ اس طرح علیحدگی اختیار کرنی ہوتی ہے کہ نتیجے سے متعلق تمام تر خدشات کو سوچ کر ہی ہول اٹھتا ہے۔ ہجرت کرنے والے اس زندگی کو ترک کر دیتے ہیں جس کو وہ آج تک جانتے آئے ہیں۔ وہ خود کو ایک نئی دنیا کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتے ہیں۔ جس میں کچھ بھی قطعی، یقینی نہیں ہوتا۔ کچھ سوالات جیسے، کیا یہ نئی دنیا انہیں قبول کرے گی یا یکسر رد کر دے گی؟ آخر ایک نئی جگہ پر قبول کیے جانے کے لیے کیا شے درکار ہوتی ہے؟ کیا آبائی علاقے کو ترک کر دینے کا فیصلہ مناسب ہے؟ اگر نئی جگہ پر لوگوں نے رد کر دیا تو پھر کیا ہو گا؟ بعض حالات میں تو یہ سوال جیسے اندر سے توڑ کر رکھ دیتا ہے کہ، وہ جگہ جہاں ہمیشہ بسر رہی، جس کو ہم اپنا سمجھتے آئے ہیں، کیا اس جگہ، ہمارے گھر اور لوگوں نے ہمیں ترک کر دیا ہے؟ کیا وہ ہم سے چھٹکارا چاہتے ہیں؟

محمدؐ کے لیے یہ اور کئی دوسرے سوالات بے چینی کا باعث تھے۔ انہوں نے ساری عمر اپنے لوگوں کے یہاں قبول کیے جانے، عزت کمانے میں صرف کر دی تھی۔ مشقت اور مشکلات اٹھا کر شناخت بنائی تھی اور قریش کہلوانے کے لائق ہوئے تھے۔ لیکن اب ہر وہ چیز جس کے لیے محمدؐ نے اب تک بے انتہا کوشش کی تھی، داؤ پر لگ چکی تھی۔ تعلق، نسبت، عزت، تکریم اور سب سے بڑھ کر شناخت، سب کو شدید خطرات لاحق تھے۔ نقصان کے اسی احساس سے نمٹنے کے لیے 'رات کا سفر' انوکھی یقین دہانی بن گیا۔ محمدؐ کو 'نشانیاں' دکھا کر یقین دلایا گیا تھا کہ ان کے لیے روحانیت کی دنیا میں ایک برتر گھر اور گہری نسبت موجود ہے۔ یہ لگان مادی دنیا، جغرافیائی اور قبائلی بندھن سے کہیں بہتر تھی۔ اس مافوق الفطرت، نظری تجربے کا مادی دنیا اور طبعی معاملات سے تعلق صاف نظر آتا ہے۔ اسی واقعے کے بعد محمدؐ بالآخر خود کو دنیا میں سنبھالا دینے میں کامیاب ہوگئے۔ ناقابل تصور، یعنی ہجرت کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنے کے قابل ہو چکے تھے۔

مشہور یہ تھا کہ محمدؐ کا الہامی پیغام ہر لحاظ سے آفاقی ہے۔ یہ نہ صرف معاشرے کی اصلاح اور انصاف کا تقاضا کرتا تھا بلکہ اس نظام کے تحت مسائل کا دیرپا حل بھی موجود تھا۔ بلکہ اس کے ساتھ اپنے اندر بنیادپرست معنوں میں گھر اور آبائی علاقے سے نسبت کے تصور کو بھی بے پناہ وسعت دینے کا حامل تھا۔ یہی نہیں بلکہ یہ شناخت کے تصور کو بھی بدل کر رکھ دے گا۔ اب وقت آن پہنچا تھا کہ اس مفروضے کا صحیح معنوں میں امتحان لیا جائے۔ عمل کی بھٹی میں اس کی کڑی جانچ کی جائے۔ اب تک صرف یہی شہر یعنی مکہ ہی محمدؐ کی زندگی کا محور رہا تھا، کیا وہ اب اس جگہ کو واقعی ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ دیں گے؟ کیا مکہ کو چھوڑنے کا مطلب ایک نئی زندگی کی شروعات تھی، بلکہ ایک نئی دنیا کی بنیاد تھی؟ اگر یہ طے کر بھی لیا تو کیا، یہ سوال توجوں کا توں قائم تھا کہ اگر فی الوقت عملی تجربہ یہاں ممکن نہیں ہے تو آخر، پھر کہاں؟

اس بابت محمدؐ کا دل اور دماغ دونوں ہی خالی تھے۔ جب وجدان ہی نہیں تھا تو اس بارے نزول کہاں سے آتا؟ دیکھا جائے تو مدینہ چلے جانے کا فیصلہ بھی کسی نئے اچھوتے خیال نہیں بلکہ چار و ناچار ماضی میں گم گشتہ تعلق کی بنیاد پر کیا گیا۔ مدینہ کا نخلستان مکہ سے شمال کی جانب دو سو میل پر واقع تھا۔ محمدؐ اس مقام کے لیے مکمل طور پر اجنبی، غیر اور لاتعلق نہیں تھے۔ ان کا اس جگہ کے ساتھ ایک دیرینہ رشتہ تھا۔ مہین ہی سہی مگر بہرحال نسبت موجود تھی، کم از کم اصولی طور پر ضرور ہی تھی۔ محمدؐ کے والد کا انتقال اسی مقام پر ہوا تھا اور ان کی فوتیدگی کے چھ سال بعد آپؐ کی والدہ بھی یہیں سے واپسی پر راستے میں چل بسی تھیں۔ اگر یہ تعلق قسمت اور وقت کا معاملہ محسوس ہوتا ہو تو اس کے علاوہ بھی ایک دوسرا تعلق تھا۔ جو باقی کسی بھی نسبت سے کہیں گہرا تھا۔ آپؐ کے پردادا، یعنی بنی ہاشم کے بانی نے اپنی زندگی میں مدینہ کی ایک عورت سے شادی کی تھی، جس کے بطن سے ایک بیٹا بھی پیدا ہوا تھا۔

ہاشم کو قریش کی جانب سے شام کے لیے نمائندہ مقرر کیا گیا تھا۔ اس وقت شام میں آج دور کے ممالک اسرائیل، فلسطین، اردن، لبنان اور پوری شامی ریاست شامل تھی۔ پیشہ ورانہ فرائض کی ادائیگی میں ہاشم شمال اور جنوب کے اطراف میں اکثر سفر کیا کرتے تھے۔ تقریباً ہر سفر کے دوران ان کا مدینہ سے گزر یقینی رہتا تھا۔ ایسے ہی ایک سفر کے دوران، آپ نے مدینہ میں خزرج قبیلے کی ایک عورت سے نکاح کر لیا اور وہیں سے آگے، شمال کی جانب اپنا سفر جاری رکھا۔ غزہ کے مقام پر ہاشم بیمار پڑ گئے اور وہیں انتقال ہوا۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ انہوں نے ایک بیٹے کو تولد کر رکھا ہے۔ یہ تفاصیل محمدؐ کے ذہن میں نقش تھیں۔ وہ خود بھی کچھ اسی طرح یتیم ہوئے تھے اور ذہن کے نہاں خانوں میں وہ اس نسبت سے مضبوطی سے جڑے ہوئے تھے کہ ہاشم کا وہ یتیم بیٹا کوئی اور نہیں، دادا عبدالمطلب تھے۔ محمدؐ کے لیے یہ نسبت بڑھ کر تھی کہ ان کے دادا بھی یتیم پیدا ہوئے تھے۔

دراصل یہ مدینہ اور مکہ کے بیچ نفسیاتی فاصلہ ہے کہ جس کے پیمانے پر یہ حقیقت خاصی انوکھی معلوم ہوتی ہے کہ ہاشم کے نومولود بیٹے کے بارے مکہ میں ان کے قرابت دار انجان رہے۔ مکہ کے لوگوں کے نزدیک مدینہ کی حیثیت ایک اجاڑ سے زیادہ نہیں تھی۔ تجارتی قافلوں کے لیے بھلے یہ ایک سودمند پڑاؤ کی جگہ تھی مگر اس کی حقیقت آٹھ میل کے محدود علاقے میں چند دیہاتی موضعوں کے پھیلاؤ سے زیادہ نہیں رہی۔ یہ ایک چھوٹا سا نخلستان تھا جو خوش قسمتی سے انتہائی زرخیز واقع ہوا تھا۔ وادی میں ہریالی تھی اور کھجور کے گھنے باغات تھے۔ جیسے تب، آج بھی اکثر شہریوں کو خواہ مخواہ کا زعم ہوتا ہے۔ مکہ کے لوگ بھی شہری ہونے کے باعث مغرور تھے اور خود کو مضافاتی علاقوں میں بسنے والے دیہاتیوں سے برتر سمجھتے تھے۔ چنانچہ، جب مکہ میں ہاشم کے بیٹے کی اطلاع پہنچی تو اس لڑکے کے چچا، ہاشم کے سگے بھائی جس کا نام مطلب تھا، طے کر لیا کہ وہ اپنے بھتیجے کو واپس مکہ میں، اپنے باپ کے خون کے ناطوں کے پاس لے کر ضرور آئے گا۔

یہ معاملہ بڑھ کر چھٹی صدی عیسوی کے عرب میں بچے کی کفالت اور تحویل کا روایتی مقدمہ بن کر رہ جائے گا۔ ویسے بھی، مطلب کو قانونی طور پر سبقت حاصل تھی۔ اس دور میں پدرانہ حقوق، مادرانہ کی نسبت زیادہ ہوا کرتے تھے مگر خود مطلب کے لیے اس معاملے کو اپنے حق میں لانے کی صرف یہی وجہ نہیں تھی۔ جس چیز نے انہیں یہ قدم اٹھانے پر مجبور کیا، وہ تو دراصل ان کی اپنی محرومی تھی۔ وہ اس نئے دریافت شدہ بھتیجے کو مکہ میں واپس لا کر پال پوس سکتے تھے۔ جس طرح تین

نسلوں بعد محمدؐ کے ساتھ پیش آیا، مطلب کے یہاں بھی جانبر ہونے والی اولاد میں صرف بیٹیاں ہی بچی تھیں۔ چنانچہ، مطلب کو امید پیدا ہوئی تھی کہ وہ اپنے بھتیجے کو لے پالک بیٹا بنا سکتے ہیں۔ ان کی دلی مراد بر آسکتی تھی۔ تاریخ میں تمام روایات ان کی اس بابت بے صبری صاف بیان کرتی ہیں۔ انہوں نے اطلاع پاتے ہی، مزید کوئی وقت ضائع کیے بغیر مدینہ کی راہ لی۔ ارادہ، بچے کی ماں کو اسے حوالے کرنے پر آمادہ کرنا تھا۔

ایک روایت میں درج ہے کہ بچے کی ماں نے بد دلی سے یہ مطالبہ مان لیا۔ مطلب مصر تھے کہ بچے کی مکہ کے مہذب معاشرے میں بہتر پرورش ہو سکتی ہے۔ سہولیات دستیاب ہوں گے اور وہ اچھی زندگی گزار سکے گا، وغیرہ۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ انہوں نے اس سے کہا کہ 'یہ بچہ مکہ سے تعلق رکھتا ہے۔ وہیں کا ہے۔'

ایک دوسری روایت میں ملتا ہے کہ توقع کے عین مطابق بچے کی ماں نے صاف انکار کر دیا۔ مطلب نے اسے منانے کی بہتیری کوشش کی مگر ناکام رہے۔ بالآخر تنگ آکر، انہوں نے بچے کو اغوا کر لیا۔ اسے اپنے ساتھ اونٹ پر بٹھایا اور مدینہ سے رخصت لی۔ اس بچے کی ماں کو جب تک خبر ہوتی، مطلب بچے کو لے کر مدینہ سے نکل چکے تھے۔ ماں کے پاس سوائے آہ و بکا، رونے دھونے کے کوئی چارہ نہیں تھا۔

دوسری روایت اس لیے بھی حقیقت پر مبنی نظر آتی ہے کہ اس کے ساتھ کئی حقائق بھی جڑے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ کہ مطلب نے مدینہ سے واپسی پر لڑکے کی شناخت چھپالی۔ امکان یہ تھا کہ مدینہ میں بچے کے ننھیال کے لوگ، بھائی بند اس کو بازیاب کرانے ضرور آئیں گے۔ چنانچہ، مطلب نے بجائے بھتیجے اس کو غلام کے طور پر شناخت کرانا شروع کر دیا۔ سات سالہ لڑکے کو یوں 'عبد المطلب' کہا جانے لگا جس سے مراد 'مطلب کا بندہ' یا 'مطلب کا غلام' ہے۔ وقت کے ساتھ لڑکے کا یہ نام پختہ ہو گیا۔ اس واقعہ کے پچاس سال بعد یہی لڑکا اپنے سب سے چھوٹے بیٹے عبد اللہ کی جان بچانے کے لیے ہبل کے سامنے نیزے گرا رہا تھا۔ عبد اللہ محمدؐ کے والد ہوں گے اور ان کی پیدائش سے پہلے ہی اسی شہر مدینہ میں وفات پا جائیں گے۔

کیا پوتا اپنے دادا کی جائے پیدائش میں نیا گھر بنا سکتا ہے؟ یوں سمجھیے کہ اس داستان کے بیانیے میں آگے بڑھنے کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ مگر، پہلی نظر میں محمدؐ کی مدینہ سے جس قدر گہری نسبت نظر آتی ہے، وہ حقیقت میں نہیں ہے۔ یعنی، چھٹی صدی عیسوی میں جب مبینہ طور پر مطلب نے اپنے بھتیجے کو اغوا کیا تھا، اس وقت مدینہ میں عبد المطلب کی والدہ اور نہ ہی ان کے اہل و اعیال میں سے کسی نے ان پر ددھیال کے حق کے اس دعویٰ کو چیلنج کیا تھا۔ مراد یہ ہے کہ اس دور میں واقعی یہ حق ددھیال کا ہوا کرتا تھا اور ماں کی نسبت کمتر حق تھا۔ محمدؐ کی نکر دادی کو یوں ہی، تن تنہا، روتا اور ہلکان چھوڑ دیا گیا تھا۔ بعد اس روز کے اس معاملے کی کبھی بازگشت بھی سنائی نہیں دی۔ عبد المطلب کے ننھیال نے چپ سادھ لی تھی۔ اس دور میں بھی، اگر یہ معاملہ مکہ کے علاوہ کسی دوسری جگہ سے تعلق رکھنے والے شخص کا ہوتا تو یقیناً مدینہ کی اجتماعی یادداشت میں یہ واقعہ کسی کو یاد بھی نہ رہتا۔

پھر یہ خیال، قبیلہ قریش کا ایک حاکم جب دن دھاڑے مقامی لڑکے پر دعویٰ کرنے پہنچ جائے اور جب اس کی منشاء کے مطابق نتائج نہ نکلیں تو وہ اس لڑکے کو اغوا بھی کر لے۔ یہ مثال مکہ کے مقابلے میں مدینہ کی حیثیت کا پتہ دیتی ہے۔ مدینہ، مکہ کے مقابلے میں جغرافیائی بلکہ نفسیاتی طور پر بھی صرف ایک دوسرے درجے کا قصبہ ہوا کرتا تھا۔ اگر ایک طرف مکہ خطہ حجاز میں تجارتی راہداری میں واقع ہونے اور حرم کی وجہ سے کاروبار اور تقدیس کا ابھرتا ہوا مرکز تھا تو دوسری طرف مدینہ اس بڑے منظر نامے میں صرف ایک سنگ میل تھا۔ یہ کسی بھی صورت منزل نہیں تھا۔ یہ تو صرف ایک زرعی نو آبادی تھی جس میں کھجور کے باغات سے نہ صرف مدینہ کے باسیوں کے لیے خوراک کا سامان بلکہ ساتھ ہی بیچنے کے لیے نباتاتی شیرہ، شراب، جڑ سے کشید کیا ہوا تیل، لکڑی کا کوئلہ اور جانوروں کے لیے چارہ مل جاتا تھا۔ کھجور کے پتوں سے کئی سبزیاں بنائی جاتی تھیں اور انہی کی ڈالیوں سے رسیوں سے لے کر چھتوں پر ڈالنے کا سامان نکالا جاتا تھا۔ الغرض، یہاں بسر کرنے والوں کے لیے اس زرخیز وادی میں زرائع معاش کے وسیع ذرائع دستیاب تھے۔ مگر یہ صرف چند لوگوں، یعنی زرعی جائیداد اور اراضی کے مالکان کے لیے دستیاب سہولت تھی۔

سماجی ڈھانچے کو بھی دیکھیں تو مکہ میں صرف ایک قبیلے یعنی قریش کا راج تھا۔ اس کی وجہ سے اس شہری علاقے میں نسبتاً توازن اور استحکام قائم چلا آرہا تھا۔ وہاں ایک تجار کو نسل اور سیاسی ڈھانچے کا وجود تھا۔ اس کے برعکس مدینہ میں کئی قبائل آباد تھے اور ان کے بیچ تقریباً ہمیشہ سے ہی زرعی زمین کی ملکیت تنازعے کا باعث رہی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ مدینہ کے ہر موضعے کے اندر ایک سے زیادہ گاؤں، علیحدہ رہ کر، قلعے کی شکل میں حفاظتی فصیلوں کے اندر بند ہو کر بسر کرتے تھے۔ یہ دیوہیکل دیواریں دوسرے قبائل یا فریقین کے ساتھ جھڑپ میں دفاع کے کام آتی تھیں۔ حالیہ سالوں میں مدینہ کے دو بڑے قبائل اوس اور خزرج تنازعات میں گھر کر کئی بار ایک دوسرے کے بالمقابل آچکے تھے۔ ان میں سے کسی ایک کو برتری تو حاصل نہیں ہوئی تھی مگر اس قضیے کی وجہ سے پوری وادی میں بدامنی اور بے چینی کی فضا پیدا ہو گئی تھی۔ یہاں تنازعات کے بگڑنے اور خون ریز جھڑپوں کا خدشہ ہر وقت موجود رہتا تھا۔ مگر، ایک شے ایسی تھی جو ان کو اب بھی اکٹھا رکھے ہوئے تھی۔ یہ دونوں بڑے قبائل مکہ کے قبیلہ قریش سے شاکی تھے۔ قریش کے نزدیک یہ جاہل، دیہاتی قبائل تھے جن کے مقابلے میں وہ خاصے مہذب اور تہذیب یافتہ واقع ہوئے تھے۔ مزید یہ کہ شمال میں کھجور کے باغات میں بسر رکھنے والے ان گنواروں میں اتنی سمجھ نہیں تھی کہ وہ آپس میں امن و آشتی قائم کر کے سکون سے زندگی گزار سکتے۔ مکہ کا یہ رویہ، مدینہ کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ اس کو اجتماعی طور پر اکٹھ قائم رکھنے پر مجبور کرتا تھا۔ اور مندرجہ بالا نکات ہیں جن کے سبب مدینہ محمدؐ اور ان کے پیروکاروں کے لیے نئی منزل بن گیا۔

مدینہ کی طرف ہجرت خاموشی سے شروع ہوئی اور اس بابت پہلے پہل مکہ میں کسی کو کانوں کان خبر تک نہیں ہوئی۔ ہجرت کا خیال پہلی بار، اس برس حج کے موقع پر منظر عام پر لایا گیا۔ پچھلے کئی برسوں سے ہر سال حج کے موقع پر محمدؐ زائرین کو الہامی پیغام سے آگاہ کرتے آئے تھے۔ وہ اس بابت باقاعدہ تبلیغ کیا کرتے تھے۔ سالانہ اجتماع میں شرکت کی غرض سے آنے والے زائرین مکہ سے باہر نصب خیمے گاڑھ کر پڑاؤ ڈالا کرتے تھے۔ آپؐ اپنے پیروکاروں کے ہمراہ ان خیمہ بستیوں میں گشت کرتے اور زائرین کے سامنے قرانی آیات کی تلاوت کرتے تھے۔ برس ہا برس کی اس کڑی مشق کے باوجود آج تک زائرین میں سے کوئی ایک شخص بھی قائل تو نہیں ہوا تھا مگر ان میں سے تقریباً سب ہی لوگ آپؐ کے پیغام کو سننے پر ہمیشہ آمادہ رہا کرتے تھے۔ یہ زائرین سینکڑوں میل کا سفر کرنے کے بعد تھکن سے چور ہوتے اور یہاں پہنچ کر خیمہ بستیوں میں ان کو محظوظ کرنے کے لیے شاعروں، مبلغوں، داستان گو اور روحانیت پسندوں کا تانتا بندھا رہتا۔ زائرین کے لیے یہ لوگ تفریح کا سامان رہا کرتے۔ ویسے بھی، لوگ سمجھتے تھے کہ آخر سننے میں قباحت ہی کیا ہے؟ بالخصوص اس شخص کو تو ضرور ہی سنا جانا چاہیے جس کی چہار سو خاصی شہرت ہے۔ وہ اس کے بارے سنتے آئے ہیں کہ کس طرح اس نے قریش کو ناکوں چنے چبوا رکھے تھے اور مکہ کی تقریباً اشرافیہ اس کی جان کے درپے ہو چکی تھی۔ اس طرح کے معاملات میں جیسے آج بھی یہ کہاوت مشہور ہے، 'ہر طرح کی تشہیر، اچھی ہوتی ہے'، اس دور میں بھی درست تھی۔

اس برس مگر معاملہ یہ ہوا کہ محمدؐ کو اتنے سالوں میں پہلی بار چند سنجیدہ سامعین مل ہی گئے۔ یہ زائرین تعداد میں چھ تھے اور مدینہ سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے محمدؐ کے پیغام کو خصوصی توجہ دی۔ بلکہ، ان لوگوں نے اجتماع ارزش میں خود ہی محمدؐ کو تلاش کیا تھا۔ یہ سب قبیلہ خزرج سے تعلق رکھتے تھے۔ مگر شاید وہ اس ابھی تک یہ نہیں جانتے تھے کہ محمدؐ کے دادا کی والدہ کا تعلق بھی مدینہ اور وہاں بھی انہی کے قبیلے سے تھا۔ انہوں نے صرف محمدؐ کے الہامی پیغام بارے سن رکھا تھا۔ قریش سے تو یہ اشخاص نالاں تھے ہی مگر وہ محمدؐ کے ساتھ کیے جانے والے ناروا سلوک پر بھی برہم نظر آتے تھے۔ وہ قریش کے اس رویے، جس میں انہوں نے اپنے قبیلے کے ایک شخص کو، جس کو وہ کبھی امین سمجھا کرتے تھے، اب نہایت غیر مناسب طریقے سے رد کر کے کنبے سے بے دخل کر دیا تھا، سخت نالاں تھے۔ پھر، کعبہ کی تعمیر نو کے دوران پیش آنے والے واقعے، یعنی سیاہ پتھر کی تنصیب کی کہانی اب عرب کے طول و عرض میں مشہور ہو چکی تھی۔ تب سے، یہ داستان حکمت اور دانائی کی مثال بنی چلی آرہی تھی اور لوگ جا بجا اس کا حوالہ دیا کرتے تھے۔ مدینہ کے لوگ پچھلے کئی برسوں سے پیچیدہ معاملات میں گھرے ہوئے تھے۔ محمدؐ کے ہاتھوں اس خوش اسلوبی سے طے پا جانے والے کلیدی معاملے کی مثال سے بھی ان کے دل میں اپنے مسائل کے حل کے لیے امید پیدا ہو گئی تھی۔ ان کا

خیال یہ تھا کہ شاید محمدؐ ان کے لیے بھی بہترین ثالث ثابت ہو سکتے ہیں۔ ابن اسحاق نے مدینہ کے ان چھ اشخاص میں سے ایک آدمی سے منسوب یہ بیان رقم کیا ہے، 'پورے عرب میں لوگ اس طرح منقسم نہیں ہوں گے، جس طرح ہم مدینہ کے لوگ بٹے ہوئے تھے۔ ہم نے سوچا، کہ شاید خدا کے حکم سے آپؐ ہمیں اکٹھا کرنے کی کچھ سبیل کر سکیں؟'

یہ بیان تاریخ میں اس وقت سے منسوب ہے جب مدینہ، یثرب ہوا کرتا تھا۔ مدینہ کا یہ نام جس کا مطلب 'محمدؐ کا شہر' یا مختصراً 'شہر' لیا جاتا ہے، بہت بعد کی بات ہے۔ پھر جس برس حج کے موقع پر چھ اشخاص میں سے ایک سے یہ بیان منسوب ہے، اس وقت تک محمدؐ کا مدینہ ہجرت کر جانا صرف ایک خواہش، خیال ہی تھا۔ بہر حال، یہ چھ اشخاص محمدؐ کے ساتھ طویل ملاقات کے بعد خاصے متاثر ہو چکے تھے۔ وہ الہام کے قائل ہو گئے اور فوراً ہی اسلام قبول کر لیا۔ انہوں نے محمدؐ سے اگلے برس حج کے موقع پر دوبارہ ملاقات کا عہد باندھا اور مدینہ واپس ہو لیے۔ مدینہ میں یہ لوگ پورا برس چوری چھپے محمدؐ کے الہامی پیغام کی تبلیغ کرتے رہے۔

اگلے برس، 621ء میں اوائل گرما کے موسم میں حج کا اجتماع منعقد ہونا تھا۔ چونکہ قریش محمدؐ کے درپے رہا کرتے تھے۔ اس لیے مکہ شہر کے اندر، بلکہ مضافات میں بھی محمدؐ سے ملاقات کرنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ اس لیے مدینہ سے آئے مختصر گروہ نے آپؐ کے ساتھ مکہ سے دور، تقریباً تین میل کے فاصلے پر منیٰ کی وادی میں ملاقات کرنا طے کیا۔ اب کی بار مدینہ سے آئے اس گروہ میں اشخاص کی تعداد بڑھ کر بارہ ہو چکی تھی اور ان میں سے تین آدمیوں کا تعلق قبیلہ اوس سے تھا۔ جو ایک لحاظ سے مثبت اشارہ تھا۔ اگر اوس اور خزرج میں سے چند لوگ بھی اکٹھے ہو کر اسلام قبول کر لیتے ہیں تو اس کا مطلب یہ تھا کہ دونوں قبائل کے ساتھ ایک ہی نشست میں بات چیت آگے بڑھائی جا سکتی تھی۔ اس ملاقات میں ایک دوسری خوش آئند بات یہ تھی کہ دریں بارہ اشخاص کوئی عام لوگ نہیں تھے بلکہ ان میں سے ہر ایک اپنے قبیلے میں کنبے کا سربراہ تھا۔ یہ وفد چند لوگ نہیں تھے بلکہ ایک بڑی آبادی کی نمائندگی کر رہے تھے۔

وفد نے جو تجویز پیش کی، اس کے مطابق محمدؐ ایک ثالث کی حیثیت سے مدینہ جائیں گے اور ان کو اوس اور خزرج، دونوں ہی قبائل کی حمایت حاصل ہو گی۔ لیکن بات چیت جب آگے بڑھنے لگی تو محمدؐ نے اصرار کیا کہ وہ مدینہ میں صرف اسی صورت تنازعات کی ثالثی کی خدمات فراہم کریں گے، اگر ان کے پیروکاروں کو بھی ان کے ساتھ ہی وہاں مستقل بسر کرنے کی اجازت ہو اور ان کا بھی اسی طرح خیر مقدم کیا جائے۔ اب تک مکہ میں قریباً دو سو لوگوں نے کھلے عام کلمہ شہادت پڑھ کر علی الاعلان اسلام قبول کر لیا تھا۔ مگر ان میں سے تقریباً سب ہی لوگ اس وجہ سے شدید مشکلات سے دوچار تھے۔ گو، مطعم کی جانب سے ملنے والی پشت پناہی کسی حد تک محمدؐ کو تو تحفظ دے رہی تھی مگر ان کے پیروکار بدستور اپنے کنبوں اور رشتہ داروں کے ہاتھوں ہراساں کیے جا رہے تھے۔ مومنین کو اپنا طریق بدلنے پر مجبور کیا جا رہا تھا۔ اسی طرح کئی دوسرے لوگ بھی تھے۔ انہوں نے باقاعدہ اسلام تو قبول نہیں کیا تھا مگر ان کی ہمدردیاں محمدؐ اور ان کے پیروکاروں کے ساتھ تھیں۔ وہ کھلے عام اسلام قبول کرنے سے خوفزدہ تھے۔ جس طرح مومنین اور ہمدردوں نے اب تک مشکلات کا ثابت قدمی سے سامنا کیا تھا، محمدؐ کو ان کا بھرپور خیال تھا۔ وہ ان کی وفا کو جواباً انہی کی طرح نبھانا چاہتے تھے۔ چنانچہ، ایسا ہرگز ممکن نہیں تھا کہ محمدؐ خود تو مکہ چھوڑ کر کسی دوسری جگہ پر سکون سے بسر کر لیں اور ان کے پیروکار پیچھے، مکہ کی اشرافیہ کے رحم و کرم پر رہ جائیں۔ محمدؐ جہاں بھی جاتے، ان کے لیے اپنے پیروکاروں کو ساتھ لے جانا انتہائی ضروری تھا۔ مگر وہ صرف اپنی خواہش پر انہیں ساتھ نہیں لے جا سکتے تھے۔ ان کے لیے نئی جگہ پر ایک اچھی اور پرامن زندگی کی ضمانت ضروری تھی۔ اس دور میں بھی مہاجر ہو جانا، اپنے آپ میں ایک مسئلہ ہوا کرتا تھا مگر پناہ گزیں ہو کر رہنا تو سراسر عذاب تھا۔ ویسے بھی اگر یہ لوگ مکہ چھوڑ کر چلے بھی جاتے تو وہ نئی جگہ پر ہرگز مقامی آبادی پر مکمل انحصار نہیں کر سکتے تھے اور نہ ہی وہاں ہمیشہ مہمان بن کر بسر کر سکتے تھے۔ انہیں ایک مضبوط سماجی تحفظ کی ضرورت تھی۔ نئے آبادی میں ہر لحاظ سے قبولیت درکار تھی۔ یعنی، ان کے لیے یہ نئی جگہ ہر لحاظ سے گھر ہوا کرتی۔

مسئلہ یہ تھا کہ اس سے قبل اس طرح کا معاملہ کبھی پیش نہیں آیا تھا۔ محمدؐ اور اس وفد کے بیچ مدینہ میں برابر حیثیت اور قبائلی تعلق سے بالاتر ہو کر عہد باندھنے کے نکتے بالکل نئے تھے۔ بوجوہ، حج کے اختتام تک یہ معاملات پوری طرح حل نہ ہو سکے۔ مگر، یہ طے ہو گیا کہ اگر محمدؐ مدینہ جانے کا قصد کرتے ہیں تو وہ صرف اور صرف ایک ثالث کی حیثیت سے نہیں جائیں گے۔ ثالث کی حیثیت تو ایک غیر کی تھی اور محمدؐ اب ایک بار پھر لاتعلق، غیر ہو کر نہیں رہنا چاہتے تھے۔ اگر مدینہ کے لوگ ان کی ثالثی کی قدر کرتے ہیں تو وہ صرف اس وجہ سے ہونا طے تھا کہ ان کے فیصلے بحیثیت خدا کے پیغمبر کی طرح قبول کیے جائیں۔

چنانچہ، یہ مذاکرات تمہیدی سمجھ اور اولین رضامندی پر اختتام پذیر ہو گئے۔ دونوں فریقین نے بہر حال حامی بھر لی کہ وہ ان معاملات کو اگلے برس حج کے موقع پر مزید آگے بڑھائیں گے۔ اس دن، مدینہ سے آنے والے وفد میں شامل بارہ کے بارہ سربراہان نے اس بابت ہاتھ ملا کر اطاعت کا عہد کرتے ہوئے محمدؐ کی ثالثی اور اسلام قبول کر لیا۔ کہنے لگے، 'ہم پیغمبر خدا کی فرمان برداری اور اطاعت کا اعلان کرتے ہیں اور ہم عہد کرتے ہیں کہ خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہیں بنائیں گے۔ ہم چوری نہیں کریں گے، زنا سے اجتناب برتیں گے، اپنی اولاد کو قتل نہیں کریں گے اور محمدؐ کے حکم سے نہیں پھریں گے۔' ان میں سے ایک نے زور دے کر اعادہ کیا، 'اگر ہم ایسا کریں گے تو یقیناً جنت کے حقدار ہوں گے اور اگر ہم اس عہد سے منہ موڑیں تو بے شک خدا ہمیں سزا دے یا معاف کر دے، یہ اس کی مرضی ہے۔'

مدینہ کے وفد کا مندرجہ بالا عہد اس کہانی میں ایک نئی طرز کی نشاندہی کرتا ہے۔ اب تک پیش آنے والے سارے معاملے کے محور میں تبدیلی کا اشارہ ہے۔ اس وفد نے یہاں نہ صرف خدا بلکہ محمدؐ کی بھی فرمان برداری اور اطاعت کا اعلان کیا ہے۔ یہ گیارہ برس قبل حرا کی پہاڑی پر نازل ہونے والی وحی کے بعد پہلا موقعہ تھا کہ جب محمدؐ صرف اور صرف ایک پیغمبر نہیں رہے تھے۔ بلکہ، اب وہ ایک رہنما بھی تھے اور انہوں نے مکہ کی اشرافیہ کے خدشات کے عین مطابق ایک سیاسی کردار سنبھال لیا تھا۔ پچاس کے پیٹے میں پہنچ کر، محمدؐ اب اسامی تحریک کو سیاسی بنیادوں بھی استوار کرنے کے قابل ہو چکے تھے۔

مدینہ کا وفد جب واپس لوٹا تو مکہ کا ایک شخص بھی ان کے ہمراہ تھا۔ اس کا نام مصعب تھا۔ محمدؐ نے خود چن کر مصعب کو مدینہ روانہ کیا تھا اور ذمہ داری سونپی تھی کہ وہ مدینہ کے لوگوں کو قرانی آیات کی تبلیغ اور تشریحات بیان کرے۔ مصعب نے یہ ذمہ داری احسن طریقے سے پوری کی۔ قرانی آیات میں اتحاد اور یگانگت کا جو رنگ تھا، اس نے مدینہ کے بٹے ہوئے قبائلیوں پر خوب اثر کیا اور جلد ہی اوس اور خزرج، دونوں قبیلوں کے کئی لوگوں نے اسلام قبول کر لیا۔

ایک طرح سے کہیں تو مدینہ، مکہ کے برعکس جلد تیار ہو گیا تھا۔ مکہ کے لوگوں کی طرح مدینہ کے باسی بھی واحدانیت کے صرف ایک حد تک قائل تھے۔ وہ مکہ کی ہی طرح 'اللہ' کو بطور برتر ذات مانتے آئے تھے مگر اس کے ساتھ منات کی بھی پوجا کرتے تھے۔ منات کعبہ میں نصب او تاروں، 'خدا کی بیٹیوں' میں سے ایک تھا۔ مگر مکہ کے برعکس چونکہ مدینہ کی معیشت کا انحصار حرم کی تحویل اور حج کی آمدن پر نہیں تھا، اس لیے اس شہر کے لیے خدائی او تاروں کو ترک کر دینا نسبتاً آسان تھا۔ اسی طرح، مدینہ میں مکہ کی طرح، قریش کی طرح قبائلی اور 'آباؤ اجداد کے طریق' جیسا بھی کوئی قضیہ نہیں تھا۔ بلکہ، ان کے لیے قران میں بیان کردہ قدیم روایت اور نسبت زیادہ برتر تھی۔ مدینہ کے لوگوں کے لیے اس قدیم روایت کو سمجھنا اس لیے بھی آسان تھا کیونکہ وہ پہلے سے ہی اس نسبت بارے سنتے آئے تھے۔ یعنی، مدینہ میں اوس اور خزرج کے قبائل کے ساتھ تین یہودی قبیلے بھی ایک عرصے سے بسر رکھتے تھے اور انہوں نے قدیم روایت کا پہلے سے یہاں پرچار کر رکھا تھا۔

آج کے جدید یہودیوں کے لیے شاید یہ حیرت کا باعث ہو مگر یہ سچ ہے کہ ساتویں صدی عیسوی میں خطہ حجاز میں یہودیوں کی کئی بستیاں تھیں۔ عرب و حجاز کے آج کے جدید سیاسی اور مذہبی منظر نامے میں یہ ناممکن نظر آتا ہے۔ یہ اسی طرح ہے جیسے آج مغربی ممالک میں عیسائی اس حقیقت کو جان کر حیرت میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ عیسائیت دراصل مشرق وسطیٰ سے تعلق رکھنے والا مذہب ہے۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ تب بازنطینی سلطنت کافی پھیلی ہوئی تھی۔ اور پھیلاؤ کا قصہ یوں تھا کہ سوائے جزیرہ نما عرب ہر طرف ہی اس کا بول بالا تھا۔ خطہ حجاز میں بھی اس کا اثر اس لیے کمزور تھا کہ یہ خطہ مرکز سے کافی دور اور پہاڑی سلسلوں کے باعث کٹ کر

واقع تھا۔ اسی وجہ سے اس دور میں حجاز کے سوا تقریباً مشرق وسطیٰ میں عیسائیوں کی حکمرانی تھی۔ یہ صرف ایک وجہ نہیں بلکہ اہم نکتہ ہے۔ نکتہ یہ ہے کہ بازنطینی سلطنت کی ریاست میں اعتقاد سیاست کا پیروکار بن چکا تھا۔ چنانچہ، عوامی حلقوں کے لیے عقلمندی کا ثبوت یہ تھا کہ اسی اعتقاد پر قائم رہا کریں جو طاقتور حلقوں کی ترجیح تھی۔ انتظام کا بھی یہ حال تھا اس وقت، بازنطینی دستے، ہرقل کی سپہ سالاری میں ایک بار پھر فارس پر سبقت قائم کرنے کے در پے تھے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جب یہ صورتحال عام تھی اور عیسائیت کا ہر طرف چرچا تھا، تب بھی یہودیت جوں کی توں جم کر باقی رہی۔ جہاں عیسائیت ریاست کا مذہب بن چکا تھا اور بوجوہ پھیل رہا تھا، وہیں ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ یہودیت سیاسی پشت پناہی کے بغیر بھی اس خطے کے طول و عرض میں پنپتی رہی۔ یہ نکتہ یہودیوں کے اپنے عقائد سے شدید لگاؤ کو ظاہر کرتا ہے۔

حجاز میں قریش نے یمن میں ماریب کے بند ٹوٹنے کے باعث مکہ کی طرف ہجرت کی تھی۔ مدینہ کے قبائل، اوس اور خزرج نے بھی اسی وقت قریش کے ساتھ سفر کیا تھا مگر بالآخر شمال میں مدینہ پہنچ کر قبضہ جما لیا تھا۔ جب قریش نے مکہ میں پڑاؤ ڈالا تو یہ صرف ایک بیابان اور متروک گھاٹی ہوا کرتی تھی۔ اس کے برعکس مدینہ میں حالات یکسر مختلف تھے۔ اس وقت مدینہ میں فلسطینی یہودیوں کی کئی نسلیں آباد تھیں۔ یہ فلسطینی یہودی مختلف ادوار میں کئی وجوہات کی بناء پر مشرق وسطیٰ کے طول و عرض میں ہجرت کر کے پھیل چکے تھے۔ ان کی سب سے نامور ہجرت دوسری صدی عیسوی میں پیش آئی تھی جب شمعون بار کوخبا کی سربراہی میں قائم یہودی ریاست میں ڈرامائی بغاوت اور غدر مچ گیا تھا۔ اس وقت، فلسطین سے ہجرت کرنے والے یہودی گروہوں میں سے اکثر نے حجاز کے خطے میں، ایک رو پر واقع نخلستانوں میں مستقل بسیرا کیا تھا۔ آج کے دور میں یہ پٹی دار علاقہ اردن اور شمال مغرب عرب پر مشتمل ہے۔ اس میں شمال سے جنوب کی طرف تبوک، تیما، خیبر اور مدینہ کے علاقے شامل ہیں۔ برس ہا برس کے بعد یہ یہودی عرب کے قبائلی اطوار میں اس قدر رنگ گئے کہ بظاہر ان پر خالص عربوں کا گماں ہوتا تھا۔ یہ بھی مقامی آبادیوں کی طرح خدا کو روزمرہ بول چال میں 'اللہ' کہہ کر پکارنے لگے تھے۔ ان میں سے اکثر کے نام بھی عربوں کی ہی طرح ہوا کرتے۔ مثال کے طور پر، اس دور کے یہودیوں میں 'عبد اللہ' نام بہت عام تھا۔ یہ حجاز کی عربی زبان بولتے تھے اور مقامی عرب رسم و رواج پر چل پڑے تھے۔ ان کے لباس اور ظاہری تراش خراش میں بھی کچھ خاص فرق نہیں رہا تھا، سوائے یہ کہ یہ اب بھی کٹر یہودیوں کی طرح زلف رکھتے تھے۔ مگر، یہ فرق بھی کچھ اتنا بڑا نہیں تھا کہ اس دور میں اس طرح کے چھوٹے موٹے فرق عرب قبائل میں بھی عام تھے۔ صرف ایک چیز تھی جو ان یہودیوں کو مقامی عرب آبادیوں سے ممتاز کرتی تھی۔ یہ ان کا خدا پر خصوصی دعویٰ ہوا کرتا تھا۔ خود خدا کی بجائے وہ اس بات پر مست تھے کہ ربانی ذات نے ان کے آباؤ اجداد سے کبھی کلام کیا تھا۔ ان کے پاس اس کا واضح ثبوت، ایک کتاب کی شکل میں موجود تھا۔

اس دور میں، جب چند ہی لوگ تھے جو پڑھ اور لکھ سکتے تھے۔ ایک کتاب کی حیثیت علامت، بت کی سی ہوا کرتی تھی۔ چرمی کاغذوں پر رقم کیے ہوئے الفاظ بڑائی کی کسی بھی دوسری حد سے بڑھ کر ہوا کرتے تھے۔ یہ مجموعے مقدس تصور کیے جاتے تھے اور ان کی دیکھ بھال بھی کچھ انہی خطوط پر نسل در نسل جاری رکھی جاتی تھی۔ یہی نہیں بلکہ عربوں کے لیے یہ غیر زبان، یعنی لاطینی میں رقم ہونے کے باعث خاصے پر اسرار بھی تھے۔ یہودیوں میں ہر قبیلے کے یہاں تورات کا اپنا قبائلی نسخہ ضرور ہی ہوتا تھا اور وہ اس کی کسی بھی دوسری شے، اثاثے سے بڑھ کر احترام کرتے اور پابوسی بجالاتے تھے۔ مقدس کتابوں جیسے تورات کے نسخوں کی آج بھی یہودیوں کے معبدوں میں اسی طرح تکریم کی جاتی ہے۔ یہودیوں کے لیے تورات اور عیسائیوں کے یہاں انجیل کے باعث ان دونوں ہی مذاہب کے پیروکاروں کو 'اہل کتاب' کہا جاتا تھا۔ لیکن، اب حالات تبدیل ہو چکے تھے۔ خدا عیسائیوں اور یہودیوں کے علاوہ عربوں سے بھی ہم کلام ہو چکا تھا۔ یہی نہیں بلکہ اب کی بار، جیسا کہ قران میں درج ہے، 'تمہاری اپنی زبان میں۔۔۔' مخاطب تھا۔ یعنی، خالص عربی زبان میں بول رہا تھا۔ یہی نہیں بلکہ قران تو تورات اور انجیل،

حتیٰ کہ اس وقت تک نازل ہونے والے تمام آسمانی صحیفوں کی نہ صرف تصدیق کر رہا تھا بلکہ اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر ان مقدس کتابوں کی جگہ لے رہا تھا۔ یہ گزشتہ تمام کتابوں سے بہتر اور مبینہ طور پر زمانے بھر کی اغلاط اور نقائص کی درستگی کا دعویدار بھی تھا۔

قران کو ابھی تک دوسری مقدس کتابوں کی طرح چرمی کاغذ پر تحریر نہیں کیا جاتا تھا اور اس سے کوئی خاص فرق بھی نہیں پڑتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ نازل ہونے والی ہر نئی وحی فوراً ہی یاد کر لی جاتی۔ یہ آیات اس قدر فصیح اور بلیغ زبان میں تھیں کہ ایک یا دو بار سننے پر سامع کے ذہن میں نقش ہو کر رہ جاتیں۔

ویسے بھی یہ جو دور تھا، اس میں ابھی تک لکھنے کا رواج عام نہیں ہوا تھا۔ لوگ ابھی تک حفظ کرنے کو لکھنے پر ترجیح دیا کرتے تھے۔ یہ لکھنے کا رواج تو طباعت اور چھپائی کے ساتھ، کافی عرصہ بعد عام ہوا ہے۔ لفظ صفحات کی بجائے یادداشت میں زندہ رہتے تھے اور پھر قرانی آیات میں تو صوتی ہم آہنگی اور لفظی تجنیس کثرت سے پائی جاتی تھی۔ ہر آیت صرف چند الفاظ نہیں تھے بلکہ یہ متوازن قافیوں اور دوہری تشبیہات پر مشتمل نہایت عمدہ کلام تھا۔ یوں، یاد کرنا اور بھی آسان ہو گیا۔

'اقراء'–یعنی، پڑھو۔ مراد یہ ہے کہ، الہامی آواز نے بھی پہلی وحی میں محمدؐ کو یہی حکم دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ لغوی معنوں میں قران کو با آواز بلند اور خوش الحانی سے پڑھنے پر زور دیا جاتا رہا ہے۔ ہر بار جب اس کی یوں تلاوت ہوتی، کوئی نہ کوئی سن رہا ہوتا اور یوں بار بار تلاوت کی جاتی تو ایک وقت آنے پر یہ سننے والی یادداشت میں پختہ ہوتا چلا جاتا۔ مدینہ میں مصعب نے یہی کام سرانجام دیا۔ الہامی پیغام جلد ہی عام ہو گیا اور زیادہ سے زیادہ لوگ قرانی آیات کے شیریں اور خوش الحان کلام کے دلدادہ ہوتے چلے گئے۔ نہ صرف یہ بلکہ زیادہ اہم یہ ہے کہ الہامی پیغام کی اصل یعنی، اتحاد اور یگانگت کے پیغام کو سمجھنے لگے، اس کے قائل ہو گئے۔

اس کا ثبوت یہ تھا کہ اگلے برس حج کے موقع پر، یعنی 622ء میں مدینہ سے آنے والے وفد میں بہتر کنبوں کے سربراہان موجود تھے۔ اتنی بڑی تعداد میں سربراہان کی ایک ساتھ موجودگی، ایک طرف تو مدینہ کے لوگوں کی سنجیدگی اور دوسری طرف محمدؐ کے الہامی پیغام کے پر اثر ہونے کا پتہ دیتی ہے۔ لیکن، اس کے باوجود اب بھی دونوں فریقین کو ایک دوسرے کی طرف سے یقین دہانی اور بھروسے کی اشد ضرورت تھی۔ اگر مدینہ کے لوگ محمدؐ کے ہاتھ پر بیعت کر کے، ان کو مکمل تحفظ اور اتحاد کا یقین دلا دیتے ہیں تو ان پر لازم ہو جاتا کہ وہ اس وعدے کو پورا کرنے کے لیے طاقت کے استعمال سے گریز نہیں کریں گے۔ یہی بات محمدؐ پر بھی لاگو ہوتی تھی۔ مکہ کے مومنین کے سربراہ کی حیثیت سے ان پر بھی مدینہ کے لوگوں کی حفاظت اسی طرح لازم ہو جاتی۔ پچھلے برس طے ہونے والا معاہدہ ادھورا تھا۔ اسی لیے یہ، 'عورتوں کا پیمان' کہلاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ ادھورا معاہدہ عورتوں کے مابین طے پایا تھا یا اس کا کسی طور عورتوں سے تعلق تھا۔ بلکہ اس لیے کہ اس وقت یہ معاہدہ دفاع کی غرض سے ایک دوسرے کے تحفظ دینے کی شق کے بغیر طے ہوا تھا۔ یعنی جنگ و جدل، دفاع اور اسلحے کا استعمال مردوں سے موسوم ہے۔ یہ معاہدہ جس طور بھی تھا، اسی وقت کامل ہو سکتا تھا جب دونوں فریقین ایک دوسرے کے دفاع کی بھی حامی بھر لیں۔ یعنی اس کو 'مردوں کا پیمان' بنا لیں۔

مدینہ کے وفد میں ابھی تک محمدؐ کی اس بابت قول و قرار اور وعدے کو لے کر بے چینی پائی جاتی تھی۔ چنانچہ اکثر نے زور دے کر پوچھا، 'اگر ہم یہ وعدہ کر لیں اور خدا آپؐ کو فتح بخشے، تو کیا ایسا تو نہیں ہو گا کہ وہ ہمیں چھوڑ کر اپنے لوگوں کے پاس واپس مکہ چلے جائیں گے؟' محمدؐ نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا، 'میں تمہارا ہوں اور تم میرے ہو۔ تمہارا دشمن میرا دشمن اور تمہارا دوست میرا دوست ہے'۔ یوں یہ معاملہ طے پا گیا۔ محمدؐ کا اب قریش یا مکہ سے کوئی واسطہ باقی نہیں رہا تھا۔ انہوں نے باقاعدہ طور پر اپنا تعلق مدینہ سے جوڑ لیا اور مدینہ کو ہی اپنی منزل بنا لیا۔ مدینہ کے لوگوں نے آپؐ کی حفاظت اور مدد کی قسم اٹھائی تھی، یعنی عربی میں 'نصر' کا وعدہ کیا تھا۔ اب مدینہ کے مومنین 'انصار' کہلائے جائیں گے۔ جبکہ دوسری طرف محمدؐ کے ساتھ جانے والے مکہ کے مومنین 'مہاجر' یعنی 'ہجرت کرنے والے' ہو جائیں گے۔

ایک کے بعد دوسرے، مدینہ کے وفد میں موجود ہر کنبے کے سربراہ نے محمدؐ کا ہاتھ تھام، بغل گیر ہو کر قسم اٹھائی کہ، 'ہم تم سے ہیں اور تم ہم سے ہو۔ تم یا تمہارا کوئی بھی ساتھی ہمارے پاس آئے گا، ہم اس کی اس طرح حفاظت کریں گے، جس طرح ہم اپنی حفاظت کرتے ہیں'۔ لیکن عملی طور پر یہ معاہدہ اس سے بھی کہیں بڑھ کر تھا۔ مثال کے طور پر، کئی برس بعد مدینہ کے ایک شخص نے اس روز کو یاد کر کے کہا، 'ہم نے در اصل یہ وعدہ کیا تھا کہ مدینہ کے لوگ رسول خدا کی سپہ سالاری میں جنگ تک کر گزریں گے۔ امن یا جنگ، سختی یا سکھی ہر دو حالتوں میں ان کی اطاعت اور فرمانبرداری کریں گے۔ کسی بھی قربانی سے گریز نہیں کریں گے۔'

622ء کے موسم گرما سے ہجری کیلنڈر کا آغاز ہوتا ہے۔ لفظ ہجری سے مراد 'ہجرت' لی جاتی ہے مگر عربی زبان میں اس لفظ کا ماخذ 'ہجر' ہے جس کے نفسیاتی اثر اور معنی کہیں گہرے ہیں۔ اس کا مطلب کسی چیز سے علیحدہ کر دینے، کاٹ پھینکنے کے ہیں۔ اس لفظ کے معنوں میں بل دینے والے درد کا احساس بھی شامل ہے، جو کسی شے کو کاٹ کر علیحدہ کرنے سے متعلق ہو سکتا ہے۔ اسی وجہ سے بعد ازاں قران بھی ہجرت کو بے دخلی کے معنوں میں بیان کرے گا۔ مثلاً یہ آیت جس میں کہا جائے گا کہ، '۔۔۔ ان کی روش یہ ہے کہ رسول کو اور خود تم کو صرف اس قصور پر جلاوطن کرتے ہیں کہ تم اپنے رب، اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔۔۔؟'۔

ایسے لوگ جو کسی مقام، جگہ سے گہری نسبت رکھتے ہوں۔ ان کے لیے اس طرح علیحدگی اور جدا ہونے کا امکان نہایت ہولناک ہو سکتا ہے۔ ایک طرح سے وہ خود کو اپنی ناڑ سے جدا کر رہے تھے۔ انہیں قبیلے اور کنبے، یہاں تک کہ اپنے خاندان تک کو چھوڑنا پڑ رہا تھا۔ پھر کعبہ سے الگ نسبت تھی۔ کعبہ کی مثال تو قطب ستارے کی تھی۔ یہ ان کا تعارف تھا۔ اسی کی بدولت تو وہ دنیا میں پہچانے جاتے تھے بلکہ اسی کی نسبت میں ان کی بقا تھی، نام تھا۔ چنانچہ، ہجرت کرنے والے ہر شخص کو اس کام کے لیے ہمت اور ایمان درکار تھا۔ یا شاید، اس طرح کی ہمت صرف اور صرف ایمان اور یقین کی بدولت ہی میسر آ سکتی ہے۔

محمدؐ کے کہنے پر مکہ کے مومنین نے مدینہ کے لیے ان سے پہلے ہی نکلنا شروع کر دیا۔ یہ چھوٹے گروہوں میں نکلتے تاکہ گرد و پیش میں دوسرے لوگوں کو شک نہ ہو۔ لیکن مکہ جیسے گنجان شہر میں بغیر اطلاع کے یوں ہی ایک روز نکل جانا ناممکن تھا۔ مومنین کے والدین، بہن بھائیوں اور دوسرے رشتہ دار فوراً ہی بھانپ گئے۔ وہ انہیں روکنے کی کوشش کرنے لگے۔ زبانی کلامی آمادہ کرتے یا پھر ضرورت پڑنے پر طاقت کا استعمال بھی کیا جانے لگا۔

مثال کے طور پر ایک مہاجر کی زبانی یہ واقعہ ملاحظہ ہو۔ 'جب ہم نے مدینہ جانے کا فیصلہ کر لیا تو ایک گروہ تشکیل دیا۔ اس گروہ میں ہم تین لوگ تھے۔ طے یہ ہوا کہ ہم اگلی صبح مکہ شہر سے چھ میل باہر جھاڑ دار جگہ 'اوت' پر ملیں گے اور پھر وہیں سے مدینہ کے لیے اکٹھے روانہ ہو جائیں گے۔ اگر ہم میں سے کوئی بھی شخص مقررہ وقت پر اس مقام تک نہ پہنچ سکا تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ اسے طاقت کے زور پر روک لیا گیا ہے اور باقی دو لوگ اس کے بغیر ہی اپنا سفر جاری رکھ سکتے ہیں۔ 'اگلی صبح ان میں سے صرف دو لوگ ہی طے کردہ مقام پر پہنچ پائے۔ تیسرے شخص کو راستے میں اس کے رشتہ داروں نے روک لیا تھا۔ روکنے والا اس کا چچا تھا اور اس کے ساتھ ابو جہل بھی موجود تھا۔ ابو جہل نے اسے کہا کہ اس کی ماں نے قسم اٹھائی ہے کہ اگر آج اس نے اپنے بیٹے کو نہ دیکھا تو وہ ساری عمر نہ تو باہوں میں کنگھی کرے گی اور نہ ہی صحرا کی دھوپ سے سایہ تلاش کرے گی۔ وہیں مر جائے گی۔ چنانچہ، وہ ان کے ہمراہ واپس ہو لیا۔ راستے میں انہوں نے اس کو گھیر لیا اور زمین پر گرا کر ہاتھ پاؤں سے باندھ لیا۔ پھر وہ اس پر تشدد کرنے لگے اور اسلام سے پھرنے کا حکم دیا۔ اس کے چچا نے کہا، 'یہ اسی طرح ہونا چاہیے۔ مکہ کے لوگوں کو چاہیے کہ اپنے بیوقوفوں کا دماغ یوں ہی ٹھکانے لگائیں جس طرح ہم نے اپنے اس بیوقوف کی درگت بنائی ہے۔'

اب تو عورتوں کے ساتھ بھی ناروا سلوک شروع ہو گیا۔ ام سلمہ کی مثال آج بھی عام ہے۔ یہ وہی خاتون ہیں جو بعد ازاں بیوگی کے بعد محمدؐ کی چوتھی منکوحہ بیوی ہوں گے۔ ام سلمہ کا واقعہ بھی خود ان کی زبانی روایت کا حصہ ہے۔ وہ بتاتی ہیں کہ کس طرح ان کے رشتہ داروں نے انہیں اونٹ پر سوار، اپنے شوہر اور نوزائیدہ بچے کے ہمراہ مکہ سے نکلتے دیکھا تو آگ بگولہ ہو گئے تھے۔ انہوں نے فوراً ہی اونٹ کو گھیرے میں لے لیا اور ان کے شوہر سے مخاطب ہوئے، 'تم جہاں چاہتے ہو چلے جاؤ لیکن خیال ذہن سے نکال دو کہ ہم اپنی بہن کو تمہارے ساتھ جانے دیں گے'۔

ام سلمہ مزید بتاتی ہیں، 'انہوں نے میرے شوہر کے ہاتھ سے اونٹ کی نکیل چھین لی اور مجھے کھینچ کر اس سے دور لے گئے'۔ اسی اثناء میں ان کے سسرال کے لوگ بھی آن پہنچے اور صورتحال مزید بگڑ گئی۔ اب جھگڑا یہ تھا کہ ام سلمہ کی بانہوں میں نوزائیدہ بچہ کس کی تحویل میں رہے گا؟ کیا اس پر ام سلمہ کے خاندان کا حق ہے یا یہ ان کے شوہر کے خاندان کی تحویل ہے؟ دیکھتے ہی دیکھتے دونوں اطراف میں کھینچ تان شروع ہو گئی اور 'وہ بچے کو گھسیٹنے لگے۔ جس کو دیکھو، بچے کو پکڑ کر اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ اسی دھکم پیل میں بیچارے کا گند حائل گیا۔ وہ درد سے بلبلا اٹھا۔'

آخر کار، ام سلمہ کے شوہر کے خاندان نے بچہ چھین لیا اور ام سلمہ کو ان کا خاندان اپنے ساتھ لے گیا۔ ان کے شوہر اکیلے رہ گئے اور انہیں چار و ناچار تنہا ہی مدینہ جانا پڑا۔ ام سلمہ اس روایت میں درد بھری آواز سمو کر کہتی ہیں، 'یوں، میں اپنے شوہر اور بچے سے علیحدہ کر دی گئی۔ میرے پاس سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں تھا کہ میں روز وادی میں آ کر بیٹھ جاؤں اور روتی رہوں۔' یہاں تک کہ دونوں اطراف میں لوگوں کے دل پسیج گئے۔ بتاتی ہیں کہ، 'تب میں نے اونٹ پر کاٹھی چڑھائی اور بچے کو اپنی بانہوں میں سمیٹ کر تھام لیا اور اکیلی ہی مدینہ کی طرف چل پڑی۔ بیابان راستے میں میرے ساتھ خدا کے علاوہ کوئی ذات نہیں تھی۔'

یہ ہجرت کیا معنی رکھتی ہے؟ ایک جوان مرد کو سبق سکھانے کے لیے سگے رشتہ داروں کے ہاتھ تشدد کا نشانہ بننا پڑتا ہے۔ ایک تن تنہا عورت کو شدید نفسیاتی اور جسمانی دباؤ کے بعد زخمی نوزائیدہ بچے کو ساتھ لیے تن تنہا ہی صحرا میں نکلنا پڑتا ہے۔ پیچھے رہ جانے والے خاندان کے افراد نڈر ہو کر بلا تامل انہیں روکنے کے لیے ہر حربہ استعمال کرتے ہیں۔ اور جب کچھ نہیں بن پڑتا تو بے بس ہو جاتے ہیں۔ پھر، جب جانے والے چلے جاتے ہیں تو اپنے پیچھے ایک مہیب خاموشی چھوڑ جاتے ہیں۔ کل یہیں تھے، آج نہیں ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے مر گئے ہوں۔ ہر جانے والے کے ساتھ شہر میں خالی پن کا اثر بڑھتا چلا جاتا ہے۔ یہ خلا اس وقت زیادہ شدت سے محسوس ہوتا ہے جب نامی گرامی لوگ جیسے عمر اور عثمان جو مکہ کی اشرافیہ سے تعلق رکھتے ہیں، بردبار اور سیانے لوگ ہیں، مکہ چھوڑ کر نکلتے ہیں تو اپنے پیچھے رہنے والوں کے لیے کئی سوال بھی چھوڑ جاتے ہیں۔ 622ء کے موسم گرما میں، ایک کے بعد دوسرا گھر یوں ہی خالی ہوتا گیا۔ متروک کر دیا گیا۔ صبح کے وقت لوگ کسی گھر کے قریب سے گزرتے تو اس کے کواڑ ہوا سے کھلے ملتے اور اندر سامان ویسے کا ویسا ہی دھرا، مکینوں سے خالی ملتا۔ وہ سمجھ جاتے کہ پچھلی رات یہ لوگ مکہ کو چھوڑ کر چلے گئے۔ وہ جان جاتے کہ یہ بھی محمدؐ کے پیروکار تھے۔ یوں اس برس، ستمبر کے مہینے تک مکہ شہر میں سے سینکڑوں مرد، عورتوں اور بچوں نے ہجرت کر لی۔

مکہ کے بااثر حلقوں میں سے چند افراد جیسے ابو جہل نے اب بھی جوں کا توں سخت رویہ روا رکھا تھا۔ مثال کے طور پر ایک محفل میں ناک سکوڑ کر بولا، 'کوئی شخص ان کے جانے پر آنسو نہیں بہائے گا'۔ لیکن لوگ رنجیدہ تھے تو روتے بھی رہے۔ محسوس ہوتا تھا جیسے کسی نے زبردستی ان کو اپنے پیاروں سے جدا کر دیا ہے۔ پورا شہر اس طرح سوگوار تھا جیسے ہر گھر میں موت واقع ہو گئی ہو۔ رفتہ رفتہ غم کے ساتھ غصہ بھی شامل ہو گیا۔ لوگ محمدؐ پر پیچ پا تھے جو اس رنج اور غم کے ذمہ دار تھے۔ محمدؐ کے لیے موزوں تو یہ تھا کہ وہ مدینہ جانے والے پہلے قافلے کے ساتھ ہی مکہ سے نکل جاتے مگر وہ مکہ میں آخری پیروکار کے حفاظت سے روانہ ہو جانے تک وہیں ٹکے رہنے پر بضد تھے۔ ان کو لاحق خطرات کے پیش نظر دو قریبی ساتھی، یعنی ابو بکر اور علی ان کے ساتھ مکہ میں ہی موجود رہے۔ لیکن پھر مہلت کا وقت ختم ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ معاملات سنبھالنے کا موقع ملتا، محمدؐ کو پناہ دینے والے عمر رسیدہ مطعم انتقال کر گئے۔ مدینہ پہنچنے سے قبل ہی تحفظ کا یہ سہارا بھی ہاتھ سے نکل چکا تھا۔

ابن اسحاق لکھتے ہیں، 'قریش دیکھ سکتے تھے کہ پیغمبر خدا نے اپنی تمام تر وفاداریاں ان کے قبیلے اور علاقے سے بھی باہر جوڑ لی تھیں اور ان کے پیروکار نئی جگہ پر منتقل ہو رہے تھے۔ وہ اب ان کے حملوں سے محفوظ ہو چکے تھے۔ بعد اس کے، ڈر یہ تھا کہ محمدؐ اپنے ماننے والوں کے پاس مدینہ چلے جائیں گے اور نئے اتحادیوں کے ساتھ مل کر مکہ پر حملہ کر دیں گے۔ اس سے پہلے وہ صرف متفکر رہا کرتے تھے، اب وہ پہلی بار محمدؐ سے خوفزدہ بھی تھے۔ چنانچہ اس بابت تجار کو نسل جو قبیلے کے اہم معاملات کو دیکھا کرتی تھی، فوراً جمع کر لیا گیا۔ 'قریش کے خدشات اپنی جگہ پر بجا تھے۔ محمدؐ نے جس طرح مکہ کے سماجی ڈھانچے پر کاری ضرب لگائی تھی، اس کے بعد کون جانتا تھا کہ اب ان کا اگلا قدم کیا ہو گا؟'

یہ خدشات اپنی جگہ مگر اس وقت مکہ میں جنگ کے خطرات کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا جا رہا تھا۔ ابن اسحاق کی تصانیف کو بھی دیکھیں تو وہ واضح طور پر مستقبل کو ماضی کے تناظر میں بیان کرنے کی کوشش میں نظر آتے ہیں۔ مکہ کی اشرافیہ نے مدینہ کے لوگوں کو کبھی سنجیدہ نہیں لیا تھا۔ ان کے نزدیک مدینہ کے دو بڑے قبائل اوس اور خزرج آپس میں گتھم گتھا ہو کر سوائے اپنا، کسی دوسرے کا نقصان نہیں کر رہے تھے۔ پھر، یہ بھی تھا کہ محمدؐ نے معاہدے کے مطابق مدینہ کی حفاظت اور دفاع کی ضرورت پیش آنے پر مسلح جدوجہد کی حامی تو بھر لی تھی مگر اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا کہ اب یقیناً ہی مکہ اور مدینہ کے بیچ فوراً جنگ چھڑ جائے گی۔ مدینہ کی کل آبادی تقریباً مکہ کے برابر تھی، یعنی دونوں ہی شہر پچیس سے تیس ہزار نفوس پر مشتمل تھے مگر یاد رہے، مدینہ کے لوگ صرف دہقان تھے۔ ان کی گزر بسر زراعت پر تھی اور وہ مکہ کی طرح سیاسی اور ریاستی معاملات سے نابلد تھے۔ وہ تیز طرار اور جنگجو نہیں تھے۔ یہ تو صرف مدینہ کا احوال ہے۔ محمدؐ خود بھی تو آج تک عدم تشدد کا پرچار کرتے آئے تھے۔ بلکہ عملی طور پر بھی انہوں نے مکہ میں تشدد کا جواب عدم تشدد سے ہی دیا تھا، جو واضح طور پر ایک کاری ہتھیار ثابت ہوا تھا۔ چنانچہ، جس جنگ و جدل بارے مکہ کی اشرافیہ تجار کونسل میں جمع ہو کر سوچ بچار کر رہی تھی، وہ ہتھیاروں کی نہیں بلکہ نظریات کی جنگ تھی۔

محمدؐ نے دیکھتے ہی دیکھتے روایتی قبائلی نظام کے تصور کو بدل کر رکھ دیا تھا۔ وفاداری اور شناخت کو آباؤ اجداد سے علیحدہ کر کے ایک برتر ذات، قدیم ترین روایت سے جوڑ دیا تھا۔ لیکن، اب تک ان کا یہ نظریہ ایک اصولی موقف سمجھا جاتا تھا اور اب وہ اس موقف سے نکل کر باقاعدہ عمل پر اتر آئے تھے۔ یہی نہیں وہ اس مقصد میں پوری طرح کامیاب ہو رہے تھے۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ نئے لوگ ان کی عملی تحریک کا حصہ بنتے جا رہے تھے۔ اب اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ حالات کو اس نہج پر پہنچانے میں خود قریش کا بھی، بڑا ہاتھ تھا۔ جس طرح کے مخالفانہ حربے وہ استعمال کرتے رہے ہیں، اس کے بعد بالآخر ایسا ہو رہنا کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی۔ بلکہ، حقیقت یہ ہے کہ قریش نے محمدؐ کو ان اطوار پر عمل کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس تلخ حقیقت کو جانتے ہوئے بھی، قریش کا خیال یہ تھا کہ مدینہ کے ساتھ دفاعی معاہدہ در اصل مکہ کے لوگوں کے ساتھ دغابازی تھی اور تجار کونسل کے اجلاس میں محمدؐ پر اب غداری اور بغاوت کے الزام بھی دھر دیے گئے۔

قریش کے ایک کنبے کا سربراہ چاہتا تھا کہ اس جرم کی پاداش میں محمدؐ کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا جائے۔ اس نے تجویز دی، 'اس کو گرفتار کر کے زنجیروں سے باندھ دو۔ پاؤں میں بیڑیاں ڈال کر بند کر دو اور اس کو وہیں مرنے کے لیے چھوڑ دو۔' اس نے آخری نکتے، یعنی مار دینے پر زور دیا۔ لیکن، دوسرے لوگ اس تجویز پر راضی نہیں تھے کہ ان کے خیال میں یہ بازی واپس پلٹ سکتی تھی۔ مکہ میں ابھی تک بڑی تعداد میں لوگوں کی ہمدردیاں محمدؐ کے ساتھ تھیں اور اگر انہوں نے جیل، جہاں محمدؐ کو رکھا جاتا، اس پر حملہ کر دیا اور انہیں چھڑا لے گئے تو پھر اس صورت میں تجار کونسل کی کل اختیار کی حیثیت کیا رہ جائے گی؟

ایک دوسرے شخص نے اپنی تجویز کی یوں وکالت شروع کی کہ، محمدؐ کو نہ صرف مکہ بلکہ حجاز سے بھی بے دخل کر دیا جائے۔ کہنے لگا، 'کیوں نہ ہم اسے ہم بے دخل کر دیں اور اس کا اس پورے خطے میں داخلہ ممنوع قرار دیں۔ ہماری بلا سے وہ حجاز کے علاوہ جہاں چاہے اپنا ٹھکانہ کرے۔ وقت کے ساتھ اب تک ہو رہے نقصان کا ازالہ بھی ہو جائے گا اور یہاں سماجی رواداری بھی بحال ہو جائے گی'۔ مگر ایک بار پھر، یہ تجویز بھی رد کر دی گئی۔ جوابی دلیل یہ آئی کہ محمدؐ اپنی مسحور کن قرانی آیات کے بل بوتے پر فوراً ہی خانہ بدوش قبیلوں کے دل جیت لیں گے اور مکہ بدو قبائل کے حملے کی زد میں آ جائے گا۔ کہا گیا، 'وہ ان بدوؤں کو ہمارے خلاف جمع کر لے گا اور اس طرح ہمیں نیست و نابود کر سکتا ہے۔ ہمارے ہاتھوں سے اختیار اور طاقت چھن جائے گا اور ہمارے ساتھ من چاہا سلوک کرے گا'۔

جب ایک کے بعد دوسری اور بالآخر ساری ہی تجاویز رد ہو گئیں تو ابو جہل سے کہا گیا کہ وہ ایک ایسا حتمی پلان تشکیل دے جو سب کے لیے قابل قبول ہو۔ ایسا حربہ، جس سے مقصد بھی پورا ہو جائے اور اس میں عوامی اشتعال کا بھی احتمال نہ ہو۔ ابو جہل نے سوچ کر کہا، 'سوائے بنی ہاشم، قریش کے ہر کنبے سے ایک جوان، مضبوط اور نجیب الطرفین شخص کا انتخاب کرو۔ اس گروہ کی ذمہ داری یہ ہو گی کہ وہ ایک ساتھ، جتھے کی شکل میں محمدؐ پر حملہ کریں اور ایک ساتھ وار کر کے اسے قتل کر دیں۔

اگر وہ ایک ساتھ، ایک ہی جہت میں حملہ کریں گے تو محمدؐ کا خون تمام کنبوں کے ذمہ لکھا جائے گا اور بنی ہاشم کسی بھی صورت پورے قریش سے انتقام لینے کا سوچ بھی نہیں سکیں گے۔ وہ خون بہا لینے پر مجبور ہو جائیں گے۔'

ابو جہل کی تجویز بجا طور پر اس ستم ظریفی کو ظاہر کرتی ہے جو مشرق کا خاصہ ہے۔ یہ تجویز آگتھا کرسٹی کے مشہور ناول کا پلاٹ معلوم ہوتی ہے جس میں کئی لوگ کچھ اس طرح مل جل کر ایک شخص کو قتل کرتے ہیں کہ آخر کار قانونی طور پر کوئی ایک شخص ذمہ دار نہیں ہوتا بلکہ شہر بھر قاتل ٹھہرتا ہے۔ اگر قریش کے کئی اشخاص محمدؐ کے قتل میں ملوث ہو جاتے تو پھر کوئی ایک شخص اس کا ذمہ دار نہ ہوتا اور یوں انتقام کا اصول ایک مذاق بن کر رہ جاتا۔ دوسری طرف آپؐ کے کنبے کا یہ حال تھا کہ اس کے نئے سربراہ ابولہب یا 'شعلے کا باپ' کی بھی دلی خواہش یہی تھی۔ اس کے نزدیک دوسرے کنبے بنی ہاشم پر احسان کر رہے تھے۔ اس نے پہلے ہی محمدؐ کو کنبے سے بے دخل کر دیا تھا اور اب اگر قریش آگے بڑھ کر ان کا قتل کر دیتے ہیں تو اس میں بھی کنبے کا مالی فائدہ تھا۔ وہ محمدؐ کے عوض خوشی سے 'دیہ' یا خون بہا وصول کر سکتا تھا۔ اس تجویز کے مطابق قریش کے تمام کنبے، محمدؐ کی موت کے بعد خون بہا میں برابر حصہ ڈال لیتے اور یوں نہ صرف محمدؐ سے چھٹکارا مل جاتا بلکہ اس کے ساتھ اس کے نتائج بھی کسی ایک شخص کو بھگتنے کی ضرورت نہیں تھی۔

گو یہ نہایت سوچی سمجھی سازش تھی مگر اس کے باوجود اس کے خاکے میں ایک بنیادی نقص تھا اور یہ کوئی چھوٹا موٹا جھول بھی نہیں تھا۔ عیب یہ تھا کہ یہ کام جس قدر رازداری اور اخفا کا متقاضی تھا، قریش نے اتنے ہی زیادہ لوگوں کو شامل حال کر لیا۔ چنانچہ، اس سازش کی خبر پھسل جانا کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی۔ محمدؐ کو اس رات حملے سے قبل ہی اس گھناؤنی سازش کی خبر پہنچ گئی۔ اگر ان تک یہ خبر کسی انسان نے نہ بھی پہنچائی ہو، روایت کے مطابق جبرائیل اطلاع لے کر پہنچ ہی گئے۔ چنانچہ، محمدؐ نے فی الفور اپنے دیرینہ ساتھی ابو بکر کو ہمراہ چلنے کا عندیہ دے دیا۔ دوسری طرف آپؐ کے چچازاد علی نے رضاکارانہ طور پر اپنے آپ کو قریش کے ساتھ مکر کرنے، یعنی گھر میں آپؐ کی موجودگی کا دھوکہ دینے کے لیے پیش کر دیا۔ صبح سویرے، اجالا پھوٹنے سے قبل جب قریش کے لوگ تلواریں اور خنجر سونت کر ان کے گھر کے باہر ان کے معمول کے مطابق باہر نکلنے کا انتظار کر رہے تھے، آپؐ گھر کے پچھواڑے میں نہایت خاموشی سے رات کی تاریکی میں نکل گئے اور خیر و عافیت سے ابو بکر کے ساتھ پہلے سے طے کردہ مقام پر جا پہنچے۔

جب صبح کی پہلی لو پھوٹی تو گھر کے اندر سے علی برآمد ہوئے۔ انہوں نے محمدؐ کی چادر اوڑھ کر، منہ کو بھی ڈھانپ رکھا تھا۔ جوں ہی قریش کے لوگ حملے کے لیے آگے بڑھے تو علی نے پردہ ہٹا لیا۔ تقریباً سب ہی حملہ آور بے یقینی میں ایک ساتھ چلا اٹھے، 'تمہارا ساتھی کہاں ہے؟'

علی نے اطمینان سے جواب دیا، 'کیا تم مجھ سے ان کی نگرانی کی توقع رکھتے ہو؟ تم ہی چاہتے تھے کہ وہ چلے جائیں۔ وہ چلے گئے ہیں'۔ علی کی اس ادائے بے نیازی پر، وہاں موجود قریش کا ہر شخص علی کو قتل کرنے کے درپے تھا مگر پھر ہائے مایوسی، چار و ناچار انہیں وہاں سے ناکام لوٹنا پڑا۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ علی کو قتل کرنے سے بالضرور ہی قصاص لاگو ہو جائے گا اور ان میں سے ہر شخص کو اپنی گردن دے کر اس کا ازالہ کرنا پڑے گا۔ ان لوگوں کے طور دیکھ کر علی کسی حد تک سہم گئے تھے مگر پھر انہوں نے خود کو سنبھالا۔ اس دن کے بعد وہ بمشکل چند روز ہی مکہ میں موجود رہ سکے، جس دوران انہوں نے محمدؐ کے چند ضروری تجارتی اور ذاتی معاملات طے کیے اور پھر تن تنہا، پیدل ہی مدینہ کی طرف روانہ ہو گئے۔

قریش کی تجار کونسل ایک بار پھر جمع ہو گئی اور انہوں نے فوراً ہی محمدؐ کا پیچھا کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس فیصلے کے تحت محمدؐ کو زندہ یا مردہ، کسی بھی حالت میں مکہ واپس لانے والے شخص کے لیے سو اونٹنیوں کے انعام کا بھی اعلان کیا گیا۔ لیکن، محمدؐ اور ابو بکر پہلے سے ہی جانتے تھے کہ قریش ان کو اپنے گھر میں نہ پا کر اسی طرح کی چال چلیں گے۔ وہ جانتے تھے کہ قریش سب سے پہلے شمال کی جانب مکہ سے مدینہ کی جانب ان کو تلاشیں گے۔ چنانچہ، وہ بجائے شمال، جنوب کی طرف پانچ میل دور نکل گئے اور یمن کی طرف جانے والی جنوبی تجارتی شاہراہ پر واقع ثور کی پہاڑی پر ایک اونچے غار میں پناہ لے لی۔

اس غار میں پیش آنے والے واقعات اسلامی قصائص میں ایک ممتاز حیثیت اختیار کر لیں گے۔ ویسے بھی، اس طرح کے معاملات میں غاروں کا ذکر آتے ہی تقدیس اور عقیدت کی علامتی گونج سنائی دینے لگتی ہے۔ ایسا ہمیشہ سے ہی ہوتا آیا ہے۔ یہ تاریخی لحاظ سے نہایت دلچسپ بات ہے کہ اگرچہ اوائل دور کے انسان کی ہمیشہ سے غاروں میں بسر رہی تھی مگر اس کی ان کے ساتھ حقیقی انس اور نسبت افلاطون کی مشہور تصنیف، 'تمثیل غار' کے بعد باقاعدہ ایک رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ یہ تصنیف انسانی سوچ کو پرچھائیوں یعنی باطن اور حقیقت یعنی ظاہر کے بیچ جھولتی، کھیلتی ہوئی دکھاتی ہے۔ لیکن غاروں سے منسوب داستانیں دنیا بھر میں اتنی کثرت سے مل جاتی ہیں کہ اکثر ان پر آفاقی ہونے کا گماں ہوتا ہے۔ ہر جگہ یہ ایک سی ہی، ایک ہی طرح سے بھائی دیتی ہیں۔ اگر آپ کا جھکاؤ فرائیڈ کی طرف ہے تو آپ یقیناً جانتے ہوں گے کہ اس کے مطابق بھی غار صرف ایک غار نہیں بلکہ علامتی طور پر ایک رحم یا بچہ دان کی حیثیت رکھتا ہے۔ تصور اور بیحد دقیق تخیل، جیسے مافوق الفطرت حالات میں اسی بات کو سمجھنے کے لیے کیے تو غار کی مثال ایک ایسی محفوظ جگہ کی لی جا سکتی ہے جہاں پناہ لینے والا شخص بے فکری سے نیند پوری کر سکتا ہے، خواب دیکھتا ہے اور باہر کی دنیا میں واپس آنے سے قبل تسلی سے بیٹھ کر، جتنی دیر چاہے اور سوچ اور تخیل کی نئی منازل طے کر سکتا ہے۔ ہر دو صورت غار صرف ایک پناہ گاہ نہیں بلکہ اس کی حیثیت احتیا یا حضانت کی ہوتی ہے۔ یہاں بسر کرنے والے کی شخصیت میں نئی سوچ اور ستھرا خیال پنپتا ہے۔

ابو بکر کے لیے ثور کی پہاڑی پر واقع یہ غار ایمان اور یقین کی تجدید اور احیا ثابت ہو گا۔ انہیں خوف لاحق تھا کہ قریش انہیں اور محمدؐ کو یہاں ڈھونڈ نکالیں گے۔ لیکن محمدؐ نے ان کو یقین دلایا کہ خدا ان کی حفاظت کر کے رہے گا۔ دوسری طرف، محمدؐ کے لیے یہ غار روحانی استحکام اور الہام کے نزول کی جگہ بن جائے گا۔ قران کی یہ آیات، "جب وہ دونوں غار میں تھے، جب وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا کہ، 'غم نہ کر، اللہ ہمارے ساتھ ہے۔' اس وقت اللہ نے اس پر اپنی طرف سے سکون قلب نازل کیا اور اس کی مدد ایسے لشکروں سے کی جو تم کو نظر نہ آتے تھے۔۔۔'۔ یہ تو قرانی آیات ہیں، دوسری طرف روایت یہ ہے کہ ان کی مدد کو قدرتی طاقتیں بھی آن پہنچیں۔

ابن اسحاق اس واقعہ کو یوں بیان کرتے ہیں کہ کیسے تیسرے دن، جب پیشہ ور جاسوسوں اور قاتلوں نے اب اپنی تلاش کا دائرہ وسیع کر لیا تھا اور بالآخر غار ثور تک پہنچ آئے تھے، اس وقت ہزاروں کی تعداد میں مکڑیوں نے غار کے دہانے پر جالا بن دیا۔ دہانے پر مکڑی کے جالوں کی اس قدر موٹی تہہ دیکھ کر تلاشنے والوں نے سوچا کہ اس غار میں سالوں سے کوئی داخل نہیں ہوا ہو گا۔ چنانچہ، وہ اس غار میں جھانکے بغیر ہی آگے نکل گئے اور آج ہمارے لیے اس وقت کی ایک مبہم سی تصویر چھوڑ گئے، جس میں ہم تصور کی آنکھ سے دیکھ سکتے ہیں کہ غار کے دہانے پر مکڑی کے جال تنے ہوئے ہیں اور اندر گھپ اندھیرے میں محمدؐ اطمینان سے بیٹھے ہیں اور ابو بکر قدرت کو یوں مدد کرتے دیکھ کر ورطہ حیرت میں مبتلا ہیں۔

بہر حال، جب یہ خطرہ ٹل گیا تو ابو بکر نے پہلے ہی اپنے ایک بھروسہ مند غلام کو اونٹ اور راہ دکھانے والا کھوجی تیار رکھنے کا حکم دے رکھا تھا۔ وہ محمدؐ کو ساتھ لیے مقررہ مقام پر اس کے پاس جا پہنچے۔ یہ تین اشخاص احتیاطاً ایک لمبا راستہ اختیار کرتے ہوئے مدینہ کی طرف سفر پر نکل پڑے۔ پکڑے جانے کے خطرے سے بچنے کے لیے انہوں نے نیم دائرے کی شکل میں راہ اختیار کی۔ پہلے تو وہ جنوب کی طرف چلتے گئے جہاں سے وہ مغرب کی طرف مڑ کر بحیرہ احمر کے ساحل پر جا پہنچے۔ پھر وہاں سے شمال کی جانب چلتے گئے، یہاں تک کہ ایک بار پھر پہاڑی سلسلے کے قریب پہنچ گئے۔ چست اور تیز اونٹوں پر سوار ہونے کے باوجود یہ سفر دس دن میں طے ہوا اور ستمبر کے مہینے میں چوبیسویں تاریخ کو مدینہ کے مضافات میں پہنچ گئے۔

ابن اسحاق لکھتے ہیں کہ، 'دوپہر کے وقت جب سورج بالکل سر کے اوپر آن پہنچا تو گرمی کی شدت بڑھ کر ناقابل برداشت ہو رہی تھی۔ مہاجرین ہر روز صبح روشنی پھوٹتے ہی مدینہ کی حدود پر آ کر بیٹھ جاتے اور سارا دن محمدؐ کی راہ دیکھتے رہتے۔ اب چونکہ گرمی بڑھ رہی تھی تو وہ تھک ہار کر نخلستان میں باغات کی طرف لوٹ گئے تھے، تاکہ گرمی سے بچاؤ کر سکیں، کھجور کے درختوں تلے تھوڑی دیر تک سستا لیں۔ اسی تپتی ہوئی دوپہر میں دور سے محمدؐ کو آتا دیکھنے والا انصار یا مہاجرین میں سے

نہیں بلکہ مدینہ کے یہودیوں میں سے ایک شخص تھا۔ وہ محمدؐ کو دیکھتے ہی خوشی سے چلا اٹھا، 'اوس اور خزرج، تمہاری خوش قسمتی آن پہنچی ہے۔' پھر اس نے یوں ہی چلاتے اور شور مچاتے، واپس مدینہ کی طرف دوڑ لگا دی'۔ اس وقت یہ شخص نہیں جانتا تھا کہ جلد ہی وہ اور مدینہ کے سارے یہودی اپنے ان الفاظ پر پچھتایا کریں گے۔

باب:13

محمدؐ کے مدینہ پہنچنے کی خبر فوراً ہی پھیل گئی۔ لوگ خیر مقدم کرنے کے لیے ایک دوسرے کو پیچھے چھوڑتے، دوڑتے ہوئے اس راستے پر پہنچ گئے جہاں آپؐ اپنی سواری پر بیٹھے چلے آ رہے تھے۔ مومنین کی خوشی دیدنی تھی۔ ایک کے پیچھے دوسرا اور پھر مدینہ کا تقریباً ہر شخص آگے بڑھ کر آپؐ کو اپنے یہاں ٹھہرنے کی دعوت دینے لگا۔ کئی تو ایسے تھے جو باقاعدہ مہمان نوازی کا موقع فراہم کرنے کی بھیک مانگ رہے تھے۔ محمدؐ نے سب کو ٹال دیا۔ اس کی بجائے کہنے لگے کہ اونٹنی جہاں ٹھہرے گی وہ وہیں پڑاؤ ڈالیں گے۔ چنانچہ اس کی مہار کھلی چھوڑ دی گئی۔ اونٹنی خراماں چلتی ہوئی نخلستان کے وسط میں پہنچ گئی اور ایک پتھریلے احاطے میں ٹہلنے لگی۔ پہلے پہل یہ جگہ قبرستان ہوا کرتی تھی مگر اب یہاں کھجوریں خشک کی جاتی تھیں۔ اونٹنی آہستگی سے جھکی اور پہلے اگلی ٹانگوں کا بکل مار کر اور پھر پچھلی ٹانگیں بھی سمیٹ کر جھولتی ہوئی وہیں بیٹھ گئی۔ تسلی سے بیٹھنے کے بعد وہ ارد گرد ہجوم کو یوں تاڑنے لگی جیسی کہتی ہو، 'بس یہیں اور کہیں نہیں'۔

جس طرح ثور کی پہاڑی میں غار کے دہانے پر جن مکڑیوں نے جالے بن دیے تھے، ویسے ہی یہ اونٹنی بھی ولایت اور بزرگی سے مالا مال مخلوق کا درجہ پالے گی۔ لوگ کہا کریں گے، اس اونٹنی نے خدا کی منشاء بتائی تھی۔ بہر حال، جب اونٹنی ٹھہر گئی اور محمدؐ نیچے اتر آئے تو اصولی طور پر ہجرت مکمل ہو گئی۔ اسلام نے مکہ میں جنم لیا تھا مگر اس کا جھولا مدینہ ہو گا۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں اسلام جوان ہو گا اور دیکھتے ہی دیکھتے دنیا کے منظر نامے پر ایک مضبوط، انتہائی تیزی سے پھیلنے والا مذہب بن جائے گا۔ اسی دن سے اسلامی دور، یعنی ہجر سے ہجرت اور پھر ہجری کلینڈر کا آغاز ہوتا ہے اور تاریخ میں یہیں سے محمدؐ اور ان کے مکہ کے پیروکاروں کے انتظار کے شب و روز کی بھی شروعات ہوتی ہے۔ انہیں مکہ کی گھاٹی میں دوبارہ داخل ہونے کے لیے سات سال کے طویل عرصے تک دن اور رات کرنا ہو گا۔

کھجوریں سکھانے کے لیے استعمال ہونے والا یہ پتھریلا احاطہ جہاں اونٹنی آ کر ٹھہر گئی تھی، دو یتیم لڑکوں کی ملکیت تھا۔ ان لڑکوں کا تعلق خزرج قبیلے کے اسی کنبے سے تھا جس کی ایک عورت کی کوکھ سے محمدؐ کے دادا عبد المطلب نے جنم لیا تھا۔ ان لڑکوں کی کفالت اور دیکھ بھال ان کے چچا کے ذمے تھی۔ محمدؐ اور ان لڑکوں کے بیچ خون کے تعلق، یتیمی اور پھر ایک ہی طرح چچا کے ہاں کفالت کی یہ نسبت اور محمدؐ کے مدینہ میں پڑاؤ ڈالنے کے انوکھے ڈھنگ اور مبینہ مشیت ایزدی، یعنی اسی احاطے میں اونٹنی کے ٹھہرنے پر لوگ خاصے متاثر نظر آ رہے تھے۔ پھر جس کنبے سے یہ لڑکے تعلق رکھتے تھے وہ خزرج کا نسبتاً غریب اور غیر موثر گھرانہ تھا۔ ان سے زمین خریدنے کا فیصلہ اس لیے بھی بہتر تھا کہ اس طرح خزرج اور اوس کے نامی گرامی اور بڑے کنبوں کا مہمان نوازی قبول نہ کرنے کا گلہ جاتا رہتا اور چھوٹے کنبوں کو برابری کا احساس الگ سے ہوتا۔ اس موقع پر لڑکوں کے چچا نے اصرار کیا کہ آپؐ یہ زمین تحفے میں قبول کر لیں اور وعدہ کیا کہ وہ اپنی جیب سے یتیم لڑکوں کو قیمت ادا کر دے گا۔ محمدؐ نے نہ صرف یہ قبول کر لیا بلکہ بعد ازاں یقینی بنایا کہ وہ یتیموں کو قیمت بھی ادا کرے۔ اس طرح یہ معاملہ یوں ہی آسانی سے طے پا گیا۔ اس روز نخلستان کے بیچوں بیچ ایک اجاڑ مقام پر بسنے والا یہ ڈیرہ اب ماننے والوں کی دنیا کا مرکز بن جائے گا۔

سب ماننے والے، جن میں انصار اور مہاجرین سب ہی شامل تھے، مل کر اس جگہ پر اگلے چند ماہ میں جو عمارت کھڑی کی وہ حیران کن طور پر سادہ تھی۔ یہ مٹی کی چار دیواری کے اندر ایک وسیع احاطہ تھا۔ یہاں جنوب کی طرف دیوار کے ساتھ کچھ حصہ کھجور کے پتوں سے ڈھک کر چھت ڈال دی گئی تھی، جس کے نیچے تیز دھوپ میں بمشکل سایہ اور سستانے کے لیے جگہ بن گئی تھی۔ مشرقی دیوار کے ساتھ رہنے اور سونے کے لیے کھجور کے تنے، پتوں اور گندھی ہوئی مٹی سے چند کمرہ نما

جھونپڑے کھڑے ہو چکے تھے۔ کسی بھی طرح سے اس عمارت میں رعونت اور آرائش کا کوئی سامان نہیں تھا۔ عبادت گاہوں، خانقاہوں اور مساجد میں آرائش و زیبائش اور جملہ غرور کے لوازمات کا رجحان بہت بعد میں، جب اسلام ایک سلطنت کا مذہب بن گیا تھا، اس کے بعد ہی پروان چڑھا۔ مساجد رفتہ رفتہ اسی رنگ میں ڈھلتی گئیں جو قدیم زمانے سے کنیساؤں اور کلیساؤں کا خاصہ رہا ہے۔ پھر، ان عمارتوں کا مقصد عبادت کے ساتھ ایک کمیونٹی سینٹر یا اجتماع کی جگہ کا بھی رہا ہے۔ بلکہ، یہودیوں کی عبادت گاہ کنیسا کے لیے انگریزی میں استعمال کیا جانے والے لفظ کا ماخذ بھی یونانی زبان سے ہے جس کا مطلب 'ایک جگہ پر جمع ہونے' یا 'اجتماع' کے ہیں۔ قدیم زمانوں سے یہی طور ہے۔ یعنی، یہ عبادت اور اجتماع، دینی اور دنیاوی، ہر طرح کے معمولات کا ایک ہی جگہ پر اور ایک ہی وقت میں متوازی انداز میں چلانے کا عملی نمونہ ہیں۔ اگر دیکھیں تو صرف یہی جگہیں ہیں جہاں ایک طرف سیکولر اور دوسری جانب مذہبی معاملات ایسے گھل مل سکتے ہیں کہ دنیا کا نظام نہایت آرام سے چل سکتا ہے۔ برداشت اور ہم آہنگی، جس کی آج کے دور میں اشد ضرورت ہے، یہاں ممکن ہو سکتی ہے۔ بہر حال، مدینہ میں قائم ہونے والی اس مسجد کا ایک گوشہ ایسا بھی تھا جس سے آج جدید مسلمان واقف تو ہیں مگر اس وقت یہاں کے معمولات، طور آج کل کی مساجد سے مختلف رہا تھا۔ یہ گوشہ محراب یا منبر کی جگہ تھی، جس کا رخ ابھی تک کعبہ کی طرف نہیں بلکہ 'بات کے سفر' کے شہر یروشلم کی طرف تھا۔ عیسائی اور یہودی بھی اسی شہر میں واقع معبد کی طرف منہ موڑ کر عبادت کیا کرتے تھے۔

مدینہ میں پہلا سال مہاجرین کے لیے بہت سخت اور جان توڑ ثابت ہوا۔ ان میں سے زیادہ تر نے زندگی میں پہلی بار اتنی سخت مشقت کی تھی۔ یہاں انہیں بسر کرنے کے لیے جان توڑ مزدوری کرنی پڑ رہی تھی۔ چونکہ ان لوگوں کا تعلق شہری علاقے سے تھا، اس لیے پٹھے جفاکشی کی عادت سے عاری تھے، جلد ہی چور ہو جاتے تھے۔ ان کے مسائل یہیں تک محدود نہیں تھے بلکہ زراعت، مال برداری اور تعمیرات کا کام بھی ان کے لیے بالکل نیا تھا۔ اس کام کو درست طریقے سے سر انجام دینا تو دور کی بات، سیکھنے میں بھی شدید مشکلات پیش آ رہی تھیں۔ تمام تر مصائب کے باوجود بہر حال اب کہیں جا کر، کئی برسوں کے بعد مہاجرین کی زندگیوں میں نسبتاً آسانی اور سکون پیدا ہو گیا تھی۔ وہ یہاں دستیاب پیشوں کی سختی اور مشقت، ان معاملات میں اپنے بھونڈے پن پر خود ہی ہنسا کرتے۔ ایسی ہی ایک کہانی علی کے بارے مشہور ہے۔ کہا جاتا ہے، علی کچی مٹی سے اینٹیں بنانے کی کوشش میں کیچڑ سے لت پت ہو رہے تھے۔ ان کے کپڑے اور جسم، یہاں تک کہ چہرہ اور بال بھی مٹی سے اٹ رہا تھا۔ محمدؐ نے انہیں اس حالت میں دیکھا تو ہنس پڑے اور چوٹ لگائی، 'اے، ابو تراب!' یعنی، 'اے، دھول کے باپ!' اور یوں علی ابو تراب کے نام سے مشہور ہو گئے۔ جو بھی تھا، ان جسمانی سختیوں کا سامنا، بہر حال کسی طور آسان نہیں تھا۔ نتیجتاً، لوگ بیمار پڑنے لگے اور مشقت کے باعث جسمانی طور پر تھکن کا شکار بن گئے اور ناتواں ہوتے چلے گئے۔ بہادری سے پرانی روایت کو توڑنے کا اعلان کر کے عہد باندھنا اور خود کو نئی زندگی کے حوالے کرنا ایک بات تھی مگر اس نئی زندگی کو تمام تر تقاضوں کے ساتھ ہر روز جینا، اس کو برداشت کرنا دوسری ہوا کرتی ہے۔ وقت کے ساتھ ان کی ہمت جواب دیتی جا رہی تھی۔

ان حالات میں صرف ایک شے تھی کہ جس نے حوصلے کو بلند اور انہیں یکجا رکھا۔ یہ اس زندگی سے جڑی وہ معنویت تھی جو الہامی پیغام اور اس طرز کے ساتھ جڑی ہوئی تھی۔ یہ لوگ مکہ کی پر آسائش اور آسان زندگی چھوڑ کر مدینہ میں مشقت اٹھا رہے تھے۔ وہ یہاں نئی تعمیرات نہیں کر رہے تھے یا صرف نئے گھر نہیں بنا رہے تھے۔ وہ تو در اصل ایک نئے سماج کی بنیادیں ڈال رہے تھے جس میں لوگوں کی نئی پہچان اور جدید اطوار، بہتر رسم و رواج اور سادہ طریق زندگی کے اصول وضع ہونے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا، جس میں آنے والے دور کے لیے، بلکہ ہر نئے دور اور دورانیے میں لوگوں کی ایک دوسرے سے نسبت کی نئی طرح ایجاد ہو رہی تھی۔

گو آج جدید دنیا کے سیاسی منظر نامے پر یہ بات خاصی عجب اور مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ ساتویں صدی عیسوی میں مدینہ میں ہونے والی یہ ترقی، یعنی شہری طبقے کا یوں آسائش اور آرام ترک کر کے ایک نئی دنیا بسانے کا تجربہ حالیہ دور میں فلسطین کے اندر یہودیوں کی نو آبادی سے خاصی مشابہت رکھتا ہے۔ اس آبادی میں سے بھی بڑی تعداد کا تعلق شہری علاقوں سے تھا جو یورپ سے یہاں لائے گئے تھے۔ یہ بالکل ویسا ہی، یکجا ہونے اور متحد سانجھ داری کا تصور تھا جس میں

لوگ جسمانی مشقت اور ذمہ داریوں کے ساتھ ایک مقصد اور سمجھ میں جڑے ہوئے تھے۔ ان کو یہاں تک لانے والے رہنما نو آبادی اور مساوات انسانی کو ماننے والے مثالیت پسند تھے۔ ان رہنماؤں نے عوام میں ایک جذبہ یگانگت اور باہمی مفاد عامہ کو پھیلا دیا اور نتیجہ یہ نکلا کہ وقت کے ساتھ یہ تصور نہ صرف بڑھ کر ریاست اسرائیل کی بنیاد بن گیا بلکہ آج دنیا بھر کے یہودی اسی کے بل بوتے پر قدیم روایت میں اپنی جڑیں تلاشتے ہوئے اسی خطے میں کہیں نہ کہیں سے تعلق نکال ہی لاتے ہیں۔ یہی حال اس وقت مدینہ کا بھی تھا۔ خدا اور آدمی کے ہم سر، ایک آواز ہونے کے تصور سے سرشار، انوکھے رنگ میں رنگ کر اوائل دور اسلام کے مسلمانوں کا یہ مختصر گروہ، جسمانی اور اعصابی مشقت سے بے نیاز ہو کر اس نئی دنیا کو بسانے میں جت گیا تھا۔ ان کے اسی طریق کو بعد میں جدید یہودیت یا قبالہ میں 'تیکون اولام' پکارا جائے گا۔ تیکون اولام سے مراد، 'دنیا کی درستگی' یا 'دنیا کی تعمیر نو' ہے۔ محمدؐ اور ان کے پیروکار، زندگی کے ہاتھوں ستائے جانے اور اپنوں کے یہاں رد کر دیے جانے کے بعد اب ایک نئی دنیا بسانے کی راہ پر چل نکلے تھے۔

جلد ہی، مدینہ میں یہ نئی گٹھ جوڑ ایک کمیونٹی کی بجائے خاندان کا منظر پیش کرنے لگے گی۔ محمدؐ نے لوگوں پر زور دیا کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ اپنوں جیسا سلوک کریں۔ تاکید دی گئی کہ انصار مکہ سے آنے والا مہاجرین کو اپنا لیں۔ وہ انہیں مہمان کے طور پر نہیں بلکہ بھائیوں اور بہنوں کی طرح ساتھ بسالیں۔ یہی نہیں بلکہ یہاں عمر، رتبے اور قبیلے، یہاں تک کہ جگہ پیدائش کا بھی کوئی امتیاز روا نہ رکھنے کا حکم دیا گیا۔ اس طرح کی اصلاحات سے صرف ایک نیا قبیلہ نہیں بلکہ اس سے بھی کہیں بڑا اجتماعی ڈھانچہ تشکیل پا رہا تھا۔ ایسا ڈھانچہ جس کا ابھی تک انہیں کوئی نام بھی نہیں سوجھ رہا تھا، بلکہ ابھی اس نئے طرز معاشرت اور زندگی گزارنے کے طریقے کو تعریف کی رو سے اسلامی طرز معاشرت اور اس طور گزر بسر کرنے والوں کو مسلمان بھی نہیں کہا جاتا تھا۔ یہ سب تو بہت بعد کی بات ہے، اتنی کہ خود محمدؐ کے وصال کے بعد کا قصہ ہے۔ جب اسلام پورے مشرق وسطیٰ میں پھیل کر ایک باقاعدہ ادارے کی شکل اختیار کر گیا، تب ہی کہیں جا کر باقاعدہ اسلامی طرز معاشرت اور مسلمان کی اصطلاحات مشہور اور مقبول ہو گئیں۔ یہ مدینہ کی وہ شناخت ہے جو ان دنوں میں پروان چڑھی تھی۔ مدینہ کی یہ نئی آبادی ابھی تک خود کو صرف مومنین کہلواتی تھی جس کا مطلب ماننے والوں کا ہے۔ مومن اور مومنین کی یہ اصطلاحات، ان کو یوں یکجا رکھے ہوئے تھیں۔ ایمان کی دولت سے سرشار، یقین کی حدوں کو چھوتے ہوئے یہ لوگ رفتہ رفتہ ایک نئے، نہایت برتر اور خوب سماج کی بنیاد ڈال رہے تھے۔

اس سب کے باوجود، شاید دنیا میں ابھی تک ایسی کوئی دوا ایجاد نہیں ہوئی ہے جو جلاوطنی اور متروک کر دیے جانے کے دکھ کا مرہم کر سکے۔ ہجر کے بعد گھر اور پیاروں کی یاد ہمیشہ باقی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ لوگ جو اپنی من مرضی سے چھوڑ جاتے ہیں، وہ بھی کسی نہ کسی طرح پیچھے رہ جانے والوں کی یاد سے جڑے رہتے ہیں۔ چنانچہ، مہاجرین جب ایک ذرہ بھر سکون سے ہو گئے تو پہلے پہل صرف مکہ سے آنے والی خبروں کی طرف متوجہ ہوئے۔ وہ مدینہ کے نخلستان میں بس تو گئے تھے مگر وہاں رہتے ہوئے بھی اپنے دل پسند شہری کھانوں کی تلاش میں سرگرداں رہتے۔ پھر، جب مزید وقت گزر گیا تو یہ حال ہو گیا تھا کہ مہاجرین، قدرتی طور پر ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے۔ گو اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اب ان میں کوئی تفریق باقی نہیں رہی تھی مگر اس کا ایک دوسرا بڑا سبب وطن کی نسبت تھی۔ وہ مکہ کی یاد تازہ کرنے، گزرے دنوں کا حال سنانے، ایک دوسرے کا دل بہلانے، بات کرنے، ایک دوسرے کی طرف چلے آتے۔ ان میں اکثر ایسے تھے جو شاید مکہ میں رہتے ہوئے اپنی امارت کے غرور میں یہاں آئے کئی لوگوں سے بات کرنا بھی پسند نہ کرتے، مگر ہائے ہجر، وائے جلاوطنی۔۔۔ دکھ جو سانجھے تھے تو کیا کرتے؟ پھر، یہ صرف یاد وطن تو نہیں تھی۔ مالیخولیا بھی نہیں تھا کہ انہیں یہاں آئے ابھی تھوڑا سا ہی تو عرصہ ہوا تھا۔ بات یہ تھی کہ اس طرح میل ملاپ، بات چیت، ایک دوسرے کو دیکھ لینے اور دکھ بانٹنے سے ہجر کا دکھ کم ہو جاتا تھا۔ وطن کو چھوڑنے، پیاروں کو یوں ترک کر دینے کی خفت قدرے کم ہو جاتی تھی۔ وہ سوچا کرتے، یہاں مستقل بس رہنا تو صرف قسمت کا کھیل ہے۔ کیا خبر وقت کے ساتھ، وہ مدینہ کے دیہاتی طور طریقوں میں ڈھل ہی جائیں گے یا شاید ایسا نہ ہو پائے؟ مگر ایسی صورتحال میں، جب انہیں زبردستی جلاوطن کر دیا گیا تھا۔ وہ اپنی خوشی سے تو یہاں نہیں آئے تھے۔ انہیں بے دخل کر دیا گیا تھا، جیسے چیر الگا کر کسی عضو کو جدا

کر دیا جاتا ہے۔ تو، مکہ کی یاد عود کر دل میں ابھرنے لگتی تھی۔ ذہن سوچ کر ہی ماؤف ہو جاتا، یاد اتنی بڑھ جاتی کہ حالت غیر ہونے لگتی۔ ایسا لگتا جیسے ایک دیو کسی بونے کو پکڑ کر زمین پر پٹخ رہا ہے۔

آج جدید دور میں اسی طرز کی ہجرت، یعنی فلسطین میں یہودیوں کی نو آبادی پر ایڈورڈ سعید نے لکھا تھا کہ، 'جلاوطنی کسی آدمی اور آبائی علاقے کے بیچ آنے والی ایسی دراڑ ہے جس کا کوئی حل نہیں ہوتا۔ اس دراڑ میں آدمی اپنے آپ اور اصلی گھر کے بیچ معلق ہو کر رہ جاتا ہے'۔ جلاوطنی کی وجوہات، زیادتی اور اس کے نتیجے میں جھیلی جانے والی تکالیف کا احساس وقت کے ساتھ مدھم نہیں بلکہ گہرا ہوتا چلا جاتا ہے۔ دل پر بوجھ اس طرح بڑھتا ہے جیسے لوہے کو زنگ گھیر لے اور ایک وقت ایسا آتا ہے کہ یہ احساس وہیں قید ہو کر سخت ہو جاتا ہے۔ صرف زنگ باقی رہ جاتا ہے۔ معاملہ لاینحل ہو جاتا ہے۔ گرچہ، جلاوطن ہونے والے لوگ نئی زندگی کی شروعات تو کر لیتے ہیں۔ اپنے لیے ایک نئی دنیا بھی بسا لیتے ہیں مگر وہ جگہ جو پیچھے رہ گئی تھی، اس کی حیثیت بدستور وطن اور اپنا ملک کی رہتی ہے۔ خوشحال اور آسودہ مستقبل کی تمام تر امیدوں کا محور ہمیشہ وہی گزشتہ مکان، بیت چکے زمانے رہتے ہیں۔ وہ ماضی میں مستقبل تلاشتے ہیں۔ خوشحالی کا پیچکس کرتے رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر، یہ صرف ایک جلاوطن ہی ہو سکتا ہے جس کے لیے قدیم زمانے کا فلسطین ایسی جگہ ہے جہاں دودھ اور شہد کی نہریں بہتی ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بائبل کے عبرانی نسخوں کے کاتبین نے کس طرح تشریحات اور تشبیہات سے ایک پتھریلی وادی جس میں کانٹوں اور خاردار جھاڑیوں کی کثرت ہے، ایک ایسی جنت بنا کر پیش کر رکھا ہے، جو ان کے تصور کی مرہون منت ہے اور حقیقت کا اس سے دور دور تک کوئی واسطہ نہیں ہے۔ اسی طرح جلاوطنی اور ہجر میں بسر کرتے ہوئے کئی معمولی چیزیں ایسی بھی ہیں جو یادداشت میں امر ہو چکی ہیں اور بالآخر، اس سرزمین کی نہ صرف نشانی بن گئیں بلکہ نسل در نسل آبائی وطن سے گہرے تعلق کی نشانیاں بھی قرار پائیں۔ جیسے صحن میں لیموں کا درخت، زیتون کے جنگل اور وہ سخت مگر سادہ زندگی جو اب باقی نہیں رہی تھی۔ یہ چھوٹی چھوٹی نشانیاں تصور میں اتنی پختگی سے بیٹھ گئیں کہ دوسری اور تیسری صدی عیسوی کے یہودی ربیوں نے تخیل کے زور پر یروشلم کے معبد کی وہ تصویر بنا رکھی ہے، جو اصل معبد، جسے رومیوں نے تہس نہس کر دیا تھا، آج جدید دور میں بے پناہ ترقی کے بعد بھی، عشر عشیر نہیں ہے۔

مدینہ میں گزارے ہجرت کے اوائل برسوں کے دوران ہجرت کا احساس یوں بھی بڑھ کر محسوس ہوتا تھا کہ آبادی میں ابھی تک مہاجرین اور انصار کے نام پر امتیاز باقی رکھا گیا تھا۔ ایسا ایک سوچ کے تحت کیا گیا تھا۔ یہاں مہاجر، یعنی وہ لوگ جو مکہ سے ہجرت کر کے آئے تھے اور انصار سے مراد مدد کرنے والے مدینہ کے لوگ تھے۔ اس نظام تسمیہ کا مقصد یقین کو قائم رکھنا تھا۔ ہر دو میں سے ایک فریق کی اپنی شناخت، اہمیت برقرار رکھنا مقصود تھا۔ پھر یہ ایمان اور قدیم روایت سے جوڑنے کا معاملہ بھی تھا۔ یعنی یہ کہ قرآن میں بھی عیسیٰ کے بارہ حواریوں کو انہی ناموں سے پکارا گیا تھا۔ جیسے تب، ویسے آج بھی مکہ اور مکہ سے جڑی نسبت، ہجرت اور ہجر سے جڑے احساس سے وہی قدیم روایت، ایمان اور ویسا ہی تسلسل قائم رکھنا لازمی تھا۔

سعید آگے چل کر لکھتے ہیں کہ، 'جلاوطنی اختیار کرنے والوں کا دکھ انوکھا ہوتا ہے۔ اس کی مثال ایسے ہے جیسے کوئی یتیمی سے دوچار ہو۔' یہ استعارہ محمدؐ پر لاگو کریں تو ان کو درپیش شدید تکلیف دہ اور چبھن کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔ مہاجرین میں سے ہر شخص، اب جا کر ہجر کی وجہ سے یتیمی کا مزہ چکھ رہا تھا۔ اپنے اہل و عیال، والدین سے دوری، کنبے اور قبیلے کے لیے انجان بن کر جی رہا تھا مگر محمدؐ کے لیے تو یہ کئی دہائیوں پہلے پیش آنے والا معاملہ تھا کہ وہ پیدا ہونے سے پہلے ہی یتیم ہو گئے تھے۔ ان کا دکھ تو اب کئی گنا بڑھ چکا تھا۔ انہوں نے تو اس استعارے کا سب کچھ یعنی یتیمی اور ہجر، دونوں ہی دیکھ رکھے تھے۔ ایک وقت تھا جب محمدؐ کو مکہ کو گھر بنانے کے لیے سخت جدوجہد کرنی پڑ رہی تھی۔ پھر مکہ میں ان کے لیے اپنے گھر کا سامان ہو گیا تو یہ بھی ہوا کہ وہی گھر ان سے آن کی آن میں چھن گیا۔ پیارے چل بسے اور گھر تہس نہس ہو گیا۔ ایک لحاظ سے محمدؐ کے لیے یہ نقصان اٹھانا لازم بھی تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عادت اور معمولات کے مطابق چیزوں کو دیکھنے، معاملات کو چلاتے رہنے اور معمول کی سوچ سے نکلنے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ اس گھن چکر سے باہر نکلا جائے۔ مکہ میں اپنی جگہ اور حیثیت پانا اور پھر اسی مکہ سے زبردستی نکال باہر

کر دیا جانا یقیناً تکلیف دہ رہا تھا، یہ اس داستان کا ایک حصہ ضرور ہے مگر پوری کہانی نہیں ہے۔ پوری کہانی میں تو یہ محمدؐ کے ساتھ پیش آنے والی سب سے اچھی چیز معلوم ہوتی ہے۔

دوسری طرف مکہ کے لوگوں کے لیے محمدؐ اب قطعاً غیر تھے۔ ان کا مکہ سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ لیکن اگر مکہ کی اشرافیہ یہ سوچ کر سکھ کا سانس لے چکی تھی کہ بالآخر رات کی تاریکی میں جلاوطن ہو کر محمدؐ کا قصہ تمام ہو چکا ہے تو یقیناً وہ غلط تھے۔ بلکہ، محمدؐ ان کو جلد ہی ایک بار پھر غلط ثابت کر دیں گے۔ بظاہر ہجرت کا معاملہ محمدؐ کی کمزوری محسوس ہوتا ہے مگر آخر کار یہ ان کی طاقت بن جائے گا۔ اگر اس وقت مکہ میں یہ سمجھا جا رہا تھا کہ محمدؐ کو جلاوطنی پر مجبور کرنے سے انہیں شکست دے دی گئی ہے تو وہ صریحاً غلط فہمی کا شکار تھے۔ یہ شکست تو جلد ہی فتح میں بدلنے والی تھی۔

محمدؐ کی عمر اب ترپن سال ہو چکی تھی۔ داڑھی اور سر کے بالوں میں چاندی جھلک رہی تھی۔ لیکن ارادوں کو دیکھیں تو دور تک کسی کمزوری، بڑھاپے اور عمر رسیدگی کا شائبہ بھی نہیں تھا۔ انہیں اس عمر میں پہنچ کر بھی بمشکل ہی نیند کی حاجت محسوس ہوتی تھی۔ وہ سارا دن دوسرے مہاجرین کے ساتھ، انہی کی طرح شدید مشقت اور سخت مزدوری کے کام کرتے اور راتیں جاگ کر عبادت، مراقبے میں بسر کرتے۔ قرانی آیات بدستور نازل ہو رہی تھیں مگر اب یہ تھا کہ ان میں سے زیادہ تر مخصوص معاملات کے بارے ہوا کرتی تھیں۔ ایسا ہونا قدرتی تھا۔ مومنین کی آپس میں اتصال اور نسبت، ایک نئی مگر انوکھی طرز کی معاشرت کے باعث مدینہ کے دوسرے لوگ خاصے متاثر ہوئے اور جوق در جوق اسلام قبول کرنے لگے۔ جلد ہی انصار کی تعداد مہاجرین سے بڑھ جائے گی۔ ہر نئے دن کے ساتھ مومنین کی بڑھتی ہوئی تعداد اور اس نئے سماجی ڈھانچے میں پیش آنے والے معاملات کے باعث رہنمائی کی گزارشات بھی اسی مطابقت سے بڑھتی جا رہی تھیں۔ چنانچہ جلد ہی قرانی آیات عبادت کے اوقات سے لے کر جائیداد اور ازدواجی مسائل، الغرض ہر طرح کے معاملات پر محمدؐ کو مومنین کی درخواستوں پر طویل اور تفصیلی جواب دیتی نظر آنے لگیں۔ یہ معاملہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے نیویارک کے ایک سابق گورنر ماریو کیومو نے کہا تھا، 'تحریک شاعری اور حکومت نثر کے زور پر چلا کرتی ہے۔'

یہاں تک پہنچ کر محمدؐ اب صرف الہامی آواز سن کر اسے آیات میں ڈھال، آگے پیش نہیں کرتے تھے۔ بلکہ انہوں نے اس کے ساتھ جینا، اس کے طور کو سمجھنا شروع کر لیا تھا۔ وہ در پیش مسئلے یا معاملے پر مراقبہ کرتے اور پھر آواز کا انتظار کرتے کہ رہنمائی کیا کرے۔ جلد ہی اس متعلق آیت نازل ہو جاتی۔ قرانی آیات میں اب زیادہ تر مومنین کے آپس میں اور دوسرے لوگوں کے ساتھ تعلقات، معاملات اور معمولات پر زور دیا جانے لگا۔ اسی زمانے کے یہی اصول آگے چل کر محمدؐ کے ہاتھوں اسلامی شریعت کے قوانین کی بنیادی شکل اختیار کر لیں گے۔ دوسری طرف مدینہ کے قبائل نے انہیں ثالثی کے لیے مدعو کیا تھا۔ اس ضمن میں محمدؐ نے ایک سال کے اندر ہی ایک ایسا خاکہ بنا لیا تھا جو اس مقصد، یعنی مدینہ کو در پیش تنازعات کو حل کرنے کی پوری صلاحیت رکھتا تھا۔ مگر، یہاں بھی محمدؐ نے اوس اور خزرج کے تنازعات کا صرف حل پیش کرنے کی بجائے کہیں بڑے مقصد کے حصول کی جانب توجہ مرکوز رکھی۔ وہ اس خاکے میں عقیدہ توحید یا واحدانیت میں انفرادی اور اجتماعی، ہر طرح کے تنازعات کا حل پیش کر رہے تھے۔

'توحید' یا 'واحدانیت' کی اصطلاح سے مراد ایک خدا میں ایمان ہے۔ زبان میں یہ اصطلاح سترہویں صدی عیسوی تک اس شکل میں موجود نہیں تھی جیسی کہ آج ہم اس کو جانتے ہیں۔ مثلاً، انگریزی زبان میں پہلی بار یہ مشہور فلسفی ہینری مور نے استعمال کی تھی مگر یاد رہے واحدانیت کا ایک جامع اور موافق تصور معلوم تاریخ میں دو ہزار سال سے موجود ہے۔ تاریخ دان جیمز کیرول ایک جگہ پر نشاندہی کرتے ہیں کہ وہ یہودی کاتب جنہوں نے پہلی بار عبرانی بائبل تحریر کی تھی اور یہ تقریباً چھٹی عیسوی قبل از مسیح کی بات ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب یہودی بابل شہر سے بے دخل کر دیے گئے تھے۔ انہوں نے بھی 'ایک خدا' کے تصور سے مراد کسی یکتا ذات سے زیادہ انسانوں کے بیچ ایکائی لی ہے۔ قدیم یہودیت میں مشہور مقدس ذات، یعنی 'یہوہ' یا 'الہ یہوہ'، جس کو ساری اسرائیلی اقوام کا خدا کہا جاتا ہے، اسی سے 'الہوم' نکلا ہے، جس سے مراد ہر شے کا خدا ہے۔ یہ وہی خدا ہے جس کو مکہ میں 'الہ' یا 'اللہ' پکارا جاتا تھا۔ کیرول وحدانیت کے اسی قدیم اور خاصے وسیع تصور کے

بارے کہتے ہیں کہ،'اس تصور میں انسانوں کے ایک گروہ کا خدا، تمام انسانوں کا خدا ہے اور اس کا کسی بھی طرح سے صرف ایک گروہ، کنبے، قبیلے یا قبیلوں کے گروہ سے تعلق نہیں ہے بلکہ وہ ہر شے کا خدا ہے۔ 'اس طرح، خدا 'ہر قسم کے اختلافات میں مفاہمت'، 'ایکائی' کی علامت بن جاتا ہے۔

اس خاکے میں محمدؐ نے وحدانیت کے انہی قدیم تصورات کو عملی سیاست میں متعارف کرایا تھا۔ یعنی، تصوریت اور عملیت کو یکجا کر دیا تھا۔ یہ ایک منجھے ہوئے سیاست دان کی نشانی ہے۔ مراد یہ ہے کہ آپؐ نے ثالثی کا ایک ایسا عملی خاکہ پیش کیا تھا کہ جس میں روایت کے عین مطابق قبائلی اصول کو استعمال میں لاتے ہوئے قبیلوں سے کہیں بڑی سوچ واضح ہوتی تھی۔ کچھ تاریخ دان اس خاکے پر تیار کردہ معاہدے کو بڑی دھوم دھام سے 'مدینہ کا آئین' قرار دیتے ہیں لیکن اس کو کچھ بھی نام دے لیں، یہ اپنے وقت کے حساب سے نہایت غیر معمولی دستاویز تھی۔ ایک طرف تو اس میں مشترکہ دفاع کا عہد شامل تھا جس کے تحت مدینہ کے دیرینہ اور خون ریز تنازعات کا حل ممکن تھا اور دوسری جانب اسی دستاویز میں وہ مجموعہ قوانین پیش کیے گئے تھے جن کے تحت معہ شناخت کو اصول بنا دیا گیا تھا۔ اس اصول کے تحت تمام کنبے اور قبائل اکٹھے ہو کر ایک شناخت، یک جان بن سکتے تھے۔ انہیں جوڑا جا سکتا تھا۔ عملی طور پر اس مجموعہ قوانین کا مطلب یہ تھا کہ مدینہ کا نخلستان یوں ایکا کر لے گا کہ جو بعد میں اسلام کی اساس یعنی 'امہ' یا 'امت' کہلائے گا۔ امہ یا امت سے مراد ایک ہی طرح کا گروہ، لوگ یا قوم ہے۔ وسیع تر، آفاقی معنوں میں اس کا مطلب گروہوں، لوگوں یا اقوام کا ایکا، اتحاد یا ایک سماج ہونا ہے۔ عملی طور پر اس تصور یعنی ایکائی کے نظریے کی دوڑ بہت دور تک جاتی ہے۔

اس معاہدے کا آغاز کچھ یوں ہوتا ہے کہ، 'یہ دستاویز محمدؐ، پیغمبر خدا کی جانب سے پیش کی جا رہی ہے جو تمام مومنین کے بیچ تعلقات کی دیکھ بھال کر رہے ہیں۔ مومنین میں مہاجرین اور انصار شامل ہیں اور وہ بھی شامل ہیں جو اس وفاقیت میں ان کے ساتھ کھڑے ہیں۔ یہ سب ایک سماج ہیں اور دوسروں سے ممتاز ہیں۔' یاد رہے، یہاں 'ایک سماج' سے مراد امہ یا امت ہے۔

اسی طرح، '۔۔۔ اور وہ بھی شامل ہیں جو اس وفاقیت میں ان کے ساتھ کھڑے ہیں' سے مراد اوس اور خزرج کے علاوہ لوگ ہیں۔ ان میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جنہوں نے ابھی تک اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ علاوہ ازیں اس زمرے میں مدینہ کے یہودی قبائل بھی شامل ہیں، جن کا ذکر ان کے کنبوں اور قبیلوں کا نام لے کر کیا گیا ہے۔ واضح طور پر لکھا گیا کہ، توحید کو ماننے والے 'یہودی بھی مومنین کے ساتھ اسی سماج کا حصہ ہیں' اور ان کو بھی 'امہ' کا حصہ قرار دیا گیا۔ پھر آگے آتا ہے کہ، 'اس دستاویز میں شامل تمام لوگ کسی بھی حملے کی صورت میں ایک دوسرے کی مدد کریں۔ وہ لازمی طور پر باہمی مشاورت اور صلاح سے کام لیں۔'

اس معاہدے کے تمام فریقین پر ایک دوسرے کی خون ریزی پر فی الفور پابندی لگا دی گئی تھی بلکہ واضح طور پر یوں ممانعت کی گئی کہ، 'کسی بھی اختلاف یا تنازعہ کی صورت میں، جس سے تباہی اور جنگ و جدل کا اندیشہ نکلتا ہو، صلاح اور حل کے لیے اللہ اور اللہ کے رسول سے رجوع کیا جائے گا۔' اس کا مطلب یہ ہے کہ، 'اگر معاہدہ کرنے والے فریقین کو امن قائم کرنے کا کہا جائے تو وہ بالضرور امن قائم کریں گے اور اس امن کو ہر قیمت پر برقرار رکھنا ان کے لیے لازم ہو گا'۔ یہاں امن قائم کرنے کا کہنے والا سے مراد محمدؐ ہیں جو اس معاہدے کے کفیل اور ضامن مقرر ہوئے تھے۔ پھر ایک شق ایسی تھی کہ جس کے دور رس اثرات متوقع تھے۔ وہ یوں ہے کہ، 'معاہدہ کرنے والے تمام فریقین پر لازم ہے کہ وہ مدینہ پر حملے کی صورت میں ایک دوسرے کی مدد کریں گے۔' اس وقت مدینہ پر کسی بھی بیرونی حملے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ مدینہ کو صرف اندرونی حالات سے کئی خطرات لاحق تھے۔ یعنی قبائل میں جنگ و جدل اور لڑائی عین ممکن تھی۔ چنانچہ، اس وقت اس شق کو صرف حسب نسخہ، معاہدے کی معیاری زبان سمجھا گیا جو قبائل کے باہمی تعلقات اور اتحاد کو اجاگر کرتی تھی۔

اس معاہدے پر اگر کسی قبیلے یا کنبے کے سردار کو اعتراض تھا تو بھی اس نے وقتی طور پر ان دھڑکوں اور شبہات کو دبا دیا۔ وجہ یہ تھی کہ وہ مدینہ میں ہر قیمت پر ہم آہنگی اور امن کی فضا قائم کرنا چاہتے تھے۔ وہ برابری اور انصاف کے خواہاں تھے اور جس طرح مومنین کو ایک گروہ یا سماج قرار دیا گیا تھا، ان کے نزدیک یہ مدینہ کے تمام دھڑوں اور قبائل کے بیچ دیرپا امن کی کنجی ثابت ہو سکتی تھی۔ چنانچہ انہوں نے اس معاہدے پر فوراً ہی دستخط کر کے مہریں ثبت کر دیں۔ یہ خلاف قیاس ہے

کہ وہ اس معاہدے سے جڑے امکانات اور اختیارات کے کم ہو جانے سے بے بہرہ رہے ہوں گے۔ یعنی، اس معاہدے کے تحت مدینہ میں ہر طرح کا سیاسی اور انتظامی ڈھانچہ اگرچہ کالعدم تو نہیں ہوا تھا مگر پھر بھی، قبائلی سرداروں کی حکومت اور اختیار ختم ہو کر رہ گیا تھا۔ اسی طرح، اگر وہ اس معاہدے کے دور رس نتائج سے آگاہ نہیں بھی تھے تو کم از کم محمدؐ کو اس کا پوری طرح ادراک تھا۔ یہ دونوں اطراف کے لیے بڑی کامیابی تھی۔ آپؐ ایک طرف اس جگہ کو جو شناخت کی تلاش میں تھی، اسے دوسری طرف ایک ایسی شناخت جو جگہ کی تلاش میں تھی کے قریب لانے، ایک دوسرے کے ساتھ جڑنے پر آمادہ کر چکے تھے۔

یہ سمجھنا مشکل نہیں ہے کہ محمدؐ کے مکہ سے یوں بچ نکلنے پر وہاں اشرافیہ نے کھ کا سانس لیا ہو گا۔ اس طرح نہ صرف انہوں نے محمدؐ کے کھڑے کیے خطرے سے چھٹکارا پا لیا تھا بلکہ اچھی بات یہ تھی کہ یہ قضیہ خون ریزی کے بغیر ہی حل ہو چکا تھا۔ اگرچہ یہ ان کا من چاہا حل تو نہیں تھا، وہ نتیجہ تو نہیں تھا جس کی منصوبہ بندی انہوں نے کر رکھی تھی مگر پھر بھی، یہ ان کے لیے قابل قبول تھا۔ ان کے خیال میں وہ محمدؐ سے ہمیشہ کے لیے چھٹکارا پا چکے تھے، بلکہ اچھی بات یہ تھی کہ محمدؐ نے مکہ سے فرار ہو کر مدینہ جیسے معمولی زرعی نخلستان میں پناہ لی تھی۔ وہ اس جگہ پر جس قدر اور جس کو چاہیں تبلیغ کر سکتے تھے اور اس سے حجاز کے بڑے منظر نامے پر چنداں فرق نہیں پڑنے والا تھا۔ بالآخر وہ انہیں دیوار سے لگانے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ ان کے نزدیک، یہ اس معاملے کا ممکنہ طور پر سب سے بہترین حل تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ ان کے رشتے دار اور قرابت دار جو محمدؐ کی پیروکاری میں مدینہ چلے گئے تھے، بالآخر جب ان کے حواس بحال ہوں گے تو وہ جلد ہی مکہ لوٹ آئیں گے۔ ویسے بھی، 'وہ وہاں رہ کر کیا کرتے؟ کھجوریں چنتے پھرتے؟'

مکہ کی اشرافیہ کو اپنے ان سوالوں کا جواب جلد ہی مل گیا۔ سالہا سال کی تضحیک، ہراساں کرنے کے حربے، بائیکاٹ، پیروکاروں کی تکالیف اور آخر میں خود محمدؐ پر قاتلانہ حملہ اور یوں بے دخلی؟ بالآخر صبر کا پیمانہ لبریز ہونا ہی تھا۔ محمدؐ نے قریش کی اشرافیہ کو قائل کرنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی، یہاں تک کہ ان کے لیے اس نئے نظام میں جگہ بھی بنالی تھی مگر وہ کڑا وقت گزر چکا تھا۔ اب حالات یکسر مختلف تھے۔ اب ان کے لیے کسی بھی قسم کی کوئی گنجائش باقی نہیں تھی۔ ہجرت پر مجبور کیے جانے کی بے عزتی اور اب جلاوطنی کی دن رات کی اذیت کے بعد برداشت جواب دیتی جا رہی تھی۔ عدم تشدد کی حد آن پہنچی تھی، بلکہ اس سے تو شکست کا شدید احساس ہونے لگا تھا۔ چنانچہ، اگر مکہ کی اشرافیہ نے محمدؐ کے بغیر پر امن زندگی کی توقع پال لی تھی تو یہ ان کی غلط فہمی تھی۔ انہوں نے اب تک آپؐ کو ہراساں کیا تھا، اب ہراساں ہونے کی باری ان کی تھی۔

محمدؐ نے مکہ کی اشرافیہ کو ہراساں کرنے کا جو طریقہ اختیار کیا، اسے 'غزیہ یا' اور 'سریہ' کہا جاتا ہے۔ غزیہ سے مراد چھاپہ، یورش یا حملہ کے ہیں۔ عربوں میں یہ طریقہ واردات بدو خانہ بدوش قبائل کا تھا، جو قحط کے دنوں میں، جب ان کے ریوڑ بھوک اور پیاس سے مرنے لگتے تو گزر بسر کرنے کے لیے اسے اختیار کرتے تھے۔ بدو قبائل کے چست اور پھریرے جوان مضبوط گھوڑوں اور توانا اونٹوں کی پیٹھ پر سوار ہو کر، چھوٹی ٹکڑیوں میں بٹے، بڑے تجارتی قافلوں پر دھاوا بول دیا کرتے۔ یہ حملے زیادہ تر تنگ گھاٹیوں میں اس وقت کیے جاتے تھے جب راستے کی دشوار گزاری اور تنگی کے باعث قافلے میں اونٹوں کی قطار نسبتاً لمبی ہو جاتی اور سب سے پیچھو چلنے والے اونٹ آسان نشانہ ہوتے تھے۔ یہ وارداتیں بدو قبائل کی طرز زندگی کا حصہ تھا۔ یعنی، انہیں گزر بسر کے لیے صحرا پر انحصار کرنا پڑتا تھا۔ اگر ان سخت دنوں میں جب صحرا کے پاس انہیں دینے کے لیے چراہ گاہوں میں گرچہ چارہ تو نہیں ہوتا تھا مگر یہی صحرا انہیں مال اور دولت سے لدے تجارتی قافلوں سے مستفید ہونے کا بھرپور موقع ضرور فراہم کر دیتا تھا۔ اس طرح، یہ وارداتیں ان کی عادت نہیں بلکہ ضرورت تھی۔ اسی لیے عام طور پر، بدوؤں کی اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے حملے کا خوف ہی کافی ہوا کرتا تھا۔ یعنی، تجار پہلے ہی بدو سرداروں کے ساتھ معاملات طے کر لیتے تھے اور مذاکرات کے ذریعے طے شدہ ٹکسال ادا کر کے صحرائی علاقے میں راہداری کے مخصوص حصوں میں قافلوں کی حفاظت کو یقینی بنا لیتے۔ لیکن اگر کسی علاقے میں سردار کمزور واقع ہوتا، بدوؤں کے آپس میں تنازعات چل رہے ہوتے یا پھر اکا دکا جگہوں پر بدامنی کا دور دورہ ہوتا تو اس صورت میں راہداری کا یہ حصہ یقیناً باغیوں اور شریروں کی آماجگاہ بن جاتا۔ وہ گھاٹیوں پر

گھات لگا کر حملے کیا کرتے اور یوں قافلے ہر صورت نشانے پر آجاتے۔ اس صورت میں بھی، یعنی باغیوں کے ہاتھ قافلوں پر اچانک حملوں کا ایک ان کہا اصول واضح طور پر لاگو رہا کرتا تھا۔ اس اصول کے تحت مال مویشی اور دولت وغیرہ لوٹنا تو جائز تھا مگر کسی انسانی جان کا ضیاع کسی بھی صورت قابل قبول نہیں تھا۔ اگر باغی غزیہ یا چھاپے کے دوران کسی شخص کو قتل کر دیتے تو قصاص اور انتقام کا قانون لاگو ہو جاتا تھا۔ یہ اصول گو تحریر تو نہیں تھا مگر پھر بھی حجاز کے صحرا میں، طول و عرض، ہر جگہ پر ہر شخص بشمول باغیوں کو بھی معلوم تھا اور ان پر بھی اس کا اطلاق ہوتا تھا۔ یہی وجہ تھی ان حملوں میں شاذ و نادر ہی کوئی شخص اپنی جان سے ہاتھ دھوتا تھا۔

مدینہ کے انصار اور دوسرے لوگوں کے پاس محمدؐ کے حکم پر کیے جانے والے ان حملوں میں شامل ہونے کی کوئی معقول وجہ نہیں تھی۔ دوسری طرف، مہاجرین کے یہاں ان حملوں کا حصہ بننے کی ہر ممکن وجہ موجود تھی۔ چونکہ، مدینہ کی قابل کاشت اراضی پہلے ہی لوگوں کی ملکیت تھی، اسی لیے مہاجرین کے پاس ان مالکان کا ہاتھ بٹانے کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔ اسی طرح وہ ابھی تک گزر بسر کے لیے انصار کی مہربانی اور احسان تلے دبے ہوئے تھے۔ وہ ہمیشہ ان پر انحصار نہیں کر سکتے تھے۔ انہیں خود بھی ہاتھ پاؤں ہلانے تھے اور کچھ ثابت کر کے دکھانا لازم تھا۔ یہ اس لیے بھی ضروری تھا کہ وہ ایک ایسے معاشرے میں بسر رکھتے تھے جہاں غیرت اور مردانگی ہی سب کچھ تھا۔ اس کے علاوہ ایک پہلو اس کلنک اور داغ کو دھونا بھی تھا جو مہاجرین کے ماتھے پر جلاوطنی کی صورت لگ چکا تھا۔ ان کے دلوں میں وقت کے ساتھ یہ ناسور بگڑتا ہی چلا جا رہا تھا اور اس کو بھرنے کے لیے ہجرت کو سرکشی میں بدلنا ضروری ہو چکا تھا۔ یہ چھاپہ مار کاروائیاں ایک ایسا راستہ تھا جس کے ذریعے وہ مکہ کی اشرافیہ پر مڑ کر وار کر سکتے تھے اور وہ جانتے تھے کہ یہ ایسا وار ہوتا جو انہیں اندر سے ہلا کر رکھ دے گا۔ قریش کے لیے تجارت اور مالی مفادات پر کاری ضرب کسی بھی طور قابل قبول نہیں تھی۔ غزیہ کے نتیجے میں مہاجرین مفعول کی بجائے فاعل بن کر ابھر سکتے تھے۔

اوائل اسلامی دور کے محققین اور تاریخ دان ان حملوں کو 'فوجی مہمات' قرار دیا کریں گے۔ حالانکہ 623ء کے اواخر تک یہ حملے بمشکل ہی باقاعدہ مہم کہلائے جا سکتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ پہلے پہل یہ حملے انتہائی بری طرح ناکامی سے دوچار ہوئے۔ مثال کے طور پر اسی برس، مارچ کے مہینے میں، ہجرت کے سات ماہ بعد محمدؐ کے حکم پر ایک حملہ آور ٹکڑی تشکیل دی گئی۔ اس میں تیس مہاجرین شامل تھے اور سربراہی آپؐ کے چچا حمزہ کر رہے تھے۔ انہوں نے مکہ کے ایک تجارتی قافلے کا راستہ روک لیا۔ اس قافلے کی سربراہی ابوجہل کر رہا تھا۔ لیکن، اس علاقے کے بدو سردار نے مداخلت کر کے معاملہ رفع دفع کرا دیا اور یوں یہ 'مہم' بے نتیجہ ہی ختم ہو گئی۔ اس واقعہ کے ایک ماہ بعد مہاجرین نے ایک بار پھر، دگنی تعداد کے ساتھ ایک بار ایسی ہی ایک دوسری کوشش کی۔ اب کی بار تجارتی قافلے کی سربراہی ابوسفیان کے ہاتھ میں تھی مگر یہاں بھی 'دو بدو لڑائی' نہیں ہوئی اور حملہ آور ناکام لوٹ کر آئے۔ اسی طرح کی چند دوسری 'مہمات' کی خود محمدؐ نے بھی سربراہی کی۔ ان کا مقصد 'قریش کا پیچکس کرنا' تھا۔ لیکن یہ ساری کوششیں بے نتیجہ ثابت ہوئیں۔ مہاجرین اس کام میں اتنے بھونڈے ثابت ہوئے تھے کہ بدو قبائل کے باغی دن دیہاڑے مدینہ کے باہر ان کے دودھ دینے والی اونٹنیاں ہانک کر لے جاتے اور جب مہاجرین ان کا پیچکس کرتے تو تھوڑی دور جا کر خود راستہ بھول جاتے۔ انہیں باغیوں کا نام و نشان بھی نہ ملتا۔

لیکن ذاتی طور پر محمدؐ ان 'مہمات' سے کسی بھی قسم کی لوٹ مار یا مال و دولت ہتھیانے کی توقع نہیں رکھتے تھے۔ وہ ایک عرصے تک تجارتی قافلوں میں مزدوری اور آڑھت، الغرض ہر طرح کا ادنی اور اعلی کام، پیشہ نبھا چکے تھے۔ وہ ان قافلوں میں حفاظت کی غرض سے کیے جانے والے انتظامات سے بخوبی واقف تھے اور اچھی طرح جانتے تھے کہ صحرائی گھاٹیوں میں کوئی بدو سردار اپنے علاقے میں اس قسم کی مداخلت، باغیانہ روش برداشت نہیں کرے گا۔ بدو قبائل الٹا ان کے گلے پڑ سکتے تھے۔ محمدؐ ان مہمات کے ذریعے بجائے مادی فائدہ حاصل کرنے کے، قریش کو ایک پیغام دینا چاہ رہے تھے۔ انہیں مال و دولت سے کوئی غرض نہیں تھی بلکہ وہ صرف اور صرف ان تجارتی قافلوں کی راہ میں جان بوجھ کر روڑے اٹکا رہے تھے تاکہ تجارت کے کاروبار میں جس قدر ممکن ہو، مشکلات پیدا کی جا سکیں۔ ایک طرح سے کہیے، وہ قریش کو ٹھوکے لگا رہے تھے، ہراساں کر رہے تھے۔ وہ ایک نکتہ واضح کر رہے تھے کہ قریش بھی اچھی طرح جان لیں کہ وہ صرف مدینہ

تک محدود نہیں ہیں بلکہ وہ اس سے باہر بھی ایک قوت کی صورت موجود ہیں، جس کا انہیں بہر حال لحاظ رکھنا ہی ہوگا۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ بظاہر ان کی یہ مہمات ناکامی سے دو چار تھیں مگر مثل ہینگ لگے نہ پھٹکری۔۔۔ وہ بغیر کوئی نقصان اٹھائے قریش کو پیغام دینے میں کامیاب رہے تھے۔ یہ آنکھ مچولی کا کھیل یوں ہی جاری رہتا مگر ایک روز مہاجرین کی ایک ٹکڑی کے ہاتھوں فاش غلطی سرزد ہو گئی۔ ایک شخص قتل ہو گیا۔

یہ واقعہ 624ء میں، جنوری کے مہینے میں پیش آیا۔ محمدؐ نے آٹھ مہاجرین پر مشتمل، ہتھیاروں سے لیس ایک ٹکڑی کو مدینہ سے دو سو میل جنوب کی جانب، مکہ کے مضافات میں ایک مہم پر روانہ کیا۔ آپؐ کے ذہن میں اس فعل کے پیچھے کارفرما مقصد کا پوری طرح علم نہیں ہے۔ مگر، چونکہ حکم یہ دیا گیا تھا کہ یہ ٹکڑی کسی پر حملہ نہیں بلکہ صرف گشت کرے گی۔ سو، ممکن ہے کہ وہ اس گشت کے نتیجے میں بہار کے موسم کے دوران دمشق کی جانب روانہ کیے جانے والے بڑے تجارتی قافلوں کے بارے میں سن گن لینا چاہتے تھے۔ لیکن ان کا مشن جو بھی رہا ہو، یہ لوگ اپنے مقاصد کے حصول میں بری طرح ناکام ہو گئے۔ ان میں سے دو اتنے کاہل تھے وہ اپنے اونٹوں کو رات اچھی طرح باندھے بغیر ہی سو گئے۔ سویرے جاگے تو دیکھا اونٹ موجود نہیں تھے۔ اونٹ رات کی تاریکی میں منڈلاتے ہوئے صحرا کی طرف نکل گئے تھے۔ چنانچہ ان دو اشخاص کو اونٹ ڈھونڈنے کے لیے پیچھے ہی چھوڑ دیا گیا اور باقی چھ مہاجرین مہم کے اگلے حصے کے لیے آگے، نخلہ کی جانب بڑھ گئے۔ نخلہ مکہ اور طائف کے بیچ واقع ایک مقام ہے۔ یہاں ان کا سامنا مکہ کے ایک مختصر قافلے سے ہوا، جس میں چار اشخاص چند اونٹوں پر دا کھ، مرکلی کی گوند اور چمڑا لاد کر لے جا رہے تھے۔ کئی ہفتوں کی مایوس کن مہم اور پے در پے غلطیوں کے بعد یہ چھ مہاجرین کو فت کا شکار تھے۔ وہ اپنے آپ کو اتنے آسان ہدف پر گھات لگا کر حملہ کرنے سے روک نہ سکے۔ حالانکہ، اس سے حاصل ہونے والا مال اور معلومات دونوں ہی ادنی تھیں۔ پھر، یہ حرام دن تھا۔ یعنی، سال میں حرمت کے تین مہینوں میں آخری مہینے رجب کا آخری روز تھا، اس وقت کے دوران قتل و غارت اور لڑائی جھگڑے کی ممانعت رہا کرتی تھی۔ وقت کی حرمت کی پرواہ کیے بغیر، اس ٹکڑی نے مکہ کے مختصر قافلے پر دھاوا بول دیا۔ ان میں سے ایک شخص فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا، دوسرا موقع پر ہی مارا گیا، جبکہ باقی دو کو زندہ پکڑ کر قیدی بنا لیا گیا۔ قافلے کا سامان بھی ہتھیا لیا گیا۔

مہاجرین کی یہ ٹکڑی ایک ہیرو کی طرح خیر مقدم کی توقع پالے، اپنی کامیابی پر نازاں فوراً ہی مدینہ کی طرف چل پڑے۔ وہ فخر سے سر سے بلند کیے، قیدیوں کو ساتھ پیدل چلاتے، مال سے لدے اونٹوں کی قطار کی مہار تھامے مدینہ میں داخل ہوئے۔ لیکن یہاں پہنچ کر بجائے جشن، محمدؐ نے ان کو آڑے ہاتھوں لیا۔ مکہ، مدینہ کی مصنوعات کی واحد منڈی تھی۔ مدینہ کے لوگوں کے لیے یہ فعل ناقابل قبول تھا۔ وہ مکہ میں نخلستان کی مصنوعات کے متمول گاہکوں کو یوں دھمکانے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ وہ اس سے پہلے بھی ان مہمات کے پیچھے کارفرما سوچ اور حکمت پر خدشات کا اظہار کر چکے تھے، مگر اس واقعہ کے بعد تو انہیں یہ خوف لاحق ہو گیا تھا کہ اب تجارت تو رہی ایک طرف، قصاص اور خونی انتقام ناگزیر ہو جائے گا۔ یہی نہیں، اس کے کئی دوسرے مضمرات بھی تھے۔ چونکہ یہ واقعہ مکہ کے قریب ہی پیش آیا تھا، اس لیے یہ مکہ کی اشرافیہ کے لیے انتہائی قابل فکر اور شرم کی بات تھی۔ اور پھر کس لیے؟ انہوں نے مرکلی کے گوند اور تھوڑے سے چمڑے کے لیے ایک شخص کو قتل کر دیا تھا؟ یہ تو سراسر اشتعال دلانے کی کوشش تھی۔ مدینہ میں لوگ سوچنے لگے، کیا انہوں نے اس لیے محمدؐ کو اپنے یہاں دعوت دی تھی کہ وہ ان کے بیچ تنازعات میں تو صلح کرا لیں مگر کسی دوسرے کے ساتھ کھلی جنگ چھیڑ دیں؟

'مدینہ کا آئین'، جس کی تیاری پر پورا ایک برس کام ہوتا رہا اور پھر اس پر سارے فریقین کو راضی کرنا علیحدہ سے ایک قضیہ رہا تھا، اب دیکھتے ہی دیکھتے سب کچھ ایک دم داؤ پر لگ گیا۔ ساری محنت اکارت ہوتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ معاہدے کی دستاویز میں مشترکہ مدافعت بارے صاف لکھا تھا کہ مقصد دفاع ہے اور ہرگز جارحیت نہیں ہے۔ بلاشبہ نخلہ میں پیش آنے والا واقعہ جارحیت تھا۔ یہی نہیں بلکہ یہ واقعہ حرمت کے مہینے میں، ایک مقدس گھڑی کے دوران پیش آیا تھا۔ بعد ازاں قرانی آیات میں بھی کہا جائے گا کہ، 'اور تم اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو، جو تم سے لڑتے ہیں، مگر زیادتی نہ کرو کہ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں

کرتا'۔یعنی،واضح طور پر ضرر،ایذا رسانی اور حملہ کرنے میں پہل کرنے والے کی نشاندہی کی گئی ہے۔مدینہ کے لوگوں نے مشترکہ دفاع اور مدافعت کا معاہدہ کیا تھا لیکن اگر اب حملہ کرنے میں پہل کی وجہ سے یہ دفاع لازم ہو جاتا ہے تو وہ اس سے ہرگز متفق نہیں تھے۔ساتویں صدی عیسوی میں بھی آج کی ہی طرح اصطلاحات کی تشریح اور تفسیر اچھا خاصا جھنجھٹ ہوا کرتا تھا۔یہاں مدافعت اور جارحیت میں فرق کرنا مشکل تھا۔جیسے تب ویسے ہی آج بھی عام طور پر یہ فرق بجائے اصل تشریح، تشریح کرنے والے پر منحصر ہوتا ہے۔

مدینہ میں بڑھتی ہوئی تنقید کو روکنے کا صرف ایک ہی طریقہ تھا۔وہ یہ کہ محمدؐ آگے بڑھتے اور معاہدے کی رو سے انسانوں سے بڑی ذات کی رہنمائی حاصل کرتے۔اس کے لیے وحی درکار تھی اور وہ نازل بھی ہو گئی۔'لوگ پوچھتے ہیں ماہ حرام میں لڑنا کیسا ہے؟'محمدؐ سے کہا گیا،'کہو!اس میں لڑنا بہت برا ہے۔مگر راہ خدا سے لوگوں کو روکنا اور اللہ سے کفر کرنا اور مسجد حرام کا راستہ خدا پرستوں پر بند کرنا اور حرم کے رہنے والوں کو وہاں سے نکالنا اللہ کے نزدیک اس سے بھی زیادہ برا ہے اور فتنہ خونریزی سے شدید تر ہے۔وہ تو تم سے لڑے ہی جائیں گے حتیٰ کہ اگر ان کا بس چلے، تو تمہیں اس دین سے پھرا لے جائیں۔۔۔'

پھر اسی طرح آگے چل کر معاملے کو صاف کرنے کی غرض سے ایک دوسری آیت میں کہا،'یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے ناحق نکال دیے گئے۔صرف اس قصور پر کہ وہ کہتے تھے،'ہمارا رب اللہ ہے'اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعے دفع نہ کرتا رہے تو خانقاہیں اور گرجا اور معبد اور مسجدیں،جن میں اللہ کا کثرت سے نام لیا جاتا ہے،سب مسمار کر ڈالی جائیں۔اللہ ضرور ان لوگوں کی مدد کرے گا جو اس کی مدد کریں گے۔۔۔'دوسرے الفاظ میں اب جارحیت کی حسب سابق، دفاع کے معنوں میں اجازت دے دی گئی تھی۔اگرچہ نخلہ کے مقام پر پیش آنے والا واقعہ اور مہاجرین کا فعل غیر ضروری تھا مگر بہر حال اس کی توجیہا موجود تھی۔ توجیہا یہ تھی کہ مہاجرین اس واقعہ کے پیش آنے سے قبل، مکہ کی اشرافیہ کے ہاتھوں زیادتی اور جارحیت کا نشانہ بنتے چلے آرہے تھے۔مومنین کے لیے تو یہ معاملہ یہیں ختم ہو گیا مگر دوسروں کے لیے، مسئلہ ابھی صرف شروع ہوا تھا۔

ابتدائی طور پر قران میں جارحیت کی اجازت کو'قتال'کہا گیا ہے جس کا صاف مطلب ہتھیاروں سے لیس ہو کر،دو بدو ٹکراؤ،لڑائی یا مقابلے کے ہیں۔عربی میں اس کے مترادفات میں غزیہ یا غزوہ کا لفظ بھی استعمال ہوتا ہے۔اس سے مراد معرکہ،باہمی کٹا چھنی یا باقاعدہ جنگ کی صورت میں خون ریزی بھی لی جاتی ہے۔لیکن یہ قرانی آیات جو بعد میں، محمدؐ کے وصال کے تقریباً دو دہائیوں بعد جمع کر کے،موضوعات کی نسبت سے ترتیب دی گئیں تو ان میں اسی تصور کی آگے تشریح اگلی ہی آیت میں اس طرح مرتب کی گئی ہے کہ،'بخلاف اس کے جو لوگ ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے اللہ کی راہ میں اپنا گھر بار چھوڑا اور جہاد کیا ہے،وہ رحمت الہیٰ کے جائز امیدوار ہیں۔۔۔'

اس طرح کی لگ بھگ کی صورتحال، مجموعہ کرنے سے بندش خیالات کا پرچار ہوتا ہے،یہی وجہ ہے کہ آج 'اللہ کی راہ میں جہاد'،دوسری صورت میں عام طور پر صرف 'لڑائی یا جنگ' کہلائی جاتی ہے۔لیکن آج یہ کسی بھی صورت ممکن نہیں ہے کہ ہم قرانی آیات کی اصل ترتیب یا وقت نزول کو جان سکیں۔بلکہ،یہاں تو ہمیں یہ بھی علم نہیں کہ ان آیات میں 'اللہ کی راہ میں جہاد' کے اصل معنی کیا ہیں؟لفظ جہاد،جہد سے نکلا ہے اور اس کا مطلب کوشش کے ہیں۔اس سے صرف مراد قتال نہیں ہے۔یہ تو بہت بعد کی بات ہے کہ جہاد کا صرف اور صرف مطلب 'مقدس جنگ' لیا جانے لگا۔

کسی حد تک،یہ ترجمے کا مسئلہ بھی ہے۔یا شاید،یہ قضیہ تشریح اور توضیع سے تعلق رکھتا ہے۔قران کی زبان میں اشارے اور کنایے کا استعمال عام ملتا ہے اور اسے پڑھتے جائیں تو اس کی تحریر گہری اور پر اسرار ہوتی چلی جاتی ہے۔یوں،ترجمے کی صورت میں اور تفاسیر کے ذریعے،عربی اور دوسری زبانوں کے بیچ اس کا سیدھا سادہ ترجمہ اور تشریح کرنا ممکن نہیں ہے۔ساری ہی سامی زبانوں کی طرح،عربی بھی لفاظی پر چلتی ہے۔کسی بھی لفظ کے کم از کم تین ماخذ لے کر اس سے ایک خوش نوا اور موافق لفظ بن جاتا ہے پھر اس کے اوپر سابقے اور لاحقے کے استعمال سے اتنے لفظ نکل آتے ہیں کہ ایک ہی رو میں بے شمار معنوں کا گماں ہوتا ہے۔

کسی بھی سامی زبان میں ماخذ کو لے کر آگے بڑھتے جائیں تو ایک ہی لفظ کے کئی مختلف مضمر مفہوم نکلتے چلے جاتے ہیں۔ ان میں سے ہر مفہوم کا استعمال مخصوص موقع یا سیاق و سباق کا متقاضی ہوتا ہے۔ اور قران، جو خدائی آواز ہے، لسانی سیاق و سباق سے بے نیاز ہے۔ قران تو اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ جو بھی اس کو سنے، ایک نتیجہ اخذ کر کے، مخصوص حوالے سے آگے بیان کر دے۔ لیکن، اس کلام سے جو نتیجہ ساتویں صدی عیسوی میں اخذ کیا گیا تھا، ضروری نہیں ہے کہ وہی نتیجہ آج اکیسویں صدی میں بھی اخذ کرنا ممکن ہو۔ کیونکہ، دونوں ہی چیزیں یعنی زبان اور حوالہ، بدل چکے ہیں۔ آج دنیا میں کہیں پر بھی ساتویں صدی عیسوی کی حجازی عربی، جس میں قران نازل ہوا ہے، بولی، سمجھی اور نہ ہی لکھی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر دور میں اسلامی سکالر اور علماء زندگی بھر قران میں استعمال کیے گئے الفاظ پر سر کھپاتے، ان کے معنی تلاشتے گزار دیتے ہیں۔ بسا اوقات تو وہ لفظوں میں ہی کھوئے رہتے ہیں، پوری آیت پر دھیان جمانے کا موقع بھی نہیں ملتا۔ یوں ان سے مفہوم اور اصل پیغام چھوٹ جاتا ہے۔

جب قران میں ایک ہی ڈھنگ سے کئی اصطلاحات جیسے قتال، 'جنگ و جدل اور لڑائی' کے لیے، وہیں اس کا استعمال 'جہاد' کے طور پر کرنا، جس کا مطلب جہد یا کوشش کے ہیں۔۔۔ میل نہیں کھاتا۔ وقت کے ساتھ زبان میں آنے والے تغیرات کے باعث اس لفظ کے دو ہرے معنی، کئی کئی مفہوم نکل آئیں گے۔ مثلاً جہاد سے مراد ایک تو یہ ہے کہ اپنے اندر روحانی کوشش اور جد و جہد کرنا، تاکہ اخلاقی اور متقی زندگی گزارنے کا سبب پیدا ہو سکے یا روحانیت میں درجات بلند ہوں تو دوسری طرف اس کے معنی بیرونی دنیا میں ہتھیاروں سے لیس ہو کر دشمنان اسلام کے خلاف جد و جہد کرنا ہے۔ جہاد کے دونوں معنی، ایک مشہور حدیث میں پا کر، اور بھی متبرک ہو جائیں گے۔ یہ حدیث بھی ایک روایت ہے، جیسا کہ تقریباً احادیث محمدؐ کے وصال کے خاصے عرصہ بعد جمع کی گئی تھیں۔ یہ مجموعہ، محمدؐ کے اقوال اور افعال کی روایات پر مشتمل ہے، جس کے محمدؐ کے چند قریبی لوگ ہیں۔ اس حدیث میں جہاد اکبر اور جہاد اصغر کا تصور پیش کیا گیا ہے۔ محمدؐ سے منسوب روایت میں درج ہے کہ، 'جہاد اصغر یہ ہے کہ ہتھیاروں سے لیس ہو کر اسلام کا دفاع کیا جائے، جبکہ جہاد اکبر یہ ہے کہ اپنے اندر تقویٰ پیدا کیا جائے اور خدا کی خوشنودی حاصل کی جائے۔ ہم یہاں استعمال ہونے والے الفاظ اکبر اور اصغر سے، دونوں طرح کے جہاد میں سے برتر جہاد، بہتر مفہوم کو بخوبی دیکھ سکتے ہیں۔

بہر حال، اس وقت زمینی حقائق یہ تھے کہ اگر اس سے پہلے کبھی محمدؐ نے امید پال رکھی تھی کہ وہ الہامی تحریک کو تشدد کے بغیر ہی پار لگا سکتے ہیں تو اب یہ ممکن نہیں رہا تھا۔ اہم سوال یہ نہیں تھا کہ آیا لڑائی جھگڑا، جنگ و جدل، معرکے اور مہمات، خون ریزی کی جائے گی یا نہیں؟ جہاد کے معنی واقعی قتال کے ہیں؟ یہ اہم نہیں رہا تھا۔ یہ تو پہلے ہی طے ہو چکا تھا۔ یہاں تک کہ اب قران بھی آنے والے کئی سالوں تک بجائے اس بات پر زور دیا کرے گا کہ آخر کن حالات میں یہ سب جائز ہو جاتا ہے؟ اور یہ کیونکر کیا جائے؟ محمدؐ نے اس سوال کو کس طرح سمجھا اور اس پر کیسے عمل کیا، یا کیا وہ حق بجانب تھے؟ یہ آج بھی گرما گرم بحث ہے۔ تشدد کا استعمال بالآخر اسلام کی کمزوری بن کر رہ جائے گا۔ آنے والی کئی صدیوں میں مجاہد 'مسلمان' اور جنگجو 'کفار' ساتویں صدی عیسوی کی سیاست کے حربوں کو حوالے کے طور پر استعمال کر کے، اس کی کئی تشریحات نکال کر اور جہاں ضروری سمجھا، اصل حقائق کو مسخ کر کے آپس میں گتھم گتھا رہا کریں گے۔ ایک دوسرے کی گردنیں کاٹتے پھریں گے۔ ان اسلام پسند مجاہدین اور ان جیسے ہی شدت پسند کفار میں سے شاذ و نادر ہی کوئی ایسا ہو گا جو نخلہ پر پیش آنے والے واقعے کے پس منظر سے آگاہ ہو گا، ان میں سے شاید ہی کسی نے غور کیا ہو کہ وہ کیا عوامل تھے، جن کے باعث یہ سارا معاملہ شروع ہوا تھا۔

نخلہ کے واقعہ نے اس وقت حالات کا دھارا بدل کر رکھ دیا تھا۔ اگرچہ اس موقع پر جارحیت اور مدافعت کی جامع تعریف، فرق تو واضح کر دیا گیا تھا مگر اس کے علاوہ ایک دوسری بات نہایت اہم تھی۔ اب تک، الہامی آواز نے محمدؐ کو ہدایت کی تھی کہ وہ اپنے دشمنوں کو نظر انداز کر دیا کریں۔ وہ ان سے منہ موڑ لیا کریں اور ان کی جہالت کے سبب، معاف کر دیا کریں۔ یہی طریق تھا کہ جس پر وہ سالہا سال سے انتہائی صبر کے ساتھ، ہر اساں کیے جانے اور مکہ میں شدید مخالفت کا سامنا ہونے کے باوجود عمل کیے چلے آ رہے تھے۔ اسی طرز کی بدولت انہیں اخلاقی فتح بھی ملی تھی اور عدم تشدد کی پالیسی کے سبب ہی وہ خاصے مقبول بھی ہو چکے تھے۔ لیکن،

اسی گاندھی جیسے عدم تشدد کے اطوار کے باعث ان سے بالآخر اپنا گھر بھی چھن چکا تھا۔ گھر کیا، ایک وقت ایسا بھی آیا تھا کہ انہیں اپنی جان کے لالے پڑ گئے تھے۔ ذاتی سطح تک تو چلو ٹھیک تھا مگر اب جب کہ آپؐ ایک رہنما تھے، اجتماعی مفادات کا تحفظ ان کا فرض بن چکا تھا۔ وہ اپنے لوگوں سے یوں عدم تشدد کا نعرہ بلند کر کے پیٹھ نہیں پھیر سکتے تھے۔ یہاں صرف ایک ہی راستہ تھا اور وہ آگے کا راستہ تھا۔ اس مرحلے پر 'اقتدار کی سیاست' ہی واحد حل ہے۔ صرف یہی کلیہ ہے جو آپؐ کو اپنے سابقہ طرز عمل میں بڑی تبدیلی پر مجبور کر دے گا۔

'اقتدار کی سیاست' نامی اصطلاح ایک ہی جیسے الفاظ اور معنوں کی تکرار معلوم ہوتی ہے۔ سیاست اور اقتدار کا چولی دامن کا ساتھ ہے، معنوں میں یہ ایک ہی بات ہے۔ لغت میں بھی سیاست کی ایسی ہی تعریف یعنی، 'حکومت کی سائنس اور آرٹ' ملتی ہے۔

بہر حال، اب یہ اصطلاح خاصی بدنام ہو چکی ہے۔ عام طور پر اس سے منفی مفہوم لیا جاتا ہے اور اس سے متعلق جدید روش کو مشہور سیاسی فلسفی آیزایا برلین نے چیلنج کیا تھا۔ برلین اپنی تصانیف میں جابجا اس شخص کی مدح سرائی کرتے نظر آتے ہیں جس نے پہلی بار 'اقتدار کی سیاست' کا ثابت خیال پیش کیا تھا۔ یہ شخص نکولو مکیاویلی ہے۔ برلن کے نزدیک مکیاویلی ایک بے درد اور غیر بتدل نہیں بلکہ ایک نہایت ذمہ دار اور ہنر مند سیاسی طور پر عملیت پسند شخص تھا۔ برلین لکھتے ہیں، 'اگر آپ سفارش کردہ سیاسی طور طریقوں سے اس لیے خائف ہیں کہ وہ آپ کو اخلاقی طور پر چنڈال لگتے ہیں؟ یا اگر آپ ان کا صرف اس لیے انکار کر دیتے ہیں کہ وہ نہایت خوفناک ہو سکتے ہیں؟ تو میکاویلی کے پاس آپ جیسوں کے لیے ایک جواب ہے۔ وہ جواب یہ ہے کہ آپ بے شک اخلاقی طور پر اچھی زندگی گزارا کریں، اپنی نجی زندگی میں کھپتے رہیں، بڑی آبادی میں ایک عام شہری بن کر بسر کریں یا چاہیں تو راہبیت اختیار کر لیں۔ آپ کے لیے کسی بھی طرح ممکن ہو، ایک کونے میں دبک کر بیٹھ جائیں۔ لیکن، اس سیاسی طور کے عملی نتائج کی صورت میں آپ پر لازم ہے کہ اپنے آپ کو دوسروں کی زندگیوں کا ذمہ دار نہ بنائیں اور نہ ہی اس کے نتیجے میں کسی فائدے یا خوش قسمتی کی توقع رکھیں۔ آپ اس صورتحال میں، مادی لحاظ سے یکسر نظر انداز کر دیے جائیں گے بلکہ آپ تباہ ہو جانے کی توقع رکھیں۔' اسی بات کو ایک جگہ پر میکاویلی نے ان الفاظ میں ایسے سمو دیا ہے کہ، 'سارے مسلح پیغمبر بالآخر فاتح بن کر ابھرے ہیں اور غیر مسلح پیغمبروں کے حصے میں دکھ اور درد کے سوا کچھ نہیں آیا'۔

محمدؐ ماضی میں نظر انداز کیے جاتے رہے ہیں، دکھ اور درد جیسے ان کی قسمت میں لکھ دیے گئے تھے۔ بلکہ ایک ایسا وقت بھی آیا تھا جب وہ تقریباً تباہ کر دیے گئے تھے۔ اب وہ اپنے ساتھ دوبارہ وہی سلوک روا رکھے جانے پر چین سے بیٹھنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے تھے۔ جہاں اس سے قبل قرانی آیات آپؐ کو تشدد سے باز رہنے پر مجبور کرتی آئی تھیں، اب وہ بھی مشروط حمایت پر راضی ہو گئی تھیں۔ اس کہانی میں ایک نیا باب شروع ہو چکا تھا۔ اب یہ صرف وقت کا کھیل تھا۔ ہم دیکھیں گے کہ صرف دو مہینے کے قلیل عرصے میں ہی حالات بگڑ کر کھلی جنگ پر منتج ہو جائیں گے۔

باب:14

جنگ بدر 14 مارچ 624ء کو لڑی گئی۔ یہ وہ تو نہیں تھا جو محمدؐ چاہتے تھے مگر اس کا نتیجہ یقیناً وہی نکلے گا جس کی محمدؐ کو ضرورت تھی۔ اوائل اسلامی تواریخ میں جنگ بدر کو شاندار الفاظ میں اسلام کی پہلی بڑی فتح کے طور پر یاد رکھا جائے گا۔ یہ ایک فیصلہ کن مسلح معرکہ ثابت ہو گا جو نہ صرف مدینہ میں بگڑتے ہوئے حالات کو سنبھالا دے گا بلکہ ساتھ ہی کم قیمت ہوتی ہوئی عزت و حرمت بھی سود سمیت واپس لوٹا دے گا۔ بالخصوص، مضافاتی علاقوں کے بدو قبائل تو اس کے بعد مدینہ کی جھولی میں آن گریں گے۔ جب محمدؐ مکہ کی طاقت اور دولت پر اجارہ داری کو میدان جنگ میں دھول چٹا دیں گے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ بالآخر بدو قبائل ان کی حمایت میں نہ نکل آئیں۔ لیکن بالآخر، ایسا ہو رہنا، باقاعدہ منصوبہ بندی نہیں بلکہ ایک غلط اندازے کی مرہون منت تھا۔

بدر کا مقام مدینہ اور بحیرہ احمر کے درمیان واقع ہے۔ یہ ایک وسیع وادی ہے جو پھیل کر ساحل کے میدانی علاقوں میں نکل جاتی ہے۔ اس وادی کے آس پاس کئی کنویں کھدے ہوئے تھے اور جابجا قدرتی ترائیاں نکال رکھی تھیں۔ یہ ترائیاں تقریباً سارا سال سرما کے موسم میں برسنے والی بارشوں کے بچے کھچے پانی سے تر رہا کرتی تھیں اور استعمال میں لائی جاتیں۔ یوں، یہ مقام ایک طرح سے پانی کے ذخائر کی وجہ سے مشہور ہو گیا تھا۔ بوجہ اہمیت، صحرا میں ہر گروہ، قبیلے اور قافلے کی نظریں اسی مقام پر لگی رہتیں۔ اکثر تجارتی قافلوں کا یہاں پڑاؤ رہا کرتا تھا۔ اس برس، اس جگہ کی اہمیت اور بھی بڑھ جائے گی کیونکہ بہار کے موسم میں دمشق جانے والا قریش کا تجارتی قافلہ واپسی پر اسی مقام پر پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا۔

قریش کے اس بڑے قافلے پر چھاپہ مار کاروائی کا صرف سوچنا ہی ہمت کا کام تھا۔ ابھی تک محمدؐ جو حملہ آور ٹکڑیاں تشکیل دیتے آئے تھے، وہ بمشکل بیس سے تیس لوگوں پر مشتمل ہوتی تھیں۔ پھر، ان چھاپہ مار کاروائیوں میں اب تک منطقی طور پر صرف نخلہ کی کاروائی ہی نتیجہ خیز ثابت ہوئی تھی مگر متنازعہ ہو گئی۔ مدینہ کی زیادہ تر آبادی، بالخصوص وہ لوگ جن کی جنوب میں واقع مکہ شہر کے ساتھ تجارت اور قرابت داری کی ڈوریں بندھی ہوئی تھیں، وہ اس معاملے کو مزید طول دینے کے حق میں نہیں تھے۔ ان کے لیے نخلہ کا تجربہ خاصا تلخ رہا تھا۔ اس واقعے کے بعد، دوبارہ ایسی ہی کسی کاروائی کے بارے میں سوچنا مکہ کو کھلی جنگ کی دعوت ہوتی۔ مگر، یہ وہ خطرہ تھا جو بہر حال محمدؐ مول لینے کو تیار تھے۔ نخلہ جیسی چھوٹی کاروائیوں سے مکہ کا کچھ بھی نہیں بگڑنے والا تھا۔ اس کے برعکس، بدر جیسے مقام پر ایک بڑی اور اب کی بار، منظم کاروائی سے قریش کے ہوش اڑ جاتے۔ محمدؐ ان کے لیے ایک بے بس اور غیر اہم جلاوطن نہ رہتے بلکہ ان کو اچھی طرح باور کرایا جا سکتا تھا کہ وہ ان کے ایسے دشمن ہیں، جس سے نبٹنا آسان نہیں ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس طرح کی کامیابی سے مدینہ میں ان کی حمایت بڑھ جاتی بلکہ یہاں کی آبادی کا اعتماد اور حوصلہ بھی بلند ہو جاتا۔ گو، مدینہ کا اثر رسوخ رکھنے والا بزرگ طبقہ ابھی تک احتیاط پر مصر تھا مگر نوجوانان ایک بڑے شہر اور انتظام کو چیلنج کرنے کے لیے اتاؤلے ہو رہے تھے۔ پھر، یہ کاروائی مال غنیمت کی ایک بڑی مقدار حاصل کا سنہری موقع بھی تھا۔

اب کی بار یہ صرف چمڑے کے کچھ پارچے اور مرکلی کے گوند کی چند بوریاں نہیں تھیں۔ بنو امیہ کے سردار ابو سفیان کی سربراہی میں، دمشق سے لوٹ کر آنے والے اس قافلے میں دو ہزار اونٹوں پر لدا قیمتی سامان تھا۔ یہ نسبتاً آسان ہدف تھا، کیونکہ پیش بندی کے نتیجے میں ملنے والی معلومات کے مطابق اتنے بڑے قافلے کی حفاظت پر مامور مسلح افراد کی تعداد صرف ستر تھی۔

اتنے بڑے قافلے کی حفاظت کے لیے صرف ستر افراد کا مسلح دستہ، یقیناً یہ انتظامات ناکافی تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ شاید قریش ابھی تک محمدؐ کے ارادوں کو بھانپ نہیں سکے تھے۔ یا پھر اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ابھی تک 'مضافات' کو کمتر، اس قابل نہیں سمجھتے تھے۔ نخلہ کے مقام پر پیش آنے والا واقعہ ایک چھوٹی اور غیر موثر کاروائی تھی۔ ان کے خیال میں، اتنے بڑے قافلے پر یوں دھاوا بول دینا، اتنی آسان بات نہیں تھی۔ پھر، قریش کا اس پورے خطے میں جو دبدبہ اور رعب تھا، اس کے ہوتے کوئی بھی شخص یا گروہ، محمدؐ کا ساتھ دینے کے لیے آگے بڑھنے سے پہلے، سو بار سوچتا۔ کس میں اتنی ہمت تھی کہ وہ قریش کو یوں للکارا کرے؟ لیکن اگر گھمنڈ میں قریش محمدؐ کو حقیر جانتے تھے تو دوسری طرف محمدؐ کا بھی ان کے بارے اندازہ پورا نہ ہوا۔

جب محمدؐ مدینہ سے بدر کی جانب دو دن کے سفر کے لیے نکلے تو ان ہمراہ صرف ایک چھاپہ مار ٹکڑی نہیں بلکہ تین سو لوگوں پر مشتمل پوری فوج تھی۔ وہ اس مہم کے دوران خون ریزی کی توقع نہیں رکھتے تھے کیونکہ تجارتی قافلے کی حفاظت پر مامور ستر افراد مسلح حملہ آوروں کی اتنی بڑی تعداد دیکھ کر یقیناً پیچھے ہٹ جاتے۔ تین سو لوگوں کی موقع پر موجودگی سے صرف اور صرف مظاہر طاقت مقصود تھی۔ وہ کسی جھڑپ یا اسلحے کے استعمال کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے تھے۔ اسی لیے، پہلی بار ایسی کسی مہم میں مہاجرین کے ساتھ مدینہ کے مقامی لوگ بھی شامل تھے۔ اس سے نخلستان میں محمدؐ کے اختیار اور اثر کا پتہ چلتا ہے۔ بلکہ، مقامی آبادی کی اس مہم پر آمادگی کا

ثبوت یہ تھا کہ فوج میں انصار کی تعداد مہاجرین سے زیادہ تھی۔ اگر اس مہم کے نتیجے میں حاصل ہونے والے فوائد کی بابت توقعات آسمان سے باتیں کر رہی تھیں تو دوسری جانب، اس لشکر کی روانگی کی خبر بھی زمین پر چار سو پھیل گئی۔

اتنے بڑے لشکر کی خبر کیسے چھپ سکتی تھی؟ صحرا میں ہر طرف چہ مہ گوئیاں شروع ہو گئیں اور معلومات پھیل گئیں۔ اس کی اطلاع تجارتی قافلے کو بھی فوراً ہی مل گئی۔ ابو سفیان نے فی النور ایک قاصد کو سریع گھوڑے پر سوار کر کے مکہ روانہ کر دیا۔ اس نے فوراً کمک روانہ کرنے کا حکم دیا تھا اور پیغام مختصر اور صاف تھا کہ، 'آؤ اور اپنی تجارت بچاؤ!'

پیغام ملتے ہی مکہ میں قریش کی تجار کو نسل آگ بگولہ ہو گئی۔ چونکہ اس تجارتی قافلے میں قریش کے سبھی کنبوں کا حصہ تھا، فوراً ہی جمع ہو گئے اور حکمت عملی ترتیب دی جانے لگی۔ اس موقع پر محمدؐ کے دیرینہ دشمن ابو جہل نے گرج کر کہا، 'کیا محمدؐ اور اس کے حواری یہ سمجھتے ہیں کہ وہ نخلہ کی طرح لوٹ مار کر لیں گے؟ نہیں۔ واللہ ایسا نہیں ہو گا۔ اس بار انہیں لگ پتہ جائے گا۔' محمدؐ کے لشکر میں تین سو افراد تھے؟ قریش نے فیصلہ کیا کہ انہیں بتا دیں گے کہ لشکر کی تعداد اور قوت کیا ہوتی ہے۔ راتوں رات، ایک بڑی فوج ترتیب دے دی گئی۔ اس لشکر میں قریباً ایک ہزار مسلح افراد شامل تھے۔ یہ فوج اگلے ہی دن ابو جہل کی سپہ سالاری میں شمال کی جانب، بدر کی طرف روانہ ہو گئی۔ ان کا خیال یہ تھا کہ اس لشکر کی اطلاع پہنچتے ہی محمدؐ کے حوصلے جواب دے جائیں گے اور وہ کسی بھی صورت اتنی بڑی فوج سے ٹکر لگانے کا سوچ بھی نہیں سکتے۔ اتنا بڑا لشکر دیکھ کر ہی محمدؐ کے اوسان خطا ہو جائیں گے۔

اسی کشمکش میں، ابو سفیان نے اس گماں پر کہ شاید مکہ سے آنے والی کمک وقت پر نہ پہنچ سکے، قافلے کا رخ بدلنے کا حکم دے دیا۔ یہ قافلہ بدر جانے کی بجائے پیچھو کی طرف ہٹ گیا اور مغرب میں کافی دور سے لمبا چکر کاٹتے ہوئے بحیرہ احمر کے ساحلوں پر جا پہنچا۔ اب وہ محمدؐ کے لشکر کی پہنچ سے بہت دور نکل آئے تھے اور اپنے پیچھو، دو لشکروں کو ایک دوسرے کے سامنے چھوڑ آئے تھے۔ یہ دونوں ہی لشکر، ابو سفیان کی حکمت عملی سے بے خبر آگے ہی بڑھتے چلے گئے۔ انہیں بدر پہنچ کر سوائے دھول کے کچھ نہیں ملنے والا تھا۔ ابو سفیان نے ممکنہ جنگ کے خطرات کو بھانپ کر ابو جہل کے نام پیغام بھجوایا کہ، 'تم اپنے قافلے اور مال و دولت کی حفاظت کے لیے نکل آئے ہو۔ خدا نے خود اس کی حفاظت کا انتظام کر دیا ہے لہذا، تم واپس چلے جاؤ۔'

لیکن ابو جہل کو محمدؐ سے ٹکراؤ کے امکان سے موڑ کر واپس مکہ لے جانا ایسا ہی تھا جیسے آگے بڑھتے ہوئے کسی طوفان کو بیچ راستے میں رک جانے کا حکم دیا جائے، یعنی ناممکن تھا۔ حالانکہ، اس طرح مسلح آمنے سامنے کا امکان بڑھا کر وہ محمدؐ کی اہمیت بڑھا رہا تھا۔ میکاویلی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ، 'اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ایک حکمران کی عظمت مشکلات اور اختلاف کے سامنے ڈٹ کر کھڑے ہونے میں ہے۔ ایسے حکمرانوں کے لیے قسمت خود ایسے دشمن تلاش لیتی ہے جو اس کے سامنے آن کھڑے ہونے کی جرات کرتے ہیں تاکہ وہ ان کے خلاف فتح حاصل کر سکے اور مقبولیت اور عظمت کی اس سیڑھی پر اوپر چڑھتا جائے جو اس کے دشمنوں نے اپنے ہاتھ سے اسے فراہم کر دی تھی۔' یہاں بھی یہی ہونے جا رہا تھا۔ قریش کا لشکر، جس کی سپہ سالاری ابو جہل کر رہا تھا، محمدؐ کے وسیع تر ارادوں کی تکمیل کے لیے آن کر سامنے کھڑا ہو گیا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ تمام تر جارحانہ روش کے باوجود، ابو جہل کے اندازے ابو سفیان کے خدشات کی نسبت زیادہ معروضی تھے۔ یہ مکہ کی عزت اور غیرت کا معاملہ تھا۔ گو قافلہ اب حملے سے محفوظ تھا مگر اس کو اپنے راستے سے ہٹنے پر مجبور کر دینا بھی محمدؐ کی جزوی فتح تھی۔ یہ خبر عام ہو جائے گی۔ یہی نہیں بلکہ بدر جیسے مقام، جہاں تقریباً صحرا کا ہر شخص، قبیلہ اور قافلہ پانی کے لیے پڑاؤ ڈالتا ہے، وہاں اس خبر کی بازگشت شروع ہو چکی ہو گی۔ یہ پورے خطے میں قریش کی ناک کٹوانے کے لیے کافی تھا۔ ابو جہل کے نزدیک یہاں سے واپس مڑ جانا جلتی پر تیل کا کام کرے گا۔ لوگ سمجھیں گے کہ قریش نے محمدؐ کے ساتھ نخلہ کے بعد یہاں بھی رعایت برت کر کمزوری کا ثبوت دیا ہے۔ ابو جہل کو ہرگز قابل قبول نہیں تھا کہ وہ اپنے ہاتھ سے محمدؐ کو یہ موقع فراہم کرے۔

چنانچہ، نہ صرف قریش کی یہ فوج بدر کی جانب بڑھتی چلی گئی بلکہ ابو جہل نے اعلان کیا، 'ہم بدر پہنچ کر تین دن قیام کریں گے۔ اونٹ ذبح کریں گے۔ وہاں محفل ہو گی اور شراب اور رنگ جمائیں گے تاکہ وہاں موجود ہر شخص اور مضافات کے سارے بدو جان لیں کہ ہم نے کیا انتظام کیا تھا۔ اس طرح ان کی تمام تر توقعات بدستور قریش کے ساتھ جڑی رہیں گی۔'

اس حکمت عملی سے لشکر کے اکثر لوگ متفق نہیں تھے۔ ان کو یہ خدشہ تھا کہ اگر یہ صرف طاقت کا مظاہرہ نہ ہوا اور معاملات بڑھ کر لڑائی لڑنے تک پہنچ گئے تو پھر کیا ہو گا؟ ایک سردار نے انہی خدشات کا اظہار یوں کیا، 'ہمیں لشکر کو میدان جنگ میں لے جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہاں، اگر دفاع ضروری ہو اور تجارتی مال داؤ پر لگا ہو تو دوسری بات ہے مگر یوں بے وجہ خطرہ مول لینا دانشمندی نہیں ہے۔' ابو جہل نے یہ سن کر اس سردار کو نامردی کا طعنہ دیا اور ناک چڑھا کر کہا، 'تمہارا سینہ خوف سے پچک گیا ہے'۔

اسی طرح ایک دوسرے شخص نے اس نکتے کی طرف توجہ دلانی چاہی کہ محمدؐ کے ساتھ لشکر میں مہاجرین بھی ہیں۔ یہ مہاجر، ان کے رشتہ دار ہیں۔ اپنا خون ہیں۔ وہ کہنے لگا، 'خدا کی قسم! اگر تم نے محمدؐ کو جنگ میں شکست دے بھی دی تو فائدہ نہیں۔ اس کے بعد تم ایک دوسرے کا سامنا نہیں کر پاؤ گے۔ تم میں سے ہر شخص دوسرے سے منہ چھپاتا پھرے گا اور دل میں کدورت ہو گی کیونکہ ہر ایک نے دوسرے کے ناطے دار، بھتیجوں اور قرابت داروں کا خون کر رکھا ہو گا۔ ہمیں یہیں سے واپس چلے جانا چاہیے۔' اس بات پر تو ابو جہل کا رنگ لال ہو گیا۔ منہ بگاڑ کر کہنے لگا، 'تم ایسا صرف اس لیے کہہ رہے ہو کیونکہ محمدؐ کے لشکر میں تمہارا بیٹا ہے۔ اس کو بچانے کی کوشش مت کرو!' اور پھر اس نے اس بحث کو نخلہ میں قتل ہونے والے شخص کے بھائی کی جانب اشارے سے سامنے بلا کر یوں سمیٹا کہ، 'تم اپنی آنکھوں سے انتقام دیکھو گے۔ اٹھو اور ان کو یاد دلاؤ کہ ان کے ذمے تمہارے بھائی کے قتل کا قرض باقی ہے'۔ مگر اس سے قبل کہ مقتول کا بھائی کچھ کہہ پاتا، وہاں موجود تقریباً ہر شخص اس کے خون کا بدلہ لینے پر راضی ہو چکا تھا۔ اس کے باوجود، کئی لوگ وہیں سے واپس ہو لیے۔ آگے بڑھنے والے لشکر کی تعداد گھٹ کر لگ بھگ سات سو کے قریب رہ گئی تھی۔

اگر وہ آگے بڑھنے یا نہ بڑھنے کی بحث میں نہ پڑتے تو شاید ابھی تک انتقام لے چکے ہوتے۔ پھر، خبریں صرف قریش تک نہیں بلکہ محمدؐ کو بھی تواتر سے پہنچ رہی تھیں۔ محمدؐ جان چکے تھے کہ نہ صرف یہ کہ ابو سفیان قافلے کو لے کر پہلے ہی نکل چکے ہیں بلکہ مکہ سے آنے والی کمک ایک بڑے لشکر کی صورت میں ان کی جانب بڑھ رہی ہے۔ یہاں قریش کی ہی طرح محمدؐ کو بھی دو میں سے کوئی ایک فیصلہ کرنا تھا۔ یعنی، یہیں سے واپس مدینہ کی طرف مڑ جاتے۔ لیکن، یہ کمزوری سمجھی جاتی اور مدینہ میں اس کا منفی تاثر بنتا۔ یہی نہیں بلکہ مضافات کے قبائل میں بھی یوں بیچ راستے سے، مکہ کے لشکر کی اطلاع پا کر واپس مڑ جانے کا پیرہو جاتا۔ ویسے بھی، اب یہ معاملہ صرف تجارتی قافلے کو روکنے سے متعلق نہیں رہا تھا۔ ویسے ہی، یہ اب صرف انا کا مسئلہ نہیں تھا بلکہ یہ تو محمدؐ اور ان کے پیروکاروں کی ساکھ کا معاملہ بن کر رہ گیا تھا۔ دوسری طرف، یہی معاملہ قریش کو بھی درپیش تھا۔ دونوں فریقین کسی بھی صورت ممکن ہوتا، کمزوری نہیں دکھا سکتے تھے۔ ان میں سے ایک کو طاقت کے حصول کی دھن تھی تو وہیں دوسرے کو اسی طاقت کے کھو جانے کا ڈر تھا۔

مکہ کا لشکر بدر پہنچا تو محمدؐ اور ان کے پیروکار پہلے سے وہاں موجود تھے اور نسبتاً اونچی جگہ پر قبضہ جمائے بیٹھے تھے۔ پوری رات ہلکی بارش جاری رہی۔ یہ مارچ کے مہینے میں ایک غیر معمولی بات تھی۔ چونکہ مکہ کا لشکر وادی کے پیندے میں تھا تو ساری رات وہ بارش کے سیلابی پانی سے بچاؤ میں مصروف رہے۔ دوسری طرف محمدؐ نے اسی بارش کا فائدہ اٹھا کر مکہ کے لشکر کے قریب واقع کنوؤں اور ترائیوں پر قبضہ کر لیا۔ صبح ہوتے ہی مکہ کا لشکر ڈھلوان سے نکل کر اونچی جگہوں پر جانے کے لیے مجبور ہو جائے گا اور وہاں پہلے سے ہی محمدؐ اور ان کے پیروکار موجود ہوتے۔ محمدؐ پانی تک رسائی روک کر گویا پورے میدان پر حاوی تھے۔

دوسرے دن صبح جب لڑائی شروع ہوئی تو وادی پر ہلکے بادل تھے۔ مومنین کا لشکر انتہائی منظم انداز میں، یک جان ہو کر لڑ رہا تھا مگر دوسری طرف مکہ کے لشکر کی حالت ابتر تھی۔ ہر کنبہ اپنے تئیں آناداً نہ طور پر دفاعی لڑائی لڑ رہا تھا۔ چنانچہ، دوپہر سے پہلے ہی ان کی کمر ٹوٹ کر رہ گئی۔ بڑی تعداد بھاگنے پر مجبور ہو گئی۔ مکہ کے لشکر میں چالیس افراد اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ ہلاک ہونے والوں میں ابو جہل بھی تھا۔ اس کو قتل کرنے والا ایک نوجوان مہاجر چرواہا تھا۔ مشہور ہے کہ ایک دفعہ اس چرواہے کو ابو جہل نے اپنے ہاتھ سے پیٹا تھا اور شدید بے عزتی کی تھی۔ لڑائی کے دوران ابو جہل کی ہلاکت کا واقعہ سناتے ہوئے کہتا ہے کہ، "میں نے ابو جہل پر وار کیا تو اس کا ایک پاؤں اور آدھی ٹانگ کٹ کر دور جا گری۔ واللہ، اس کی ٹانگ ہوا میں یوں اڑی جیسے کوترے میں ڈالنے سے کھجور کا برادہ اڑتا ہے'۔ اور، اس کو ابو جہل کے آخری الفاظ نے خوب طمانیت دی، جب اس نے مرتے ہوئے کہا، 'اے بکریاں چرانے والے، تم اپنی حیثیت سے بہت بڑے ہو چکے ہو۔'

یہ معلوم نہیں کہ ابو جہل نے دم توڑتے ہوئے واقعی یہ الفاظ کہے یا نہیں مگر اس کہانی سے لڑائی میں قریش کے حصے میں آنے والی ہزیمت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ محمدؐ نے لڑائی کے بعد میدان جنگ میں اپنے ساتھیوں سے کہا، 'یہاں قریش نے تمہارے سامنے اپنی جان کھوئی ہے اور خون بہایا ہے'۔ ان کے لہجے میں افسوس اور فخر، ایک ساتھ جھلک رہا تھا۔ اس لڑائی میں مکہ کے چنے ہوئے جنگجو شامل ہوئے تھے۔ انہیں اپنی قابلیت اور طاقت پر گھمنڈ بھی تھا۔ پھر، ان کا خیال تھا کہ شاید ان کا سامنا عام، گنوار اور چھٹ بھیے قسم کے باغیوں سے تھا جن میں کمتر غلام بھی شامل تھے۔ ان کے ٹکڑوں پر پلنے والے غلام۔ قریش کو انہی کے ہاتھوں شکست فاش ہوئی تھی۔ ان کے لیے یہ سب ناقابل یقین تھا، ان نتائج کے لیے ہر گز تیار نہیں تھے۔ ان کے خواب و خیال میں بھی یہ ممکن نہیں تھا مگر ایسا واقعی ہو چکا تھا۔ ان کی بنائی دنیا برباد ہو چکی تھی۔

نوجوان لڑکا، جس نے ابو جہل کو قتل کیا تھا۔ اس کی بیان کردہ روداد، جس میں ابو جہل کی ٹانگ کٹ کر دو جا گری تھی، بدر کی جنگ میں پیش آنے والے ایسے کئی دوسرے واقعات میں سے ایک ہے۔ ان میں سے ہر ایک کو جزئیات سمیت بیان کیا گیا ہے۔ اوائل اسلام کی دونوں رقم کردہ تواریخ یعنی ابن اسحاق کی 'سیرت رسول' اور الطبری کی 'تاریخ اسلام' کے بدر سے متعلق حصے کسی یونانی شاعر کے میدان جنگ کی لہولہو داستان معلوم ہوتی ہے۔ اس میں ہر طرف خون اور دلیری بکھری ہوئی ملتی ہے۔ مثلاً، دشمن کی ٹانگ تلوار کے ایک ہی وار میں یوں کٹ کر دور جا گرتی ہے کہ 'نلی میں سے گاڑھا گودا بہنے لگا۔۔۔'۔ یا پھر، پیٹ چر گیا اور آنتیں برچھی پر لپٹی زمین پر پھیل گئیں۔ ہر زخم کمال دلیری سے سہہ لیا گیا، بلکہ اس نے بے خوف کر دیا۔ یہاں تک کہ ایک شخص کے ساتھ یوں ہوا کہ جب دشمن کی تلوار سے اس کا بازو کٹ کر جھولنے لگا تو، 'میں اس کو پاؤں کے نیچے دبا کر کھڑا ہو گیا اور اتنا کھینچا کہ جسم سے الگ ہو گیا۔ اسے وہیں پھینک کر، میں نے پھر سے لڑائی شروع کر دی۔۔۔'

جنگ میں پیش آنے والے واقعات کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کی روایت پرانی ہے۔ قدیم سمیریوں سے لے کر بازنطینی، تقریباً ہر دور کی داستانوں میں بڑائی کی عمارت میں بہادری اور غیوری کی ایسی ہی کہانیاں ہیں جو ان قوموں کی بنیاد رہی ہیں۔ یہاں بھی شجاعت کے یہ قصے، انوکھے نہیں ہیں۔ لیکن ابن اسحاق اور الطبری جہاں ایک طرف جوانمردانہ اسلامی شناخت بنانے میں مشغول تھے، وہیں دوسری طرف انہوں نے تاریخ کی سرگزشت لکھتے ایمان داری کا دامن چھوٹنے نہیں دیا۔ یعنی یہ کہ موت کو چکما دیتی داستانوں کے ساتھ وہ میدان جنگ میں پھیلی وحشت اور افراتفری کا بھی برابر ذکر کرتے ہیں۔ لڑائی کے دوران مرنے والے پندرہ مومنین کا حال باوجود یہ کہ ان میں چند ایک کی کہانی تو خاصی زبوں اور فضیحت ناک رہی تھی، پھر بھی بہر حال لکھی گئی ہے۔ مثال کے طور پر ان میں سے ایک جوش میں آکر ایک چٹان سے کود پڑا اور اس کی گردن ٹوٹ گئی۔ ایک دوسرا شخص گھوڑے پر سوار تھا۔ گھوڑا، پہلی بار اس قدر افراتفری دیکھ کر بدک گیا اور اس کو نیچے گرا

دیا۔ یہ شخص اپنے ہی گھوڑے کی سموں تلے کچل کر مر گیا۔ اسی طرح، ایک تیسرا شخص، شاید اس نے پہلی بار تلوار سنبھالی تھی۔ اتنی زور سے گھمائی کہ دشمن تو پیچھو ہٹ گیا مگر تلوار گھوم کر اس کی اپنی ٹانگ میں پیوست ہو گئی۔ ران کی رگ کٹ گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے، خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے موت واقع ہو گئی۔

پردہ سکرین پر چلتی ہوئی فلم کی طرح، روایات بھی جنگ بدر کی داستان دکھاتی نظر آتی ہیں۔ اگر ایک موقع پر جوانمردی ہے تو اگلے ہی پیرے میں انسانی بے بسی کا اظہار کیا گیا ہے۔ ایک طرف بہادر جنگجو جرات اور شجاعت کی مثال قائم کر رہے ہیں تو وہیں پر خوفزدہ انسان بچاؤ کی تدبیر کرتے نظر آتے ہیں۔ آج ریموٹ کنٹرول کے جدید دور میں، ہم انسانوں کے لیے اس خوف اور دہشت کو سمجھنا تقریباً ناممکن ہے۔ دو بدو ننگی تلواروں سے لڑتے، ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے، دوسرے کو جان سے مار دینے کے اس احساس کو جاننا ہمارے لیے ممکن نہیں ہے۔ لڑنے والا ہر مہرہ سامنے کھڑے دشمن کی سانس میں بسے خوف کو سونگھ، چہرے پر پڑھ سکتا تھا۔ مقابل کے پسینے چھوٹتے دیکھتا یا اس کی ہیبت سے ہتھیلی پر آئے اسی پسینے کے باعث ہاتھ میں تھامی تلوار کو پھسلتا ہوا محسوس کر سکتا تھا۔ آگے بڑھتے ہوئے مخالف کی للکار، اس کی آواز میں دہشت اور پھر وار کرنے پر بے ساختہ پیچھو ہٹ جانا، نہیں تو آگے بڑھ کر تیز دھار جسم میں گھونپ دینا۔۔۔ ہم اس میں سے کچھ بھی نہیں سمجھ سکتے۔ لڑائی میں صرف تلواریں اور خنجر نہیں چلتے تھے۔ برچھیاں ہی نہیں لہرائی جاتی تھیں۔ پتھر اور لاتیں، تھپڑ اور مکے، کہنی سے وار اور گھٹنے سے مار کر نیچے گرا دینا۔۔۔ الغرض ہر وہ چیز استعمال میں لائی جاتی جس سے بچاؤ ممکن ہو سکتا تھا۔ ہر وہ حربہ آزماتے جس سے زندہ بچ جانے کی سبیل بن سکتی تھی۔

یہاں تو افراتفری سوا تھی۔ ہر شخص کو یہ بول اٹھتے تھے کہ اس کے مدمقابل شخص کوئی انجانا دشمن نہیں ہے بلکہ اس کا کوئی عزیز تھا۔ قریبی یا دور سے رشتہ داری نکلتی تھی، سب ہی لوگ ایک دوسرے کے ناطے دار تھے۔ بعض کی تو ایک دوسرے سے کبھی گاڑھی یاری رہی تھی۔ بحیثیت انسان، وہ دل ہی دل میں اب بھی دلی دوست تھے۔ یہ جنگ ہر لحاظ سے ہیبت ناک تھی کیونکہ اس میں ہر طرح کی ذاتیت کا مدخل تھا۔ یہ ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے تھے۔ مہاجرین اور قریش ایک دوسرے سے یوں گتھم گتھا تھے کہ انہیں اپنے پڑوسیوں، دور کے عم زادوں، سسرالیوں، چچاؤں، بھتیجوں اور بھانجوں کے ساتھ ہی نہیں بلکہ کچھ تو ایسے تھے کہ انہیں اپنے باپ، سگے بھائی اور بیٹوں کے ساتھ بھڑنا پڑ رہا تھا۔

پھر، دن بھر لڑائی کے بعد شام آ گئی۔ فاتح بدستور میدان میں موجود تھے اور مفتوح جان بچاتے وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ یہ مال غنیمت جمع کرنے کا وقت تھا۔ دن بھر کے تھکے ہارے جنگجو زرہ بکتریں، تلواریں، خنجر، برچھیاں، گھوڑے اور اونٹ، الغرض جو چیز ہاتھ آئی، سمیٹ لیے۔ محمدؐ نے اپنے لیے صرف دو اشیاء رکھیں۔ ان میں ایک چمچماتی ہوئی دو نوک والی ایک تلوار تھی اور دوسرا ایک اونٹ تھا۔ یہ نسلی اونٹ وزن میں بھاری بھرکم اور خاصا چست تھا۔ اہم بات یہ تھی کہ یہ ان کے دیرینہ دشمن، حال ہی میں قتل ہونے والے ابوجہل کی ملکیت ہوا کرتا تھا۔ لیکن، یہ مال غنیمت اس تاوان کے سامنے کچھ بھی نہیں تھا جو محمدؐ کے لشکر کو پچاس جنگی قیدیوں کے عوض ملنے والا تھا۔ ان قیدیوں میں نہ صرف ابوسفیان کا سگا بیٹا شامل تھا بلکہ محمدؐ کے انتہائی قریبی رشتے دار بھی تھے۔ ان کے چچا عباس اور خدیجہ کا بھتیجا بھی تھا۔ یہ خدیجہ کا وہی بھتیجا ہے جو محمدؐ کا داماد تھا۔ اس کے گھر میں آپؐ کی بیٹی زینب تھیں۔ کسی کے ساتھ رعایت نہ برتتے، محمدؐ نے انہیں بھی باقی قیدیوں کے ساتھ ہی شمار کیا اور ویسا ہی سلوک روا رکھا۔ زینب نے ایک اچھی بیوی کا ثبوت دیتے ہوئے مکہ میں ہی اپنے شوہر کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اب بھی، اپنے شوہر کو چھڑانے کے لیے تاوان میں اپنا سارا زیور گٹھڑی میں باندھ کر محمدؐ کو بھیج دیا۔ ان زیورات میں وہ ہار بھی شامل تھا جو خدیجہ نے زینب کو شادی کا تحفہ دیا تھا۔

یہ ہار دیکھتے ہی محمدؐ بے چین ہو گئے۔ جیسے اندر سے تڑک گئے ہوں۔ انہوں نے اپنے داماد کو رہا کر دیا اور سارے زیورات واپس زینب کو بھجوا دیے۔ انہیں گھر کی یاد ستانے لگی اور بے چینی نے گھیر لیا۔

لوگ لڑائی میں پیش آنے والے واقعات سناتے رہے اور اس کے قصے صحرا میں عام ہو گئے۔ مومنین کے نزدیک کمزور فوج اور نا ممکنات کے باوجود فتح دراصل خدا کی نصرت تھی۔ خدا بدر میں ان کا حامی تھا۔ ان میں سے کچھ فرشتوں کی بابت بتانے لگے کہ بادلوں میں سے سفید گھوڑوں پر سوار فرشتے اترے اور ان کے ساتھ، قدم بہ قدم لڑنے لگے۔ دوسری طرف، مکہ میں بھی کئی ایسے تھے جو اپنی ناقابل یقین شکست کی وجہ یوں گردانتے پائے گئے کہ، 'سفید لباس میں ملبوس آدمی جو چتکبرے، یعنی سیاہ دھبوں والے گھوڑوں پر سوار تھا، آسمان اور زمین کے بیچ اڑنے لگے۔ ان کا مقابلہ کرنا تو دور کی بات، روکنا بھی ممکن نہیں تھا۔' یہی بات، قران نے بھی مومنین سے مخاطب ہوتے ہوئے یوں کہی کہ، 'پس حقیقت یہ ہے کہ تم نے انہیں قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے ان کو قتل کیا۔۔۔'

جیسے آج، ویسے ہی تب بھی ہر شخص فاتح سے مرعوب ہو جاتا تھا۔ بالخصوص جب فتح غیر متوقع ہو۔ بدر کی جنگ کے بعد مومنین کا اعتماد آسمانوں کو چھونے لگا۔ اور جوں جوں اس جنگ کے نتیجے اور ان کی فتح کی خبر پھیلی تو اس کا مومنین پر اثر اور محمدؐ کی ساکھ بڑھتی ہی چلی گئی۔ انہوں نے خطہ حجاز کے مضبوط ترین قبیلے کو پچھاڑ دیا تھا۔ صحرا کے وسیع ریتلے میدانوں، قصبوں کے چوراہوں اور پانی کے ہر ذخیرے پر چرچے ہونے لگے۔ یہ چرچا، قریش کے لیے ناسور بن کر رہ گیا۔ کہاں وہ سوچتے تھے کہ محمدؐ کو جلاوطنی پر مجبور کر کے اس قضیے کو حل کر دیا ہے اور آج یہ حالت تھی کہ منہ چھپاتے پھر رہے ہیں۔ یہ چرچا صرف مکہ، مدینہ اور مضافات تک محدود نہیں رہے گا بلکہ دیکھتے ہی دیکھتے یہ پورے خطہ حجاز اور اس سے بھی آگے نجد کی پہاڑیوں کے اس پار، جنوب میں یمن اور شمال میں ملک شام کے آخری کونے تک پھیل جائے گا۔ مکہ کی نیک نامی کو یہ دھچکا اس لیے بھی شدید تھا کہ کامیاب تجار کے لیے ان کی ساکھ ہی سب کچھ ہوتا ہے۔ قریش کی دھاک اور شہرت ہی ان کی ضمانت تھی اور اگر وہ اسی کا دفاع نہیں کر سکتے تو پھر خمیازہ ان کی معیشت کو بھگتنا پڑے گا۔ وہ جانتے تھے کہ محمدؐ اور ان کے ابتدائی پیروکاروں کو قریش کی اس ہزیمت پر خالص فائدہ اور عزت ہی ملے گی۔ اب تک وہ یہ صرف محمدؐ کا دعویٰ تھا مگر بعد بدر کے قریش پر واقعی تھرتھری پیدا ہو گئی تھی۔ اب صحرا کے اندر اور اس سے بھی آگے، لوگ سوچنا شروع ہو جائیں گے۔ اب میدان میں صرف قریش ہی نہیں تھے بلکہ پہلی بار ان کی ٹکر کا کوئی فریق موجود تھا۔ اگر قریش بہتیری کوشش کر کے اتحادیوں کو اپنی فوقیت کا یقین دلا بھی دیتے پھر بھی اس وقت عرب کی اقتداری سیاست اس بات کی متقاضی تھی کہ پورے خطے میں قبائل جانتے ہوئے بھی محمدؐ کو نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔

اس بات میں کوئی شک نہیں تھا کہ جلد یا بدیر قریش انتقام لیں گے۔ مکہ اور مدینہ میں دوبارہ جنگ اب ناگزیر تھی۔ سوا اس کے کوئی چارہ نہیں تھا اور اب کی بار دونوں فریقین کے بدو حمایتی بھی میدان میں اتریں گے۔ خانہ بدوش قبائل کا یہ تھا کہ وہ ہمیشہ فاتح کے شانہ بشانہ کھڑا رہنا چاہتے تھے۔ ان کے لیے یہی سودمند تھا۔ اس سے پہلے تو خیر قریش کے سوا کوئی دوسرا اس قابل ہی نہیں تھا مگر اب حالات بدل چکے تھے۔ انہیں پہلی بار دو میں سے ایک کا چناؤ کرنا تھا۔ اب اگر یہ خانہ بدوش قبائل آگے بڑھ کر محمدؐ کا ساتھ دینے آن کھڑے ہو جاتے ہیں تو یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ مدینہ کے لشکر نے نہ صرف قریش کو شکست فاش دی تھی بلکہ ان کی فتح میں خدائی ہاتھ کے بھی تذکرے دیکھنے میں آ رہے تھے۔ جیسے اس سے قبل وہ قریش کو حرم کی تحویل داری پر محترم جانتے تھے، اب ان صحرائی قبائل نا ممکن کو ممکن فتح میں بدلتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ یہی نہیں، خدا خود اس نئے فریق کی حمایت میں کھڑا تھا۔ وہ ان کے لیے لڑ رہا تھا۔ بعد اس کے، آخر یہ قبیلے کہاں جا سکتے تھے؟

بدر کے نتیجے میں ہاتھ آنے والے کئی جنگی قیدی ابھی بھی تحویل میں تھے اور ان کے عوض تاوان پر بات چیت چل رہی تھی۔ یعنی، جلد ہی محمدؐ نے ایک بار پھر کئی مسلح فوجی ٹکڑیاں تشکیل دینا شروع کر دیں۔ اب کی بار، ان کا ہدف بدو قبائل تھے۔ انہیں حکم تھا کہ طاقت کا استعمال صرف اس صورت کیا جائے جب یہ قبائل مدینہ کے ساتھ اتحاد سے انکار کر دیں۔ باقی کسی بھی صورت میں لڑائی چھیڑنے کی سختی سے ممانعت تھی۔ بدو قبائل کے علاوہ کئی خانہ بدوش بھی تھے، جن کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ انہوں نے عملیت کا مظاہرہ کیا اور فوراً ہی مدینہ کی نئی ابھرتی ہوئی روشن طاقت کو مکہ کی گرہن لگی پرانی قوت پر فوقیت دی اور اتحادی بن گئے۔ جوں جوں

وقت گزرتا جارہا تھا، ابن اسحاق لکھتے ہیں کہ ایک کے بعد دوسرا وفد 'نئے اتحادیوں کے ساتھ دوستی کے معاہدے کیے بغیر کسی لڑائی کے مدینہ لوٹنے لگے' اور ایسے ہر معاہدے کے ساتھ محمدؐ کا حلقہ اثر بڑھنے لگا اور مکہ دھندلا کر رہ گیا۔

اگر ان قبائل میں سے چند نے باضابطہ اسلام قبول کر لیا تھا تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں تھا۔ باہمی دفاع کا معاہدہ اور محمدؐ کے اختیار کو تسلیم کرتے ہی یہ قبیلے امہ کا حصہ بن جاتے تھے۔ وقت آنے پر یہ اعتماد، ایمان اور یقین، ان سے عملی تعاون میں بدل جائے گا۔ پھر، یہ معاہدے صرف وعدے نہیں تھے بلکہ روایتی طور پر خراج اور تحائف کا تبادلہ کیا جاتا تھا۔ اس طرح محمدؐ اب مدینہ کے لیے آمدن کے نئے ذرائع پیدا کر رہے تھے۔ چنانچہ، جلد ہی مومنین کے لیے ایک خزانے کی بنیاد بھی رکھ دی گئی۔ اس میں قبائل سے وصول ہونے والے خراج کے علاوہ مکہ کے تجارتی قافلوں پر دوبارہ سے منظم انداز میں شروع ہونے والے حملوں سے حاصل ہونے والا مال غنیمت اور دولت بھی جمع ہونے لگی، کیونکہ بدو قبائل کی حمایت ملنے کے بعد مکہ کے تجارتی قافلے غیر محفوظ ہو چکے تھے۔ مثال آج کی طرح، اس وقت بھی پیسہ کھل کر بولا کرتا تھا اور یوں مدینہ میں محمدؐ کی حمایت بڑھتی ہی چلی گئی۔ صرف دو سال کے عرصے میں آپؐ ایک ثالث سے کہیں بڑا کردار ادا کر رہے تھے۔ مراد یہ ہے کہ اب وہ باقاعدہ ایک سیاسی قوت بن چکے تھے۔ شاید پہلی بار وہ خود کو صرف مومنین کا ہی نہیں بلکہ پورے مدینہ کا رہنما بنتا دیکھ رہے تھے۔ پہلی ہی بار وہ روحانی اور سیاسی اختیار کو مجتمع کر کے ایک ہی نقطے پر سمیٹ رہے تھے۔

لیکن طاقت اور اختیار اسی وقت تک کار آمد ہوتا ہے، لوگ اس کا دھیان رکھتے ہیں، جب تک کہ اس کا مظاہرہ ہوتا رہے۔ یہ اس وقت کی سیاسی منطق اور انتہائی اہم ضرورت تھی۔ محمدؐ کے لیے اس ضمن میں ابھی بھی اس کا واقعی مظاہرہ کرنا باقی تھا۔ الہامی آواز نے درگزر کرنے اور برداشت پر زور دیا تھا لیکن یہ اس وقت کی بات ہے جب آپؐ کے ساتھ صرف گنے چنے، چند ہی لوگ تھے۔ اگر وہ واقعی اس نئے نظام کو مستحکم بنانا چاہتے تھے اور اپنا اختیار واضح کرنا چاہتے تھے تو ضروری تھا کہ وہ وقت کے نئے تقاضوں پر پورا اتریں۔ یہ مقام کئی تقاضوں میں سے ایک، سنگ دلی کا متقاضی تھا۔ جو اس وقت کی ریت تھی، طاقت کا یہ بے دریغ استعمال مدینہ میں ہی کیا جائے گا۔ مدینہ کے یہودی قبائل ایک سیاسی ضرورت کی بھینٹ چڑھ جائیں گے۔

انسان بھی عجب کارخانہ قدرت ہے۔ اسے تلخ کا شدید ترین احساس دشمن سے نہیں بلکہ ان سے ملتا ہے جو کبھی عزیز ترین ہوا کرتے تھے۔ صرف اور صرف یہی ہوتے ہیں جو دوسرے کو اندر ہی اندر، گہرائی تک مایوس کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ سب سے پہلے تو بے وفائی کا شدید نفی احساس کہ، 'تم کیوں کر یہ کر سکتے ہو؟' یہ احساس اندر تک کاٹ کر رکھ دیتا ہے۔ یہ صرف اس لیے نہیں ہوتا کہ خود اپنی سوچ اور توقعات پر حیرت ہے بلکہ غیر مشروط ساتھ کو دوستی سمجھ بیٹھنے کی اپنی غلطی ہوتی ہے۔ جب اس طرح کی توقعات دم توڑتی ہیں تو اس میں دوسرا شخص غلط ہی نظر آتا ہے اور ہم انسان اس کو ذاتی انا کا مسئلہ بنا کر بے وفائی، دغا، غداری اور افشائے راز جیسے کئی ناموں سے نواز دیتے ہیں۔

محمدؐ کا خیال یہ تھا کہ مدینہ کے یہودی ان کے پیغام پر فوراً ہی لبیک کہہ دیں گے۔ آخر، ان کے پیغمبر آپؐ کے بھی پیغمبر تھے۔ وہ بھی ان ہی کی طرح مقدس ذات سے سبق لے رہے تھے، بعینہ ویسے ہی خدائی الہام کے مستحق ٹھہرائے گئے تھے۔ انہوں نے بالکل ان کی ہی طرح اپنے لوگوں، یعنی مکہ کے بابیوں کو وعید سنائی تھی۔ قران میں بھی جابجا عبرانی بائبل کے تمام ہی الہامی کرداروں، آدم سے لے کر ابراہیم، یوسف اور موسیٰ، سلیمان اور الیاس، الغرض سب کو ہی شاندار الفاظ میں عزت بخشی گئی تھی۔ عربوں کی طرح یہودی بھی اب خدا کو اللہ، یعنی برتر ذات اور بسا اوقات عزت مند الفاظ میں جیسے قران میں بھی آیا ہے، الرحمان یعنی رحم کرنے والا کے ناموں سے یاد کرتے تھے۔ اس دور کے بابل کی تلمود میں بھی تو خدا یعنی اللہ کو رحمانہ کے نام سے پکارا گیا ہے۔ محمدؐ کے لیے یہ بالکل عیاں تھا کہ یہودی اور مسلمان دونوں ہی ابراہیم کے وارث ہیں۔ ابراہیم قدیم روایت میں پہلے حنیف مشہور ہیں۔ ان کے نزدیک، یہ دونوں توحد انیت کے ایک ہی درخت کی دو شاخیں ہیں۔ کیا ہوا اگر وہ مختلف ہیں، جس بھی صورت سے کہیے، یہ عم زاد ہیں۔ اجنبی تو نہیں ہیں۔ پھر، یہودی تو ہمیشہ سے ہی دین ابراہیم کے داعی رہے ہیں۔ دین

ابراہیم سے مراد ابراہیم کی ریت، طریقہ ہے۔ اسی وجہ سے محمدؐ نے اپنے تئیں یہ سوچ لیا کہ انہیں نہ صرف یہودیوں کی رضامندی مل جائے گی بلکہ وہ تو ان کی حمایت میں پیش پیش رہیں گے۔ ویسے بھی، اس نئے الہامی پیغام کی قدیم زمانوں میں اتاری گئی کسی بھی وحی پر فوقیت عیاں تھی۔ اس کی بڑائی میں کوئی دو رائے نہیں تھی۔ چنانچہ، محمدؐ کے لیے یہودیوں کا یہ طور ناقابل یقین اور سمجھ تھا کہ آخر کوئی بھی شخص، جو پہلے سے ہی ایک خدا کی عبادت کرتا ہے، وہ اس جدید مگر واضح پیغام کو کیونکر رد کر سکتا ہے؟

بے شک پہلے پہل تو ایسا ہی لگتا تھا کہ مدینہ کے یہودی محمدؐ کو کھلے دل اور دماغ سے قبول کر لیں گے۔ مدینہ میں آباد ان کے تین بڑے قبیلوں کے تقریباً سبھی کنبے آگے آئے تھے اور بخوشی ثالثی کے معاہدے پر دستخط اور مہریں ثبت کر کے، امہ کا حصہ بن چکے تھے۔ لیکن، ان کی حیثیت دوسرے درجے کے شہریوں جیسی تھی۔ یعنی، انہیں اوس اور خزرج کا معاہد یا ساتھی یا رفیق یا شریک کہا گیا تھا۔ قران کی الہامی آواز نے 'اہل کتاب' سے اس ضمن میں براہ راست اپیل بھی کر رکھی تھی۔ محمدؐ سے کہا گیا کہ وہ کہیں، 'ہم اللہ کو مانتے ہیں۔ اس تعلیم کو مانتے ہیں جو ہم پر نازل کی گئی ہے۔ ان تعلیمات کو بھی مانتے ہیں جو ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور اولاد یعقوب پر نازل ہوئی تھیں اور ہدایات پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو موسیٰ اور عیسیٰ اور دوسرے پیغمبروں کو ان کے رب کی طرف سے دی گئیں۔ ہم ان کے درمیان فرق نہیں کرتے اور ہم اللہ کے تابع فرمان ہیں۔' اسی طرح ایک دوسری آیت کہ، 'ہم اللہ کے مسلم ہیں'۔ قران ہی میں مومنین کو ہدایت دی گئی تھی کہ وہ یہودیوں کے ساتھ بحث میں نہ پڑیں اور ان کا رویہ، جیسا کہ اس آیت میں کہا گیا، 'اور اہل کتاب سے بحث نہ کرو مگر عمدہ طریقے سے، سوائے ان لوگوں کے جو ان میں سے ظالم ہوں' بلکہ تاکید کی کہ وہ تو ان سے کہا کریں، 'اے اہل کتاب! آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے۔ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب نہ بنالے۔۔۔'۔ یہاں پر درپیش صورتحال کے پیش نظر عیسائیوں کو تخاطب میں زیادہ تر باہر رکھنا سمجھ بھی آتا ہے۔ لیکن جلد ہی ایسی آیات بھی آئیں گی جن میں ان کو بھی مخاطب کیا جائے گا۔ مثلاً، 'یقین جانو کہ نبی عربی کو ماننے والے ہوں یا یہودی، عیسائی ہوں یا صابی۔۔۔ جو بھی اللہ اور روز آخر پر ایمان لائے گا اور نیک عمل کرے گا اس کا اجر اس کے رب کے پاس ہے اور اس کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں ہے۔' قصہ مختصر، جیسا اوپر ایک آیت میں بیان ہوا، ہر اس شخص کو پکارا گیا جو وحدانیت کا ماننے والا تھا۔ قدیم دور کے پیغمبروں پر یقین رکھتا چلا آرہا تھا۔

لیکن مسئلہ یہ تھا کہ مدینہ کے یہودیوں کے پاس محمدؐ کو عیسیٰ کی ہی مانند پیغمبر ماننے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ وہ بدستور اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ پیغامبری کا دور بارہ صدیاں پہلے ہی، بابل سے اخراج کے ساتھ ہی ختم ہو چکا تھا۔ بعد اس کے کوئی پیغمبر نہیں تھا۔ جس طرح قریش نے حتمی طور پر اعلان کر دیا تھا کہ وہ 'آباؤ اجداد کے طریق' کو نہیں چھوڑ سکتے، اسی طرح یہودی بھی اپنی انہی روایات پر جم کر کھڑے ہونے پر مصر تھے۔ دو سال میں بمشکل ہی کسی یہودی نے اسلام قبول کیا تھا۔ یہودیوں کی یہی روش محمدؐ کے لیے حیران کن تھی۔ ان کو برہم کرنے کے لیے کافی تھی۔

مکہ میں تو قران کی الہامی آواز خدائی پیغام کو پھیلانے میں درپیش مشکلات بارے کافی نرم خو ہوا کرتی تھی۔ جیسے، 'اے نبی، ہم نے سب انسانوں کے لیے یہ کتاب برحق تم پر نازل کر دی ہے۔ اب جو سیدھا راستہ اختیار کرے گا، اپنے لیے کرے گا اور جو بھٹکے گا اس کے بھٹکنے کا وبال اسی پر ہو گا۔ تم ان کے ذمہ دار نہیں ہو'۔ لیکن مدینہ میں محمدؐ یہودیوں کی بابت خاصے ذمہ دار نظر آرہے تھے۔ یہودیوں کی عدم دلچسپی بھی تو بہت ہی زیادہ تھی۔ وہ کٹر اپنی جگہ پر کھڑے تھے اور نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں طرف سے سختی اور اڑیل پن نظر آنے لگا۔ آپؐ ان کو جتنا منانے کی کوشش کرتے یہ اتنا ہی سختی سے انکار کر دیتے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بالآخر ان کی بابت قران کی الہامی آواز بھی بدل گئی۔ اس میں بھی محمدؐ کی سی برہمی جھلکنے لگی۔ جیسے یہ آیت، 'اے اہل کتاب! کیوں اللہ کی آیات کا انکار کرتے ہو حالانکہ تم خود ان کا مشاہدہ کر رہے ہو؟' اور یہ کہ، 'اے اہل کتاب! کیوں حق کو باطل کا رنگ چڑھا کر مشتبہ بناتے ہو؟ کیوں جانتے بوجھتے حق کو چھپاتے ہو؟' جلد ہی یہودیوں کو براہ

راست مخاطب کرنا چھوڑ دیا گیا اور ان کا حوالہ صیغہ غائب یا غیر متعلق کے طور پر دیا جانے لگا۔ اب انہیں 'ہم' نہیں بلکہ 'وہ' کہہ کر پکارا جانے لگا۔ قران کے نزدیک ان میں سے کچھ تو اب بھی، 'مستقیم اور قابل عزت' تھے مگر دوسرے سب ہی وہ تھے کہ، 'جنہوں نے اپنے دین کو کھیل اور تفریح بنالیا تھا۔' ان کی مثال بالکل مکہ کے منکرین جیسی تھی۔ کیا وہ دیکھ نہیں سکتے تھے کہ اس طرح وہ اپنے ہی دین کی نفی کر رہے ہیں؟ اور یہ کہ قران نے کبھی بھی قدیم تورات کی نفی نہیں کی تھی بلکہ یہ تو اس کی تجدید کر رہا تھا؟

لیکن، بہر حال یہودیوں کو اس تجدید کی چنداں ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ بلکہ وہ تو اس بات پر شاکی تھے کہ ایک غیر شخص، باہر کا آدمی انہیں بتا رہا تھا کہ لے دے کر، وہ اپنے دین سے ہٹے ہوئے، جتنا ہونا چاہیے، اتنے اچھے یہودی نہیں تھے۔ چنانچہ، یہودیوں کے ربیوں نے قرانی استدعا کو یکسر رد کر دیا۔ ابن اسحاق کی تصنیف میں ان ربیوں کے محمدؐ کے ساتھ مکالموں پر مبنی کئی صفحات بھرے پڑے ہیں۔ وہ جا بجا تکرار کرنے لگے۔ آپؐ کو بحث میں کھینچنے لگے۔ 'قضیے کو بڑھاتے ہوئے' دعویٰ کرنے لگے کہ دراصل محمدؐ کے بیان کردہ قصائص غلط ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ اس طرح کے مکالمے کبھی نہیں ہوئے۔ وجہ یہ ہے کہ قران میں بیان کردہ قصائص کی تفصیلات واقعی ان قدیم نسخوں سے قدرے مختلف تھی جنہیں آج بھی مغرب میں باقاعدہ شرعی اور درست مانا جاتا ہے۔ آج کی نسبت، اس وقت تو مشرق وسطیٰ کے طول و عرض میں ان پر کہیں زیادہ اتفاق رہا کرتا ہو گا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ان قصائص کے کئی طرح کے نسخے، جو بنیادی طور پر ایک دوسرے سے کہیں مختلف ہیں، اس خطے کے طول و عرض میں مل جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مغرب میں اس بابت جس تفصیل کو 'غلط' کہہ کر پکارا جاتا ہے، اس کی حیثیت مشرقی چرچوں کی قصہ خوانی میں جھول سے زیادہ کچھ بھی نہیں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہاں اصل مسئلہ مذہب کا نہیں بلکہ سیاست سے تعلق رکھتا تھا۔ مدینہ کے تین یہودی قبائل پہلے ہی پانچویں صدی میں اوس اور خزرج کی مدینہ میں مستقل سکونت کے بعد اقلیت بن چکے تھے۔ اور اب، محمدؐ کا اثر رسوخ تیزی سے بڑھ جانے کے باعث ان کو خدشہ تھا کہ شاید وہ تعداد کے لحاظ سے مزید پیچھے رہ جائیں گے۔ پہلے پہل شاید، ان میں اتحاد ہوتا تو وہ مدینہ کے اندر ایک سیاسی قوت بن کر ابھر سکتے تھے۔ لیکن بجائے اس کے، وقت کے ساتھ ان کے نئے قبائل کے ساتھ تنازعات بڑھتے ہی چلے گئے۔ یہی نہیں، ان قبائل کے آپس میں بھی کچھ اتنے خاص برادرانہ تعلقات نہیں تھے اور اختلافات جنم لیتے ہی رہتے تھے۔ یہاں تک کہ محمدؐ کی مدینہ میں ایک ثالث کی حیثیت سے آمد کے بعد بھی وہ آپس میں سینگ اڑاتے رہے اور اس روش کا خود انہیں شدید نقصان پہنچا۔ چونکہ اس سے پہلے بھی ان کی اکثریت، اقلیت میں بدل چکی تھی۔ اب محمدؐ کی بڑھتی ہوئی طاقت کو وہ نہ صرف مذہب بلکہ مدینہ میں اپنے مستقبل کے حوالے سے بھی خطرے کے طور پر دیکھ رہے تھے۔ ان کے یہ خدشات جلد ہی درست ثابت ہوں گے۔

اگرچہ یہ واضح تھا کہ محمدؐ کو یہودیوں کی جانب سے اس طرح مخالفت اور الہامی پیغام سے عداوت پر سخت مایوسی ہوئی تھی لیکن وہیں یہ بھی طے ہے کہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ انہیں بھی یہودیوں پر واضح کرنا ہو گا کہ وہ اس بابت کسی بھی طرح آسانی سے مایوس ہونے والے نہیں تھے۔ بجائے اس کہ وہ مدینہ کی ایک بڑی آبادی کی مخالفت مول لیتے، انہیں ایسا طریقہ اختیار کرنا تھا کہ الہامی پیغام کی مخالفت کرنے والوں کو سبق سکھا کر ان کی ایک مثال بنا دی جائے۔ چنانچہ، یہودیوں میں سب سے چھوٹا قبیلہ جس کو بنی قینقاع کہا جاتا تھا، پہلی مثال بن گیا۔

ایک روایت میں اس کو ابن اسحاق کی زبان میں 'قینقاع کی واردات' کہا گیا ہے۔ یہ واقعہ جنگ بدر کے تقریباً ایک مہینے بعد مدینہ کے بازار میں پیش آیا۔ بنی قینقاع سے تعلق رکھنے والے ایک نوجوان لڑکے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے یہاں ایک بدو لڑکی کو چھیڑا تھا۔ یہ لڑکی بازار میں خوانچہ لگائے کچھ بیچ رہی تھی کہ یہ لڑکا آیا اور اس کا پردہ اٹھا کر چھیڑ خوانی کرنے لگا۔ لڑکی نے اس حرکت پر اسے گالیاں دی اور سخت برا بھلا کہا۔ لڑکے اور اس کے دوست کی خاصی سبکی ہوئی۔ چنانچہ، انہوں نے بدلہ لینے کی غرض سے ایک اور ایسی ہی حرکت کر ڈالی۔ کیا یہ کہ، چھپ کر لڑکی کے لباس کے لٹک رہے کپڑوں کو قریب ہی ایک کھمبے نما سے

باندھ دیا۔ جب لڑکی اٹھی تو کھنچاؤ کی وجہ سے شلوار پھٹ گئی اور وہ بیچ بازار میں نیم عریاں ہو گئی۔ جب یہ واقعہ پیش آیا تو قریب ہی ایک مومن کا گزر تے ہوئے لڑکوں پر نظر پڑ گئی اور اس نے انہیں یہ حرکت کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا، چنانچہ وہ غصے سے آگے بڑھا اور لڑکی پر ہنستے ہوئے مردوں کو خوب لعن طعن کی۔ بات بڑھ کر ہاتھا پائی تک پہنچ گئی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان میں سے ایک شخص قتل ہو گیا اور خود مومن کو بھی مقتول کے وارثین نے موقعہ پر ہی جان سے مار دیا۔

اس روداد میں سارا الزام قینقاع پر دھر دیا جاتا ہے کہ پہلے تو انہی میں سے ایک نے ایک انتہائی بیچ حرکت کی اور پھر جب اس کا نتیجہ ایک شخص کے قتل کی صورت نکلا تو بجائے یہ کہ وہ ثالثی کے لیے محمدؐ سے رجوع کرتے، خود ہی معاملے کو اپنے ہاتھ میں لے کر قاتل سے وہیں بدلہ بھی چکا دیا۔ حالانکہ اس نے انہیں اپنی حرکت پر صرف شرمسار کیا تھا۔ بھرے بازار کے وسط میں یوں ایک لڑکی کو رسوا کرنا، اس کی عصمت کے ساتھ کھیلنا، کسی بھی شخص کو تاؤ دلا سکتا ہے۔ کوئی بھی عزت دار شخص ایسا واقعہ دیکھ کر آپے میں نہیں رہ سکتا، وہ یقیناً اس کو روکنے کی کوشش کرتا۔ باوجود اس کے، اس روایت کا کچھ حصہ ناقابل اعتبار اور غیر معتبر ہے۔ وہ یوں کہ مدینہ کی کوئی عورت اور ایک بدو لڑکی، بالخصوص مشقت اور مزدوری کرنے والی بدو لڑکیاں اس وقت تک ہرگز پردہ نہیں کرتی تھیں۔ حجاب اور پردے کا تصور تو اس واقعہ کے تین سال بعد، اور اس وقت بھی صرف اور صرف محمدؐ کی منکوحہ بیویوں کے لیے خود قران نے متعارف کیا تھا۔ تاہم، مدینہ کے بازار میں پیش آنے والا یہ غل غپاڑہ قینقاع کی مدینہ سے بے دخلی کا پیش خیمہ ثابت ہو گا۔

لیکن، اس کے علاوہ بھی دوسری وجوہات تھیں۔ یہ خالصتاً سیاسی ہیں۔ ان میں سے ایک کا محور دشمن کے ساتھ مل کر مدینہ کی آبادی کے خلاف سازباز کرنا تھا۔ آخر کسی نے تو ابوسفیان تک مدینہ سے روانہ ہونے والے تین سو لوگوں کے لشکر کی اطلاع پہنچائی ہی تھی، جس کے بعد وہ فوراً ہی اس تجارتی قافلے نے نہ صرف رخ بدل دیا تھا بلکہ مکہ سے کمک بھی منگوالی تھی۔ اگرچہ اس معاملے میں قینقاع کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت تو موجود نہیں تھا مگر چونکہ یہ مکہ کے ساتھ گہرے تجارتی تعلقات رکھتے تھے، اس کے پیش نظر ان پر شبہ کیا جاتا رہا تھا۔ یہاں بھی بہر طور، قینقاع اصل ہدف نہیں تھے بلکہ ایک بڑے سیاسی کھیل میں ان کی حیثیت صرف ایک مہرے کی تھی۔ مدینہ کی اس سیاسی بساط میں اصل شکار تو قبیلہ خزرج میں قینقاع کا بڑا حامی عبداللہ بن ابی نامی شخص تھا۔

ابن ابی قبیلہ خزرج میں ایک نامی گرامی، پختہ اور آزمودہ سردار تھا۔ محمدؐ کی آمد سے قبل تک وہ نخلستان کی باگ ڈور سنبھالنے کے خواب دیکھ رہا تھا اور قریب تھا کہ اپنی سیاسی بصیرت اور ذہانت کے سبب مدینہ کا سربراہ مقرر ہو جاتا۔ مشہور تھا کہ جلد ہی وہ 'مدینہ کا شہزادہ' بن جائے گا اور ایسی ہی ایک دوسری افواہ میں کہا جاتا تھا کہ، 'اپنے تاج میں ہیرے بھی جڑ کر رکھ چھوڑے ہیں'۔ یہ تو معلوم نہیں ہے کہ آخر ابن ابی کا مدینہ کی سیاست اور اختیار پر حاکمیت قائم کرنے کا طریقہ کیا ہوتا، بالخصوص ان حالات میں جب اوس اور خزرج ایک دوسرے کے مدمقابل، تنازعات میں گھرے ہوئے تھے۔ شاید، وہ خود کو ان دونوں قبائل کے بیچ ایک صلح جو کی حیثیت سے دیکھتا آیا تھا۔ اس نے اس دھوکے میں کہ شاید محمدؐ اس کے مقاصد کے حصول میں مدد کریں گے، فوراً اسلام قبول کر لیا تھا۔ اگر ایسا تھا تو پھر اس کی یہ غلط فہمی جلد ہی دور ہو چکی ہو گی۔ مہاجرین اور انصار کے بیچ قائم کی جانے والی تمیز سے کردار بھی واضح ہو گیا تھا کہ ان میں سے کون ہے جو مدد کرنے والا ہے اور کس کی مدد کی جانی ہے؟ لیکن مدینہ میں اس بابت یہ صرف ابن ابی نہیں تھا جو یہ محسوس کرتا ہو کہ محمدؐ کی روحانی قوت، سیاسی سوچ اور اختیار میں ڈھلتے ہوئے امتیاز برت رہی ہے۔

انصار میں تقریباً ہر شخص یہ دیکھ سکتا تھا کہ محمدؐ کے انتہائی قریبی مشیران میں ابوبکر، عمر اور علی ہی تھے جو تینوں مہاجر تھے۔ گو انصار نے ان کا خیر مقدم تو کر لیا تھا مگر ان میں سے اکثر انہیں دل سے قبول نہیں کر پائے تھے۔ مہاجرین میں ابھی تک غریبت جھلکتی تھی۔ یہ بدستور ایک بڑے شہر سے وارد ہونے والے مغرور لوگ تھے جو یہاں آن کر بس گئے تھے۔ اب وہ نہ صرف یہاں کا اختیار سنبھال رہے تھے بلکہ وہ مدینہ کو جنگ و جدل اور مکہ کے ساتھ تنازعات میں جھونک کر خطرات سے دوچار کر رہے تھے۔ انصار کی یہ تعداد اور مدینہ کی باقی ماندہ آبادی جس نے ابھی تک اسلام قبول نہیں کیا تھا، وہ محمدؐ کے بڑھتے ہوئے سیاسی کردار سے شاکی تھے۔ ابن ابی اس گروہ میں سب سے زیادہ بولنے والا، اس ضمن میں بڑھ چڑھ کر تحفظات کا اظہار کیا کرتا تھا۔

پھر، یہاں ابن ابی کی بات توجہ سے سنی بھی جاتی تھی۔ وہ مدینہ کی سیاست میں کلیدی شخصیت، ایک مرکزی کردار کی حیثیت رکھتا تھا۔ نہ صرف یہ کہ اس کی بات کو مقامی آبادی وزن دیتی تھی بلکہ مکہ کے تجارتی قافلوں پر کی جانے والی چھاپہ مار کاروائیوں کو اس نے کھل کر مذمت اور مخالفت کی تھی۔ اس نے بدر کی مہم میں حصہ لینے سے انکار کر دیا تھا۔ لیکن اب چونکہ فتح کے بعد اس کے اس فیصلے پر سوال اٹھ رہے تھے تو وہ سیاسی طور پر کمزور ہو گیا تھا۔ اس کے باوجود، محمدؐ کے لیے اس پر براہ راست معترض ہونا ممکن نہیں تھا۔ ابن ابی پر چڑھائی کرنے کا مطلب خزرج کے پورے قبیلے کو اشتعال دلا کر، اپنی مخالفت پر مجبور کرنے کے مترادف تھا۔ چنانچہ، حکمت کا تقاضا یہ تھا کہ ابن ابی کو بلاواسطہ چیلنج کرنے کی بجائے اس کو اپنے اتحادیوں کی حفاظت میں ناکامی سے دوچار کر دیا جائے۔ اس کے حمایتی، یعنی بنی قینقاع کو 'آئین مدینہ' کی خلاف ورزی کا مرتکب قرار دے کر علیحدہ کر دینے سے یہ مقصد بخوبی پورا ہو سکتا تھا۔ یعنی، ابن ابی کے لیے ان کا بچاؤ کرنا کسی طور بھی ممکن نہ رہتا۔ اس پر تنقید ہوتی اور اقتدار کے اس امیدوار سے سیاسی طور پر جان چھوٹ جاتی۔

سیاسی کشمکش اور اقتدار کی اس جنگ کے بیچ میں یوں گھر جانا: بنو قینقاع کے لیے آخری حربہ ہوتی مگر بہر حال اب وہ اس بساط میں بری طرح نشانے پر تھے۔ اب اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ اس کی وجہ بازار میں ایک لڑکے کی حماقت کے نتیجے میں ہونے والا قتل تھا یا وہ دشمن کے ساتھ ساز باز میں شریک رہے تھے یا پھر انہوں نے اس نئے سیاسی نظام کے ناقدین کے ہاتھ مضبوط کیے تھے۔ محمدؐ نے فیصلہ سناتے ہوئے ان کو سرکشی اور بغاوت، بد خواہی کا مرتکب پایا اور حکم دیا کہ ان کے پیروکار قینقاع کے گاؤں کا محاصرہ کر لیں۔ انہیں اپنے مضبوط گڑھ سے نکال دیں اور اس کے لیے طاقت کا استعمال کرنا پڑے تو وہ کر گزریں۔

اس معاملے پر یہ محمدؐ کا انتہائی سخت اور شدید ردعمل ہے۔ لیکن اصل نکتہ ہی یہ ہے کہ اس طرح پہلی بار انہوں نے اپنے اختیار اور طاقت کا بھرپور استعمال کیا تھا اور مخالفین پر واضح کر دیا تھا کہ ابن ابی، اس اختیار اور طاقت کو استعمال کرنے کے قابل نہیں ہے۔ قینقاع کا محاصرہ پندرہ روز تک جاری رہا۔ یہاں تک کہ پانی کی قلت پیدا ہو گئی اور نتیجتاً انہوں نے ہتھیار ڈال کر خود کو محمدؐ کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ مدینہ میں ہر کسی کا خیال یہ تھا کہ شاید وہ عمومی شرائط ہی لاگو کریں گے۔ جیسے، قینقاع اپنے ہتھیار پھینک دیں گے۔ ان کی آئندہ کئی برسوں تک آمدن ضبط کر لی جائے گی اور ان کے سرداروں کو کچھ عرصے کے لیے زیر حراست رکھا جائے گا۔ لیکن، محمدؐ نے انہیں بیڑیاں پہنانے کا فیصلہ سنا کر سب کو ہکا بکا چھوڑ دیا۔ ان کے لیے سزا یہ تجویز کی گئی کہ مردوں کو قتل، عورتوں اور بچوں کو غلام بنا کر ساری جائیداد ضبط کر لی جائے گی۔

ابن ابی نے فیصلہ سنتے ہی فوراً بیچ میں کود کر محمدؐ سے شفاعت کی استدعا کر دی۔ قینقاع اس کے وفادار چلے آ رہے تھے اور اب ان سے وفاداری نبھانے کی باری اس کی تھی۔ بلکہ اس فیصلے کے نتیجے میں اس کی ساکھ داؤ پر لگ چکی تھی۔ اس کی دھاک اور وقار کہ بحیثیت کھرے رہنما، اس کے لیے لازم تھا کہ وہ اپنے اتحادیوں کو بچانے کے لیے ہر ممکن کوشش کر گزرے۔ لیکن، ابن ابی کے ہاتھ میں اس مقصد کے لیے واحد ہتھیار خنجر اور بلوہ تھا۔ اس نے محمدؐ پر گرج کر کہا، 'میرے رفیقوں کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ یہ سات سو مرد جنہوں نے ہر حال، دشمن کے سامنے میرا ساتھ دیا ہے، تم چاہتے ہو کہ ایک صبح میں یوں ہی کاٹ کر مار دیے جائیں؟ واللہ، میں اس فیصلے پر خود کو غیر محفوظ سمجھتا ہوں۔ مجھے تو یہ خوف ہے کہ نجانے مستقبل میں کیا کچھ ہونے والا ہے'۔

محمدؐ نے اس پر بجائے کچھ کہنے، پیٹھ پھیر کر اپنی راہ لی۔ اس پر ابن ابی غصے سے سرخ ہو گیا۔ آخر محمدؐ کی ہمت کیسے ہوئی کہ وہ اس پر یوں پیٹھ پھیرتے؟ چنانچہ، اس نے دوڑ کر انہیں گریبان سے پکڑ لیا اور یہ دونوں اشخاص ایک دوسرے سے کھینچ تان کرنے لگے، 'خدا تمہیں غارت کرے، مجھے جانے دو!' محمدؐ نے چلا کر کہا۔ ان کے ماتھے پر رگیں ابھر کر پھڑپھڑانے لگیں اور غصے سے چہرہ سرخ ہو گیا۔ لیکن ابن ابی نے بدستور انہیں سختی سے پکڑے رکھا اور کہا، 'میں تمہیں اس وقت یہاں سے جانے نہیں دوں گا، جب تک تم ان کے ساتھ بہتر سلوک نہیں کر لیتے'۔

یہ ماجرا دیکھ کر محمدؐ کے حامی ان کی مدد کرنے کو آگے بڑھے لیکن تب تک کھینچ تان میں محمدؐ کا گریبان پھٹ چکا تھا اور خود کو ابن ابی کی گرفت سے آزاد کرا لیا۔ انہوں نے سر کو جھٹکا اور آگے بڑھنے والوں کو اشارے سے روک دیا۔ اب یہاں سے معاملے کو مزید طول دینے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ ابن ابی نے ابھی ابھی ایک اصول سمجھ کر اس کے آگے سر تسلیم خم کر دیا تھا۔ یعنی یہ کہ فیصلہ کرنے کا اختیار محمدؐ کے پاس تھا اور یہ صرف اور صرف آپؐ کا اختیار تھا۔ صرف ان کا حکم چلا کرے گا اور صرف ان کا ہی حکم ہے جو قینقاع کی جان بخشی کر سکتا تھا۔ اور اب چونکہ ابن ابی کو یہ بات اچھی طرح سمجھ آ چکی تھی، سمجھوتہ کرنے میں کوئی حرج نہیں تھی۔ بلکہ، یہ محمدؐ کے لیے سیاسی طور پر سود مند تھا۔ آپؐ پیچھے ہٹ کر کچھ سوچنے لگے اور ایک توقف کے بعد اس قضیے کو حتمی طور پر یوں سمیٹ لیا کہ، 'یہ تمہارے ہیں۔ ان کو جہاں چاہے لے جاؤ۔' قینقاع مدینہ کے نخلستان کے سوا کہیں بھی جا سکتے تھے۔ دو ہزار افراد کے لیے بے دخلی کا حکم دے دیا گیا۔

جلاوطن کرنے کی سزا نئی نہیں تھی۔ انفرادی طور پر یوں زبردستی بے دخل کرنے کے کئی واقعات پیش آ چکے تھے اور عرب شاعری میں باغیانہ روش پر بے دخل ہو جانے والے کرداروں کا تذکرہ جا بجا ملتا ہے مگر ایک قبیلے کی یوں ایک ساتھ خروج کی حالیہ تاریخ میں یہ قدرے نئی مثال تھی۔ یہ اجتماعی سزا تھی۔ اور بجا طور پر یہ قتل عام اور غلامی سے کم معلوم ہوتی تھی مگر پھر بھی گہرے معنوں میں سخت فیصلہ تھا۔ قینقاع کے لوگ ابھی تک ابن ابی سے توقع رکھتے تھے کہ وہ محمدؐ کے ساتھ بات چیت کر کے اس سزا میں تخفیف کروا سکتا ہے لیکن اس کی بعد اس کے، ایک بھی نہ چلی۔ اسے مات ہو چکی تھی، اختیار کم ہو گیا تھا اور اس کا اثر رسوخ اس قدر زائل ہو چکا تھا کہ اصل فیصلے کو جلاوطنی میں بدلنا بھی محمدؐ کی مرضی معلوم ہوتا تھا۔

فیصلے کے تیسرے روز ہی قینقاع کا وداع عمل میں آ گیا۔ مدینہ کے نخلستان میں ہر شخص جان گیا کہ اب اختیار محمدؐ کے پاس ہے۔ وہ مدینہ سے یوں رخصت ہوئے کہ عورتیں اور بچے اونٹوں پر سوار تھے اور مرد پیدل چل رہے تھے۔ ان کا رخ مدینہ سے ساٹھ میل شمال کی جانب یہودیوں کے اکثریتی نخلستان خیبر کی طرف تھا۔ انہیں صرف وہی سامان ساتھ لے جانے کی اجازت دی گئی تھی جو وہ اپنے ساتھ لے جا سکتے تھے۔ پیچھے رہ جانے والا مال و اسباب اور جائیدادیں جس میں زمین، کھجور کے باغات اور مکانات شامل تھے مہاجرین میں برابر تقسیم کر دیے گئے جبکہ اس کا پانچواں حصہ مدینہ کے مال خانے کی ملکیت قرار پایا۔ مدینہ کی ساری آبادی خاموشی سے یہ سب دیکھتی رہی۔ اگرچہ یہ عیاں تھا کہ کبھی خود جلاوطن ہونے والے اب دوسروں کو ملک بدر کر رہے تھے لیکن اس وقت کسی شخص نے اس ستم ظریفی پر تبصرہ کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

بدر کے عواقب کا خمیازہ بھگتنے والے صرف بنی قینقاع نہیں تھے۔ اس وقت شاعر ہونا بھی خطرے سے خالی نہیں تھا۔ اگرچہ آج جدید دور میں شاعروں کو بے ضرر سمجھا جاتا ہے مگر مغرب کی زبان میں کہیں تو شاعر ساتویں صدی عیسوی میں خطہ عرب میں راک سٹار ہوا کرتے تھے۔ اس کی وجہ صرف غزل گوئی، غنائی اور درد انگیزی نہیں تھی۔ عربی زبان میں کی جانے والی شاعری کی ایک صنف 'ہجو' بھی خاصی مشہور ہوا کرتی تھی۔ اس طرح کی شاعری میں شوخ مگر ایمائی اور فحش تجنیس، ذو معنویت اور دو دھاری گرہیں لگانا عام بات تھی۔ مشہور تھا کہ ہجو جس قدر شدید کاٹ رکھتی ہو، اتنی ہی مقبول ہوتی تھی۔ لیکن اگر الفاظ کی کاٹ، تیز دھار والی تلوار کی مثال جیسی لی جائے تو اس کا جواب بھی تیز تلوار کے وار سے ہی دیا جا سکتا ہے۔

ہجو یہ شاعری کرنے کی قیمت بھی یہیں پر واضح کر دی گئی۔ محمدؐ پر تنقید اور الفاظ کے تیر برسانے والی ایک پر مغز شاعرہ عاصمہ ہوا کرتی تھی۔ اس کی شاعری میں تنقید اور بے عزتی تو تھی ہی لیکن تضحیک اس لیے بھی بڑھ کر معلوم ہوتی تھی کہ یہ الفاظ ایک عورت اچھال رہی تھی۔ اگرچہ ترجمے سے شاعری کا ردھم اور تاثیر ختم ہو کر رہ جاتی ہے مگر پھر بھی، اس کی شاعری اتنی کاٹ دار تھی کہ لغوی معنوں میں بھی سنیں تو شدید حقارت اور بے حرمتی کا احساس ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر، 'اے خزرج کے ناکارہ، نامردو! کیا تم بھڑوے ہو؟/ تم ایک اجنبی کو اپنے گھونسلے پر قبضہ کرنے دو گے؟/ تم اس سے یوں امید لگا کر بیٹھے ہو جیسے مرد جو کی شربت کو لالچ سے دیکھتا ہے/ کیا کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں ہے، جو اس کو ئل سے اپنے گھونسلے کو بچائے؟'

گو اس سے پہلے بھی محمدؐ کو یوں ہی تضحیک اور بے حرمتی کا نشانہ بنایا جاتا رہا ہے۔ یہ مکہ میں ہوا کرتا تھا۔ وہاں آپؐ کے پاس اس طرح ٹھٹھے بازی اور تمسخر، طعنہ زنی اور جگ ہنسائی کو برداشت کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ مگر اب صورتحال بدل چکی تھی۔ محمدؐ نے آہ بھر کر کہا، 'کیا کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو مجھے اس عورت سے چھٹکارا دلائے؟'۔ آپؐ کی یہ خواہش عاصمہ کے ہی ایک رشتہ دار جو مومن تھا، اس کے لیے حکم بن گیا۔ اسی رات وہ اس عورت کے گھر پہنچ گیا اور دیکھا کہ وہ اپنے بچے کو سینے سے لگائے سو رہی ہے۔ اس نے اپنی تلوار سونت لی اور اس کے سینے میں گھونپ دی۔ اگلی صبح اس نے محمدؐ سے سوال کیا، 'کیا اس کو قتل کرنے کی پاداش میں مجھے کوئی سزا ملے گی؟' آپؐ نے دو ٹوک جواب دیا، 'اس کی قیمت چکانے کے لیے دو بکریاں بھی آگے نہیں بڑھیں گی!'

ایک دوسرا مخالف شاعر بھی تھا۔ اس کا نام ابو افق تھا۔ اس نے عاصمہ کی نسبت جو میں خاصی نرمی برتی تھی۔ کہا کرتا، 'یہ وہ شخص ہے جو باہر سے آیا اور اس نے ہمیں تقسیم کر دیا ہے/ دھڑلے سے کہتا ہے کہ، 'یہ جائز ہے اور وہ ناجائز ہے'/ لیکن اے مدینہ والو! اگر تم طاقت اور بڑائی میں یقین رکھتے ہو/ تم اپنے لوگوں میں سے ایک رہنما کیوں نہیں چن لیتے؟'۔ لیکن، اب صورتحال یہ تھی کہ اس طرح کی تنقید بھی قابل قبول نہیں تھی۔ محمدؐ نے اس کی بابت صرف اتنا کہا کہ، 'کون ہے جو اس لچے بدمعاش سے بدلہ لے سکتا ہے؟' اور فوراً ہی ایک شخص نے آگے بڑھ کر اس کو سبق سکھانے کی حامی بھر لی۔ عاصمہ کی ہی طرح، اس کا انتقام لینے کی بھی کسی نے جرات نہیں کی۔

تیسرے شاعر کا نام ابن اشرف تھا۔ گو وہ بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا مگر اس کا یہ فرار عارضی ثابت ہوا۔ اس کا تعلق یہودیوں کے ایک دوسرے قبیلے بنو نضیر سے تھا۔ یہ اپنے ہمراہ پچاس لوگوں کا وفد لے کر مکہ روانہ ہو گیا۔ اس کا مقصد قریش کو بدر کا انتقام لینے پر اکسانا تھا۔ اس نے لکھا، 'اس طرح کی لڑائی میں آنسو اور بارش طوفان بن کر برستے ہیں/ قریش کا پھول بدر کے کنوؤں کے گرداگرد آئے ہیں/ یہ وہ مقام ہے جہاں کئی نامور لوگ کاٹ کر پھینک دیے گئے'۔ اس کا جواب محمدؐ کے ایک دیرینہ ساتھی حسان بن ثابت نے یوں دیا کہ، 'بھونکو! یوں بھونکو جیسے ایک کتے کا پلا کتیا کے پیچھے روتا ہے/ خدا نے ہمارے رہنما کو اطمینان بخشا ہے/ وہ جو اس سے لڑے نیست و نابود ہو گئے'۔ بہادری کا مظاہرہ کہیں یا اسے ابن اشرف کی بیوقوفی جانیں، اس نے مدینہ واپس آ کر ابن ثابت کو منہ پر جواب دینے کا فیصلہ کر لیا۔ یہاں پہنچتے ہی اسے قتل کر دیا گیا۔

بنو قینقاع کی بے دخلی کے بعد بھی اگر کسی شخص کے ذہن، کونے کھدرے میں اگر دیے جانے والے پیغام کی ذرہ برابر بھی چوک باقی تھی تو وہ جلد ہی قرانی آیات کی صورت میں ایک حکم کی صورت دور کر دی گئی۔ یہ حکم مذہبی افعال میں ایک بڑی تبدیلی پر مشتمل تھا۔ یعنی، قبلہ بدل دیا گیا۔ اس سے پہلے مومنین بھی شمال کی جانب رخ کر کے یہودیوں کی مانند یروشلم میں معبد کے آگے سر ٹیکتے تھے اب اس کو جنوب کی طرف موڑ دیا گیا۔ قران میں یہ حکم کچھ یوں ہیں کہ، 'تمہارے منہ کا بار بار آسمان کی طرف اٹھنا ہم دیکھ رہے ہیں۔ لو، ہم اسی قبلے کی طرف تمہیں پھیرے دیتے ہیں جسے تم پسند کرتے ہو۔ مسجد حرام کی طرف رخ پھیر دو۔ اب جہاں کہیں تو ہو، اسی کی طرف منہ کر کے نماز پڑھا کرو۔ 'یعنی قبلہ بدل دیا گیا تھا اور یہودیوں کے بارے مزید کہا، 'یہ لوگ جنہیں کتاب دی گئی تھی، خوب جانتے ہیں کہ (تحویل قبلہ کا) یہ حکم ان کے رب ہی کی طرف سے ہے اور برحق ہے، مگر اس کے باوجود جو کچھ یہ کر رہے ہیں، اللہ اس سے غافل نہیں ہے۔'

قبلہ میں یہ تبدیلی علامتی طور پر دو گنی اہمیت رکھتی تھی۔ ایک طرف تو یہ حکم مکہ کی طرف اشارہ کرتا تھا۔ بدر کے فوراً بعد یہ اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ اب قریش کے ساتھ قبلے کی تحویل پر کھلی جنگ ہوا کرے گی۔ یہ کعبہ پر بعینہ ویسی ہی ملکیت کا ارادہ تھا جیسا کہ یہودی اپنی جان کی بازی لگا کر یروشلم پر دعوٰنس جماتے آئے ہیں۔ جیسے زبور میں ایک جگہ رقم ہے کہ، 'اے یروشلم! اگر میں تمہیں بھول جاؤں تو بے شک میرے ہاتھ کاٹ دیے جائیں۔' ویسے ہی اب مومنین بھی اپنے سر دھڑ کی بازی لگا کر مکہ کو کبھی نہیں بھولیں گے۔ اس کی حرمت پر جان قربان کرنے سے گریز نہیں کریں گے۔ اب یہ جگہ ماضی کا قصہ نہیں بلکہ حال کی حقیقت بن چکی تھی۔ اسے ایمان کا مرکزی نقطہ قرار دے دیا گیا تھا۔ عبادت کرنے والے اب اس پر اپنا دعویٰ قائم کر سکتے تھے اور ہر صورت اس پر قبضہ کر کے رہیں گے۔

دوسری طرف عبادت کا یہ نیا قبلہ اس بات کی بھی غمازی کرتا ہے کہ جسے تاریخ دانوں نے 'یہودیوں کے ساتھ علیحدگی' قرار دیا ہے۔ بالخصوص، اس وقت تو راہیں جدا ہونا بالکل واضح تھا کہ حال ہی میں ایک یہودی قبیلے کو بکال باہر کر دیا گیا تھا۔ گو اس سے پہلے ان کے ساتھ ناطے داری اور وحدانیت کے تعلق کا برملا اظہار کیا جاتا رہا تھا مگر اب پہلی بار اسلامی انفرادیت کی بنیاد، ایک مختلف شناخت کی صورت میں رکھ دی گئی تھی۔ انفرادیت گری کا عمل باقاعدہ طور پر شروع ہو چکا تھا۔ جس طرح چھ صدی قبل عیسائیت نے خود کو یہودیت سے علیحدہ کر کے ایک جداگانہ شناخت قائم کر لی تھی، اب ابھرتا ہوا یہ نیا دین، یعنی اسلام بھی وہی کرنے جا رہا تھا۔ گو اسلام اور یہودیت کی تاریخ اور میراث ایک ہی تھی مگر اب قبلے کی اس تبدیلی کے بعد یہ عیاں ہو گیا تھا کہ بھلے ماضی ایک رہا ہو، مستقبل کسی صورت بھی ایک جیسا نہیں ہو گا۔ شاید یہ علیحدگی ناگزیر تھی، جیسے ایک خاندان ٹوٹ جاتا ہے تو پھر اس کی قسمت میں مزید تلخی لکھ دی جاتی ہے۔ اسلام اور یہودیت کے بیچ یہ تلخی اب وقت کے ساتھ بڑھتی ہی چلی جائے گی۔

باب:15

اکثر کہا جاتا ہے کہ آدمی کو اس کے دشمنوں کی قابلیت کی بنیاد پر پرکھا جا سکتا ہے۔ اگر یہ بات درست ہے تو پھر وہ نوجوان چرواہا جس نے ابو جہل کو بدر کے میدان میں قتل کر ڈالا تھا، تاریخ اسلام میں اپنی سمجھ سے کہیں بڑا کردار ادا کر گیا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ابو جہل کی موت کے بعد محمدؐ کے دشمنان کی قابلیت اور حکمت ایک دم، بہت تیزی سے بہتر ہو گئی۔ مکہ کی تجار کونسل، جو قریش کے سارے ہی فیصلے کیا کرتی تھی، اس کی سربراہی ایک ایسے شخص کے ہاتھ آ چکی تھی، جس نے اپنی ذہانت کو استعمال میں لاتے ہوئے، کمال ہوشیاری سے تجارتی قافلے کا رخ بدر سے موڑ کر محمدؐ کے ہاتھوں لٹنے سے بچا لیا تھا۔ یہ قریش کے نامی گرامی کنبے امیہ کا سردار ابو سفیان تھا۔

زیرک اور منجھے ہوئے فوجی سپہ سالاروں کی طرح ابو سفیان کا بھی انہی اصولوں پر یقین تھا، جن میں گرما گرمی اور شدید حریفانہ سوچ کی بجائے نپے تلے اقدامات کیے جاتے ہیں۔ ایسے رہنماؤں کے لیے اگر انسانی جانوں کو داؤ پر لگانا ناگزیر ہو تو ایسا بجائے ذاتی عناد، انتہائی ضرورت کے پیش نظر ہی کرتے ہیں۔ سچ یہ ہے کہ اگر اس سے پہلے قریش کی سربراہی ابو جہل کی بجائے ابو سفیان کے ہاتھ میں ہوتی تو محمدؐ اور ان کے پیروکاروں کو مکہ سے زبردستی بے دخل کرنے کی قطعاً ضرورت پیش نہ آتی۔ ابو جہل کی شتابی اور شدید مخالفت کے باعث محمدؐ کمزور ہونے کی بجائے، طاقتور ہوتے چلے گئے۔ ابو سفیان اس صورتحال میں انہیں کچلنے کی بجائے حدود میں رکھنے کی کوشش کرتے۔ عین ممکن تھا کہ وہ محمدؐ کے سماجی اصولوں کو سیاسی ضرورت کے تحت یا شاید ان کی اہمیت کے پیش نظر قبول کر لیتے۔ اگرچہ وہ بھی قریش کی روایات یعنی، آباؤ اجداد کے طریق کار پر چار کرتے تھے مگر وہ دیکھ سکتے تھے کہ سماجی ڈھانچے میں تبدیلیاں ناگزیر ہیں اور بڑی اصلاحات کی ضرورت ہے۔ ان کی اپنی بیٹی جن کا نام ام حبیبہ تھا، اسلام قبول کر چکی تھیں۔ وہ ان افراد میں شامل تھیں جنہوں نے عرصہ پہلے بائیکاٹ کے دوران ایتھوپیا ہجرت کر لی تھی۔ لیکن اب بجائے مدینہ چلی جاتیں، مکہ میں ہی سکونت اختیار کر لی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ام حبیبہ، یہاں رہ کر ابو سفیان کی سوچ پر خاصا اثر انداز ہوتی آئی تھیں۔ سو، اگر بدر کے بعد ابو جہل زندہ ہوتا تو یقیناً غصے میں آگ، انتقام کی آگ میں جل بھن جاتا اور پہلے سے بڑی فوجی مہم پر نکل پڑتا۔ مگر، ابو سفیان نے مخالفت اور لعن طعن کے باوجود سوچ اور سمجھ کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہیں دیا۔

اس بات میں کوئی شک نہیں تھا کہ بدر کا انتقام لینا انتہائی ضروری تھا۔ مکہ کی عزت اور شہرت اور شہر کے طویل مدتی ذرائع معاش داؤ پر لگ چکے تھے۔ مگر بجائے یہ کہ وہ انتقامی کاروائی کے لیے دوڑ پڑیں، ابو سفیان نے فیصلہ کرنے میں اچھا خاصا وقت لیا اور تیاریاں شروع کر دیں۔ کئی بدو قبائل جو ابھی تک قریش کے اتحادی تھے، ان کے ساتھ از سر نو تعلقات اور باہمی دفاع کے معاہدوں کی تجدید کی گئی۔ سرما کے مہینوں میں انتظار کیا گیا اور اگلے ہی برس بہار کا موسم تک دس

ہزار فوجیوں پر مشتمل ایک مضبوط فوج تشکیل دے دی گئی جس میں سینکڑوں گھڑسوار بھی شامل تھے۔ اس لشکر کا رخ دس دن کی مسافت پر واقع مدینہ کی طرف تھا۔

ابو سفیان کا ارادہ مدینہ پر چڑھائی نہیں تھا۔ بلکہ وہ صرف محمدؐ کو یہاں سے نکال باہر کرنا چاہتے تھے۔ اسی لیے، مدینہ کے نخلستان پر چڑھ دوڑنے کی بجائے لشکر کو حکم دیا کہ مدینہ سے باہر، مضافاتی علاقے میں پڑاؤ ڈال لیں۔ یہ جگہ احد کی پہاڑی کے قدموں میں مدینہ سے تین میل شمال کی جانب واقع تھی۔ مقصد واضح تھا کہ وہ پورے مدینہ پر حملہ کرنے نہیں بلکہ محمدؐ اور ان کے پیروکاروں سے بدلہ لینے، بدر کا حساب چکانے آئے تھے۔ ابو سفیان نے اس بابت کسی بھی قسم کے شک کو دور کرنے کی غرض سے اوس اور خزرج کو واضح پیغام دینے کے لیے ایک قاصد روانہ کیا۔ پیغام یہ تھا، 'ہمیں اپنے عم زاد محمدؐ کے ساتھ نبٹنے دو اور ہم تمھیں بخش دیں گے۔ ہمیں تمہارے ساتھ جنگ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔' یعنی، یہ قریش کا قریش کے ساتھ معاملہ تھا۔ اس قضیے میں کسی دوسرے قبیلے کو سینگ اڑانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

قریش کے لشکر نے یہ طریقہ خوب سوچ سمجھ کر اختیار کیا تھا۔ ابو سفیان کو مدینہ کے اندر بڑھتی ہوئی انارکی اور تقسیم کی پہلے سے خبر تھی۔ وہ جانتے تھے کہ محمدؐ ابھی تک سیاسی طور پر قدم جمانے کی کوشش میں ہیں اور ان کا اختیار تنازعات میں گھرا ہوا ہے۔ ہم وثوق سے نہیں کہہ سکتے کہ ابو سفیان کا یہ فعل امر مانع تھا یا وہ واقعی مدینہ میں مزید تقسیم پیدا کر کے فتح حاصل کرنا چاہتے تھے، لیکن یہ ایک انتہائی سوچی سمجھی اور ذہین چال تھی۔ یعنی، دستانہ پہنے دستانہ ہاتھ آگے بڑھا کر پیٹھ کے پیچھے سے آہنی مکا بھی دکھا دیا تھا۔ اگر مدینہ کی اکثریت نخلستان کو جنگ میں جھونکنے پر تیار تھی تو وہ دیکھ سکتے تھے کہ ابو سفیان پہلے سے ہی پوری تیاری کر کے آئے تھے لیکن اگر وہ اس سارے قضیے سے الگ رہنے کا فیصلہ کرتے ہیں تو یہ ابو سفیان کے لیے بھی قابل قبول حل تھا۔ اس لشکر کا مدینہ کو جنگ پر اکسانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا، وہ تو صرف محمدؐ اور ان کے پیروکاروں کو مدینہ سے باہر نکالنا چاہتے تھے۔ ابو سفیان کا خیال تھا کہ ایک یا دوسری صورت، محمدؐ اپنے حواریوں کے ساتھ بالآخر مدینہ سے باہر نکل آئیں گے، جہاں یہ لشکر انتہائی سرعت اور قرار واقعی طور پر ان سے نبٹ لے گا۔

لیکن مومنین میں سے کچھ ابو سفیان کی اس چال کو پہلے ہی سمجھ گئے۔ ان میں ابن ابی بھی شامل تھا جو محمدؐ کے ساتھ قینقاع کے معاملے پر بھی اچھا خاصا گتھم گتھا ہو گیا تھا۔ محمدؐ نے اس قضیے کے بعد اس کو خود سے مزید دور کرنے کی بجائے اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ آپؐ نے کئی دوسروں کی مخالفت کے باوجود ابن ابی کو مشیران میں شامل کر لیا۔ ابن ابی نے صورتحال کو دیکھتے ہوئے مشورہ دیا کہ مومنین کو مدینہ کے اندر ہی جم کر ڈٹے رہنا چاہیے۔

'واللہ، اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا کہ دشمن سے لڑنے کے لیے ہم مدینہ سے باہر نکلے ہوں اور ہمیں بھاری نقصان نہ اٹھانا پڑا ہو' ابن ابی نے مزید کہا، 'اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ دشمن مدینہ میں داخل ہوا ہو اور یہاں سے بچ نکلا ہو۔ انہیں اپنے حال پر چھوڑ دو۔ اگر وہ وہیں رہے جہاں ہیں تو ان کا حال بدتر ہوتا جائے گا اور اگر نخلستان میں داخل ہونے کی کوشش کی تو پھر ہم میں سے ہر شخص ان کے ساتھ دو بدو لڑائی کرے گا۔ عورتیں اور بچے چھتوں پر سے ان پر پتھر برسائیں گے اور بالآخر وہ بھاگنے پر مجبور ہو جائیں گے۔'

اس نے مزید کہا، 'ابو سفیان کے لشکر میں شامل گھڑسواروں کے دستوں نے پہلے ہی کھیتوں میں فصل برباد کر دی ہے۔ وہاں اب بچانے کے لیے کچھ نہیں بچا۔ تو بہتر یہی ہے کہ ہم انتظار کریں اور اگر وہ جرات کریں تو انہیں مدینہ میں داخل ہونے دیں۔ مومنین کو نخلستان کی ہر گلی اور کوچے، اونچی جگہوں اور چھپنے کے مقامات کی پوری معلومات ہونے کی وجہ سے برتری حاصل ہے۔' جیسے آج، ویسے ہی تب بھی شہری علاقوں میں لڑائی لڑنا کسی بھی فوجی سپہ سالار کے لیے بھیانک خواب ثابت ہو سکتا تھا اور ابن ابی کا خیال یہ تھا کہ ابو سفیان جیسا سیانا شخص کبھی بھی شہر میں داخل ہونے کی حماقت نہیں کرے گا۔ اگر مکہ کا سردار پہلے ہی محمدؐ اور ان کے پیروکاروں سے باہر نکل کر لڑنے کی توقع پالے بیٹھا تھا تو آخر، ہم اس کی توقعات کے برعکس ایسا کیوں کریں؟ بالخصوص ان حالات میں جبکہ ابو سفیان کا لشکر

احد کی پہاڑی کے قدموں میں پڑاؤ ڈالے ہوئے تھی، یہاں تو پینے کے لیے پانی کا ایک قطرہ بھی میسر نہیں۔ آخر کار، انہیں مجبور ہو کر وہاں سے نکلنا ہی پڑے گا۔ اس کے لیے انہیں کچھ بھی نہیں بلکہ جم کر نخلستان کے اندر تیار رہنے کی ضرورت تھی۔

لیکن اگر سمجھ بوجھ بہادری کا ایک حصہ ہوتی ہے تو محمدؐ کے اکثر جوان اور جوشیلے پیروکار ایسی بہادری کے قائل نہیں تھے۔ یہ جوانان زیادہ تر مہاجرین تھے اور ابھی تک جلاوطنی کی ہزیمت پر تلملائے بیٹھے تھے۔ انہوں نے کہا کہ ابوسفیان کے اس چیلنج کو یوں نظر انداز کر دینا، دراصل کمزوری ہو گی اور اگر ابن ابی کی حکمت عملی کامیاب بھی ہو جاتی ہے تو آخر کار، مدینہ کے لیے اخلاقی شکست سمجھی جائے گی۔ وہ درخشاں فتح حاصل کر کے سرخرو ہونا چاہتے تھے، شہرت اور عظمت کی بلندیوں کو چھونے کی تکرار کرنے لگے۔ اس سے پہلے بدر کے مقام پر وہ مکہ کے چنے ہوئے جنگجوؤں کو شکست سے دوچار کر چکے تھے اور اب اسی طرح ایک بڑے لشکر کے سامنے گنی چنی تعداد کے ساتھ بہادری اور جرات کی ایک اور مثال قائم کرنے کے لیے تیار تھے۔ ابن ابی کی حکمت عملی سن کر ایک دم ہر طرف سے شور و غوغا بلند ہو گیا اور سبھی چلانے لگے، 'اے خدا کے رسول! آپ ان کتوں کو بھگانے کے لیے ہماری سپہ سالاری کیجیے!'

ایسی صورتحال میں ایک رہنما کیا کر سکتا ہے؟ بہتر یہ ہے کہ وہ حکمت سے کام لے لیکن اس سے اپنی ہی بنیاد کو مایوس کرنے کا خدشہ لاحق رہتا ہے۔ محمدؐ کے معاملے میں، یہ بنیاد مہاجرین تھے۔ وقت آئے گا کہ وہ اپنے اختیار کو استعمال میں لاتے ہوئے عوامی خواہشات پر حاوی ہوں گے مگر وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ ابھی وہ اس قابل نہیں ہیں۔ اور پھر، یہاں ایک دوسرا عنصر بھی تھا۔ وہ یہ کہ، محمدؐ پہلے ہی ابن ابی کی قینقاع کے معاملے میں مداخلت کے بعد اس کے مطالبات مان کر خود کو بلند نظر ثابت کر چکے تھے۔ لیکن، ایک بار پھر اسی طرح اس کے عمل دخل کو یوں قبول کر لینے کا مطلب اسے شہ دینے کے مترادف تھا۔ دونوں صورتوں میں سے، یعنی مہاجرین کی خواہش کے عین مطابق کھلے میدان میں لڑائی یا ابن ابی کی رائے کو مقدم جانتے ہوئے احتیاط برتنے میں سے آپؐ نے پہلی تجویز کا انتخاب کیا۔ انہوں نے اپنے جوان پیروکاروں کی خواہش کو فیصلے پر حاوی کر دیا۔ محمدؐ نے پر تکلف جنگی لباس پہن لیا۔ وہ اپنے سر پر مغفر سجائے، بھاری بھر کم زرہ بکتر پہنے اور ہاتھ میں تلوار تھامے برآمد ہوئے، اور جب ابن ابی نے آگے بڑھ کر ایک دفعہ پھر مدینہ سے باہر جنگ لڑنے کے حوالے سے خدشات کا اظہار کرنا چاہا تو محمدؐ نے اسے روک لیا کہ اب بہت دیر ہو چکی ہے۔ انہوں نے کہا، 'یہ ایک پیغمبر کے لیے کسی بھی طرح سے موزوں نہیں ہے کہ وہ زرہ بکتر پہن کر بغیر لڑائی لڑے، اسے اتار دے۔' ابن ابی کے لیے اس کے بعد کوئی چارہ نہیں تھا۔ لہٰذا، اس نے اپنے کنبے کے تین سو جنگجوؤں کو جمع کر لیا اور محمدؐ کے ساتھ لشکر میں شامل ہو کر حمایت کا اظہار کر دیا۔ یہ اس کی جانب سے آپؐ کی پیروی کا اشارہ تھا۔ لیکن ابن ابی کے کنبے سے تین سو افراد کی شمولیت کے باوجود بھی اس شام محمدؐ کے ساتھ صرف ایک ہزار کے لگ بھگ لوگ ہی لشکر کی صورت باہر نکلے۔ بدر میں جہاں جنگی طاقت دو کے مقابلے میں ایک تھی تو یہاں دس کے سامنے ایک مومن کھڑا تھا۔

ابن ابی کا حمایتی اظہار بھی بالآخر صرف علامتی ہی ثابت ہوا۔ یعنی، وہ صرف ایک اشارہ تھا۔ جیسے ہی محمدؐ کا لشکر مدینہ سے نکل کر مضافات میں پہنچا تو اس نے اپنے گھوڑے کی لگام کھینچ لی اور اعلان کیا کہ وہ اپنے آدمیوں کو لے کر اس جگہ سے آگے نہیں جائے گا۔ مکہ کے لشکر کو اس جگہ سے آگے لڑائی میں گھیرنے کی کوشش، انہیں دفاع کی بجائے جارح بنا دے گی۔ اس نے محمدؐ کی توجہ 'آئین مدینہ' کی اس شق کی جانب دلائی، جس کے تحت وہ اور مدینہ کے دوسرے لوگ صرف اور صرف باہمی دفاع کے پابند تھے۔ اس نے اپنے حمایتیوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا، 'محمدؐ نے میری بات سننے سے انکار کر دیا ہے اور بجائے وہ نوجوانوں کے کہے پر عمل پیرا ہے۔ ان لڑکے لپاڑوں کو جنگ کی سمجھ نہیں ہے۔ مجھے اس جنگ میں خود کو جھونک کر اپنے آپ کو یوں بے وجہ قتل کروانے کی سمجھ نہیں آتی۔' پھر، اس نے اپنے آدمیوں کو واپس مڑنے کا حکم دے دیا۔ محمدؐ نے بدستور بقایا لشکر کے ساتھ آگے کی طرف سفر جاری رکھا، ابن ابی کا خیال تھا کہ انہیں بالضرور شکست سے دوچار ہونا پڑے گا۔ وہ بعد ازاں، جنگ کی باقیات دکھا کر اور اپنی رد کردہ تجویز کی اہمیت کے بل بوتے پر مدینہ میں حمایت حاصل کر لے گا اور بالآخر پورے نخلستان کی رہنمائی کا حقدار کہلائے گا۔

محمدؐ کے ساتھ لشکر میں اب صرف سات سو اشخاص رہ گئے تھے۔ یہ ابھی تک اس فوج کو مکہ کے بڑے لشکر کے مقابلے میں تعدادی لحاظ سے زیر کرنے کا اہل سمجھ رہے تھے۔ اس رات انہوں نے بجائے بھڑنے کے، اپنے آدمیوں کو 'ہرا' کے مقام سے گزار کر پہاڑی کے بالکل قدموں میں لے آئے۔ ہرا وہ جگہ ہے جہاں کھیتوں کے دونوں طرف قدیم زمانے میں لاوا بہہ جانے کی وجہ سے نوکیلی اور پتھریلی سطح بن چکی تھی اور مکہ کے گھڑسوار اور زرہ پوش فوجی گزرنے یا پہنچنے سے قاصر تھے۔ یہاں پہنچ کر صبح طلوع ہونے سے پہلے ہی مومنین کے لشکر نے ایسی جگہ پر قبضہ کر لیا کہ جہاں پیچھو پہاڑ کی اوٹ تھی اور دائیں بائیں، دونوں اطراف میں ہرا کی پتھریلی چٹانیں تھیں۔ یوں مکہ کا لشکر صرف اور صرف سامنے سے حملہ کر سکتا تھا۔ جنگی حکمت عملی کے تحت محمدؐ نے پچاس تیراندازوں کا ایک دستہ ترتیب دیا اور اسے پہاڑی پر چوکس رہنے کا حکم دیا۔ کہا، 'اپنے تیروں سے ان گھڑسواروں کے یلغار میں لشکر کی حفاظت کرو۔' مزید تاکید کی، 'چاہے کچھ بھی ہو جائے، تم ہمیں ان پر قابو پاتا ہوا بھی دیکھ لو، اپنی جگہ سے ہلنے کی کوشش مت کرنا، اس صورت میں انہیں پیچھو سے حملہ کرنے کی جرات نہیں ہو گی۔' یہ ایک نہایت عمدہ حکمت عملی تھی مگر اس کی کامیابی کا پورا انحصار تیراندازوں کے اس دستے کے چوکس ہو کر جمے رہنے پر تھا۔

احد کی لڑائی 25 مارچ، 625ء کو سورج طلوع ہوتے ہی شروع ہو گئی۔ یہ بدر کی جنگ کے تقریباً ایک سال بعد لڑی جا رہی تھی مگر اب کی بار اس کے نتائج مختلف بر آمد ہوئے۔ رات گئے، یہ محمدؐ کے لشکر کے لیے تباہی ثابت ہو گی۔ وہ خود زخمی ہو چکے ہوں گے اور ان کے پینٹھ ساتھی میدان جنگ میں قتل کر دیے جائیں گے۔ حالانکہ، اس قدر عمدہ جنگی حکمت عملی کے بعد ایسا ہونا ممکن نہیں تھا۔

جس طرح نوجوانان چاہتے تھے، اس لڑائی میں کچھ بھی شاندار نہیں تھا۔ یہ فوجی ترانوں اور مردانہ وار نہیں بلکہ غصے سے پھنکار اور پھیلتے ہوئے نتھنوں کی گڑگڑاہٹ، لوہے کے تصادم، گالم گلوچ کرتے ہوئے مردوں، خوفزدہ گھوڑوں اور اونٹوں کی ہنہناہٹ اور سب سے بڑھ کر مکہ کے لشکر میں پیچھو آتی عورتوں کی چیخ و پکار، رجھانے والے الاپ اور بدر کی ہزیمت یاد دلانے والے شور میں لڑی جانے والی جنگ تھی۔

یہ جنگ میں عورتوں کا روایتی کردار رہا تھا۔ وہ اپنے لشکر کے مردوں کو طیش، غیرت دلاتیں اور دشمنان پر تبرہ کرتیں۔ اپنی شدید اور تیز تر ہوتی آواز میں رواس پٹاس کرتیں، جس سے لڑائی میں شدت پیدا ہو جاتی اور دوسری طرف فوجیوں کے دل میں خوف پیدا ہو جاتا۔ ان کی مثال، دنیا کے ایک دوسرے کونے میں جنگ کے دوران ڈھول کے کہر میں بجتی ہوئی پونگی یا بین کی سی ہوا کرتی تھی۔ ابو سفیان نے اس مقصد کے لیے بدر کے پندرہ مقتولین کی بیواؤں اور بیٹیوں کا انتخاب کیا تھا۔ ان عورتوں کی سربراہی خود ابو سفیان کی بیوی کر رہی تھی۔ اس کا نام ہندہ تھا۔ یہ عورتیں جنگ کے دوران چلاتیں، 'آگے بڑھو اور جرات دکھاؤ تو ہم نرم تکیوں پر تمہاری مدارت کریں گی' اور، 'اگر لڑکھڑائے تو یاد رکھو، ہم نرمی نہیں برتیں گی'۔

لیکن ہندہ کے لیے سب سے اہم اپنا ذاتی انتقام یقینی بنانا تھا۔ بدر کی جنگ میں اس کا باپ اور بھائی دونوں ہی محمدؐ کے چچا حمزہ کے ہاتھوں قتل ہو چکے تھے۔ اور اب، اس نے ارادہ باندھ لیا تھا کہ اس لڑائی میں وہ حمزہ کو قتل ہوتا دیکھے گی۔ اس مقصد کے لیے اس نے پہلے ہی، کھلے عام ایک ایتھوپیائی غلام، جس کا نام وحشی تھا کو تیار کر رکھا تھا۔ اس کام کے عوض، یعنی میدان جنگ میں حمزہ کو ڈھونڈ کر موت کے گھاٹ اتارنے کے بدلے میں، غلامی سے آزادی اور منہ مانگا انعام دینے کا وعدہ کر رکھا تھا۔

شاید، ایک غلام سے یہ کام لینے کے لیے اتنا بڑا انعام ہی درکار ہوتا۔ حمزہ ایک ہیبت ناک جنگجو تھے۔ ان کی طرح کے جنگجو، گنتی کے ہی لوگ تھے جو ہر دم لڑنے بھڑنے پر تیار رہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ لڑائی کے میدان میں حمزہ کو تلاش کرنا بہت مشکل نہیں تھا۔ کہا جاتا تھا کہ جہاں ہولناک لڑائی چھڑی ہوئی دکھائی دے، جان لو کہ حمزہ وہیں، سر کے مغفر میں شترمرغ کی کلغی سجائے بے جگری سے لڑتا ہو گا۔ ایک شخص بتاتا ہے کہ اس دن لڑائی کے دوران حمزہ اپنے آنے والے ہر دشمن کو لعن طعن کرتے، گالیاں سناتے ہوئے آگے بڑھتے، بالخصوص اس شخص کو بہت ہی برا بھلا کہہ دیا جس کی ماں مکہ میں لڑکیوں کے ختنے کرتی تھی، جس بابت حمزہ کا

خیال تھا کہ یہ واقعی جہالت تھی۔ وہ بتاتا ہے کہ دوسروں کو تو دیکھتے ہی تلوار لہراتے اور طیش دلانے کو ملامت کرتے کہ، 'او چھنال کے بچے، آؤ مجھ سے لڑو!' مگر اس شخص کو تو بہت ہی برا کہا، 'او بظر کاٹنے والی کے بچے، آؤ مجھ سے لڑو!'۔ اس پر وہ سخت طیش میں آگیا اور حمزہ پر حملہ کرنے کو آگے بڑھا تو انہوں نے تلوار کا ایک ہی وار کیا اور بظر کاٹنے والی کے بچے کا کام تمام کر دیا۔

یہ حمزہ کے ہاتھوں ہونے والا آخری قتل تھا۔ اگرچہ وہ ایک ہیبت ناک جنگجو تھے مگر وہ صرف اسی شخص کو زیر کر سکتے تھے جو تلوار یا خنجر سے حملہ کرتا ہو۔ ایتھوپیائی غلام کے پسندیدہ ہتھیار کے سامنے وہ بے بس تھے۔ وحشی سے روایت منقول ہے کہ، 'میں نے اپنی برچھی سے اچھی طرح نشانہ لیا، یہاں تک کہ میں مطمئن ہو گیا اور پھر میں نے اسے لہرا کر حمزہ پر پھینک دیا۔ یہ اس کے پیٹ میں اتنی زور سے پیوست ہوا کہ ٹانگوں کے بیچ میں سے نکلا۔ وہ میری طرف مڑا اور ڈگمگا کر وہیں گر پڑا۔' وحشی بتاتا ہے کہ اس پر خوف طاری تھا، 'میں نے کافی دیر انتظار کیا۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ حمزہ مر گیا ہے تو پھر میں نے جا کر مردہ جسم سے اپنی برچھی نکالی'۔

حمزہ جیسے بہادر اور جری شخص کے قتل ہونے کے باوجود محمدؐ کا لشکر سبقت لے رہا تھا۔ مکہ کے گھڑ سواروں کا ہر حملہ پسپا کیا جاتا رہا اور پہاڑی کی چوٹی پر تعینات تیر اندازوں کا دستہ چن چن کر تیر برساتا رہا۔ کئی گھوڑے اور گھڑ سوار ہلاک کر دیے گئے۔ جیسے جیسے دن چڑھتا گیا، مومنین کا لشکر آگے ہی بڑھ رہا تھا اور بالآخر مکہ کے لشکر میں پھوٹ پڑ گئی اور وہ میدان جنگ سے بھاگنے لگے۔ تب ہی، پہاڑی پر تیر اندازوں کے دستے نے بھی نظم کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا۔

ان تیر اندازوں میں سے ایک یوں بیان کرتا ہے کہ، 'میں نے عورتوں کو دیکھا وہ اپنے کپڑے سمیٹ کر میدان سے یوں بھاگ رہی تھیں کہ ان کے ٹخنے نظر آ رہے تھے۔ دستے میں آواز آئی، 'لوٹ لو، لوٹ لو'۔ پھر کسی نے بھی ہمارے اس دستے کے کپتان کی ایک نہ سنی جو چلاتے ہوئے رسول اللہ کے حکم کی یاد دہانی دلا رہا تھا۔ انہوں نے اپنی جگہ چھوڑ دی اور میدان جنگ میں سے مال غنیمت لوٹنے کے لیے دوڑ پڑے۔'

ابو سفیان کے لشکر میں گھڑ سواروں کے کمانڈر نے یہ موقع تاڑ لیا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو جمع کیا اور احد کی پہاڑی کے گرد سے گھوم کر پیچھے کی طرف سے حملہ کر دیا جہاں اب حفاظت کے لیے مامور تیر انداز اپنی جگہ چھوڑ چکے تھے۔ ان کی دیکھا دیکھی، پیادہ زرہ پوشوں نے بھی پلٹ کر حملہ کیا اور یوں بازی الٹ گئی۔ ایک کے بعد دوسرا مومن قتل کیا جانے لگا اور بچ جانے والے دوڑتے ہوئے، پیچھے پڑے پیدل فوجیوں، گھڑ سواروں، برستے تیروں اور برچھیوں سے بچتے، جان بچاتے احد کی پہاڑی پر چڑھنے لگے۔ اسی کشمکش میں صفیں ٹوٹنے لگیں اور افراتفری پھیل گئی۔ محمدؐ کے سر پر چوٹ لگی اور وہ میدان میں گر گئے۔

شور و غوغا بلند ہوا کہ محمدؐ قتل کر دیے گئے ہیں۔ یہ تو معلوم نہیں کہ یہ افواہ مکہ کے لشکر میں سے نکلی یا مومنین میں سے کسی نے شور مچا دیا مگر یہ ضرور سمجھ میں آتا ہے کہ آخر لوگوں نے ایسا کیونکر سوچا ہو گا؟ محمدؐ زرہ پہنے، سر پر مغفر سختی سے جمائے لڑ رہے تھے۔ ایک شدید وار کی وجہ سے مغفر کا لوہا گال کو چیرتا ہوا ٹھوڑی تک چلا گیا۔ ان کا اوپر والا ہونٹ پھٹ گیا، ناک ٹوٹ گئی اور ماتھے پر گہرا زخم آیا۔ یہ زخم اس قدر گہرا تھا کہ جیسے عام طور پر سر پر لگنے والی چوٹ کے نتیجے میں ہوتا ہے، تیزی سے خون بہنے لگا اور چہرہ لہولہان ہو گیا۔ لیکن اس وقت محمدؐ کے لیے زخم اہم نہیں تھے۔ قریبی ساتھیوں نے انہیں سہارا دے کر کھڑا کیا تو حیران کن طور پر دیکھتے ہیں کہ ان کے پیروکار الٹے پیر بھاگ رہے ہیں۔ اس بات سے اب کیا فرق پڑتا تھا کہ ان کے ساتھیوں کے خیال میں آپؐ قتل کر دیئے گئے ہیں؟ کیا اسلام پر ان کا ایمان اس قدر کمزور تھا؟ کیا وہ واقعی یہ سوچتے چلے آ رہے تھے کہ اسلام صرف اور صرف محمدؐ سے متعلق ہے؟ 'محمدؐ اس کے سوا کچھ نہیں کہ بس ایک رسول ہیں'، یہ قران کے الفاظ ہیں جو اس لڑائی کے بعد آپؐ کے اسی غصے کی ترجمانی کر رہے ہیں۔ اسی آیت میں آگے سوال کیا جائے گا، 'ان سے پہلے اور رسول بھی گزر چکے ہیں، پھر کیا اگر وہ مر جائیں یا قتل کر دیے جائیں تو تم لوگ الٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟'

شور، افراتفری اور ناتواں حالت میں انہوں نے اپنے ساتھیوں کو پوری قوت سے چلا کر واپس بلانے کی کوشش کی، 'میری طرف۔ او خدا کے بندو، میری طرف!' لیکن صرف تیس کے لگ بھگ ہی لوگ آپؐ کی آواز سن سکے اور ان کے گرد جمع ہو گئے۔ اس بارے بھی قران کے الفاظ خاصے تلخ ہوں گے، 'اللہ

نے جو وعدہ تم سے کیا تھا وہ تو اس نے پورا کر دیا، ابتداء میں اس کی علم سے تم ہی ان کو قتل کر رہے تھے مگر جب تم نے کمزوری دکھائی اور اپنے کام میں باہم اختلاف کیا اور جونہی کہ وہ چیز اللہ نے تمہیں دکھائی جس کی محبت میں تم گرفتار تھے (یعنی مال غنیمت)، تم اپنے سردار کے حکم کی خلاف ورزی کر بیٹھے اس لیے کہ تم میں سے کچھ لوگ دنیا کے طالب تھے اور کچھ آخرت کی خواہش رکھتے تھے'۔ پھر کہا، 'یاد کرو جب تم بھاگے چلے جا رہے تھے، کسی کی طرف پلٹ کر دیکھنے تک کا ہوش تمہیں نہ تھا اور رسول تمہارے پیچھو تم کو پکار رہا تھا اس وقت تمہاری اس روش کا بدلہ اللہ نے تمہیں یہ دیا کہ تم کو رنج پر رنج دیے تاکہ آئندہ کے لیے تمہیں یہ سبق ملے۔۔۔'۔ قصہ مختصر، یہ شکست در اصل خدا کی طرف سے محمدؐ کی نافرمانی کرنے پر ان کے لیے سزا قرار پائی۔ لیکن، انہی آیات میں خدا نے مومنین کو اس فاش غلطی پر معافی کی نوید بھی سنائی۔

چونکہ ابو سفیان کے نزدیک اس چڑھائی کا مقصد محمدؐ کے ساتھ معاملہ نبٹانا تھا، جو کہ مبینہ طور پر پورا ہو چکا تھا۔ محمدؐ کے بارے میں افواہ پھیلنے پر مکہ والوں نے قتل و غارت ترک کر دیا اور پے در پے حملوں میں کمی لے آئے۔ لیکن ہندہ کا کام ابھی پورا نہیں ہوا تھا۔ قریش کی دوسری عورتیں میدان جنگ سے مال غنیمت یعنی تلواریں، خنجر، زرہ بکتریں اور گھوڑوں کی کاٹھیاں، الغرض جو ہاتھ آتا، اکٹھا کر رہی تھیں مگر ہندہ ان کو نظر انداز کیے، ایک کے بعد دوسرے، میدان میں بکھرے لاشوں کو الٹ پلٹ کر اس کو تلاش رہی تھی، جو اس کو چاہیے تھا اور جب وہ لاشہ مٹی اور دھول میں اٹا مل گیا تو دیکھتے ہی اس نے فلک شگاف چیخ لگائی۔ یہ اس قدر تیز، کانوں کو چیرتی ہوئی چیخ تھی کہ سالوں بعد بھی لوگ اس کا تذکرہ کرتے تو ان کی رونیں کھڑی ہو جاتیں۔ وہ حمزہ کی لاش پر کھڑی ہوئی، چاقو نکالا اور دونوں ہاتھوں میں تھام کر زور سے مردہ جسم میں گھسیڑ دیا۔ پیٹ کو چیر دیا اور بجائے یہ کہ سینے میں سے دل نکالتی، اس سے کہیں بڑا اور گہرا عضو نکال لیا۔ یہ حمزہ کا جگر تھا۔ فخر اور جیت، بدلے کی آگ میں جلتے اس نے جگر کو دونوں ہاتھوں سے کھینچ کر الگ کیا اور اپنے سر سے یوں اونچا اٹھا لیا کہ انگلیاں اس میں کھبی ہوئی تھیں اور اس کے سر پر حمزہ کا خون ٹپک رہا تھا۔ پھر سب کے سامنے اس نے جگر میں دانت گاڑھ لیے اور چبانے لگی۔ اس کے منہ سے خون ٹپک کر ٹھوڑی سے نیچے گندھے اور سینے پر پھیل کر اسے رنگ رہا تھا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہندہ نے حمزہ کا جگر چبا کر نگل لیا اور دوسرے روایت کرتے ہیں وہ چباتی جاتی اور پھر تھوک کر مٹی میں رول کر وحشیانہ انداز میں ان پر کودنے لگتی۔ ہر دو صورت، ہندہ نے انتقام کی خوفناک مگر لازوال تصویر بنا ڈالی۔

ہندہ کے یوں بھیانک انداز میں لاشے کی تضحیک اور قطع و برید دیکھ کر مدینہ کے لشکر میں افراتفری اور ڈر بڑھ گیا۔ لیکن اسی منظر کو دیکھ کر مکہ کے اکثر فوجی محو رہ گئے اور وہ تماشا کرنے ہندہ کے گرد جمع ہونے لگے۔ یہ محمدؐ اور ان کے گرد جمع مومنین کے لیے جان بچا کر پیچھو ہٹنے کا اچھا موقع تھا، چنانچہ وہ دوڑتے، محمدؐ کو سنبھالتے، احد کی پہاڑی پر چڑھ گئے اور اوپر سے پیچکس کرنے والے دشمن کے چند فوجیوں پر پتھر اؤ کرنے لگے۔ چونکہ یہ فوجی زرہ پوش تھے اور چڑھائی چڑھنے سے قاصر تھے، پھر لگاتار پتھر اؤ کی وجہ سے انہیں بالآخر پیچھو ہٹنے ہی بنی۔ شام ڈھل چکی تھی اور رات کے سائے پھیل رہے تھے۔ ابو سفیان گھوڑے پر سوار احد کی پہاڑی کے قدموں میں پہنچ گیا اور چلا کر پوچھنے لگا، 'خدا کے نام پر مجھے بتاؤ، کیا محمدؐ واقعی مر گئے ہیں؟'

عمر نے اونچی آواز میں جواب دیا، 'نہیں۔ واللہ نہیں۔ وہ اس وقت بھی تمہاری بات سن رہے ہیں۔'

'تو پھر سنو!' ابو سفیان نے پہاڑی کے قدموں میں سے چلا کر کہا۔ بجائے یہ کہ وہ مزید دھمکانے کی کوشش کرتے یا جیسے کہ توقع تھی، فتح کے نشے میں الابلا تقریر اور غرور جھاڑتے، ابو سفیان نے سب سے پہلے ہندہ کے ہاتھوں حمزہ کے لاشے کی یوں بے حرمتی پر واضح کر دیا کہ یہ اس کے احکامات نہیں تھے۔ کہا، 'تمہارے مرنے والے ساتھیوں میں سے چند کی لاشوں کو بے حرمتی کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ میں نے نہ تو اس کا حکم دیا اور نہ ہی اس کام سے روکا۔ نہ تو اس عمل سے مجھے کوئی خوشی ہوئی اور نہ ہی اس کا مجھے کوئی دکھ ہے۔'

ان حالات میں، یہ تقریباً معافی کی درخواست تھی۔ ابوسفیان نے بدر کی جنگ کا انتقام لینے کا تہیہ کیا تھا اور وہ لے لیا گیا تھا۔ معاملہ نبٹ گیا تھا اور کم از کم اس دن بدلہ چکا دیا تھا۔ مزید کہا، 'جنگ کی باری تمہاری ہے۔ آج کا دن ہمارا تھا اور تمہارا دن چکا دیا گیا'۔ یوں، خود کو ابوجہل کے برعکس قابل عزت اور غیرت مند دشمن قرار دے کر اپنی فوج کو خیمے اکھاڑنے کا حکم دیا اور مکہ کا لشکر اسی رات واپس ہو لیا۔

گو ناک اور گال کے زخم مندمل ہو گئے لیکن احد کے بعد ساری عمر محمدؐ کو سر درد کی شکایت باقی رہی۔ بعض اوقات تو یہ درد اتنا شدید ہو جاتا کہ رفتہ رفتہ میگرین میں ڈھل گیا اور انہیں یوں ہی تکلیف میں بسر کرنی پڑی۔ ان کے پیروکاروں میں سے بھی زیادہ تر کی حالت کچھ اچھی نہیں تھی اور وہ لٹے پٹے، کٹی ہوئی حالت میں واپس مدینہ پہنچے اور یوں اعتماد، فخر، اتحاد اور جسم پر لگے گہرے زخموں کا مداوا شروع ہوا۔ مگر باوجود اس کے، ایسا لگنے لگا تھا کہ نخلستان میں ابن ابی کی سیاسی حیثیت اور اہمیت پہلے سے بڑھ گئی ہے۔ لڑائی کے برآمد ہونے والے نتائج وہی تھے جس کی اس نے پیشن گوئی کی تھی۔ صاف طور پر محمدؐ کے فیصلے نے سب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا۔ عام خیال یہ پیدا ہو گیا کہ مکہ کے لشکر کے ساتھ کھلے میدان میں جنگ واقعی بیوقوفی تھی اور لوگوں کو ابوسفیان کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ اس نے اس صورتحال کا فائدہ نہیں اٹھایا۔ اگر وہ نخلستان میں گھس کر ہر شے کو تہس نہس کر دیتا تو اس کو روکنے والا کون تھا؟ اب عام عوام دیکھ سکتی تھی کہ مدینہ میں محمدؐ کی بڑھتی ہوئی طاقت اور اختیار دراصل ان کے لیے نقصان کا باعث ثابت ہو سکتی ہے۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ وہ پیغمبر تھے اور اس لحاظ سے روحانی پیشرو بھی ضرور تھے مگر ابن ابی کے خیال میں مدینہ کے لوگ یقیناً اتنے عقلمند تو ضرور ہی تھے کہ اب وہ سیاسی اختیار اور رہنمائی اس جیسے گھاگ، محتاط اور عاقل شخص کے ہاتھ میں دیکھنا چاہیں گے۔

لیکن اس خیال کے بیچ ابن ابی واضح طور پر محمدؐ کی کئی خوبیوں میں سے ایک، سب سے خوب کا پوری طرح اندازہ لگانے میں ناکام رہا۔ وہ بھول گیا کہ محمدؐ کسی بھی ایسی صورتحال میں، جہاں ان کی کایا پلٹتی ہوئی دکھائی دیتی ہو، اپنے حق میں واپس پلٹنے کی بھرپور صلاحیت رکھتے تھے۔ دنیا جہاں میں کوئی بھی لیڈر فتح کو اپنے فائدے کے لیے نہایت آسانی سے استعمال کر سکتا ہے لیکن ایک ایسا رہنما جو شکست کو اپنے حق میں بدل سکتا ہو، نایاب ہوتا ہے۔ محمدؐ اس سے پہلے جب مکہ سے زبردستی نکال دیے گئے تو اس وقت بھی ایسا ایک بار کر چکے تھے اور اب دوبارہ بھی ایسا کرنے کے قابل تھے۔ بلکہ، اس بار تو خود ابن ابی نے ناداستگی میں ایسا ہو رہنا، آسان بنا دیا۔

احد کی لڑائی کے بعد، اسی ہفتے یہ جمعہ کا دن تھا۔ مومنین مسجد میں جمع ہوئے تو ابن ابی بات کرنے کے لیے کھڑا ہو گیا۔ اس نے سب سے پہلے حمد و ثناء بیان کی اور پھر محمدؐ کی ستائش کرنے لگا۔ اس کے بعد اس نے اپنے تئیں شکر ادا کیا کہ لڑائی کے دوران، زخمی ہونے کے باوجود آپؐ کی جان محفوظ رہی۔ لیکن پھر وہ خود کو اپنے منہ میاں مٹھو بننے سے روک نہ سکا اور مجمع کے سامنے اپنی حکمت اور پیشن گوئی کی شیخی بگھارنے لگا۔ جوش خطابت میں کہا، 'اگر میرے بھائی اس بات پر غور کر لیتے تو آج زندہ ہوتے، قتل ہونے سے بچ جاتے'۔ یہ ایک ایسا بیان تھا جو ظاہر ہے، دلوں کو جیتنے، دادرسی کرنے کی بجائے مقتولین کے وارثین کے زخموں پر نمک چھڑکنے کے مترادف تھا۔ جوں ہی ابن ابی نے یہ بات کہی، مجمع بپھر گیا۔ اس وقت مسجد کا احاطہ لوگوں سے بھرا ہوا تھا اور وہ سبھی اس کے خلاف ہو گئے۔ ابن ابی پر ہر طرف سے آوازے کسے جانے لگے اور اس کو بزدلی اور بدترین ہونے کے طعنے دیے جانے لگے۔ 'خدا کا دشمن' 'لوگ چلا رہے تھے۔ 'تم یہاں کھڑے ہو کر بات کرنے کے قابل نہیں ہو۔ بالخصوص اس کے بعد تو بالکل نہیں جو تم نے کیا ہے۔۔۔ لڑائی والے دن بھی اور آج بھی جو کرتے پھر رہے ہو'۔ کئی لوگ آگے بڑھے اور اسے پکڑ کر زمین پر گرا دیا۔

اس واقعہ کے بعد جلد ہی قرانی آیات میں ایک نیا لفظ ظاہر ہو گا۔ یہ لفظ 'منافقون' ہے۔ منافقون سے عام مراد ریاکار، مکار، دوغلا یا حیلہ باز کی لی جاتی ہے۔ قران میں یہی لفظ ترانوے سورت کا عنوان بھی بن جائے گا۔ اس سورت کی ابتداء کچھ یوں ہوتی ہے، "اے نبی، جب یہ منافق تمہارے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں، 'ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ یقیناً اللہ کے رسول ہیں' ہاں، اللہ جانتا ہے کہ تم ضرور اس کے رسول ہو مگر اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافق قطعی جھوٹے ہیں۔" آگے مزید کہا، 'انہوں نے

اپنی قسموں کو ڈھال بنا رکھا ہے اور اس طرح یہ اللہ کے راستے سے خود رکتے اور دنیا کو روکتے ہیں۔ 'اور پھر نہ صرف ہدایت کی بلکہ اس بابت خاصی تشویش کا اظہار بھی کیا گیا ہے کہ، 'انہیں دیکھو تو ان کے جثے تمہیں بڑے شاندار نظر آئیں، بولیں تو تم ان کی باتیں سنتے رہ جاؤ مگر اصل میں یہ گویا لکڑی کے گندے ہیں جو دیوار کے ساتھ چن کر رکھ دیے گئے ہوں۔ ہر زور کی آواز کو یہ اپنے خلاف سمجھتے ہیں۔ یہ پکے دشمن ہیں۔ ان سے بچ کر رہو، اللہ کی مار ان پر، یہ کدھر الٹے پھرائے جا رہے ہیں؟'

لیکن کیا ابن ابی دشمن تھا؟ یا واقعی منافق تھا؟ گرج دار اور بھاری بھر کم الفاظ سے مزین خطابت یعنی علم انشا اور عوام الناس میں مقبول اور ہر دلعزیز بیانات پر مبنی جذباتی خطابت میں باریک دھاگے جتنا فرق ہوتا ہے۔ یہاں بھی، 'منافقون' کا ترجمہ 'منافق' یا 'دوغلے' یا 'ریاکار' یا ایسے کئی دوسرے معنی نکالنا، دراصل اس لفظ پر بوجھ لادنے کی مانند ہے۔ مفہوم کے طور پر لپیٹیں تو اس کے معنی، 'وہ لوگ جن کے تحفظات ہوں یا وہ جو پیچھے ہٹ جائیں' بنتا ہے مگر لغوی معنوں میں اس سے مراد، 'وہ جو اپنی بل میں گھس گئے' لی جاتی ہے۔ یہاں بل میں گھسنے سے مراد صحرائی چوہے کی ہے جو خوف کی حالت میں زمین کھود کر گہرائی میں گھس جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ابن ابی نے نہ تو جھوٹ بولا اور نہ ہی کبھی اسلام سے انکار کیا۔ اس نے صرف محمدؐ کے سیاسی فیصلوں پر سوال اٹھانے کا حق استعمال کیا تھا۔ اس لحاظ سے اس نے کوئی لگی لپٹی رکھے بغیر، جیسے کہ 'منافق' کے معنی لیے جاتے ہیں کہ دوغلے پن کا مظاہرہ کیے بغیر، کھلے عام ان نظریات کا اظہار کیا تھا، جنہیں آج جدید دور میں ہم 'ریاست اور چرچ' یعنی، 'سیاست اور مذہب' کو جدا رکھنا یا 'سیکولر' خیالات کہتے ہیں۔

یہ نئی بندش چند لوگوں کے لیے نئی مشکلات پیدا کر دے گی۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے اسلام تو قبول کر لیا تھا مگر ضروری نہیں تھا کہ ان کے خیالات محمدؐ کو عطا کردہ خدائی اختیار اور اقتدار کی دھن میں ادا کیے جانے والے ہر بیان سے تال میل رکھتے ہوں۔ یہ ایک پیغمبر اور سیاستدان میں واضح فرق قائم رکھنا چاہتے تھے مگر اب یہی فرق قرانی آیات میں بھی مٹتا، دھندلاتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اب وہ صرف پیغمبر یا رسول نہیں تھے بلکہ واقعی نبی بنتے جا رہے تھے۔ یعنی یہ کہ اب وہ صرف 'تم میں سے ایک' نہیں تھے بلکہ زندگی کے ہر پہلو میں مشیت ایزدی کے ترجمان ثابت ہو رہے تھے۔

پھر، منافقت کا الزام لگانا جیسے معمول بن گیا۔ ہر وہ شخص جو محمدؐ کے فیصلوں پر ذرا بھر معترض ہوتا، صورتحال سے قطع نظر منافق کہلایا جاتا۔ مثال کے طور پر احد کی لڑائی میں قتل ہونے والے ایک نوجوان لڑکے کا باپ رنجیدہ رہا کرتا تھا۔ اسے کہا جاتا کہ، 'تمہیں تو خوش ہونا چاہیے کہ تمہارا بیٹا اب جنت کے باغ میں ہے'۔ لیکن چونکہ وہ بیٹے کے مرنے پر بے آس اور نڈھال تھا، اس سے اس کی تشفی نہ ہوئی۔ سسک کر بولا، 'واللہ یہ جنت کا نہیں بلکہ غموں کا باغ ہے۔ تم نے میرے بے چارے لڑکے کو بہکایا تو وہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا اور مجھے اس کی موت پر دکھ کی چھڑی سے پیٹ رہے ہو'۔ یہ شخص بھی اب منافق کہلایا جانے لگا اور بعد اس کے لوگ اس سے احتراز برتنے اور اس پر شبہ کرنے لگا۔ پر جوش اور تند و تیز مومنین مسجد سے ان لوگوں کو زبردستی باہر نکال دیتے جن کے ایمان پر انہیں خود اپنے ایمان سے کمتر ہونے کا گماں ہوتا۔ وہ ان سے پھر اس طرح کنارہ کش ہوتے کہ مڑ کر ان کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہ کرتے۔

یہ رجحان نیا نہیں تھا۔ تاریخ میں اس سے پہلے اور بعد میں بھی اس طرح کے حالات میں تقریباً ہر موقع پر ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔ یعنی، شکست کے بعد صفوں میں ترتیب برقرار رکھنے کی، غلطی تسلیم کرنے سے انکار، کسی دوسرے کو مورد الزام ٹھہرانے یا اپنے اندر دشمن کو تلاش لانے کی کوشش، عام بات ہے۔ لیکن فرق یہ ہے کہ آگے چل کر اسلام میں یہ رجحان بڑھ کر بدعت، الحاد اور انحراف کے الزامات میں بدل جائے گا کیونکہ اس زمانے کے بعد سیاسی اکثریت کا طور طریقہ انہی خطوط پر رواں دواں رہا ہے۔ جیسے ایڈورڈ سعید نے اپنی ایک تصنیف میں لکھا ہے کہ، 'یہ ان لکیروں کی تاثیر ہے جو آپ اپنے اور اپنے ہم وطنوں کے بیچ کھینچ لیتے ہیں اور یوں جلاوطنی میں بسر کرنے کا سب سے بدصورت پہلو ابھر کر سامنے آتا ہے۔ یعنی مبالغہ آرائی کی حد تک گروہی عصبیت اور باہر سے وارد ہونے والے غیروں کے لیے عداوت جنم لینے لگتی ہے۔ بسا اوقات یہ بیر اور مخالفت ان کے لیے بھی پیدا ہو جاتی ہے جو حقیقت میں آپ کے ہی جیسی صورتحال، حالات

سے دو چار ہوتے ہیں۔ بالآخر یوں ہوتا ہے کہ ہر شخص جو خونی رشتوں میں جڑا ہوا نہیں ہے، دشمن بن جاتا ہے اور مخالفین سے ہمدردی کرنے والا ہر شخص کسی غیر دوستانہ قوت کا حامی محسوس ہوتا ہے۔ یوں اکثریتی طبقے کے لیے اپنے بنائے کلیوں سے اک ذرہ بھر بھی ہٹاؤ آخر کار انتہائی درجے کی غداری اور سرکشی قرار پاتا ہے'۔

ابن ابی کو منافق قرار دے دینا، دینی نہیں بلکہ ایک سیاسی معاملہ تھا۔ اس وقت اگر میکاویلی ہوتا تو یقیناً ترپ کی اس چال کو ضروری قرار دیتا کیونکہ نو صدیوں بعد اس نے اپنے پشت پناہ حاکم کو تاکید کی تھی کہ، 'ہو سکتا ہے کہ چند شرفاء اور امراء شہر سوچ سمجھ کر اور اپنی بلند ہمتی کی وجہ سے خود مختار رہنے، خود کو تم سے آزاد رکھنے کی کوشش کریں گے۔ ایسے شرفاء کے سامنے ایک حکمران کے لیے اپنی حفاظت کا جس قدر ممکن ہو، سامان کرنا انتہائی ضروری ہوتا ہے۔ ان سے ہمیشہ اس طرح شاکی رہنا کہ جیسے یہ تمہارے پکے دشمن ہیں کیونکہ وقت آنے پر، جب تم کسی مصیبت یا بیرونی بپتا سے دوچار ہو گے تو یہی تمہاری بربادی میں مدد بن جائیں گے'۔

منافق کا سرنامہ ملنے کی وجہ سے یہ معاملہ اب طول پکڑ گیا۔ اگرچہ مسجد میں زبردستی خاموش کرائے جانے کے بعد سے ابن ابی نے فاصلہ کر لیا تھا لیکن اپنے حواریوں اور قرابت داروں کے بیچ بیٹھ کر وہ گاہے بگاہے مہاجرین کے خلاف دلی آزردگی اور بغض کا اظہار کرتا رہتا تھا۔ اکثر کہتا، 'انہوں نے ہمیں نکال باہر کر دیا ہے اور ہماری ہی سرزمین پر ہمیں اقلیت بنا کر رکھ دیا ہے۔ واللہ، جب وہ مثال دیا کرتے ہیں کہ 'اپنے کتے کو پالو اور بالآخر وہ تمہیں ہی کاٹ دے گا'، ہمارے ساتھ بھی یہی ہوا ہے۔' اس صورتحال میں ابن ابی کو مکمل طور پر بے اثر کرنے کے لیے محمدؐ کو صرف اور صرف ایک اور حتمی قدم اٹھانے کی ضرورت تھی۔

چنانچہ، آپؐ نے صرف مدینہ میں جاری کشمکش پر نظر گاڑھے رکھنے کی بجائے اطراف میں بھی اپنا حلقہ اثر بڑھانا شروع کر دیا۔ قریش کی رقابت میں وہ اب کی بار وسطی عرب کے علاقوں یعنی نجد میں بدو قبائل کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا رہے تھے۔ بدو سردار عیاری سے اس ساری صورتحال کا فائدہ اٹھا رہے تھے، ایک طرف تو وہ مکہ کو ہتھیلی کے تلے رکھتے تھے، تو دوسری طرف مدینہ کے ساتھ پینگیں بڑھا رہے تھے۔ مقصد آخر کار، ایک بہتر اور منافع بخش اتحاد کا حصہ بننا تھا۔ لیکن، بدوؤں کے لیے یہ کھیل خاصا خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ بالخصوص جب مکہ اور مدینہ کے بیچ جاری چپقلش خود انہی قبائل کے اندر پھوٹ ڈلوا سکتی تھی۔ یہی، ایک قبیلے بنو عامر کے ساتھ ہوا۔

اس قبیلے کے سردار نے محمدؐ کے ساتھ اتحاد کر کے ان سے وفاداری کا اعلان کر دیا۔ محمدؐ نے چالیس افراد پر مشتمل ایک وفد بھیجا جس کے ذمے بنو عامر کے لوگوں میں اسلام کی تبلیغ کرنے کا کام سونپا گیا۔ لیکن سردار کا بھتیجا بجائے مدینہ، مکہ کے ساتھ اتحاد کا خواہاں تھا اور چچا کی ساکھ کو نقصان پہنچا کر خود قبیلے کا سردار بننا چاہتا تھا۔ چنانچہ، اس نے ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت، اپنا دامن صاف بچاتے ہوئے ایک پڑوسی قبیلے کو محمدؐ کی جانب سے بھیجے جانے والے وفد پر گھات لگا کر حملہ کرنے پر آمادہ کر لیا جو ابھی راستے میں ہی ایک مضافاتی مقام پر پڑاؤ ڈالے بیٹھا تھا۔ یہ سازش کامیاب ہو جاتی لیکن حملے میں ایک مومن زندہ بچ گیا۔ وہ حملے کے وقت اونٹوں کو چرانے دور لے گیا تھا اور واپسی پر اس نے دور سے دیکھا کہ جس جگہ اس مختصر قافلے کا پڑاؤ تھا، وہاں گدھ منڈلا رہے ہیں۔ وہ سمجھ گیا اور وہیں سے مدینہ کی راہ لی۔ لیکن راستے میں اس نے دیکھا کہ بنو عامر کے دو قبائلی درختوں کے سائے میں سوئے پڑے ہیں۔ اسے گماں ہوا کہ شاید ان قبائلیوں کا حملہ آوروں سے تعلق تھا، اس نے غصے میں آکر انہیں وہیں موقع پر قتل کر دیا۔

بنو عامر کے سردار نے اس مومن کے جرم کی سراسر ذمہ داری محمدؐ پر ڈال دی۔ مومنین کا نکتہ یہ تھا کہ، 'غلطی کسی طور بھی ایک سوچی سمجھی حرکت قرار نہیں دی جا سکتی'، لیکن اب اس جواز سے کوئی فرق پڑنے والا نہیں تھا۔ اگرچہ خود محمدؐ کے وفد کے انتالیس لوگ قتل کیے جا چکے تھے مگر اس کے باوجود آپؐ کے پاس سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ بنو عامر کے دو مقتولین کا خون بہا ادا کریں۔ چنانچہ، 'آئین مدینہ' کے تحت انہوں نے تمام دستخط کرنے والوں کا اجلاس بلایا اور

انہیں خون بہا میں حصہ ڈالنے کا حکم دیا۔ لیکن، چونکہ مدینہ کا قبیلہ بنو نضیر آئین مدینہ کے سوا بھی ایک طویل عرصے سے بنو عامر کے اتحادی چلے آ رہے تھے، محمدؐ نے انہیں خون بہا کا دوسروں سے زیادہ حصہ ادا کرنے کا خصوصی حکم دیا۔

بنو نضیر مدینہ میں قینقاع کی بے دخلی کے بعد بچ جانے والے دو یہودی قبائل میں سے ایک تھا۔ ان کے نزدیک، محمدؐ کا یہ فیصلہ بعید از قیاس تھا۔ وجہ یہ تھی کہ وہ 'آئین مدینہ' کے تحت خود کو مومن کی غلطی کا اتنا ہی ذمہ دار سمجھتے تھے جتنا کہ مدینہ کے دوسرے قبائل قرار پائے تھے۔ ابن اسحاق لکھتے ہیں کہ اگرچہ انہوں نے اس بابت بات چیت کے لیے ان کے یہاں بلائی گئی انہی کی سبات کونسل، یعنی ہفتے کے روز بیٹھک میں تشریف لانے والے محمدؐ اور ان کے وفد کا نہایت خوش اخلاقی سے خیر مقدم کیا۔ محمدؐ کے ہمراہ وفد میں ابو بکر اور عمر بھی تھے۔ لیکن بنو نضیر کے ذہن میں کچھ اور ہی چل رہا تھا۔ ابن اسحاق کے مطابق انہوں نے اس وفد کو باہر ہی انتظار کرنے کا کہا۔ وجہ یہ بتائی کہ وہ آپس میں بیٹھ کر اس معاملے پر غور کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن در حقیقت وہ محمدؐ کو خون بہا کی مطلوبہ مقدار ادا کرنے کی بجائے محمدؐ کو قتل کرنے کا منصوبہ بنا رہے تھے۔

اگرچہ اس طرح کی ساری ہی کہانیاں بھیدی ہوا کرتی ہیں مگر یہ عجیب بھی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بنو نضیر کا پلان یہ تھا کہ وہ گاؤں کی اس دیوار کے اوپر سے ایک بھاری بھر کم پتھر لڑھکا دیں گے جس کے نیچے سائے میں محمدؐ بیٹھے انتظار کر رہے تھے۔ واردات کے بعد وہ اس کو ایک حادثہ قرار دے دیتے۔ لیکن ان کا یہ منصوبہ آخری وقت میں چوپٹ ہو گیا جب محمدؐ نے اچانک ہی وہاں سے بغیر کچھ کہے رخصت لی اور واپس نہیں آئے۔ بعد میں انہوں نے بتایا کہ ایک فرشتے نے انہیں بنو نضیر کی سازش سے پیشگی مطلع کر دیا تھا۔ لیکن، فرشتے نے بتایا یا نہیں، پھر بھی معروضی حالات میں یہ ناممکن نظر آتا ہے۔ مثلاً، سبات کو نسل کی میٹنگ ابھی تک جاری تھی، پھر محمدؐ ابو بکر اور عمر کو بھی بتائے بغیر وہاں سے چلے آئے اور انہیں خطرے سے آگاہ بھی نہیں کیا؟ اس کے علاوہ یہ بھی ناممکن نظر آتا ہے کہ ایک بھاری بھر کم پتھر ایک دم دیوار پر کیونکر چڑھایا جاتا؟ اسے عین نشانے پر لڑھکانا تو دور کی بات ہے۔ ان میں سے کچھ بھی معروضی حالات میں ممکن نہیں ہے۔ یا پھر شاید، یہ اس کہانی کے وہ مستند ٹکڑے ہیں جو اس بابت جمع کیے جا سکتے تھے تاکہ اس کے بعد پیش آنے والے واقعات، جن کا مستند حال دستیاب ہے، جواز پیدا کیا جا سکے۔ بغیر جواز کے ان واقعات کو بجا تسلیم کرنا درست نہ ہوتا۔

ایک گھنٹے کے اندر ہی محمدؐ نے نضیر کو پیغام بھیجا، 'میرا شہر چھوڑ دو۔ میرے خلاف غداری کی سازش کرنے کے بعد میرے ساتھ بسر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔' اس پیغام کے مندرجات ہی اس وقت کے حالات اور واقعات کے ترجمان ہیں۔ مدینہ اور نہ ہی مدینہ کا پرانا نام یثرب بلکہ 'میرا شہر۔۔۔'۔ اور غداری کی سازش مدینہ نہیں بلکہ 'میرے خلاف۔۔۔'۔ یہ بیان محمدؐ کے اختیار مطلق، غیر مشروط اور بلا شرکت غیرے اقتدار کا اعلان تھا۔ مثال یوں کہ جیسے فرانس کے 'بادشاہ آفتاب'، لوئی چودہویں نے کہا تھا کہ، 'میں ریاست ہوں!'۔

محمدؐ کا اس معاملے میں یہ حرف آخر، ایک پیغام کی صورت انصار میں سے ہی ایک مومن کے ہاتھ بھجوایا گیا جس کے اس سے پہلے تک نضیر کے ساتھ دوستانہ تعلقات رہے تھے۔ نضیر یوں ایک رفیق کے ہاتھوں ملنے والے ایسے دھمکی آمیز پیغام پر ہکا بکا رہ گئے اور اس سے پوچھا کہ آخر اس نے اس پیغام رسانی کی حامی کیونکر بھر لی؟ تو جواب ان کی علیحدگی اور ایک نئے سیاسی انتظام کے اعلان کی صورت آیا کہ، 'دل بدل گئے ہیں اور اسلام نے سارے پرانے اتحاد فسخ کر دیے ہیں'۔

اس نئی صورتحال سے نبٹنے کے لیے بنو نضیر کا اجلاس بلا لیا گیا۔ ابھی یہ اجلاس جاری تھا کہ ابن ابی نے پیغام بھجوایا اور مزاحمت پر زور دیا۔ یہ پیغام کچھ یوں تھا کہ، 'میرے ساتھ بدوؤں میں سے دو ہزار مسلح افراد تیار کھڑے ہیں اور خود میرے اپنے حامی میرے گرد جمع ہیں۔ تم رک کر مزاحمت کرو اور وہ سب اس لڑائی میں تمہارا ساتھ دیں گے۔ بنو قریظہ بھی تمہارے ساتھ ہے۔' حالانکہ بنو قریظہ، یعنی مدینہ میں یہودیوں کے دوسرے قبیلے نے ایسا کوئی پیمان نہیں باندھا تھا، یا کم از کم بنو نضیر اس سے لاعلم تھے۔ ابن ابی کے پیغام پر قبیلے کے بزرگوں نے اپنے خدشات کا اظہار کیا کہ اگر یہ مزاحمت ناکام ہو جاتی ہے تو اس صورت میں شاید یہ معاملہ صرف

بے دخلی کا نہیں رہے گا بلکہ اس سے بھی زیادہ یعنی، 'املاک ضبط کر لیں گے، بچوں اور عورتوں کو غلام بنالیں گے اور مردوں کو قتل کیا جاسکتا ہے'۔ مگر اس کے باوجود، بنو نضیر کی کونسل نے ابن ابی کی بات پر اعتبار کرتے ہوئے گاؤں کے مرکز میں مورچے سنبھال کر قلعہ بند ہونے کا فیصلہ کر لیا۔

بنو نضیر کے اس فیصلے پر محمدؐ کے جواب نے سب کو چونکا دیا۔ آپؐ نے بنو نضیر کی ملکیت میں جتنے کھجور کے باغات تھے، کاٹ دینے کا حکم دے دیا۔ عرب کے صحرا میں کسی بھی قسم کے درخت کی قدر و قیمت بڑھ کر ہوتی تھی، لیکن کھجور کے باغات کو خصوصی توجہ حاصل رہا کرتی تھی۔ ان میں سے ہر درخت کئی نسلوں کی محنت اور دیکھ بھال کی ترجمانی کرتا تھا اور کھجور کے باغات کو تباہ کرنا صرف املاک کا نہیں بلکہ تاریخ مٹانے کے مترادف سمجھا جاتا تھا۔ کھجور کے باغات کو 'کاٹ پھینکنے' کا حکم خاصا سوچ سمجھ کر دیا گیا تھا۔ مطلب یہ تھا کہ اس کے بعد بنو نضیر کے لیے یہاں رکنے کا کوئی جواز باقی نہیں تھا۔ یہی نہیں بلکہ یہ حکم ایک انتباہ بھی تھا کہ اگر انہوں نے مزاحمت جاری رکھی تو ان کا انجام بھی کھجور کے درختوں جیسا ہو سکتا تھا۔ اس طرح کے سخت حکم کا ایک اضافی فائدہ یہ بھی تھا کہ اس طرح ابن ابی کی عیاری اور ناتوانی بھی کھل کر سامنے آگئی کیونکہ ابھی تک وہ اپنے وعدہ کے مطابق دو ہزار لوگوں کا لشکر مہیا نہیں کر پایا تھا۔ بنو نضیر کا محاصرہ شروع ہو گیا اور یہ تقریباً پچھلے برس قینقاع کے ساتھ پیش آنے والی صورتحال تھی۔ پندرہ دن بعد، نہ صرف پانی کی قلت پیدا ہو گئی بلکہ نضیر مدینہ میں اپنے مستقبل سے قطعی مایوس ہو گئے تو ہتھیار ڈال دیے۔ ان کے ساتھ رعایت یہ برتی گئی کہ جان بخش دی گئی مگر انہیں اپنے ساتھ صرف اتنا ہی سامان لے جانے کی اجازت دی گئی کہ جتنا تین افراد ایک اونٹ پر لاد سکتے تھے۔

لیکن اس بار وداع قینقاع کی مانند رواس پٹاس پر مبنی جلوس کی صورت نہیں بلکہ نضیر کی رحصتی مدینہ سے دھوم دھام اور فتح کی پریڈ جیسا معلوم ہو گا۔ وہ ڈھول پیٹتے اور تمبورے بجاتے، نئے چمچماتے کپڑے پہن کر اور زیورات سے لدے پھندے روانہ ہوں گے۔ ایک عینی شاہد نے آنکھوں دیکھا حال یوں بیان کیا، 'وہ اس قدر طمطراق اور شان و شوکت سے نکلے کہ زمانے میں نہ تو ان سے پہلے اور نہ ہی اس کے بعد کبھی کسی قبیلے نے اتنا اہتمام کیا ہو گا'۔ یہ احتجاج کا انوکھا مگر بہترین مظاہرہ تھا۔ یہ ایک انتہائی دلیرانہ اظہار تھا کہ نخلستان میں صرف وہی ہیں جن کے سر ابھی بھی فخر سے بلند ہیں جبکہ مدینہ کی باقی ماندہ مقامی آبادی شرمسار ہے۔ یوں، مدینہ سے بے دخل ہو کر ان میں سے زیادہ تر شمال میں خیبر کے نخلستان اور کچھ خاندان فلسطین اور شام کی جانب نکل گئے مگر اپنے پیچھے اس نرالے انداز میں رخصت کی وجہ سے ایک لمبی بحث چھوڑ گئے۔ لوگوں کے بیچ ایک عرصے تک ان کے طریق وداع کا تذکرہ ہوتا رہا اور اس کے ساتھ جلاوطنی اور اس کی وجوہات بھی زیر بحث رہیں۔

قرانی آیات میں جلد ہی مومنین کے ہاتھوں باغات کی تباہی کے دلخراش منظر کا توڑ بھی آگیا کہ، 'تم لوگوں نے کھجور کے جو درخت کاٹے یا جن کو اپنی جڑوں پر کھڑا رہنے دیا، یہ سب اللہ ہی کے اذن سے تھا اور (اللہ نے یہ اذن اس لیے دیا) تاکہ فاسقوں کو ذلیل و خوار کرے'۔ یعنی یہ مومنین کا نہیں بلکہ ابن ابی جیسے لوگوں کا قصور تھا۔ یعنی، 'تم نے دیکھا نہیں ان لوگوں کو جنہوں نے منافقت کی روش اختیار کی ہے؟ یہ اپنے کافر اہل کتاب بھائیوں سے کہتے ہیں، 'اگر تم سے جنگ کی گئی تو ہم تمہاری مدد کریں گے' مگر اللہ گواہ ہے کہ یہ لوگ قطعی جھوٹے ہیں'۔ بنو نضیر کو جلاوطن کر کے محمدؐ نے اب روز روشن کی طرح عیاں کر دیا تھا کہ وہ اپنے اختیار کے خلاف کسی بھی صورت، کوئی مزاحمت برداشت نہیں کریں گے۔ وہ ایک بار پھر ابن ابی پر اپنا فرمان لاگو کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔

لیکن آپؐ کے سخت مزاج پیروکاروں، جیسے عمر کے لیے یہ کافی نہیں تھا۔ چونکہ وہ جنگجو تھے انہوں نے محمدؐ پر زور دیا کہ وہ ابن ابی کا معاملہ یہیں ختم کر دیں اور اسے قتل کرنے کا حکم جاری کریں۔ لیکن، جواب میں محمدؐ نے عمر کو ایک سیاسی سبق سکھا دیا۔ جواب دیا، 'کیا؟ تاکہ لوگ کہیں کہ محمدؐ اپنے ساتھیوں کا قتل عام کرتا ہے؟'۔ ابن ابی کو قتل کر کے علامت بنا دینے کے نتائج خاصے بھیانک ہو سکتے تھے۔ اگر اس کو اپنے ساتھ جوڑ کر رکھا جائے تو وہ کہیں زیادہ فائدہ مند ثابت ہو سکتا تھا۔ اسے تو گاہے بگاہے یہ یاد دلانے کی ضرورت تھی کہ اس کی حیثیت صرف ایک ماتحت کی ہے۔ بلاشبہ، پانچ سال بعد جب محمدؐ بلاشرکت غیرے، اختیار کل کے مالک

ہوں گے تو وہ عمر سے سوال کریں گے، 'اب تمہارا کیا خیال ہے؟' تو عمر جواب دیں گے کہ، 'واللہ، اگر میں اس وقت آپؐ کی صلاح پر ابن ابی کو قتل کرنے کا حکم جاری کر دیتا تو مدینہ کے سرداران غصے سے آگ بگولے ہو جاتے۔ لیکن آج انہیں ابن ابی کو قتل کرنے کا حکم دے دوں تو وہ خود اپنے ہاتھ سے اس کا کام تمام کر دیں گے'۔

جہاں تک بنو نضیر کی بے دخلی کا تعلق ہے تو قران کی الہامی آواز انتہائی عضب ناک انداز میں اس فیصلے کا دفاع کرتی نظر آتی ہے۔ اس سے پہلے جہاں کہا گیا تھا کہ یہودیوں کی گنی چنی تعداد ہی محمدؐ کے الہامی پیغام کی مخالفت کرتی آئی ہے اور وہ اپنے دین کو دھوکہ دے رہے ہیں، اب اصرار یہ تھا کہ شاید یہودیوں میں صرف چند ہی لوگ ہیں جو 'واقعی یہودی' ہیں۔ اس بابت، ایک کے بعد دوسری اور پھر کئی آیات نازل ہوئیں جن سے خود محمدؐ کے احساسات کی ترجمانی ہوتی تھی۔ قینقاع اور نضیر، دونوں کی ہی بے دخلی کو 'ظالمین' کے ساتھ ممکنہ طور پر واقعی سلوک کا حقدار قرار دے دیا گیا۔ اس ضمن میں یہ آیات جواز کے طور پر نازل ہوئیں کہ، 'وہی ہے جس نے اہل کتاب کافروں کو پہلے ہی حملے میں ان کے گھروں سے نکال باہر کیا۔ تمہیں ہرگز یہ گماں نہ تھا کہ وہ نکل جائیں گے، اور وہ بھی یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ ان کی گڑھیاں انہیں اللہ سے بچالیں گی مگر اللہ ایسے رخ سے ان پر آیا جدھر ان کا خیال بھی نہ گیا تھا۔ اس نے ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خود اپنے ہاتھوں سے بھی اپنے گھروں کو برباد کر رہے تھے اور مومنوں کے ہاتھوں بھی برباد کروا رہے تھے۔ پس عبرت حاصل کرواے دیدہ بینار کھنے والو!'۔ یہی نہیں بلکہ اگلی آیت میں عارضی رعایت کا تذکرہ بھی ملتا ہے اور پھر سخت وعید بھی کہ، 'اگر اللہ نے ان کے حق میں جلاوطنی نہ لکھ دی ہوتی تو دنیا میں ہی وہ انہیں عذاب دے ڈالتا اور آخرت میں تو ان کے لیے دوزخ کا عذاب ہے ہی۔۔'۔ یہ آیات مدینہ میں بچ جانے والے آخری یہودی قبیلے کے لیے اچھا پیغام نہیں تھا۔ ان کے لیے قینقاع اور نضیر کے برعکس، بچ نکلنے کے تمام راستے مسدود ہو جائیں گے۔

باب:16

اہل اقتدار کی جانچ پڑتال اور ان کے بارے گہری کھوج ساتویں صدی میں بھی اتنی ہی شد ومد سے کی جاتی تھی، جتنی کہ آج عام ہے۔ چنانچہ محمدؐ کی نجی زندگی بھی اب ذاتی معاملہ نہیں بلکہ عوام کی دلچسپی کا سامان بن چکا تھا۔ یاد رہے، تاریخی کرداروں کی ذاتی زندگی اور معاملات بارے کوئی بھی بات اسی لیے حتمی نہیں ہوتی کہ لوگوں کی گہری دلچسپی اور متنوع حوالہ جات کے باعث ہمیشہ ہی سہو زمانی کا احتمال باقی رہتا ہے۔ مطلب یہ کہ تاریخی لحاظ سے اس میں اشتباہ کا عنصر زیادہ ہوتا ہے۔ ویسے بھی 'پرائیویسی' کا تصور نسبتاً جدید ہے، اسی طرح شادی اور بیاہ کا صرف رومانوی جوڑ ہونا بھی آج ہی کے دور کی اختراع ہے ورنہ تاریخ کے دھارے میں تقریباً ہمیشہ سے ہی شادی در اصل مردوں کے بیچ طے پانے والا معاملہ رہا ہے۔ یہ باپ اور شوہر کی دلچسپی کا سامان ہے۔ یہ ناطہ خاندان کو جوڑنے یا پھر اس کو مزید مستحکم کرنے کا ذریعہ تھا اور یہی وجہ ہے کہ عم زادوں کے بیچ شادی بہت عام رہی ہے۔ لیکن رہنماؤں کے لیے یہ رشتہ اتحاد بنانے اور تعاون بڑھانے کا ذریعہ بھی ہے۔ شادی کے ذریعے رفیقوں اور ساتھیوں کے ساتھ انتہائی قریبی تعلق استوار کیا جاسکتا ہے اور سابقہ دشمنوں میں چپقلش مٹا کر قریب تر لایا جاسکتا ہے۔ اس طرح سیاسی افہام و تفہیم ایک نیا درجہ پالیتی ہے بلکہ اہم ترین ضرورت، یعنی ہم آہنگی کو تحریری شکل مل جاتی ہے۔ یہی نہیں، بلکہ شادی بیاہ کے رشتے استوار کر کے یہی تحریری اعلان، اگلی نسلوں کے لیے اولاد کی صورت خون کے تعلق سے لکھ دیا جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ادھیڑ عمری کے ڈھلنے تک ایک ایسا شخص جو یک زوجگی میں ایک عمر گزار چکا تھا، اب کئی بار شادی کرلے گا۔ خدیجہ کی فوتیدگی کے صرف تین سال کے عرصے میں محمدؐ تین بار نکاح کر چکے تھے اور ابھی چھ مزید شادیاں کریں گے۔ اواخر عمر میں کی جانے والی شادیوں میں، پہلی بیوی ایک خاموش طبیعت بیوہ تھیں جن کا نام 'سودہ' تھا۔ یہ شادی ان کے پیروکاروں کے اصرار پر طے کی گئی تھی کیونکہ وہ خدیجہ کے بعد ان کی حالت بارے خاصے متفکر تھے۔ محمدؐ کے دیرینہ

ساتھی اور قریبی دوست ابو بکر نے اپنی بیٹی عائشہ کا رشتہ پیش کیا، جسے قبول کر لیا۔ اور پھر، تاکہ یہ محسوس نہ ہو کہ وہ ابو بکر کو دوسروں پر فوقیت دیتے ہیں، بوجوہ دوسرے ساتھی عمر کی بیٹی حفصہ سے بھی نکاح کر لیا۔ حفصہ بدر کی جنگ میں بیوہ ہو چکی تھیں۔ اس طرح اب آپؐ کے دو قریبی ساتھی اور مشیران سسر بن چکے تھے اور دوسرے دونوں رفیق داماد بن جائیں گے۔ بلکہ ان میں سے ایک تو ان کا دوہرا داماد ہوں گے۔ بنو امیہ کے انتہائی معتبر اور اشرافیہ سے تعلق رکھنے والے عثمان نے پہلے محمدؐ کی سب سے بڑی صاحبزادی سے شادی کی۔ ان کی ان صاحبزادی کو اسلام کا پیغام عام ہوتے ہی طلاق دے دی گئی تھی۔ احد کی لڑائی کے کچھ عرصے بعد وہ انتقال کر گئیں تو عثمان نے فوراً ہی ان کی بہن ام کلثوم سے نکاح کر لیا۔ اسی طرح، محمدؐ نے خود اپنی مرضی سے سب سے چھوٹی بیٹی فاطمہ کی شادی اپنے چچازاد اور تقریباً لے پالک، علی سے کر دی۔

شادیوں کا یہ گڈمڈ اس روایتی عرب نسبت کی جدید مغربی تعریف، جسے عرف عام میں 'نیوکلیائی خاندان' کہا جاتا ہے، پورا اترتا ہے۔ عام طور پر شجرہ نسب کی جو تعریف کی جاتی ہے وہ ایک سیدھے سادے خط جیسی ہے مگر عربوں میں شجرہ نسب کی یہ شکل اس جامع تعریف کے ساتھ مذاق معلوم ہوتا ہے۔ یہاں اس کی مثال بجائے ایک شجر، انگور کی جکڑ کڑ بیل کے جنگل کی سی ہے۔ پھر، نسبت کے اس جنگل کی جڑیں اتنی گہری ہیں کہ یہ مستقبل میں بھی دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ محمدؐ کے دو سسر یعنی، ابو بکر اور عمر آپؐ کے بعد اسلام کے رہنما بن جائیں گے اور ان میں سے ہر ایک کو 'خلیفہ' مقرر کیا جائے گا۔ ان کے بعد دونوں داماد یعنی عثمان اور علی بھی اسی مقام پر فائز کیے جائیں گے۔ یوں شادیوں کے اس بندھن میں، یعنی رشتے ملے کر کے دانستہ یا غیر دانستہ، محمدؐ در اصل اس نئی اسلامی دنیا کی قیادت کو ایک قالب میں ڈھال رہے تھے۔

لیکن اگر مندرجہ بالا نسبت اور خاندانی جوڑ توڑ کا مایا جال اور اس کا مقصد مردوں کے لیے واضح تھا تو ضروری نہیں کہ شادی کے رشتوں میں بندھنے والی عورتیں بھی اس سے واقف ہوتیں۔ بالخصوص، آپؐ کی سب سے کم عمر اور بے لاگ بیوی ابو بکر کی بیٹی عائشہ کو اس کا بالکل اندازہ نہیں تھا۔ جہاں اس سے پہلے محمدؐ کی قیادت کو سیاسی حریفوں کی جانب سے مخالفت کا سامنا تھا، اب ویسے ہی مسائل گھر کے اندر سے جنم لیا کریں گے۔

بلاشبہ، عائشہ نے کبھی خود کو صرف ایک سیاسی اتحاد کا ذریعہ نہیں سمجھا بلکہ وہ تو اپنے آپ کو محمدؐ کی باقی تمام منکوحہ بیویوں سے برتر سمجھتی آئی تھیں۔ یہاں تک کہ اکثر و بیشتر ہی، تقریباً سبھی معاملات میں ان میں سے کسی کو بھی خاطر میں نہ لاتیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے اپنی ساری عمر صرف اور صرف اپنے لیے ایک استثنائی اور امتیازی حیثیت برقرار رکھنے پر زور دیئے رکھا۔ مثال کے طور پر جس عمر میں ان کی محمدؐ سے شادی ہوئی، اسی کو لے لیں۔ وہ خود بتایا کرتیں کہ جس عمر میں یہ شادی طے ہوئی وہ چھ سال کی عمر کی ایک چھوٹی بچی تھیں اور رخصتی کے وقت عمر نو سال تھی۔ ان کی حیات میں ہی کئی لوگ تھے جو اس دعویٰ پر معترض تھے لیکن یہ بھی تو ہے کہ صرف گنے چنے افراد ہی عائشہ کی بے باک طبیعت کے باعث، ان کی بات کو رد کرنے کی جرات رکھتے تھے۔ کئی سال بعد اسلامی دنیا کے انتہائی مضبوط سیاستدان، معاویہ کہا کریں گے کہ 'ہمیشہ یہ ہوتا کہ جس معاملے کو میں چاہتا کہ بند رہے، عائشہ اسی کو کھول دیتیں اور ایسا معاملہ جو میرے خیال میں کھلنا چاہیے، عائشہ بند رکھنے پر زور دیتیں'۔

اگر عائشہ واقعی اتنی کم عمری میں بیاہی گئی تھیں تو یہ بھی ہے کہ اسی زمانے کے کئی لوگوں نے اس پر خصوصی نظر کی ہے۔ بجائے ان کے قول، کئی لوگ روایت کرتے ہیں کہ یہ شادی نو سال کی عمر میں طے ہوئی اور رخصتی بارہ سال کی عمر میں عمل میں آئی۔ یہ قابل قبول بھی ہے کیونکہ اس وقت رسم یہی تھی کہ لڑکی کی شادی بلوغت کی عمر کو پہنچتے ہی فوراً کر دی جاتی تھی۔ لیکن پھر اس طرح، یعنی رسم کے عین مطابق بلوغت کی عمر میں شادی سے عائشہ بھی دوسری لڑکیوں کی طرح معلوم ہوتیں۔ جو ظاہر ہے، ان کے لیے قابل قبول نہیں تھا کیونکہ وہ ساری عمر اس کوشش میں رہیں کہ دوسروں سے ممتاز اور الگ نظر آئیں۔ وہ تند خو اور طرار زبان، مگر خاصی ذہین تھیں۔ خود بتایا کرتیں کہ وہ اکثر محمدؐ پر 'تند و تیز اور کاٹ دار جملے' کس دیا کرتی تھیں، جس پر نہ صرف آپؐ برا نہیں مناتے تھے بلکہ اس طرح ہلکی

پھلکی چوٹ لگانے سے ان کے بیچ محبت بھی بڑھ جاتی تھی۔ حالانکہ، انہی روایات کو بغور دیکھیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ محمدؐ عائشہ کو کم سنی اور لڑکی پنے فائدہ دیتے ہوئے شوخی کی کھلی چھٹی دے دیا کرتے تھے۔ یہیں، عائشہ کا چنچل پن اور سحر بھی واضح ہوتا ہے۔

عائشہ مسحور کن اور ذہین شخصیت کی مالک رہی ہوں گی لیکن وہ چنچل اور شوخ تو ضرور ہی تھیں۔ اسی شوخی کے باعث ان کا سحر اکثر دھندلا جاتا ہوگا، یا کم از کم آج کے دور کے تناسب میں یہ ایسا ہی محسوس ہوتا ہے۔ عائشہ کی زبانی جو واقعات روایت کیے گئے ہیں، اگرچہ ان کا مقصد تو اثر رسوخ اور زندہ دلی دکھانا مقصود ہے مگر بہر حال بسا اوقات ان تفاصیل سے ان کی شخصیت کا ایسا پہلو سامنے آتا ہے جو ایک ایسی نک چڑھی جوان عورت کا ہے جو اپنی راہ میں آنے والے کسی بھی شے کو خاطر میں نہیں لاتی اور اپنی ہی منوا کر رہتی ہے۔

مثال کے طور پر یہ روایت کہ ایک دفعہ محمدؐ نے بوجوہ ایک دوسری بیوی کے ہاں خاصا وقت گزار دیا۔ وجہ یہ تھی کہ ان کے لیے وہاں 'مشروب عسل' تیار کیا گیا تھا۔ مشروب عسل یعنی شہد سے تیار کردہ ایسا میٹھا ہوتا ہے جو غالباً اس دور میں بکری کے دودھ میں انڈہ ملا کر بہت سارے شہد میں پھینٹ دیا جاتا تھا۔ محمدؐ اس مشروب کو بہت پسند کرتے تھے۔ چونکہ عائشہ اچھی طرح جانتی تھیں کہ محمدؐ کو سانس میں بدبو سے بہت کوفت ہوتی ہے۔ اس لیے جب واپس آئے تو انہوں نے ناک سکوڑ کر منہ پھیر لیا اور پوچھا کہ وہ کیا کھا کر آئے ہیں؟ جب مشروب عسل کا بتایا تو منہ بنا کر کہا، 'جن مکھیوں نے وہ شہد بنایا تھا، یقیناً فسنتین کے کڑوے پھول کھاتی رہی ہیں'۔ وہ دیر تک یوں ہی ناپسندیدگی کا اظہار کرتی رہیں اور صلہ یہ ملا کہ اگلی بار جب محمدؐ کو اسی بیوی کے یہاں یہی مشروب دوبارہ پیش کیا گیا تو انہوں نے پینے سے صاف انکار کر دیا اور وقت سے پہلے ہی چلے آئے۔

ایسی دوسری مثالیں بھی ہیں جن میں عائشہ اس سے بھی کہیں بڑھ کر اپنی جتوایا کرتیں۔ جیسے، محمدؐ نے ایک عیسائی قبیلے کے ساتھ معاہدہ کیا اور اس نئے اتحاد کی اہمیت کے پیش نظر، قبیلے کے سردار کی بیٹی کے ساتھ شادی کرنے پر حامی بھر لی۔ سردار کی بیٹی بہت خوبصورت تھی۔ جب، وہ عورت نکاح سے پہلے مدینہ پہنچی تو عائشہ نے اس کو خبر انہ مشورہ دیا کہ اگر وہ نکاح کی رات مزاحمت کرے تو محمدؐ کی نظر میں اس کی قدر بڑھ جائے گی۔ اسے کہا کہ وہ ان سے کہے، 'میں تم سے خدا کی پناہ مانگتی ہوں۔۔۔'۔ اس کو علم نہیں تھا کہ دراصل یہ کلمہ نکاح کو فسخ کرنے کے مترادف ہے۔ جوں ہی اس نے ایسا کہا تو محمدؐ چونک گئے اور فوراً ہی وہاں سے چلے گئے۔ اگلے ہی دن سردار کی بیٹی کو واپس بھجوا دیا گیا۔

اس صورتحال میں، جب وہ اس قدر بے باک، شوخ اور نتائج سے بے پرواہ ہوا کرتی تھیں تو یہ بات یقینی تھی کہ جلد ہی، جب 'گمشدہ ہار کا واقعہ' پیش آئے گا تو عائشہ اس قضیے کے عین مرکز میں، پھنس کر رہ جائیں گی۔ کئی لوگوں کو کسر نکالنے کا موقع مل جائے گا۔

اگرچہ یہ صرف ایک عام ہار نہیں تھا لیکن ظاہر ہے، کوئی بھی ایسا سوچ سکتا ہے۔ یہ ایک دھاگے میں پروئے ہوئے چند منکے تھے۔ عقیق، شاید مرجان یا پھر صرف سمندری سیپیاں تھیں۔ عائشہ نے اس بابت کچھ نہیں کہا اور اگر پوچھا بھی تو ہاتھ کو لہرا کر ٹوک دیتیں کہ ان کے خیال میں یہ تفصیل غیر اہم تھی۔ بہر حال، یوں کہہ لیجیے کہ یہ ایک ایسا ہار تھا جو لڑکیاں پہنا کرتی ہیں لیکن اس ہار کی قیمت پروئے ہوئے ہیروں کے ہار سے بھی زیادہ تھی کیونکہ یہ ہار محمدؐ نے عائشہ کو شادی کا تحفہ دیا تھا۔

ہار ایک سفر سے واپسی کے دوران گم ہو گیا۔ شمال میں ایک بڑے بدو قبیلے مصطلق کی حمایت حاصل کرنے کے لیے ایک وفد گیا۔ عام طور پر جب محمدؐ خود ایسے وفود، جو سفارتی اور جنگی دونوں ہی طرح کے ہتھیاروں سے لیس ہوا کرتے تھے، سربراہی کرتے تو سفر پر اپنے ساتھ کسی ایک بیوی کو بھی ساتھ لے جاتے۔ ایسی مہمات پر جانے کے لیے عائشہ ہمیشہ ہی تیار رہتیں۔ وجہ یہ تھی کہ سفر ایک زندہ دل اور پر شوخ جوان عمر لڑکی کے لیے شغل اور ہر بار نیا تجربہ ہو سکتا ہے۔ آخر، ہودج یعنی اونٹ کی پشت پر کاٹھی پر چھتری سے ڈھکی ہوئی اونچی نشست پر بیٹھے سفر میں ارد گرد کا مشاہدہ خاصا دلچسپ مشغلہ رہا کرتا ہوگا۔ وہ دیکھتی ہوں گی کہ شمال کے لق و دق میدانوں میں دور دور تک گھوڑوں اور اونٹوں کے ریوڑ چرتے نظر آ رہے ہیں۔ خیبر اور فدک کے ہرے بھرے نخلستانوں میں کھجور کے وسیع باغات جیسے

گھیرے دار وادیوں میں زمرد اور سبزہ کے موتی بکھرے ہوں۔ اسی طرح جابجا، دور دراز علاقوں کے سخت جان بدو جنگجو جو اسلحے سے لیس، سرپٹ گھوڑوں اور اونٹوں پر گھومتے پھرتے رہتے۔ یہ مناظر کسی بھی شہری لڑکی کے لیے خاصے رومانوی اور دلپذیر ہو سکتے ہیں۔ اور پھر، جب مذاکرات ناکام ہوئے تو لڑائی شروع ہو گئی۔ ایسے میں، عائشہ کے لیے اپنے قافلے کے مردوں کو چیخ چیخ کر لڑائی اور جرات پر اکسانے کا تجربہ کیسا رہا ہو گا؟

بہر حال، اس جھڑپ میں محمدؐ اور ان کے حامیوں کو بنو مصطلق پر بہت حاصل ہو گئی۔ لڑائی میں کئی جنگی قیدی ہاتھ آئے تھے، جن میں سے اکثر کو تاوان لے کر چھوڑ دیا اور جو باقی تھے، غلام بنالیا گیا۔ بعد اس کے، اس مختصر لشکر نے رات کے اندھیرے میں ہی واپسی کا سفر اختیار کیا۔ رات میں سفر کا مقصد یہ تھا کہ دن میں سورج میں تپتے دن کے چڑھنے سے پہلے، جب سحری سے پہلے صحرا کی ریت ٹھنڈی ہوتی ہے، کافی فاصلہ طے کر لیں۔ روانگی سے قبل جہاں خیمے نصب تھے، عائشہ رفع حاجت کے لیے اس جگہ سے تھوڑی دور، صحرائی جھاڑیوں کی اوٹ میں چلی گئیں۔ جب واپس آئیں تو قافلہ روانگی کے لیے تیار تھا۔ وہ اپنے اونٹ کی پشت پر نصب ہودج میں بیٹھ گئیں۔ یہاں، انہیں احساس ہوا کہ ان کے گلے میں ہار نہیں ہے۔ شاید کسی جھاڑی میں اٹک کر ٹوٹ گیا تھا اور منکے بکھر گئے تھے۔ انہوں نے سوچا کہ اگر وہ اس بابت جلدی سے کام لیں اور واپس جا کر ڈھونڈیں تو کھویا ہوا ہار واپس مل سکتا ہے۔ وہ کسی سے کچھ کہے، بتائے بغیر ہی ہودج سے نیچے اتریں اور واپس جھاڑیوں کی طرف چل پڑیں۔

اگرچہ اس بابت انہوں نے خاصی پھرتی دکھائی اور انہیں قافلے کی روانگی کا بھی احساس تھا، وہ اندازے سے مطلوبہ جگہ ڈھونڈنے لگیں۔ ببول کی ساری جھاڑیاں ایک سی تھیں اور سحر کی مدہم روشنی میں یہ کام اور بھی مشکل ہو گیا تھا۔ پھر جب انہیں مطلوبہ جگہ مل گئی تو ریت کو ٹٹولنے لگیں۔ لیکن صحرا کی ریت میں ایک کے بعد دوسرا منکا تلاشتے انہیں کافی دیر لگ گئی۔ جب سارے منکے مل گئے تو ایک دھاگے میں پرو کر گلے میں ڈال دیا اور واپس ہو لیں۔ لیکن، جب تک وہ واپس آئیں تو کیا دیکھتی ہیں کہ قافلے کا نام و نشان بھی نہیں ہے۔ خدام اور قافلے کے لوگوں نے گماں کیا کہ عائشہ ہودج کے شامیانے میں بیٹھ چکی ہیں، یوں ہی روانہ ہو گئے۔

صحرا میں شارع عام کے طور پر استعمال ہونے والے ریتلے راستے وقت گزرنے کے ساتھ پختہ ہوتے چلے جاتے ہیں اور باقاعدہ روٹ کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ ایسی شاہراہوں پر لدے پھندے اونٹ نسبتاً دھیرے مگر خاصی سہولت کے ساتھ رواں رہتے ہیں۔ اگر عائشہ چاہتیں تو صبح کے اوقات میں، جب ہوا خنک اور ریت ٹھنڈی ہوتی ہے، ایک گھنٹے کے اندر قافلے کو جا پہنچتیں۔ لیکن ان کے اپنے الفاظ میں، "میں نے اپنے آپ کو چادر میں لپیٹ لیا اور وہیں ریت پر لیٹ گئی۔ میں جانتی تھی کہ جب وہ مجھے قافلے کے ساتھ نہیں پائیں گے تو یقیناً تلاشتے ہوئے واپس یہیں آئیں گے۔' صحرا جیسی مشکل جگہ پر بچاؤ کی یہ سوچ بھی درست تھی۔

یہ خلاف قیاس تھا کہ قافلے میں عائشہ کی غیر موجودگی محسوس نہیں کی جائے گی۔ پھر، یہ بھی سوچ سے باہر تھا کہ جب وہ انہیں ساتھ نہیں پائیں گے تو یوں ہی رواں دواں رہیں گے۔ وہ انہیں تلاش کرنے ضرور آئیں گے۔ وہ اسی کشمکش میں تھیں کہ سورج چڑھ آیا اور گرمی بڑھنے لگی۔ انہوں نے ببول کے ایک درخت کے سائے تلے پناہ لی اور انہی سوچوں میں پریشاں رہیں۔ یقیناً، وہ جان لیں گے اور جب وہ جان لیں گے تو کوئی نہ کوئی انہیں لینے ضرور آئے گا۔ ویسے بھی، ان کا یوں قافلے کے پیچھے جانا مناسب نہیں تھا۔ وہ محمدؐ کی پسندیدہ ترین بیوی تھیں، کیا وہ قافلے کے اونٹوں کے پیچھے ایک بدو، چرواہوں کی لڑکی کی مانند بھاگتی ہوئی اچھی لگتیں؟

لیکن، کافی دیر کے بعد بھی ان کو تلاشنے کوئی نہیں آیا کیونکہ قافلے کے لوگوں کو علم ہی نہیں تھا کہ عائشہ غائب ہیں۔ یہاں تک کہ قافلہ مدینہ بھی پہنچ گیا۔ وہاں بھی، کسی نے ان کی غیر موجودگی کو محسوس نہیں کیا۔ آمد کے شور و غل میں، جب اونٹوں پر سے سامان اتارا جا رہا تھا، اتنی بڑی مہم کے بعد واپسی پر لوگ ایک دوسرے کا خیر مقدم کرنے میں مشغول تھے اور جنگی قیدیوں اور غلاموں کو سنبھالا جا رہا تھا۔ ایسے میں، عائشہ کی غیر موجودگی کو کسی نے محسوس نہیں کیا۔ خیال یہ تھا کہ وہ ہودج سے اتر کر پہلے ہی گھر چلی گئی ہیں یا شاید وہیں، کہیں ہیں۔ یہ عائشہ کی خوش قسمتی تھی یا ایک لحاظ سے بد قسمتی کیسے کہ انصار میں سے ایک جنگجو جسے روانگی میں دیر ہو گئی تھی،

اب اکیلا ہی دن کے وقت تپتی دھوپ میں مدینہ کے لیے روانہ ہوا تھا۔ راستے میں اس نے عائشہ کو کیکر کے درخت کے نیچے بیٹھا ہوا پایا۔ اس کا نام صفوان تھا اور بعد ازاں عائشہ نے اپنے سر کی قسم اٹھا کر بتایا کہ اس نے انہیں دیکھ کر پہچان لیا اور نہایت احترام اور بانک پن سے اونٹ سے نیچے اتر آیا اور صحرا کی سی پاکیزگی اور عزت کے ساتھ انہیں اونٹ پر بیٹھنے میں مدد کی۔ پھر اس نے مدینہ تک اونٹ کی مہار تھامے، بیس میل کا سفر پیدل طے کیا۔ جب وہ شام کے وقت مدینہ پہنچیں تو لوگوں نے بھی یہی دیکھا کہ وہ اونٹ پر سوار ہیں اور اونٹ کی مہار تھامے صفوان آگے پیدل چل رہا ہے۔

یقیناً عائشہ نے تاڑ لیا ہو گا کہ اس وقت لوگ انہیں کیسی نظروں سے دیکھ رہے تھے اور بجائے آگے بڑھ کر ان کا خیر مقدم کرتے، پیچھو ٹھتے ہوئے دیکھے جا سکتے تھے۔ ان میں سے کسی نے آگے بڑھ کر شکر ادا نہیں کیا کہ وہ محفوظ رہیں اور خیر و خیریت سے واپس پہنچ آئیں۔ بلکہ، وہ سب تو انہیں عجیب نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ وہ چاہے صفوان کے اونٹ پر اضطراب کی حالت میں بھی جس قدر سیدھا بیٹھنے کی کوشش کر لیں یا سر کو اونچا رکھنے کی سعی کر لیں، یا پھر اپنی غصہ ناک نظر سے لوگوں کو ان کی حیثیت یاد دلائیں، اب بے سود تھا۔ لوگ سرگوشیاں کر رہے تھے اور کھسر پھسر ہو رہی تھی۔ وہ یقیناً سمجھ گئی ہوں گی کہ یہ کیا کھچڑی پکائی جا رہی ہے۔ محمدؐ کی سب سے لاڈلی بیوی تن تنہا ایک جوان مرد کے اونٹ پر سوار مدینہ کے بازاروں میں سے گزر رہی تھی اور وہ جنگجو اونٹ کی مہار کھینچ رہا تھا؟ یہ خبر منہ در منہ، ایک گھر سے دوسرے اور گاؤں، گاؤں پھیل گئی۔ لوگ کٹ کٹ کر رہے تھے کہ ہار کی گمشدگی تو ایک بہانہ ہے۔ ایک مرد کے ساتھ دن بھر صحرا میں مٹر گشت سے کیا مراد ہے؟ جب وہ پیدل ہی قافلے تک ایک گھنٹے کے اندر پہنچ سکتی تھیں، تو پھر وہیں بیٹھی انتظار کیوں کرتی رہیں؟ کیا ان کی آپس میں یہ پہلے سے طے شدہ ملاقات تھی؟ کیا محمدؐ کو اپنی سب سے پسندیدہ اور شوخ، زندہ دل بیوی نے دھوکہ دے دیا ہے؟ لوگ تھے کہ ان کی زبانیں قابو میں نہیں آ رہی تھیں۔ اس بابت گماں اور تہمتوں کو روک لگانا ناممکن ہو گیا۔

اب یہ بات کوئی معنی نہیں رکھتی تھی کہ اس سارے معاملے کی حقیقت کیا تھی۔ جیسے آج، ویسے ہی تب بھی جب ایک بار اس طرح کے الزامات کا جن ایک بار بوتل سے نکل آئے تو پھر اس کو واپس بند کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ لیکن یہاں سب سے اہم بات یہ ہے کہ اہم لوگوں بارے ایسے معاملات، الزام تراشی اور یوں بدنامی سیاسی منظر نامے پر خوب اثر انداز ہوا کرتی ہے۔ عائشہ اور صفوان کے بیچ کیا ہوا یا نہیں ہوا، یہ اہم نہیں رہا تھا۔ ساتویں صدی عیسوی کے مدینہ میں بھی وہی ہوا جو آج بھی دنیا بھر کے کسی بھی شہر میں ہو سکتا ہے، یعنی جنسی بے راہ روی کا صرف الزام دھر کر کسی بھی سیاستدان کو منہ کے بل گرایا جا سکتا ہے۔ یہ حربہ، ہمیشہ سے یوں ہی استعمال میں لایا گیا ہے۔ جلد ہی مدینہ کا نخلستان اس بابت الزام تراشی، حقارت، لعن طعن اور بد مزہ مباحثوں کی لپیٹ میں آ گیا۔ کنوؤں پر اور کھیت کھلیانوں میں، کھجور کے باغات اور قصبات کے سرائے گھروں، بازاروں اور اصطبلوں۔۔۔ یہاں تک کہ مسجد میں بھی لوگ مزے لے لے کر باتیں بنانے لگے۔

اس دوران محمدؐ نے عائشہ کی پاکیزگی پر ایک لمحے کے لیے بھی شک نہیں کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے اپنے تئیں پوری کوشش کر لی کہ اس معاملے کو یکسر نظر انداز کر دیا جائے لیکن چونکہ دن بدن یہ بات بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی اور اسی وجہ سے آپؐ کے اختیار پر گہرا اثر پڑ رہا تھا۔ چنانچہ، مناسب یہی سمجھا کہ اس بابت کوئی فیصلہ لینے تک عائشہ کو میکے بھیج دیا جائے۔ لیکن، یہ بھی سچ تھا کہ ان کی پسندیدہ، شوخ، چنچل اور ذہین بیوی کی لاپرواہی نے انہیں دو دھاری تلوار کی نوک پر لا کھڑا کیا تھا۔ جیسا کہ علی نے انہیں مشورہ دیا تھا، اگر وہ عائشہ کو طلاق دے دیتے ہیں تو اس کا مطلب یہ نکالا جائے گا کہ عائشہ نے واقعی انہیں دھوکہ دیا ہے۔ دوسری طرف، اگر وہ عائشہ کا ساتھ دیتے ہیں تو لوگوں کی زبانوں کو کون روکے گا؟ وہ کہتے پھریں گے کہ ایک عمر رسیدہ شخص کو اس کی کم عمر بیوی نے چھل دے دیا۔ ہر دو صورت، چاہے وہ کوئی بھی فیصلہ کر لیں، ان کے اختیار اور ساکھ کو ناقابل تلافی نقصان پہنچنا یقینی تھا۔ خود ان کی اپنی ساکھ کیا، اسلام کے الہامی پیغام کی حرمت بھی داؤ پر لگ جاتی۔ یہ بات سننے میں عجیب اور ناقابل یقین لگتی ہے مگر صورتحال واقعی یہ بن چکی تھی کہ اس نئے دین کا مستقبل ایک نوعمر لڑکی کی عزت اور عفت پر ٹنگا ہوا تھا۔

زندگی میں پہلی بار، عائشہ کی ایک بھی نہیں سنی جائے گی۔ جیسے ابن اسحاق نے لکھا ہے، 'انہوں نے بہتیری کوشش کی، سب کچھ کہہ دیا'، لیکن اب ان کے کچھ بھی کہے سے کوئی فرق پڑنے والا نہیں تھا۔ وہ طیش میں آکر برہم ہو جاتیں، ان کا گھمنڈ چور چور ہو جاتا اور تہمت لگانے والوں کو کوسنے دیتے پھٹ پڑتیں۔ وہ کچھ بھی کر لیں، اب ہر چیز بے اثر ہو چکی تھی۔ کئی سال بعد بھی وہ ان دنوں کو یاد کر کے کانپ جایا کرتیں اور ساتھ گلہ کرتیں کہ لوگ جانتے بوجھتے کہ صفوان نامرد ہے، الزام تراشی سے باز نہیں آئے۔ لیکن یہ ایسا دعویٰ ہے جس کو رد کرنے کے لیے تب صفوان زندہ نہیں تھا۔ وہ ایک لڑائی میں مارا گیا تھا۔ ایسی کیفیت میں، دنیا بھر میں کوئی بھی کم عمر لڑکی ہو، عائشہ بھی جب کچھ نہ بن پڑتا تو رونے لگتیں۔ روایت میں اس بابت کئی مثالیں ہیں اور حد سے زیادہ مبالغہ آرائی سے کام لے کر استعارے استعمال میں لاتے، اس کیفیت کو بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو ایسی صورتحال میں سمجھ بھی آتا ہے۔ جیسے، خود عائشہ سے منسوب یہ بیان ہے کہ، 'میں خود کو رونے سے روک نہیں پاتی تھی۔۔۔ میں ہر وقت روتی رہتی، یہاں تک کہ مجھے لگتا کہ شاید رونے سے میرا جگر پھٹ جائے گا'۔

عائشہ کو درپیش یہ صورتحال اور بھی بدتر اس لیے تھی کہ محمدؐ سے شادی کو چار سال ہونے کو آئے تھے اور ابھی تک ان کے یہاں اولاد نہیں تھی۔ درحقیقت، خدیجہ کے وصال کے بعد اب تک انہوں نے جتنی شادیاں کی تھیں، کوئی اولاد نہیں تھی۔ اولاد کے نہ ہونے، بالخصوص اولاد نرینہ کے بغیر بات اور بھی بگڑ گئی، کچھ اور ہی رخ اختیار کر گئی۔ اب ایک نیا مسئلہ بھی زیر بحث رہنے لگا۔ وہ یہ کہ، آپؐ نے متعدد بار نکاح کیا۔ ان شادیوں کا مقصد صرف اور صرف امہ کو یکجا کرنا تھا۔ مومنین اور اتحادیوں کو جوڑ کر رکھنا تھا، لیکن یہ تعلقات اور اتحاد صرف اور صرف اولاد سے پختہ ہو سکتے تھے۔ نیا خون ہی دراصل جوڑ کی نئی سمتوں کی بنیاد بن سکتا تھا اور پرانی رقابتوں، تقسیم کو مٹا سکتا تھا۔ ویسے بھی، اولاد کے بغیر شادی کا کیا مقصد رہ جاتا ہے؟

یقیناً خدیجہ کے بعد تمام بیویوں نے اپنے تئیں محمدؐ کی اولاد حاصل کرنے کی اپنی سی بہتیری کوشش کی ہو گی۔ اگر ان میں سے کسی کے یہاں بھی محمدؐ کی اولاد جنم لیتی تو اسے دوسری تمام بیویوں پر فوقیت حاصل ہو جاتی۔ بالخصوص، یہ اولاد اگر لڑکا ہوتا تو وہ آپؐ کا جائز جانشین ہوتا۔ چنانچہ، اس بابت کوئی شک نہیں کہ ان میں سے ہر ایک نے، بالخصوص عائشہ نے بھی ہر ممکن کوشش کی تھی۔ وہ اس بات پر بھی نالاں تھیں، اکثر حسد کرتیں کہ محمدؐ کی توجہ کا مرکز اسی وجہ سے ان کے نواسے ہیں، جو خدیجہ کے بھی نواسے تھے۔ یہ دو لڑکے حسن اور حسین، علی اور فاطمہ کے فرزند ان تھے۔ محمدؐ شاذ و نادر ہی کھل کر ہنسا کرتے تھے، مگر اب تو یہ حال تھا کہ وہ صرف اپنے نواسوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے ہی کھل کھلاتے تھے۔ روایات میں ان کی حسن اور حسین کے ساتھ انسیت اور قربت کی کئی مثالیں مل جاتی ہیں۔ آپؐ کی ایسی شبیہ بنتی ہوئی دکھائی دیتی ہے جس میں ایک خوش قسمت اور لاڈ پیار کرنے والا نانا اپنے نواسوں کو فخر سے گود میں اٹھائے بیٹھا ہے۔ ان کے بیچ اتنی قربت ہے کہ محمدؐ جیسا معتبر شخص چاروں شانے چت پڑا ہے اور دو بچے اس پر لوٹ رہے ہیں۔ وہ ہاتھ اور گھٹنے زمین پر ٹکائے، چوپایا بن کر انہیں سواری کرا رہا ہے اور جب مسجد میں عبادت کے دوران سجدے کے لیے جھکتا ہے تو یہ بچے بے اختیار دوڑ کر پیٹھ پر سوار ہو رہتے ہیں اور وہ دیر تک یوں ہی جھک کر وہیں سجدے میں پڑا رہتا ہے۔ آہستہ آہستہ عائشہ کے اندر یہ خوف جم کر بیٹھ گیا کہ وقت کے ساتھ آپؐ کی زندگی کی اصل خوشی وہ نہیں بلکہ یہ دو لڑکے، حسن اور حسین ہیں۔

محمدؐ کا اس عمر میں لاولد رہنا اور کئی سال پہلے خدیجہ کی رفاقت میں چار بیٹیوں اور ایک بیٹے کی پیدائش کے حالات میں خاصا فرق ہے۔ آپؐ کے یہاں پیدا ہونے والا واحد لڑکا، فرزند قاسم نومولود ہی چل بسا تھا۔ مراد یہ ہے کہ محمدؐ کے یہاں اولاد پہلے سے تھی۔ اسی طرح عائشہ کے سوا آپؐ کی ساری ہی منکوحہ بیویاں، نکاح سے پہلے بیوہ یا طلاق یافتہ تھیں۔ ان کے یہاں بھی سابقہ شوہروں سے اولاد تھی۔ یوں، ان کا بھی تولیدی لحاظ سے عنیز زرخیز ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لحاظ سے کثیر الازواج ہونے کے بعد بھی لاولد رہنے کی وجہ سے مغربی دنیا میں جو محمدؐ کا منفی ازدواجی تصور پیش کیا جاتا ہے، زیادتی ہے۔ محمدؐ خدیجہ کے بعد تمام عمر خود سے کیے مجرد رہنے کے عہد پر قائم رہے۔ یا اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ساتویں صدی عیسوی میں پچاس یا پچپن سال کی عمر آج کے مقابلے میں خاصی طویل سمجھی جاتی تھی۔ اس وقت، یہ بڑھاپا شمار ہوتا تھا۔ یعنی، اس عمر میں شہوت باقی نہیں رہتی یا جنسی قابلیت کا کم ہو جانا بھی عین ممکن ہے۔ لیکن، ان عضویاتی حقائق کے

باوجود، آنے والی کئی صدیوں میں اسلامی علماء اور جید سکالر ایک دوسری توجیہا پیش کرتے، بلکہ اسی پر اصرار کرتے نظر آئیں گے۔ وہ کہا کریں گے کہ دراصل بعد کی تمام شادیوں کے باوجود محمدؐ کا لاولد رہنا الہام کی قیمت ہے۔ چونکہ، قران خدا کی جانب سے نازل کیا جانے والا جامع اور حرف آخر ہے۔ محمدؐ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ یوں، پیغمبر کے بطن سے اولاد نرینہ پیدا ہونا قدرتی طور پر، خدا کے حکم پر ممکن نہیں تھا۔ جیسا کہ عام طور پر ہر جگہ علمائے دین، ہر معاملے میں کچھ نہ کچھ حکمت ڈھونڈ ہی لاتے ہیں، جیسے تب ویسے ہی آج بھی کہا کرتے ہیں کہ ایک ایسا شخص جس پر الہام نازل ہوا، اس کو اتنا بڑا رتبہ عطا کیا گیا ہو، اس کے لیے یہ اولاد اور اولاد نرینہ جیسے روزمرہ زندگی کے معاملات بے معنی ہو جاتے ہیں۔

عائشہ کے یہاں اولاد نہ ہونے کی جو بھی وجہ رہی ہو، انہیں یہ دکھ اندر ہی اندر گھن کی طرح کھائے جا رہا تھا۔ وہ چاہے جس قدر شوخ اور چنچل ہوں، محمدؐ کے ساتھ شرارت، چھیڑ چھاڑ کر کے ان کا دل بہلا لیں۔ انہیں وہ نہیں دے سکتی تھیں جو آپؐ کو خدیجہ سے میسر آیا تھا۔ عائشہ بھلے خدیجہ کے بعد آنے والی تمام بیویوں میں محمدؐ کی پسندیدہ ترین ہوں لیکن وہ جتنی بھی سعی کر لیں، خدیجہ کی یاد کو محو نہیں کر سکتی تھیں۔ تب ہی، جھنجھلا جاتیں اور ان کے بارے یہاں تک کہہ دیا کہ، 'وہ پوپلے منہ والی بوڑھی عورت جس کو خدا نے بہتر سے بدل دیا'۔ تس پر محمدؐ نے انہیں ٹوک دیا تھا۔ یہی نہیں، بلکہ اب تو خدیجہ کے بعد، ان کے نواسے بھی محمدؐ کے نور نظر بن چکے تھے۔ اور اب، جب کہ یہ نیا قضیہ شروع ہو چکا تھا، عائشہ پہلے سے بھی کہیں بڑھ کر غیر محفوظ ہو گئیں۔ محرومی کا احساس چوگنا ہو گیا۔ وہ اس معاشرے میں، جہاں ماتا سے محروم ہونا تقریباً گناہ سمجھا جاتا ہو اور اب اسی سفاک معاشرے میں عزت اور عفت بھی یوں داؤ پر لگ جائے تو عائشہ کے لیے حالات بدترین رخ اختیار کر چکے تھے۔ ایسی صورتحال میں ان کے لیے المیہ یہ تھا کہ، ان کا مقام اور رتبہ ختم ہو کر رہ جاتا۔

اس سارے قضیے، جس کو عام طور پر 'ہار کا ماجرا' کہا جاتا ہے، اس کے حل کا صرف اور صرف ایک طریقہ تھا۔ یعنی، اس بابت انسانوں سے کہیں بڑی ذات کی جانب سے کوئی الہام نازل ہوتا، جو ہو بھی گیا۔ اگرچہ عائشہ نے محمدؐ کو اپنی پاک دامنی کا یقین دلانے کے لیے ہر طرح کی قسم اٹھالی تھی، لیکن محمدؐ کے لیے دین کی حرمت برقرار رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ وہ الہامی آواز سے رجوع کرتے۔ چنانچہ، وہ مراقبہ میں چلے گئے اور خدا سے مدد چاہی۔ تھوڑی ہی دیر میں ان پر نزول وحی کی کیفیت طاری ہو گئی۔ عائشہ بتاتی ہیں، 'جب وہ وحی کے نزول کے بعد سنبھلے تو ان کو اس قدر پسینہ آ رہا تھا کہ جیسے سرما میں بارش برستی ہے۔ آپؐ نے پیشانی سے پسینہ پونچھا اور مجھ سے کہنے لگے، 'مبارک ہو عائشہ! اللہ نے تمہاری پاک دامنی کی گواہی دی ہے'۔

اس بابت قرانی آیات میں واضح کر دیا گیا کہ عائشہ پر تہمت لگائی گئی ہے۔ کئی آیات میں پھیلی تفصیلات سے روشنی ڈالی گئی اور جو کہا گیا، اس میں چیدہ یہ تھا، 'جو لوگ یہ بہتان گھڑ لائے ہیں وہ تمہارے ہی اندر کا ایک ٹولہ ہیں، اور انہیں سزا مل کر رہے گی'۔ اسی طرح، 'لیکن جس وقت تم لوگوں نے اسے سنا تھا، اسی وقت کیوں نہ مومن مردوں اور مومن عورتوں نے اپنے آپ سے نیک گماں کیا اور کیوں نہ کہہ دیا کہ یہ صریح بہتان ہے؟' آگے چل کر پوچھا گیا، 'جبکہ تمہاری ایک زبان سے دوسری زبان اس جھوٹ کو لیتی جا رہی تھی اور تم اپنے منہ سے وہ کچھ کہے جا رہے تھے جس کے متعلق تمہیں کوئی علم نہ تھا۔ تم اسے ایک معمولی بات سمجھ رہے تھے۔ حالانکہ اللہ کے نزدیک یہ بڑی بات تھی'۔ جھڑکنے کی طرح کہا، 'کیوں نہ اسے سنتے ہی تم نے کہہ دیا کہ، 'ہمیں ایسی بات زبان سے نکالنا زیب نہیں دیتا، سبحان اللہ، یہ تو ایک بہتان عظیم ہے؟' اور پھر نصیحت کی، 'آئندہ کبھی ایسی حرکت نہ کرنا، اگر تم مومن ہو!'۔

انہی آیات میں یہ بھی کہا گیا کہ اگر تہمت لگانے والے سچے تھے تو پھر انہیں اس گھناؤنے الزام کو ثابت کرنے کے لیے چار گواہ پیش کرنے چاہیے تھے۔ گواہوں کا نہ ہونا بھی دراصل ان کے جھوٹے بہتان کا ثبوت ہے۔ یوں نہ صرف عائشہ کو چھٹکارا مل گیا بلکہ خود خدا کی آواز ان کے لیے ایک نہیں، دو نہیں بلکہ چار چار لوگوں کی گواہی کا تقاضا کر رہی تھی۔ پہلے تو بہتان کا نشانہ بننے اور پھر اس پر ہراساں کیے جانے والی کسی بھی عورت کے لیے اس سے بہتر فیصلہ کوئی نہیں ہو سکتا۔ پھر عائشہ کی عزت، حرمت اور عفت کو خدا کی پرزور تائید اور پشت پناہی مل چکی تھی اور وہ لوگ جنہوں نے افواہیں پھیلائی تھیں، الزام تراشی کی تھی اور تہمت لگائی

تھی بری طرح پٹ چکے تھے۔ لیکن، اس معاملے کا یوں طے ہونا بلاشبہ عائشہ کے لیے خاصا اطمینان بخش تھا، مگر تب سے آج تک ان کے ہی جیسی صورتحال سے دوچار باقی عورتوں کے لیے یہ خدائی گواہی، انسانوں کے ہاتھوں میں تشریحات کی مٹی میں رل کر کچھ اتنی اچھی ثابت نہیں ہوئی۔

یہ آیات، جن کے ذریعے عائشہ کی پاکدامنی ثابت ہوئی تھی، بعد ازاں قدامت پسند اسلامی عالمین کے ہاتھوں اس کے انتہائی مختلف مفہوم برآمد ہوں گے۔ یہی آیات یوں استعمال کی جائیں گی جو ان کے اصل مقصد کے سراسر منافی ہے۔ یعنی ان آیات کے ذریعے عورتوں کو بجائے تحفظ دیا کریں، مجرم ٹھہرایا جائے گا۔ زنا بالرضا اور زنا بالجبر کو خلط ملط کر کے، یہ جواز پیش کیا جائے گا کہ ہر دو صورت ایسا کوئی بھی الزام، اگر عورت چار گواہوں کو پیش کرے، تو ہی قابل قبول ہو گا۔ ظاہر ہے، کسی بھی عورت کے لیے یہ شرط پوری کرنا ممکن نہیں ہے۔ چونکہ وہ ایسا نہیں کر سکتی تو پھر دوسری صورت میں بھی اسی کو مورد الزام ٹھہرایا جائے گا۔ یعنی، مبینہ طور پر عصمت دری کرنے والا مرد باعزت بری کر دیا جائے گا لیکن الزام لگانے والی عورت یا کئی صورتوں میں مرد پر بھی نہ صرف بہتان باندھنے بلکہ بدکاری کا بھی الزام پکا سمجھ کر مجرم ٹھہرایا جائے گا، کیونکہ اس نے اپنے منہ سے غیر ازدواجی، غیر اخلاقی، بدکاری اور حرام کاری پر مبنی افعال کا اعتراف کر لیا ہے۔ باوجود ہر شے، آج اس بابت گرما گرم مذہبی مباحثوں اور دنیا بھر میں جاری غیرت کے نام پر مکالمے سے قطع نظر، ستم ظریفی یہ ہے کہ عائشہ، یعنی ایک عورت کی بریت اور تحفظ کا باعث بننے والی قرانی آیات کو ان کے بعد عجب، اصل روح کے منافی، الٹ انداز میں تضحیک، خاموش کرانے کے حربے کے طور پر اور عورتوں کے قتل کی بنیاد بنا دیا گیا ہے۔

بہر حال، اس دور میں واپس جائیے تو خود عائشہ بھی قران کی گواہی کے نتیجے میں حاصل ہونے والی اس شادمان فتح کا دیر تک اثر قائم نہ رکھ پائیں۔ وہ اب تک خدیجہ کے سوا آپؐ کی باقی تمام بیویوں سے عمومی حسد اور جلن کو ایک حد میں رکھتی آئی تھیں۔ اس کی عمومی وجوہات تھیں جو سمجھ بھی آتی ہیں، یعنی ان کا تقابل نہیں تھا۔ جیسے، عمر کی بیٹی حفصہ ظاہری خوبصورتی کی بجائے ذہانت کی وجہ سے جانی جاتی تھیں۔ (بعض روایات کے مطابق انہوں نے قران کی طباعت میں خاصا کلیدی کردار ادا کیا تھا)، اسی طرح ام سلمہ اور سودہ دونوں ہی ادھیڑ عمر گھریلو عورتیں تھیں۔ ام سلمہ وہی ہیں جو مکہ سے مدینہ تن تنہا اپنے نومولود زخمی بیٹے کے ہمراہ سفر کر چکی تھیں اور ان کے شوہر احد کی لڑائی میں قتل کر دیے گئے تھے۔ لیکن، اب محمدؐ نے پانچویں بار شادی کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ شادی، جویریہ سے طے ہوئی تھی۔ جویریہ کو مصطلق قبیلے کے ساتھ لڑائی میں قیدی بنایا گیا تھا۔ 'واللہ، مجھے اس سے شدید نفرت تھی تاآنکہ میں نے اسے دیکھ نہ لیا'۔ عائشہ نے جویریہ کی خوبصورتی کا اعتراف کرتے ہوئے مزید کہا، "میں جانتی تھی کہ محمدؐ بھی اسے اسی نظر سے دیکھا کریں گے، جیسے وہ مجھے نظر آئی تھی'۔ لیکن تب تک عائشہ کو نہ تو سیاست میں دلچسپی تھی اور نہ ہی اس کی سمجھ ہوا کرتی تھی۔ محمدؐ نے جویریہ کے ساتھ نکاح کا فیصلہ خوبصورتی نہیں بلکہ حال ہی میں ان کے مفتوح کیے جانے والے قبیلے کی جانب سے پیش کی جانے والی مفاہمت کی درخواست کے باعث کیا تھا۔ یہ اتحاد اور قربت کا اشارہ تھا۔ ایک ایسا اعلان تھا کہ جس کے تحت ماضی کی تلخیوں کو بھلانے کا اعادہ کیا گیا تھا اور اگر مصطلق اب تک اسی اتحاد اور باہمی تعلقات سے انکار کرتے آئے تھے، اب آگے بڑھنے والے دوستی کے ہاتھ کو قبول کرنے کے لیے خوشی خوشی تیار تھے۔ شاید، عائشہ ان معاملات کو خواہش اور ہوائے نفس کے پیمانے میں تولتی ہوں لیکن محمدؐ کے لیے یہ رائج سفارتی اور سیاسی طریقہ کار تھا۔ تاآنکہ، ایک دن آپؐ نے ایک بار پھر، ایک نئی، پسند کی شادی نہ کر لی۔

اب کی بار کیے جانے والے نکاح کے بارے میں کوئی شک اور شبہ نہیں کہ یہ خالصتاً خواہش اور چاہ کی بنیاد پر کیا گیا تھا۔ اس شادی کی مثال سے آپؐ کی شخصیت کا خالصتاً انسانی پہلو بھی اجاگر ہوتا ہے کہ پچاس کے پیٹے میں پہنچ کر بھی ان کے دل میں ایک بار پھر بشری صفت، یعنی تمنا اور خواہش نے جنم لیا تھا اور وہ اس شوق میں بہہ گئے۔ لیکن، ایک بار پھر اس بابت کہانی عجب معلوم ہوتی ہے۔ روایات کا مطالعہ کریں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تفصیلات کو کچھ ایسے نرالے انداز میں بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ جس میں ان کی مردانہ خواہشات ابھر کر سامنے آجاتی ہیں۔ حالانکہ، اس نکاح کے بعد بھی ان کے یہاں اولاد پیدا نہیں ہو گی۔ کہا جاتا ہے کہ بظاہر وہ اپنے لے پالک بیٹے زید سے ملنے ان کے یہاں گئے لیکن گھر میں صرف زید کی بیوی زینب موجود تھی۔ زینب اپنے شوہر کا انتظار کر رہی تھیں اور

جب محمدؐ گئے تو جیسا کہ ابن اسحاق نے انتہائی محتاط انداز میں، ان الفاظ کا استعمال کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ وہ دیکھتے ہیں کہ زینب 'بے ترتیب لباس پہنے، غیر مانوس حالت میں تھیں'۔ آپؐ یہ دیکھ کر شرم سے لال ہو گئے اور بڑبڑاتے ہوئے باہر نکل گئے۔ روایت میں یوں لکھا ہے کہ وہ کہنے لگے، 'اس سے اللہ کی پناہ جو مردوں کے دلوں پر اثر ڈالتا ہے'۔ جب زید کو اس بابت پتہ چلا تو انہوں نے اسے محمدؐ کی خواہش جان کر، فرزندانہ اطاعت کا مظاہرہ کرتے ہوئے زینب کو طلاق دے دی تاکہ آپؐ نکاح کر سکیں۔ بعض روایات کے مطابق زید، زینب کے ساتھ شادی پر خوش بھی نہیں تھے۔

اگر باپ کی شادی بہو کے ساتھ، چاہے وہ لے پالک بیٹے کی ہی طلاق یافتہ بیوی کیوں نہ ہو، جائز ہوتی تو پھر شاید یہ مسئلہ نہ ہوتا۔ لیکن، اصل کہانی جو بھی رہی ہو، یقیناً یہ معاملہ ایک اور 'مگشدہ بار کا واقعہ' ثابت نہیں ہو گا۔ اس سے پہلے کہ لوگ ایک بار پھر چہ مہ گوئیاں کرنے لگیں اور افواہیں پھیلتیں، قرانی آواز نے فوراً ہی مداخلت کر کے معاملہ سلجھا دیا اور مبینہ طور پر ایک نئے قضیے کو جنم لینے سے قبل ہی گھونٹ کر مار دیا۔ یہ مسئلہ یوں حل ہوا کہ محتاط الفاظ کے ساتھ ایک بار پھر ممنوع فعل کا امر واقعی کے طور پر اعادہ کیا گیا۔ اس معاملے کی طرح کی صورتحال میں ممانعت، 'ان بیٹوں کی بیویاں جو تمہارے صلب سے ہوں' کے الفاظ سے کی گئی تھی، یعنی سگے بیٹوں کی بیویوں سے نکاح کرنے سے منع کر دیا گیا تھا اور لے پالک بیٹوں کی بیویوں سے نکاح جائز قرار دیا گیا تھا۔ یہیں پر الہامی آواز نے اس موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس بابت کافی تفصیل سے نکاح کے معاملے میں ممنوع امور کو بھی واضح کر دیا۔ اس کے ساتھ محمدؐ کی پدرانہ حیثیت کو بھی یوں بیان کیا کہ، 'محمدؐ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں'۔ مزید وضاحت یوں کی، 'وہ اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں'۔

مقدس ذات کے حکم کے سامنے، جیسے اس سے قبل لوگوں کی زبان بندی ہو جاتی تھی، اب کی بار عائشہ کے پاس بھی کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ محمدؐ کے زینب کے ساتھ نکاح کو قبول کر لیں۔ انہوں نے چار و ناچار قبول تو کر لیا لیکن طبیعت ایسی تھی کہ اپنے محسوسات کو بیان کرنے سے خود کو روک نہ سکیں۔ محمدؐ سے کہنے لگیں، 'سچ ہے کہ اللہ آپؐ کی دلی فرمائش پر فوراً سے پہلے ہی آمادہ ہو جاتا ہے'۔ شاید وہ نہیں جانتی تھیں کہ حال ہی میں قرانی آیات کی روشنی میں خود کو ملنے والی خلاصی اور اب یہ بات، خوش خلقی اور بے مہری گردانی جا سکتی تھی۔

محمدؐ اپنی بیویوں کے بیچ جاری اس کل وقتی کشمکش سے اچھی طرح واقف تھے۔ اسی لیے وہ یقینی بناتے کہ ان میں سے ہر ایک کے ساتھ مناسب وقت گزارا کریں۔ چنانچہ، وہ تسلسل کے ساتھ، باری آنے پر ہر بیوی کے ساتھ ایک رات گزارتے۔ ان کا اپنا ذاتی کوئی کمرہ نہیں تھا بلکہ وہ ایک بیوی کے یہاں سے دوسری کے پاس وقت بسر کرنے کے لیے چلے جاتے۔ وہ اب بھی بدستور سادہ منش تھے اور ان کی بیویوں کے کمروں میں بھی اسی وجہ سے تعیش اور آرام کا کوئی سامان نہیں تھا۔ یہ کوارٹر، جن میں آپؐ کی منکوحہ ازدواج کی بسر تھی، بمشکل ہی کمرے کہلائے جا سکتے تھے۔ مسجد کے مشرقی حصے میں چہار دیواری کے ساتھ ایک لمبوتری ترتیب میں کھجور کے پتوں کی ڈھلوانی چھتیں ڈال کر اور پتلی دیواریں کھڑی کر دی گئی تھیں، جن کے دروازے مسجد کے احاطے میں کھلتے تھے۔ دروازے کیا، پردے کے نام پر کھجور کے پتوں کی چٹائیاں ٹنگی ہوتی تھیں۔ ان کمروں کے اندر بھی کچھ خاص اہتمام نہیں تھا بلکہ پیچھے دیوار کی طرف پتھروں کے اوپر سلیٹیں بچھی تھیں جو بستر کا کام کرتی تھیں۔ ان کے اوپر بچھائی رلیاں اور رضائی، تلائیاں سونے کے وقت، یعنی رات کو پھیلا دی جاتیں اور صبح ہوتے ہی لپیٹ کر سلیٹوں پر دھر دیا جاتا۔ مومنین محمدؐ کی ذاتی اور ازدواجی زندگی پر گہری نظر رکھتے تھے۔ مثلاً، وہ کس بیوی کے ساتھ زیادہ وقت گزارتے ہیں؟ کون سی بی بی ہیں، جن کے ہاتھ سے بنائے 'مشروب عسل' کو وہ زیادہ پسند کرتے ہیں؟ کون سی بیوی تھی، جس کے یہاں رات گزارنے کے بعد اگلی صبح محمدؐ کی طبیعت زیادہ ہشاش بشاش ہوتی تھی؟ اور اس طرح کئی دوسری باتیں تھیں۔ مراد یہ ہے کہ اب محمدؐ کے لیے ذاتی زندگی کا تصور بالکل ختم ہو کر رہ گیا تھا اور وہ ہر طرح سے عوامی کردار میں ڈھل چکے تھے۔ عہد وکٹوریہ کے یورپی عالمین اس بابت خاصی عجب روش اختیار کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کے یہاں، اس طرح کے کثیر الازدواج معمولات اخلاق باختگی اور عیاشی

سمجھے جاتے ہیں، وہ ایسی زندگی پر نکتہ چینی کرتے چلے آئے ہیں اور سمجھتے رہے ہیں کہ شاید یہ اطمینان بخش تجربہ رہا ہو گا، حالانکہ اس طرح کے معمولات زندگی یقینی طور پر کسی بھی شخص کے لیے بے پناہ ذہنی اور اعصابی دباؤ کا باعث بن سکتے ہیں۔

اس ضمن میں، اسی زمانے میں نازل ہونے والی ایک آیت کئی شادیوں کے نتیجے میں پیدا ہونے والی صورتحال اور دباؤ پر خاصی تفصیل سے روشنی ڈالتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس کی شروعات تو محمدؐ کے لیے بحیثیت امہ کے رہنما، خصوصی انتظام اور بریت کا اعلان کرتی ہے کہ وہ جتنی بار چاہیں، نکاح کر سکتے ہیں۔ یہ الفاظ کچھ یوں ہیں کہ، 'یہ رعایت خالصتاً تمہارے لیے ہے' اور آگے یوں وضاحت کہ، 'دوسرے مومنوں کے لیے نہیں ہے'۔ اصولی طور پر، آپؐ کے علاوہ تمام مرد مومنین روایتی طریقہ کار کو اپنا سکتے تھے۔ یعنی، وہ ایک وقت میں زیادہ سے زیادہ چار شادیاں کر سکتے تھے۔ اس کی اجازت قران میں موجود ہے۔ لیکن، یہ صرف ایک قاعدہ تھا۔ الہام میں کثیر الازدواجی کی بلاواسطہ حوصلہ افزائی کرنے کی بجائے ایک جگہ پر اس سے بوجوہ احتراز کرنے پر زور دیا گیا ہے۔ چار شادیوں کی اجازت صرف اس صورت میں ہے کہ اگر بیویوں کے بیچ برابری کی حیثیت برقرار رکھنا ممکن ہو۔ لیکن، اس کے بارے بھی قران یہی کہتا ہے کہ ایسا کر پانا، مشکل ہے۔ محمدؐ کو کہا گیا کہ وہ اپنے پیروکاروں کو تاکید کریں کہ، 'بیویوں کے درمیان پورا پورا عدل کرنا تمہارے بس میں نہیں ہے۔ تم چاہو بھی تو اس پر قادر نہیں ہو سکتے'، اسی بابت ایک دوسری آیت میں ہدایت کی گئی کہ، 'لیکن اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ ان کے ساتھ عدل نہ کر سکو گے تو پھر ایک ہی بیوی کرو'۔

گو انہیں تو خصوصی رعایت میسر تھی، مگر خود محمدؐ کے لیے ذاتی طور پر وہ 'ایک ہی بیوی' ہمیشہ سے خدیجہ رہی تھیں۔ خدیجہ کے وصال کو آٹھ سال بیت چکے تھے لیکن جوں جوں رہنمائی کے تقاضے بڑھتے گئے، ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اب وہ پہلے سے کہیں زیادہ یک زوجگی کی زندگی کو ترس رہے تھے جو کبھی ان کو خدیجہ کے ہمراہ میسر تھی۔ اگرچہ متعدد نکاح سفارتی اور سیاسی ضرورت تھے مگر حقوق کی ادائیگی اور ازدواجی تقاضے بھی تھے جن کا پورے کر نا بہر حال ان کی ذمہ داری تھی۔ یوں، آپؐ کے لیے زندگی کے اس موڑ پر ایک طرف رسالت، دوسری طرف سیاست و سفارت اور تیسری طرف ذاتی زندگی کے تمام تر فرائض ایک ساتھ، ایک ہی وقت میں، روز بروز بڑھتے ہوئے بوجھ کے ساتھ نبھانا لازم ٹھہرا۔ ایک طرف تو لوگ پیغمبر سے رجوع کرتے، دوسری طرف اتنے بھاری بھر کم ازدواجی معاملات اور تیسری جانب سیاسی منظر نامے پر ایک بار پھر سے مکہ کے ساتھ جنگ کے سائے منڈلا رہے تھے۔ ایسے حالات میں، ان پر ہر طرح کا دباؤ بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا۔ اسی کیفیت میں، وہ معاملات کو چلاتے، وقت کے تقاضوں تلے اس قدر دب جائیں گے کہ آگے چل کر ایک موقع ایسا آئے گا جس کے تصفیہ کی غرض سے اٹھایا جانے والا ایک قدم، محمدؐ کی زندگی کا متنازعہ ترین فیصلہ ثابت ہو گا۔

باب:17

سیاسی طور پر کسی بھی بالغ نظر، سیانے آدمی سے پوچھ لیں۔ وہ اس بات کی تصدیق کرے گا کہ ایک منجھا ہوا سیاسی رہنما جب اندرون ملک دباؤ کا شکار ہو جائے تو مقبولیت برقرار رکھنے کے لیے جارحانہ خارجہ پالیسی اختیار کرتا ہے۔ یہ ایسی حکمت عملی ہے جو تاریخ میں تقریباً ہر اہم موڑ پر غالباً ہر سیاستدان نے ہی استعمال کی ہے۔ محمدؐ نے اسی طور کو اپنا لیا۔ اگرچہ وہ مدینہ کے اندر مخالفین کو کامیابی کے ساتھ دھول چٹا رہے تھے مگر کلی طور پر یہ ضروری تھا کہ اپنا حلقہ اختیار اور اثر بڑھانے کے لیے مدینہ سے باہر بھی کاروائیاں عمل میں لائیں۔ چنانچہ، مکہ کے تجارتی قافلوں کو ہراساں کرنے میں تیزی لائی گئی۔ یہ حربہ اس قدر کامیاب ہوا کہ بالآخر قریش روایتی شمال سے جنوب میں سیدھے خط پر واقع تجارتی راہداری کو ترک کر کے نجد کے لق و دق اجاڑ اور جنوبی عراق میں واقع نسبتاً طویل اور مہنگے روٹ کو استعمال کرنے پر مجبور ہو گئے۔ جلد ہی، یہ راستہ بھی غیر محفوظ ہو جائے گا۔ مثال کے طور پر، اسی راہداری پر زید کی سربراہی میں کی جانے والی ایک چھاپہ مار کاروائی کے نتیجے میں ایک

بڑا قافلہ لوٹ لیا گیا۔ اس قافلے کو نجد کے میدانوں میں جالیا گیا اور خاصا مال ہاتھ آیا۔ تجار اور حفاظتی دستوں کو اپنی جان بچانے کے لیے لدے ہوئے اونٹ اجاڑ میں چھوڑ کر بھاگتے ہی بنی۔

حسان بن ثابت نامی شاعر نے اس واقعے کو خاصے پر جوش انداز میں بیان کیا ہے۔ مکہ کے لوگوں کو مخاطب کر کے، تجارت اور ان کے نام کو یوں تہمل ترغمہ ہونے پر طنز کا نشانہ بنایا۔ نہایت پر شوق انداز میں لکھا، 'دمشق کی انہار کو الوداع کہو، بھول جاؤ۔۔۔ کہ ان راستوں پر اب تمہارے لیے خار ہے'۔ ابن ثابت آج کے کسی بھی شاعر کے مقابلے میں زیادہ مصروف رہا کرتے تھے۔ ان کی مصروفیت میں صرف اور صرف ہم سر شاعروں کی ہجو لکھنا نہیں تھی جنہیں آپؐ کی شدید مخالفت اور توہین پر قتل کر دیا گیا تھا بلکہ کئی دوسری اصناف پر بھی طبع آزمائی کرنی پڑ رہی تھی۔ حالات اس قدر تیزی سے بدل رہے تھے کہ ہر نئے دن کے ساتھ کچھ نہ کچھ تازہ تخلیق کرنا پڑتا۔ بعض اوقات، ابن ثابت جیسے شعراء کے لیے یہ خاصا مشکل بھی ہو جاتا تھا۔ مثلاً، کیا ہوا کہ مومنین کا ایک ٹولہ شمال میں خیبر کے نخلستان میں چھاپہ مار کاروائی کے لیے روانہ کیا گیا۔ یہ فوجی ٹکڑی کامیابی کے ساتھ اپنے ہدف پر پہنچ گئی اور مطلوبہ شخص کو نیند میں قتل بھی کر دیا مگر اس ایک شخص خاصا اوتاولا ہو رہا تھا۔ وہ فرط جوش سے پیچھو ہٹا اور پتھروں سے نیچے لڑھک گیا، جس کے شور سے ارد گرد لوگ جاگ گئے۔ حملہ آوروں کو جان بچا کر نکاسی کے لیے کھودے گئے گندے پانی کے ایک تالاب میں پناہ لینی پڑی۔ اگرچہ گڑھے میں خاصی بدبو تھی لیکن انہیں جان کے لالے پڑے ہوئے تھے تو وہیں دبک کر بیٹھے رہے۔ بہر حال، کئی گھنٹے چھپے رہنے کے بعد انہیں فرار کا راستہ مل ہی گیا اور وہ بچ نکلے۔ اگرچہ، یہ واقعہ کسی طور پر بہادری کو ظاہر نہیں کرتا مگر ابن ثابت نے پھر بھی اس کو کچھ یوں سمیٹا کہ، 'رات میں دبے پاؤں سفر کرتے، ننگی تلواریں تھامے یہ لوگ، شیر کی طرح بہادر اور جنگل کے باسی، کوئی آفت ان کے سامنے کچھ بھی نہیں ہے'۔

اس طرح کی شاعری، بالخصوص وہ جس میں واقعات کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا ہے، یقیناً احد کی لڑائی کے بعد مومنین کے ہو رہے پست حوصلے بلند کرنے کے کام آتی تھی۔ یہ اس وقت کی ضرورت بھی تھی، لیکن یہی تخلیقات محمدؐ کے مخالفین کو طیش دلانے کا موجب بھی بن گئی۔ چنانچہ، مکہ کے سردار ابو سفیان نے اب کی بار اتحادیوں کو ساتھ ملا کر خاصی بڑی فوج تشکیل دینے کا ارادہ کیا۔ اس فوج میں قریش کے دیرینہ اتحادی نجد کے بدو غطفان اور خیبر کے یہودی قبائل کثیر تعداد میں شریک تھے۔ بنو نضیر کے کئی لوگ اب خیبر میں جا بسے تھے اور وہ ابھی تک مدینہ سے بے دخلی پر تلملائے بیٹھے تھے اور محمدؐ سے اپنی املاک اور جائیداد ضبط کرنے کا حساب چکتا کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ، 627ء کے اوائل میں ابو سفیان نے مدینہ پر چڑھائی کا عندیہ دے دیا۔ اس دفعہ، اس لشکر کا ارادہ مدینہ کے مضافات تک محدود رہنے کا نہیں، بلکہ وہ ایک ہی بار اس نخلستان کے اندر گھس کر محمدؐ کی ابھرتی ہوئی طاقت کا ہمیشہ کے لیے قصہ تمام کرنا چاہتے تھے۔

لیکن، اتنے بڑے لشکر کو صحرا میں نقل و حرکت میں خاصا وقت لگ رہا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حملے کی خبر محمدؐ تک بہت پہلے ہی پہنچ گئی اور انہیں پوری تیاری کا موقع مل گیا۔ پہلے تو انہوں نے مدینہ کے گرد و نواح میں موسم بہار کی فصل کو وقت سے پہلے ہی کاٹنے کا حکم دیا کہ جب قریش کا لشکر یہاں پہنچے تو گھوڑوں اور اونٹوں کے لیے چارا ناپید ہو۔ پھر، اگلا فرمان نخلستان کے گرد ایک گہری خندق کھودنے کا جاری ہوا۔ مدینہ کے ارد گرد مغرب، جنوب اور مشرق کی جانب جمے ہوئے لاوے کے میدانوں کی وجہ سے گھوڑوں اور زرہ پوشوں کا گزرنا ممکن نہیں تھا۔ لیکن شمال کی جانب واقع مرکزی راستہ کھلا تھا اور یہاں سے ابو سفیان کے لشکر کے گھڑ سوار اور پیدل فوج آسانی سے اندر گھس سکتی تھی۔ اس کا فوری حل یہ نکالا گیا کہ مدینہ کی ساری آبادی بشمول عورتوں اور بچوں کو کدالیں تھما کر اس راستے کو کھودنے کے کام پر لگا دیا گیا۔ کھدنے والی خندق اتنی گہری اور چوڑی تھی کہ کوئی بھی گھڑسوار کود کر اسے پار نہیں کر سکتا تھا۔ بلکہ، دوسری طرف کناروں اور گہرائی میں تیز دھار چوب دار لکڑیاں نصب کر دی گئیں تاکہ ایسی کوئی بھی کوشش واقعی ناکام رہے۔ آبادی میں سے ہر دس افراد کے ذمے ساٹھ فٹ کھدائی کا کام لگایا گیا اور یوں چھ دن کے اندر ہی خندق تیار ہو گئی۔ جب یہ ہو چکا تو مدینہ میں شمال کی جانب سے داخل ہونے والا راستہ اب ایک گہری کھائی کا منظر پیش کر رہا تھا اور کھدائی کے دوران نکلنے والی مٹی کے تودے اور بڑے پتھروں کو اندر کی طرف ڈھیر لگا کر دفاعی فصیل اور چوکیاں بنا دی گئی تھیں۔

ابو سفیان اور ان کے لشکر کو اس طرح کی تیاری کی ہرگز توقع نہیں تھی۔ خندق کھودنے کا یہ تصور، جسے عام طور پر 'بے عزت' اور 'غیر عرب' خیال کیا جاتا تھا، فارس میں استعمال ہونے والی 'فرسودہ' اور 'پاجی' ترکیب تھی۔ ایسے حربوں کو وہیں رہنا چاہیے تھے۔ چنانچہ، قریش کے فوجی جھنجھلاہٹ میں تیر برساتے اور ساتھ با آواز بلند لعن طعن اور طنزیہ جملے کستے۔ کہا جاتا، یہ کس طرح کے ڈرپوک اور خائف جنگجو ہیں جو دھول کے ڈھیر کے پیچھو چھپ کر بیٹھے ہیں؟ یہ ڈھیر عورتوں اور بچوں نے جمع کیا ہے؟ مکہ کے لشکر میں ایک شاعر نے وہیں بیٹھے بٹھائے اشعار جڑ دیے کہ، 'لیکن یہ خندق جس پر ان کا انحصار ہے۔۔۔ ہم ان کو پھر بھی مٹا دیں گے ۔۔۔ ہم سے ڈر کر انہیں دیکھو تو۔۔۔ کیسے، اس کے پیچھو دبک کر بیٹھے ہیں'۔

اس طنز اور لعن طعن کا مقصد یہ تھا کہ محمدؐ اور ان کے پیروکاروں کو جوش دلا کر باہر نکال لائیں اور دو بدو لڑائی پر اکسائیں۔ ان میں سے کئی ایسا کر بھی گزرتے لیکن محمدؐ نے انہیں خندق کی کچی فصیل پیچھو ہی جم کر بیٹھے رہنے پر مجبور کیے رکھا۔ ویسے بھی ان کی یہ حکمت عملی خاصی کامیاب رہی تھی اور جلد ہی یہ ثابت بھی ہو گیا۔ دشمنان کے چند گھڑسواروں نے ایک جگہ، جہاں سے خندق تنگ تھی، اسے پھلانگنے کی کوشش کی لیکن گھوڑوں سمیت اوندھے منہ گر گئے۔ بعد اس کے، کسی نے دوبارہ ایسی کوشش نہیں کی۔ کھائی کے دونوں اطراف میں بھی دیکھیں تو اس جنگ، جسے بعد میں 'خندق کی لڑائی' کہا جائے گا، انسانی جان کے نقصان کی شرح بہت کم رہی تھی۔ ابو سفیان کے لشکر میں سے پانچ جبکہ محمدؐ کی فوج کے صرف تین اشخاص جان سے گئے۔

ابتدائی گرما گرمی کے بعد، ابو سفیان کے پاس سوائے مدینہ کا محاصرہ کرنے کے کوئی چارہ نہیں رہا تھا۔ حالانکہ، وہ خود بھی جانتے تھے کہ یہ کامیاب نہیں ہو گا۔ وجہ یہ تھی کہ کسی فصیل دار شہر کا محاصرہ ایک بات ہوتی ہے لیکن یہاں تو مدینہ کا نخلستان ابھی تک باقاعدہ شہر نہیں تھا بلکہ کئی گاؤں کا جمگھٹا تھا، پھر یہ خاصا وسیع اور آبادی بکھری ہوئی تھی۔ ہر گاؤں کی اپنی فصیل تھی اور مرکز میں اس طرح کے حالات سے نبٹنے کے لیے خاطر خواہ انتظامات موجود تھے۔ الغرض، پورے مدینہ کا محاصرہ تقریباً ناممکن تھا۔ محاصرہ کرنے والے زیادہ سے زیادہ نخلستان میں داخلے کے مرکزی راستے کو روک لیتے اور خندق کی وجہ سے صرف تیر برسا کر ہراساں کر سکتے تھے۔ لیکن، مدینہ کے باسیوں پر دباؤ ڈالنے کے لیے یہ بھی کافی تھا۔ خندق کے اس پار سے وہ ایک بہت بڑے لشکر کو دیکھ سکتے تھے، جس میں ہر طرف گہما گہمی اور بڑے پیمانے پر لمبے عرصے کے لیے پڑاؤ کے انتظامات کیے گئے تھے۔ رات کو دیر تک، دور دور تک پھیلے خیموں میں آگ روشن رہتی اور ہر روز دن چڑھتے ہی تیر انداز تازہ دم ہو کر ایک نئے جوش سے مدینہ پر تیر برساتے رہتے۔ چونکہ، یہ باقاعدہ لڑائی نہیں تھی تو دن بھر گھڑسوار یہاں وہاں دوڑتے پھرتے اور تیر انداز نئی جگہیں تلاشتے جہاں سے بہتر نشانے لیے جا سکتے۔ اگرچہ مدینہ ابھی تک محفوظ تھا مگر پھر بھی نخلستان کے اندر بے چینی پھیل رہی تھی۔ ایک محفل میں مدینہ کا ایک سردار جھنجھلا کر کہنے لگا، 'محمدؐ نے ہم سے ایک نئی دنیا کا وعدہ کیا تھا مگر اب دیکھو، ہم میں سے ایک بھی، خود اپنے گھر میں بھی محفوظ نہیں ہے'۔

ابو سفیان محاصرے اور ہراساں کرنے کے حربوں کے ذریعے، اسی طرح کی بے چینی پھیلنے کا انتظار کر رہے تھے۔ یوں، انہیں مدینہ کی صفوں میں کمزوریاں مل جاتیں، جن کا استعمال کر کے وہ محمدؐ پر اپنی برتری قائم کر سکتے تھے۔ چنانچہ، جلد ہی پس منظر میں سازشوں کی پھپھل اور سودے بازی شروع ہو گئی۔ ایک دوسرے کو ورغلایا جانے لگا، کنبوں کے سرداروں کو بہلا پھسلا کر حمایت پر راضی کرنے کی کوششیں ہونے لگیں اور جاسوسی کی جانے لگی۔ مخبر اور جاسوس دوغلے اور بسا اوقات تگنی سازشیں کرنے لگے۔ ساتویں صدی عیسوی میں بھی جنگ کا وہی سماں بن گیا جو آج ہم دنیا بھر جدید اسباب کے ساتھ عام دیکھتے ہیں۔ ہدردیاں، حمایت، مفادات، بہلاوے اور ڈراوے، یعنی ہر طرح کا حربہ استعمال میں لایا جانے لگا۔ ایک کے بعد دوسری اور ان دنوں میں گزرنے والی ہر رات کے اندھیرے میں، جاسوس اور قاصدین نخلستان کے چپے چپے میں پھیل جاتے اور خندق عبور کر کے قریش کے لشکر میں آتے جاتے، پیغامات کا تبادلہ ہوتا رہتا اور تانے بانے بنے جاتے۔ دن بدن بے چینی بڑھ رہی تھی اور بے یقینی کی صورتحال گہری ہوتی جا رہی تھی۔ مدینہ جیسی جگہ، جہاں کوئی بھی اجنبی، امن کے زمانے میں دور سے ہی پہچانا جا سکتا تھا، اب تو چھوٹے سے چھوٹا راز چھپا کر رکھنا بھی تقریباً ناممکن ہو گیا۔ لیکن، یہ ابو سفیان کی حکمت عملی کا حصہ تھا۔ مطلب یہ کہ مدینہ کے لوگوں، بالخصوص محمدؐ پر

اعصابی دباؤ بڑھا کر اور انہیں اپنے ہی لوگوں کے بارے شک و شبہ میں مبتلا کر کے، افواہوں کی گردش میں کمزور کیا جاسکتا تھا۔ پہلے تو یہ مشہور کر دیا گیا کہ محمدؐ نے غطفان کے بدوؤں کو قریش کے لشکر کا ساتھ چھوڑنے کے عوض نخلستان میں پیدا ہونے والی کھجور کی فصل کا تیسرا حصہ دینے کا وعدہ کر لیا ہے۔ محمدؐ نے ایسا کوئی وعدہ کیا تھا یا نہیں، یہ اہم نہیں ہے۔ اہم یہ ہے کہ صرف یہی افواہ مدینہ میں وسیع پیمانے پر نااتفاقی اور رنجی پھیلانے کے لیے کافی تھی۔ باغات کے تقریباً مالکان اور اس میں مشقت کرنے والے دہقان اس بابت غم و غصہ کا شکار ہو گئے کہ آخر کتنی آسانی سے محمدؐ نے ان کی محنت سے اگائی ہوئی فصل کو یوں، بغیر ان سے پوچھے سودے میں جھونک دیا ہے؟ کئی تو یہ محسوس کرنے لگے کہ دراصل یہ مصیبت اور محاصرہ، محمدؐ کی مکہ کے ساتھ انتقامی روش کو بڑھاوا دینے کی وجہ سے آئی تھی اور ان کے خیال میں، اس کے نتائج میں ادا کی جانے والی قیمت کی ان سے وصولی سراسر زیادتی ہے۔ اور اسی طرح مومنین میں کئی دوسرے بھی تھے، جو لڑاکا واقع ہوئے تھے، غطفان کو یوں راضی کرنے کی کوشش کو 'بے عزتی' تصور کرنے لگے۔ جلد ہی مدینہ بھر میں اس بابت غم و غصہ اور محمدؐ پر دباؤ بڑھنے لگا۔

جلد ہی ایک دوسری خبر نے سارے مدینہ کو گھیر لیا۔ کہا گیا کہ ابو سفیان نے نخلستان کے 'منافقین' اور یہودیوں کے آخری بچ جانے والے یہودی قبیلے قریظہ کے ساتھ رابطہ کر کے ترغیب دی ہے کہ وہ مدینہ کے اندر نیا اتحاد قائم کر لیں۔ محمدؐ کے خلاف اس گٹھ جوڑ کو قریش نے ہر طرح سے حمایت اور مدد کی یقین دہانی کرائی ہے۔ ایک شخص نے قسم اٹھائی کہ اس نے اپنی آنکھوں سے کچھ عرصہ قبل بے دخل کر دیے جانے والے یہودی قبیلے نضیر کے ایک سردار کو قریظہ کے مرکزی گاؤں میں داخل ہوتے دیکھا ہے اور وہ وہاں 'اونٹ کے کوہان کو مروڑنے' کا کہہ رہا تھا۔ یعنی وہ قریظہ کو بنو نضیر کی بے دخلی کی زیادتی کا بدلہ لینے پر آمادہ کر رہا تھا۔

یہ ساری ہی افواہیں، تواتر سے محمدؐ تک پہنچ رہی تھیں اور یقیناً وہ یہاں بھی ابو سفیان کی طرف سے شروع کی جانے والی اس اعصابی جنگ کا سامنا کرنے کے لیے ڈٹ کر تیار کھڑے تھے۔ ہمیشہ کی طرح، وہ اس مہم کا کرارہ جواب دینے کے اہل تھے اور ایک دفعہ پھر تمام تر افواہوں اور سازشوں کو اپنے فائدے کے لیے استعمال میں لانے والے تھے۔ چنانچہ، انہوں نے اس مقصد کے لیے نعیم بن مسعود کی خدمات حاصل کر لیں۔ نعیم قبیلہ غطفان سے تعلق رکھنے والے ایک سردار تھے جنہوں نے چھپ کر اسلام قبول کر لیا تھا۔ 'میرے قبیلے کے لوگ اس راز سے واقف نہیں ہیں'، انہوں نے محمدؐ سے کہا، 'بہرحال، آپؐ کہیے، جو کہیں گے، میں کرنے کے لیے تیار ہوں'۔ اس وقت، نعیم کی خدمات کا یوں میسر آجانا، غیب سے مدد کے مترادف تھا کہ وہ بجا طور پر مقاصد کے حصول میں کام آسکتے تھے اور اس کام کے لیے موزوں ترین آدمی تھے۔ وہ مدینہ کے اندر محمدؐ کے مخالفین اور محاصرہ کرنے والوں کے بیچ، ایک ہی وقت میں تلبیس پھیلا کر غلط فہمیوں کو جنم دے سکتے تھے۔ 'تم یقینی بناؤ کہ وہ ایک دوسرے کو ترک کر دیں'، محمدؐ نے رازداری سے کہا، 'کہ جنگ دھوکے اور فریب کے سوا کچھ نہیں'۔

یہ فوجی حکمت عملی تاریخی لحاظ سے بھی خاصی مشہور و معروف ہے اور اس مقولے کہ 'محبت اور جنگ میں سب جائز ہے' کے مصداق، راس آتی ہے۔ ویسے بھی، محمدؐ پہلے شخص نہیں تھے جنہوں نے یہ طریقہ اختیار کیا ہو۔ 'جنگ ایک فریب ہے' نامی یہ تصور، پہلی بار چھٹی صدی قبل از مسیح میں مشہور چینی سپہ سالار اور فلسفی سان تزو کی مشہور تصنیف 'جنگ کا آرٹ' میں ملتا ہے۔ ویسے، یہاں محمدؐ کا سان تزو کے فلسفے اور تصور کو یوں منقول کرتے ہوئے دیکھنا خاصا عجیب بھی معلوم ہوتا ہے اور امکان یہ ہے کہ شاید ان کی زبان سے اس روایت کو یوں بیان کروانا، ابن اسحاق کی شرارت ہے۔ وجہ یہ ہے کہ سان تزو کے یہ نظریات آٹھویں صدی عیسوی میں جدید خطوط پر استوار شہر دمشق کے کتب خانوں میں تو عام مل جاتے تھے لیکن ساتویں صدی عیسوی میں مدینہ کے نخلستان میں اس کا تذکرہ پایا قاعدہ لفظ بہ لفظ عام ہونا ناممکن سی بات لگتی ہے۔ تاہم، ایک بات تو طے ہے کہ محمدؐ کو اس نظریہ کی خوب سمجھ تھی اور بساط پر ان کی چلی یہی چال اور اس کے نتائج گواہ ہیں۔

اس چال کو عملی شکل میں ڈھلتا ہوا دیکھنا، نہایت دلچسپ ہے۔ یہ ایک ایسی جنگی حکمت عملی کا مظاہرہ ہے جس میں بہت خوبصورتی سے دیکھتے ہی دیکھتے، دشمن کو شہ مات ہو جاتی ہے۔ ہوا یوں کہ نعیم سب سے پہلے قریظہ کے پاس گئے۔ انہیں یقین دہانی کرائی کہ وہ پوری رازداری اور خیر خواہ کی حیثیت سے موجود ہیں۔ پھر انہیں تنبیہ کی کہ ابو سفیان کی جانب سے کیے جانے والے کسی بھی وعدے پر اعتبار فاش غلطی ہو گی کیونکہ قریش کے لشکر کی دلچسپی صرف اور صرف بدلہ لینے اور لوٹ مار میں

ہے۔ جب ایک بار ان کا مقصد پورا ہو گیا تو وہ واپس چلے جائیں گے اور قریظہ یاد رکھیں کہ بعد میں وہ مخالفت کی وجہ سے محمدؐ اور ان کے پیروکاروں کے عتاب کا شکار ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ، ان کے لیے بہتر یہی ہے کہ وہ ابو سفیان سے ضمانت کے طور پر، اتحادی ہونے کے ناطے مکہ کے چند آدمیوں کو اپنے پاس رکھنے کا تقاضا کریں۔ اس طرح، انہیں ابو سفیان کے ارادے اور زبان کی سچائی کا بھی علم ہو جائے گا۔

قریظہ کو یوں شک میں ڈال دینے کے بعد، نعیم نے اب دوسرا پکا دیا اور ابو سفیان کے پاس جا پہنچے۔ انہوں نے یقینی بنایا کہ جب وہ بات کریں تو ابو سفیان کے ساتھ قریش کے لشکر میں چیدہ لوگ بھی ان کی بات سن لیں۔ انہوں نے ابو سفیان کو اطلاع دی کہ قریظہ نے بطور ضمانت، مکہ کے چند لوگوں کو اپنے پاس روک لینے کا مطالبہ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ جبکہ ان کی حقیقت یہ ہے کہ وہ دراصل محمدؐ کے وفادار ہیں۔ اگر قریش انہیں اپنے چند آدمی ضمانت کے طور پر حوالے کر دیتے ہیں تو وہ انہیں مومنین کے حوالے کر دیں گے، جو پہلے ہی مکہ کے خون کے پیاسے ہیں۔ تو بہتر یہ ہو گا کہ قریش ان کا یہ مطالبہ یکسر رد کر دیں۔ جب یہ بھی ہو گیا تو اس چال کے آخری حصے میں، نعیم واپس اپنے قبیلے غطفان کے پاس جا پہنچے۔ انہیں کہا کہ دراصل قریظہ نے مکہ کے قریش نہیں بلکہ غطفان کے آدمیوں کو 'ضمانت' کے طور پر رکھنے کا مطالبہ کیا ہے اور ابو سفیان اس مطالبے پر تقریباً راضی ہے۔

ابن اسحاق بتاتے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک نے توقع کے عین مطابق ردعمل ظاہر کیا۔ قریظہ نے ابو سفیان سے ضمانت کے طور پر چند آدمیوں کو اپنے پاس رکھنے کا مطالبہ کیا۔ جیسا کہ نعیم نے متنبہ کیا تھا، ابو سفیان نے اسے قریظہ کی چال سمجھا اور اپنے آدمیوں کو محمدؐ کے ساتھ وفاداری کا چارا بنا کر پیش کرنے کی ترکیب سمجھ کر یہ مطالبہ یکسر رد کر دیا۔ یوں، مدینہ میں کوئی نیا اتحاد جنم لینے سے پہلے ہی ختم ہو گیا اور اب قریظہ نے مدینہ کے باقی لوگوں کی ہی طرح نخلستان کا دفاع جاری رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ دوسری طرف، قبیلہ غطفان بھی نعیم کی بات پر یقین کرتے ہوئے کہ ابو سفیان نے انہیں دھوکہ دیا ہے، خیمے اکھاڑے اور واپس ہو لیے۔ وہ اس بات پر بھی سیخ پا تھے کہ ابو سفیان کی وجہ سے مبینہ طور پر محمدؐ کی جانب سے دی یا نہ دی جانے والی، کھجور کی فصل سے بھی محروم رہ گئے۔ خندق کی وجہ سے پیدا ہونے والی صورتحال سے نالاں اور اب اتحاد کے یوں بکھر جانے پر ابو سفیان ہمت ہار چکے تھے اور عین ممکن تھا کہ وہ محاصرے کو ایک بڑی ناکامی قرار دے کر اس قصے کو ختم کر دیتے۔ لیکن، قریش کے لشکر کو اپنی شکست تسلیم کرنے میں تین ہفتے لگ گئے اور ان کی اس ناکام مہم کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے کے لیے سرما کے موسم نے آن گھیرا۔

اندرون صحرا، سرما کے دوران دن بھر تپتے رہنے کے بعد رات کے وقت اتنا سرد ہو جاتا ہے کہ اکثر درجہ حرارت چار ڈگری سینٹی گریڈ تک گر جاتا ہے۔ یوں، رات کی ٹھنڈ اور شدید ٹھنڈ دن کی گرمی کے مقابلے میں زیادہ چبھتی ہوئی محسوس ہوتی ہے اور طرح طرح کے مسائل پیدا ہو سکتے ہیں۔ قریش کے لشکر انہی مسائل کا شکار ہو گیا اور آخری دھکا ایک رات، گھاٹیوں میں سے سنسناتی ہوئی ہواؤں کی شکل میں آگیا۔ آن کی آن میں آندھیاں اور جھکڑ چلنے لگے۔ طوفان باد و باراں میں لشکر کے خیمے اکھڑ گئے اور برتنوں میں بھی ریت اور دھول بھر گئی۔ 'واللہ، ہمارے گھوڑے اور اونٹ مر رہے ہیں اور ہمارا ایک برتن بھی سلامت نہیں ہے۔ اس جھکڑ میں آگ جلانا تو دور کی بات، ہم خیمے بھی سیدھے نہیں کھڑے کر پا رہے۔ 'اعلان کیا کہ، 'سامان باندھ کر لاد دو۔ ہم واپس جا رہے ہیں'۔

محمدؐ نے ایک بار پھر مکہ کی بڑی فوج کو نیچا دکھا دیا تھا لیکن ان کے پیروکار ماضی کے برعکس اس کارنامے پر خوش نہیں تھے۔ اس سارے قضیے کے دوران، تقریباً ہر شخص محاصرے کے نتیجے میں پیدا ہونے والی مایوسی کا شکار ہو چکا تھا۔ ایک طرح سے مومنین خود کو اس دوران بے طاقت اور بے بس محسوس کرتے رہے۔ اگرچہ، خندق کھودنے کر دفاع کی حکمت عملی خاصی کامیاب رہی تھی، مگر اعصابی طور پر وہ گھٹ کر رہ گئے۔ دشمن منہ پر کھڑا، معاملات کو 'غیر عرب' طریقے سے نمٹنے کے طعنے دیتا رہا اور بجائے یہ کہ وہ روایتی عربوں کی طرح اس کو سبق سکھاتے اور دو بدو لڑتے، سارا وقت لڑائی اور لعن طعن سے بچنے کی کوشش کرتے رہے۔ یعنی، انہیں فتح تو مل گئی تھی مگر وائے افسوس، ان کی غیرت اور حمیت پر گہری کاٹ لگ گئی۔ یہ ایسی صورتحال تھی کہ ابن ثابت جیسے کہنہ مشق اور نامی

گرامی، لفاظی کے ماہر شاعر کے لیے بھی بچوں اور عورتوں کے ہاتھوں خندق کھود کر دفاعی حصار بنانے کی حکمت عملی میں سے جرات اور بہادری کے قصیدے نکال لانا ممکن نہیں تھا۔

دنیا کا کسی رہنما کے لیے اپنے کٹر حامیوں کو یوں منحرف ہوتا دیکھنا، ممکن نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کے لیے یہ گنجائش نہیں ہوتی۔ محمدؐ کے لیے مومنین کے حوصلے بلند کرنے اور مضبوط اختیار کی یقین دہانی کرانے کے لیے عملی اقدامات اٹھانا انتہائی ضروری ہو گیا تھا۔ انہوں نے یہ قدم اٹھانے میں مزید وقت ضائع نہیں کیا۔ اسی دن، یعنی جمعہ کے روز دوپہر کو، ابو سفیان کے لشکر کی واپسی کے صرف پانچ گھنٹوں کے بعد ہی، جب لوگ مسجد میں ہفتہ وار اجتماع کے لیے جمع تھے، آپؐ نے ایک نئی دشمنی کا اعلان کر دیا۔ یہ دشمن، مدینہ میں بچ جانے والا آخری یہودی قبیلہ قریظہ تھا۔ انہوں نے بتایا کہ جبرائیل ظاہر ہوا ہے۔ اس نے اطلاع دی اور تاکید کی ہے کہ، 'قریظہ کے دل میں اپنا خوف بٹھا دو'۔ یعنی، مبینہ طور پر مکہ کے ساتھ مل کر امہ کے خلاف سازباز کرنے کی سخت سزا دی جائے۔

آخر قریظہ ہی کیوں؟ بلاشبہ، مدینہ میں آپؐ پر عدم اطمینان کا اظہار کرنے والے، ان کی جارحانہ پالیسی کے نتیجے میں پیدا ہونے والی صورتحال، یعنی مدینہ کے محاصرے پر شاکی صرف قریظہ تو نہیں تھے۔ یہ ضرور تھا کہ یہ یہودی قبیلہ نسبتاً لگ تھلگ اور بے طاقت تھا، چنانچہ 'منافقین' کے مقابلے میں آسان ہدف ہوتا۔ 'منافقین' کا یہ تھا کہ انہوں نے بظاہر اسلام قبول کر لیا تھا اور ان کی ایک بڑی تعداد مدینہ کے مقامی قبائل اوس اور خزرج سے تعلق رکھتی تھی اور نخلستان میں پھیلی ہوئی تھی۔ ان میں کئی بااختیار اور مقامی آبادی پر اثر انداز ہو سکتے تھے۔

بہر حال، افواہیں اپنا کام کر چکی تھیں اور قریظہ کے لیے حالات سازگار نہیں رہے تھے۔ وہ غیر محفوظ ہو چکے تھے اور مدینہ کے اندرونی سیاسی منظر نامے پر مات کھا چکے تھے۔ سیاست کی زبان میں کہیے تو وہ قربانی کا بکرا بن چکے تھے اور اب وہ امہ میں پھیل رہی بے چینی اور مایوسی کو ختم کرنے کی بھینٹ چڑھ جائیں گے۔ نہ صرف یہ کہ محمدؐ کو پہلے ہی ذاتی طور پر ان کے یہاں پیغمبر تسلیم نہ ہونے کی مایوسی تھی بلکہ اب ان کے پیروکاروں کو محاصرے کے دوران پیش آنے والی صورتحال اور لعن طعن کا بھی ازالہ ہو سکے گا۔ یوں، آن کی آن میں، جب کہ آج صبح تک مومنین خود محصور تھے، شام ڈھلنے تک محاصر بن جائیں گے۔ وہ اجتماع کے بعد مسجد سے گروہوں کی شکل میں تلواریں، نیزے، خنجر اور تیر کمان سے لیس ہو کر برآمد ہوئے اور قریظہ کے گاؤں کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔

اپنے قلعہ نما گاؤں کے اندر قریظہ کے سردار نے قبیلے کی کونسل کا اجلاس بلا لیا اور اراکین کے سامنے اس نئے قضیے سے نمٹنے کے لیے تین طرح کی تجاویز پیش کیں۔ پہلی تجویز یہ تھی کہ وہ اپنی یہودی شناخت ترک کر دیں، اسلام قبول کر کے محمدؐ کو واقعی پیغمبر تسلیم کر کے اپنی ساری وفاداریاں حتمی طور پر ان کے ساتھ منسلک کر دیں۔ دوسری تجویز یہ تھی کہ جب سبت میں مذاکرات کا مرحلہ آئے تو وہ محمدؐ اور ان کے وفد پر اچانک حملہ کر دیں اور وہیں کام تمام کر دیں۔ یہ قصہ ہی ختم ہو۔ جبکہ، تیسرا اور آخری راستہ 'مساوہ' تھا۔ مساوہ سے مراد یہ ہے کہ قبیلے کے مرد، عورتوں اور بچوں کو قتل کر دیں تاکہ انہیں قید اور غلامی میں جھونکنے سے بچایا جا سکے اور پھر جب یہ ہو رہے تو وہ خودکشی کر لیں یا لڑتے ہوئے مر جائیں۔ مساوہ نامی یہ تجویز، تاریخ میں اس واقعے کی روایت ہے جب 73ء میں نو سو سے زائد یہودی مرد، عورتوں اور بچوں کے ایک گروہ، جس کو رومیوں نے محاصرے میں لے رکھا تھا، ہتھیار ڈالنے کی بجائے خودکشی کر لی تھی۔ کونسل نے سردار کی تینوں ہی تجاویز کو مسترد کر دیا۔ قریظہ کا سردار بگڑتی ہوئی صورتحال کو پہلے ہی بھانپ چکا تھا لیکن شاید کونسل کے باقی اراکین حالات کا رخ دیکھ نہیں پا رہے تھے۔ ان کا نکتہ نظر یہ تھا کہ یہ معاملات کسی بھی صورت اتنے شدید ردعمل کے متقاضی نہیں تھے۔ ان کے اس خیال کی وجہ یہ تھی کہ قریظہ کے قبیلہ اوس کے ساتھ دیرینہ تعلقات تھے اور وہ یقیناً ان کی مدد کو آگے بڑھیں گے۔ چنانچہ، جیسا کہ عام طور پر خطرے سے دوچار لوگ کیا کرتے ہیں، ایک دوسرے کو تسلی اور تشفی دینے لگے۔ حقیقت یہ تھی کہ قریظہ ابھی تک سال بھر پہلے بنو نضیر کو مدینہ کی مقامی آبادی کی جانب سے ملے اس جواب کو پوری طرح سمجھنے سے قاصر رہے تھے۔ وہ ابھی تک خوش فہمی میں مبتلا تھے۔ سال بھر پہلے ملنے والا جواب صاف تھا کہ، 'دل بدل گئے ہیں اور اسلام نے سارے پرانے اتحاد فسخ کر دیے ہیں'۔

بہر حال، انہوں نے پھر بھی اوس سے مدد کی اپیل کر دی اور زور دیا کہ انہوں نے مدینہ کے لوگوں کے شانہ بشانہ خندق کھودنے میں حصہ لیا تھا۔ اگرچہ وہ محاصرے کے دوران آتش مزاجی سے دفاع میں پیش پیش نہیں رہے تھے تو اس کی وجہ بھی یہ تھی کہ محاصرہ شمال میں واقع داخلی راستے پر کیا گیا تھا اور ان کا گاؤں وہاں سے آٹھ میل دور جنوب میں واقع تھا۔ اپیل میں قسم اٹھائی گئی تھی کہ انہوں نے عملی طور پر کسی بھی طرح سے محمدؐ کے خلاف سازباز میں حصہ نہیں لیا اور اگر انہیں کچھ گلہ بھی تھا تو وہ بے جا ہے۔ انہوں نے جنگ کی صورتحال میں وہی کیا جو ایسے حالات میں کوئی بھی آزاد قبیلہ کرتا، یعنی اپنے لیے تصفیے کے ممکن تمام راستے کھلے رکھتا۔ اس اپیل کے جواب میں اوس نے مکمل خاموشی اختیار کر لی اور اب محمدؐ قریظہ کے ساتھ ساتھ دوسرے تمام قبائل پر بھی سختی سے واضح کر دیں گے کہ امت میں 'قبائلی آزادی' نامی کسی شے کا کوئی وجود باقی نہیں ہے۔

قریظہ نے دو ہفتے تک محصور رہ کر مقابلہ کیا لیکن بالآخر چونکہ ناگزیر تھا، غیر مشروط ہتھیار ڈال دیے۔ انہیں گاؤں سے زنجیروں میں جکڑ کر بیڑیاں پہنائے باہر نکالا گیا مگر ان میں سے اکثر ابھی تک نتائج کے بارے پر امید تھے۔ بیشتر ابھی تک یہ سمجھ رہے تھے کہ بدترین حالات میں بھی، زیادہ سے زیادہ ان کا انجام وہی ہوگا جو اس سے پہلے دوسرے دو یہودی قبائل کا ہو چکا تھا۔ ویسے بھی، بے دخلی سے بڑی سزا کیا ہوتی؟ مگر، جلاوطنی ایک شے ہے اور قتل عام اس کے برعکس دوسری بات ہے۔

ہتھیار ڈالنے والے قیدیوں کو یوں پابجولاں برآمد کرنا کچھ اتنی اچھی نشانی نہیں تھی۔ اوس کے سردار اس کا مطلب سمجھتے تھے، چنانچہ فوراً ہی اپنے دیرینہ اتحادیوں کی مدد کو آگے بڑھے۔ انہوں نے جرح کی کہ کم از کم آپؐ قریظہ کی زندگیاں تو بخش ہی سکتے ہیں اور جیسا کہ اس سے پہلے قینقاع اور نضیر کے ساتھ سلوک ہوا، ویسا ہی کریں۔ لیکن، محمدؐ صرف ماضی کو دہرانے کی بجائے کچھ بڑھ کر چاہتے تھے۔ اب کی بار، ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ مستقبل کے لیے ایک ایسی مثال بنا کر پیش کرنے کا ارادہ رکھتے تھے جس کے بعد ماضی کو دہرانے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔ بار بار کی تنبیہ اور نشاندہی سے ایک ہی بار جان چھوٹ جاتی۔ چونکہ وہ اوس کی درخواست کو مسترد کر کے مدینہ کی مقامی آبادی کو طیش نہیں دلانا چاہتے تھے، اس لیے انہوں نے بظاہر ان سے مشورہ لینے کا فیصلہ کیا۔ 'اوس کے لوگو!' انہوں نے وفد کے ہر شخص کی طرف فرداً فرداً اشارہ کرتے ہوئے کہا، 'کیا تم اس بات پر مطمئن ہو گے کہ تم میں سے ہی کوئی ایک قریظہ کی قسمت کا فیصلہ کرے؟'

انہوں نے بجا طور پر اس بات پر اطمینان کا اظہار کیا کیونکہ ان کا خیال یہ تھا کہ اس طرح وہ قریظہ کے قیدیوں کی جان بچا لیں گے۔ اگرچہ فیصلہ تو اوس میں سے ہی کسی کنبے کا کوئی شخص کرتا لیکن وہ شخص کون ہوگا، یہ فیصلہ بدستور محمدؐ کے پاس تھا۔ قریظہ کی قسمت کا فیصلہ کرنے والے جس شخص کو محمدؐ نے چنا، وہ یقیناً جانتے تھے کہ وہ اسے کیوں چن رہے ہیں۔ بعض روایات میں، چنے جانے والے شخص پر اوس کے تقریباً اور قریظہ کے اکثر لوگوں کا اتفاق تھا۔ یہ قبیلہ اوس کے ایک نامی گرامی سردار سعد بن معاذ تھے۔

سعد جنگجو اور سخت طبیعت کے مالک تھے اور 'خندق کی لڑائی' کے دوران اٹھنے والی افواہ، یعنی غطفان کو کھجور کی فصل کا تیسرا حصہ دینے کی بات پر شدید مخالفت کر چکے تھے۔ وہ فصل کا تیسرا حصہ تو کجا، ایک کھجور بھی دینے کے خلاف تھے۔ 'ہم انہیں اپنی ملکیت حوالے کر دیں؟' وہ غصے سے بولے تھے، 'ہرگز نہیں۔ ہم تلوار دیں گے'۔ ان کی تب خون بہانے اور بھڑ جانے کے شوق اور جوش کا نتیجہ بھی نکلا تھا۔ وہ خندق کے دفاع کے دوران، اپنی جارحانہ طبیعت کے باعث باہر نکل آئے اور تیر لگنے کے باعث شدید زخمی ہو چکے تھے۔ ان کی حالت تشویش ناک تھی اور وہ جانتے تھے کہ اب ان کے پاس زیادہ وقت نہیں بچا۔ چونکہ وہ چلنے پھرنے سے قاصر تھے، اس لیے چمڑے کی ایک پالکی میں بٹھا کر محمدؐ کے پاس لایا گیا اور وہاں انہوں نے اپنی بگڑتی ہوئی جسمانی حالت کا ذکر کرتے ہوئے، انصاف برتنے کا عہد کیا، 'خدا کی راہ میں میرا وقت آن پہنچا ہے اور مجھے کسی آدمی کی طرف سے الزام تراشی اور دکھ کی کوئی پرواہ نہیں ہے'۔ مطلب یہ تھا کہ چونکہ موت قریب تھی تو لوگوں کو ان کے فیصلے پر کسی بھی طرح سے تعصب کا الزام دھرنے کی ضرورت نہیں تھی، بجائے یہ کہ عوام بدگماں ہو، انہیں اس حالت کے پیش

نظر غیر جانبدار تصور کیا جانا چاہیے۔ لیکن، چونکہ ان کے نزدیک انصاف کے تقاضے صرف تلوار سے ہی بہتر طور پر پورے کیے جا سکتے تھے، یہاں بھی ان کی غیر جانبداری، تلوار کی طرف ہی مائل رہی۔ قریظہ کے لیے مختصر فیصلہ یوں صادر کیا کہ، 'مردوں کو قتل کر دیا جائے گا، جائیداد تقسیم ہو جائے گی اور عورتوں کو بچوں سمیت قیدی بنا لیا جائے'۔

بعض سکالروں کے خیال میں، سعد کا یہ کردار در اصل اوائل دور کے اسلامی تاریخ دانوں کی کارستانی ہے تاکہ وہ محمدؐ کو قتل عام کی ذمہ داری سے مبرا قرار دے سکیں۔ اس طرح آپؐ کا اس بابت کردار بظاہر قابل انکار بن جاتا ہے۔ ان خطوط کے باعث یہ جواز دیا جا سکتا ہے کہ در اصل یہ محمدؐ نہیں بلکہ سعد کا فیصلہ تھا اور آپؐ کے پاس ایک مرتے ہوئے شخص کی زبان کا بھرم رکھنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ لیکن، قریب سے دیکھیں تو خود یہ جواز ایک دردناک حقیقت کو عیاں کرتا ہے کہ ایک ایسی چیز جس کا جواز تلاش کیا جا رہا ہے، کسی بھی صورت قابل جواز نہیں ہے۔ اس فیصلے کا کسی بھی طرح سے، کوئی عذر ممکن ہی نہیں ہے۔ یہاں یہ بات بھی خاصی مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہے کہ محمدؐ اتنا بڑا اور نازک فیصلہ کسی دوسرے کے ہاتھ میں دے دیں گے اور فیصلہ کرنے والا شخص آپؐ کا قریبی مشیر بھی نہیں تھا؟ اور پھر، اگر یہ فیصلہ خود محمدؐ نے صادر نہ بھی کیا ہو، کم از کم اس فیصلے میں ان کی منشاء اور مرضی ضرور رہی ہو گی؟ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ جب فیصلہ سنا دیا گیا تو اس فیصلے پر عمل درآمد خود آپؐ کی نگرانی میں کیا گیا۔ مدینہ کے مرکز میں بازار سے ہٹ کر گڑھے کھود لیے گئے اور جب یہ ہو گیا تو قریظہ کے تمام مرد، ابن اسحاق کی زبانی، 'وہ مرد جنہوں نے کبھی اپنی ٹھوڑی پر استرا پھیرا ہے'، دو دو اور چار چار کی تعداد میں باہر لائے گئے، باری باری گڑھوں پر گھٹنوں کے بل بٹھا کر سر قلم کر دیے گئے۔

یہ آسان کام نہیں تھا۔ کسی کا سر قلم کرنا، اس وقت لڑی جانے والی لڑائیوں کی روایتی کہانیوں سے یکسر مختلف ہے۔ ماننے والوں کی کئی ٹولیاں اس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے صبح اور شام کے کئی گھنٹوں تک جتی رہیں۔ دن چڑھ کر گرمی میں وہ کاروائی روک دیتے۔ یوں، تین دن تک مسلسل صبح شام جاری رہنے والے اس قتل عام کے بعد یہ کام مکمل ہو گیا اور لاشوں سے بھرے گڑھوں میں مٹی بھر دی گئی۔

کچھ عینی شاہدین نے روایت کی ہے کہ ان گڑھوں میں چار سو کے لگ بھگ لاشیں دفن کی گئی تھیں، کئی دوسری روایات میں یہ تعداد نو سو کے قریب بتائی جاتی ہے۔ ہر دو صورت، مقتولین کی اتنی بڑی تعداد دہشت انگیز ہے۔ بدر اور احد کی لڑائیوں میں مرنے والے افراد کی تعداد ملا کر بھی چند درجن سے زیادہ نہیں تھی۔ یعنی، میدان جنگ کی گرما گرمی اور کھلی چھٹی کے باوجود تعداد اتنی کم رہی تھی لیکن یہاں، مدینہ کے عین مرکز میں سینکڑوں کی تعداد میں افراد کو باقاعدہ ایک ترتیب سے قتل کر دیا گیا۔ یہ دہشت سے بھرپور طاقت کا اس قدر بے رحم مظاہرہ تھا کہ اس کا اثر عرب کے طول و عرض میں پھیل گیا۔ پورے خطے میں اس کی بازگشت سنائی دی گئی اور اس کے اثرات وہی نکلے، جو مدینہ کی اس نئی ریاست کو مطلوب تھے۔ اب ہر طرح سے، ہر کسی کو، اندرون یا بیرون، شیشے کی طرح واضح ہو گیا تھا کہ کسی بھی قسم کے اختلاف اور سازش کو کسی بھی صورت برداشت نہیں کیا جائے گا۔

قریظہ کی ملکیت میں جو کچھ بھی تھا۔۔۔ مکان، کھجور کے باغات، ذاتی املاک اور جائیداد، فیصلے کے تحت مومنین میں برابر بانٹ دی گئیں اور شرعی قانون کے مطابق اس کا پانچواں حصہ مال خانے کی ملکیت قرار پایا۔ زیادہ تر عورتوں اور بچوں کو غلام بنا کر تقسیم کر دیا گیا اور کچھ کو نجد میں گھوڑوں اور اسلحے کے عوض فروخت کر دیا گیا۔ لیکن، قریظہ کی ایک عورت جس کا نام ریحانہ تھا، ان سب سے مختلف سلوک کی مستحق قرار پائیں۔ ریحانہ بنو نضیر میں پیدا ہوئی تھیں لیکن قریظہ میں بیاہی گئیں اور شاید ان کی دو یہودی قبائل سے یہ وابستگی ہی تھی، جس کے باعث محمدؐ نے انہیں پہلے ہی علیحدہ کروا دیا۔ لیکن، یہ علیحدگی ان کو خصوصی سزا دینے کے لیے نہیں تھی بلکہ آپؐ نے ریحانہ کے ساتھ نکاح کر لیا۔ وہ محمدؐ کی ساتویں منکوحہ بیوی تھیں۔

ریحانہ کا سابقہ شوہر اور تمام مرد رشتہ دار ان کی آنکھوں کے سامنے قتل کر دیے گئے تھے، یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ یہ نکاح اور بعد از نکاح، آپؐ کے ساتھ یہ بندھن کیسا رہا ہو گا، لیکن یہاں نکتہ یہ نہیں ہے۔ اس نکاح سے ایک پیغام دینا مقصود تھا۔ وہ یہ کہ قریظہ کے اس انجام سے بھلے محمدؐ ان لوگوں کے لیے بے رحم اور بے درد ثابت ہوتے ہوں جو ان کے اختیار کو تسلیم کرنے سے انکاری تھے لیکن بہر حال وہ پھر بھی، نئے اتحاد اور شروعات کرنے پر کبھی پیچھو نہیں ہٹے۔ جب ایک بار پوری قوت سے سنگ دلی دکھادی گئی تو اب یہ نئی شروعات کا وقت تھا۔

دلیل اور تاویل کے بیچ اگر خفیف نہ سہی، مگر ایک باریک دھاگے بھر کا فرق ضرور ہوتا ہے۔ قریظہ کے قتل عام پر صدیوں سے بے شمار دلائل پیش کیے گئے ہیں۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ قریظہ نے مکہ کے ساتھ مل کر محمدؐ کے خلاف سازباز کی، حالانکہ ان کے اس فعل کے آج تک کوئی ٹھوس شواہد نہیں مل سکے۔ پھر کہا جاتا ہے کہ یہ اس زمانے اور مقام کے اعتبار سے ریاستی امور چلانے کا رائج اور عین ممکن طریقہ کار تھا، جو درست نہیں۔ ایک اور جواز یہ ہے کہ محمدؐ نے خود حکم جاری نہیں کیا جو تکنیکی لحاظ سے درست بھی ہے۔ ایک اور بات یہ کہی جاتی رہی ہے کہ قریظہ کو اسی سلوک کی توقع تھی، حالانکہ ان میں سے بیشتر آخر تک پر امید رہے۔ اسی طرح یہ کہ، محمدؐ کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا، حالانکہ اس وقت بھی متوقع فیصلہ، یعنی جلاوطنی کا متبادل موجود تھا۔ ایک اور بات یہ بھی ملتی ہے کہ مقتولین کی تعداد کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا ہے، جو ممکن ہے کہ درست ہو لیکن وہیں یہ بھی ممکن ہے کہ یہ بات درست نہ ہو کیونکہ، ہر دو صورت شواہد ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتے، وغیرہ وغیرہ۔

اگرچہ قران میں 'قتال' کی اجازت دی گئی تھی لیکن قران میں ہی، جب دشمن ہتھیار ڈال کر خود کو حوالے کر دے، اس صورت میں عداوت کی ممانعت ہے۔ زیادہ تر مسلم فقہاء یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ شاید قتل عام یوں پیش نہیں آیا جیسا کہ ابن اسحاق نے بیان کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بظاہر یہ قرانی تعلیمات کے منافی معلوم ہوتا ہے۔ ان میں سے چند ایک تو یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ ایک سازش ہے اور اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس کا مقصد اسلام کو بدنام کرنا ہے اور قریظہ کو 'شہداء' کا درجہ دینے کی کوشش ہے۔ بلاشبہ، کئی یہودی سکالروں نے قریظہ کو مسادہ کے باغیوں جیسا بنا کر پیش کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ ان باغیوں نے رومیوں کے آگے ہتھیار ڈالنے کی بجائے خودکشی کر لی تھی۔ حالانکہ، سچ یہ ہے کہ قریظہ نے پہلے ہی مسادہ کے طرح کی تجویز کو بالخصوص، تعین کر کے رد کر دیا تھا۔ اس بحث کے بیچ کچھ عیسائی سکالر بھی کود پڑتے ہیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ قریظہ کے ساتھ کیا جانے والا سلوک اور طریقہ کار کا آج جدید دور میں جنگ و جدل کے مغربی اصولوں کا کسی بھی طور ساتویں صدی عرب کے قاعدوں کے ساتھ موازنہ نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن، ان کی حقیقت یہ ہے کہ وہ اس معاملے میں ایک طرف مستشرقین کی برداشت کا امتحان لیتے اور انکساری کا ناجائز فائدہ اٹھاتے نظر آتے ہیں جبکہ دوسری طرف قرون وسطی اور بیسویں صدی عیسوی میں یورپی تاریخ کے ایسے ہی دہشت ناک واقعات سے یکسر آنکھ چرا لیتے ہیں۔ سادہ الفاظ میں کہیے تو وہ شرمیلاتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔

اوپر بیان کردہ تقریباً تمام ہی دلائل اور تاویلات میں ایک بات سانجھی ہے۔ وہ یہ کہ ان میں سے ہر ایک میں ترش حقائق پر مبنی تاریخ کے اس بدمزہ نوالے کو نگلوانے کی سر توڑ کوشش کی گئی ہے۔ اس کی بے سوادی کو کم کرنے کا سامان کیا گیا ہے۔ چنانچہ، اس معاملے کو اچھی طرح سمجھانے کے لیے تاریخ میں ہمارے پاس جانے پہچانے سخت حقیقت پسند میکاویلی بھی ہیں۔ کیوں نہ، ان سے رجوع کرتے ہیں؟ میکاویلی بغیر کوئی لگی لپٹی رکھے، نہایت سادہ انداز میں ایسے ریاستی معاملات کی تعریف کچھ یوں کرتے ہیں کہ، 'اصل سوال سختی یا بے رحمی کے درست یا غلط ہونے کا نہیں بلکہ اس کے استعمال کا ہے۔ یعنی، کیا اس کا استعمال اچھا تھا یا برا؟' لیکن یہاں میکاویلی جو سیاسیات کے ماہر مانے جاتے ہیں، خود ہی اپنے سوال میں استعمال کیے جانے والے الفاظ میں بری طرح الجھ کر رہ جاتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں، 'ہم کہہ سکتے ہیں کہ سختی یا بے رحمی کا استعمال اچھی طرح کیا گیا ہے: وہ یوں کہ اگر ہمیں بدی یا برائی کی اچھی طرح نہ صرف سمجھ ہو بلکہ ہم اس بابت انہی خطوط پر بات بھی کر سکیں۔ پھر یہ کہ اس کا استعمال صرف ایک ہی بار اور حتمی معنوں میں کیا جائے۔ اور پھر یہ کہ اس کا استعمال اس لیے ناگزیر ہو کہ اس سے فتنے کو روکنا

مقصود ہے۔ اور آخر میں اس روش کو جاری نہ رکھا جائے بلکہ جس قدر ممکن ہو، اس ایک ہی دہشت ناک مثال کو بار بار اصلاح کے معنوں میں استعمال کیا جاتا رہے'۔ یہاں، ایک ہی جملے میں چار مشروط عبارتیں بیان کی گئی ہیں۔ میکاویلی نہایت چالاکی سے ایک حاشیہ کھینچتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس سے کوئی حل نہیں نکلتا یا ایسے کسی بھی فعل کی توجیہ برآمد نہیں ہوتی۔ اسی لیے وہ آگے چل کر واپس اپنے اصل سوال کی طرف مڑ آتے ہیں۔ کہتے ہیں، 'ایک حکمران کے لیے ضروری ہے کہ وہ بے رحمی اور سختی کی بجائے صلہ رحمی اور دردمندی کو اپنی ساکھ بنائے۔ لیکن، اس کے ساتھ ساتھ وہ محتاط رہے کہ صلہ رحمی اور دردمندی کو بری طرح استعمال نہ کرے، اس کا ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوئی صورت نہ چھوڑے'۔ خود میکاویلی کے لیے بھی یہ نہایت نازک مقام ہے اور ان کی اسی منطق کی وجہ سے بالآخر ان کے اپنے ہی نام کو بٹا لگ جاتا ہے اور آج ان کے ناقدین، انہیں کچھ اچھی نظر سے نہیں دیکھتے۔ میکاویلی کی دلیل یہ ہے کہ حقیقت میں بے رحمی، رحمدلی سے کہیں زیادہ دردمند اور دیالو، یعنی پر اثر ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ ایک ایسی بات لکھ گئے ہیں کہ جس کی وجہ سے دنیا بھر میں جبر کرنے والے ڈکٹیٹروں کی مشکل آسان ہو جاتی ہے، انہیں اپنے ناجائز سلوک کا جواز مل جاتا ہے کہ، 'بے رحمی کی اکا دکا مثالیں قائم کرنے والا حکمران ان حکمرانوں سے کہیں زیادہ رحمدل اور دردمند ہوتا ہے جو ریاست میں صرف رحمدلی کا ڈھونگ رچا کر بدامنی کا باعث بن جاتے ہیں اور ہر طرف قتل و غارت عام ہو جاتی ہے'۔

حالانکہ، 627ء میں ہوئے قریظہ کے اس قتل عام کو اگر آج مشرق وسطیٰ میں جاری تصادم کی روشنی میں دیکھیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس ایک واقعے کی وجہ سے ایک ہولناک مثال قائم ہو گئی ہے۔ یہاں آج بھی مذہب اور سیاست بری طرح ایک دوسرے میں الجھے ہوئے ہیں، جیسے ساتویں صدی عیسوی میں رہا کرتے تھے۔ اوائل دور کی اسلامی تواریخ میں اس قتل عام کی جو بھی توجیہات پیش کی گئی ہیں وہ آج بھی اسی شدت کے ساتھ کارفرما ہیں۔ ان کے ساتھ قران میں مدینہ کے یہودیوں پر محمدؐ کی رسالت سے انکار پر غم و غصے کو بھی استعمال میں لایا جاتا ہے اور یوں ایک ہی درخت کی دو شاخوں کی عجب انتہائیں پیدا ہو کر رہ جاتی ہیں۔ ان انتہاؤں کو آج ہم 'مسلمانوں کی یہود دشمنی' اور 'یہودیوں میں اسلاموفوبیا' کے نام سے جانتے ہیں۔ تاہم، محمدؐ کو اپنے وقت میں درپیش سیاسی صورتحال کی روشنی میں اس سارے معاملے کا معروضی اور نسبتاً جذبات سے باہر نکل کر جائزہ لیا جائے تو ایک واضح صورت نظر آ سکتی ہے۔ وہ یہ کہ قریظہ کا قتل عام بلاشبہ طور پر بے رحمی کا ایک بھیانک مظاہرہ تھا لیکن وہ اس سیاسی کشمکش میں دو طرفہ ناگزیر نقصان کا شکار ہو گئے۔ سختی کے اس مظاہرے کا اصل ہدف قریظہ یا یہودی نہیں تھے بلکہ مدینہ کے وہ لوگ تھے جنہیں محمدؐ کے اختیار اور رہنمائی پر ابھی تک شبہ اور امور مملکت پر تحفظات رہا کرتے تھے۔ اگر اس سے پہلے کسی کے دل و دماغ میں آپؐ کے اختیار اور طاقت بارے کوئی شک و شبہ رہا تھا، وہ اب اچھی طرح رفع ہو گیا۔ سب کو معلوم ہو گیا کہ اصل طاقت کس کے ہاتھ میں ہے۔

ریاست میں اس طرح کی سیاست کا رنگ ہم آج بھی دنیا میں جا بجا دیکھ سکتے ہیں۔ آج بھی کبھی نہ ختم ہونے والے مباحثوں میں یہ گردان جاری رہتی ہے جیسی کہ اس طریق سیاست کا تب محمدؐ کے زمانے میں ہر جا تذکرہ رہا کرتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ صرف اسی طرح، یعنی دلائل اور استدلال کو ایک طرف رکھ کر، مباحثوں کو خاطر میں نہ لا کر، سخت مظاہر کی بدولت ہی ایسا دیرپا اختیار اور حکم قائم کیا جا سکتا ہے جو طویل عرصے تک مراعات اور اجابت کی فراہمی کی بنیاد بن سکتا ہے۔ نئے دور کو جنم دے سکتا ہے اور ممکنات کے لیے راہیں کھول سکتا ہے۔ معروضی معنوں میں تو یہ طریقہ کار انا پرست رویہ ہی قرار دیا جا سکتا ہے جو کہ ریاست کے عملی اور زمینی معاملات میں عجب ہی معلوم ہو گا۔ ویسے بھی، ہم ریاست کو درپیش حالات میں اٹھائے جانے والے ایسے اقدامات بارے کبھی بھی حتمی طور پر کچھ کہنے سے قاصر ہی رہتے ہیں کیونکہ ہم نہیں جانتے کہ اگر نسبتاً نرم رویہ اختیار کیا گیا ہوتا تو جانے، کیا ہوتا؟ اس کہانی میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محمدؐ کے لیے یہ حکمت عملی خاصی کامیاب رہی۔ انہوں نے مدینہ کے ہر شخص، گروہ، قبیلے اور بیرون میں صحرا کے دور دراز علاقوں میں بسنے والوں تک بھی واضح کر دیا کہ ضرورت پیش آنے پر وہ آخری حد تک جانے کے قابل ہیں۔ طاقت کا استعمال ناگزیر ہوا تو وہ ہرگز نہیں چوکیں گے، دریغ نہیں کریں گے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انہیں ہر طرح کے اندرونی اور بیرونی ریاستی خلفشار اور روز روز کے جھمیلوں سے چھٹکارا مل گیا۔ اب وہ نہایت تسلی کے ساتھ مستقبل کے لیے ایک نہایت پر امن راستہ، خوب صورت نقشہ کھینچنے، اور

ریاست کی ایک واقعی فلاحی شکل ترتیب دینے کی طرف توجہ مبذول کر سکتے تھے۔ ان کی نظریں اب مکہ پر تھیں اور قریش کے ساتھ معاملات کو نبٹانے کے لیے، میسر آنے والے اسی ریاستی امن، سیاسی سکون اور رہنمائی کے لیے انتہائی ضروری ذہنی اطمینان کا بھرپور استعمال کیا کریں گے۔

باب:18

شاید، پوری تاریخ انسانی میں محمدؐ کے اپنے آبائی شہر میں لوٹ کر آنے جیسی دوسری مثال نہیں ہو گی۔ جلاوطن ہونے والا ہر شخص واپسی کے خواب دیکھتا ہے۔ لیکن صرف واپسی کا خواہاں نہیں ہوتا بلکہ چاہتا ہے کہ جب پلٹ کر آئے تو اس کا بھرپور خیر مقدم ہو۔ وہ لوگ جنہوں نے جلاوطنی پر مجبور کیا تھا، ماضی کی ہر زیادتی پر نادم کھڑے ہوں اور عوامی سطح پر اس کا ازالہ، واپس چلے آنے کی بھیک مانگ کر کریں۔ لیکن، آخر ایسا کیونکر ہو؟ وہ جگہ جہاں سے نکال دیے گئے۔ جو چھوٹ گئی تھی، واپس چلے بھی آئیں تو بھی ویسی کی ویسی ہی رہے گی۔ پیش منظر، لوگ اور ہر وہ چیز جس سے اپنائیت محسوس ہوتی ہے، نقشہ تو وہی رہتا ہے۔ ہاں، مندرجہ بالا خواب کے پورا ہونے کے لیے جگہ نہیں، لوگوں میں تبدیلی لازم ہوتی ہے۔ یہ تبدیلی، کیا ہے؟ جو بھی ہے، جب یہ انہونی ہو جائے، اگر ہو جائے تو اسی جگہ پر ہر شے مانوس مگر بدلی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ جیسے، کچھ انوکھا رونما ہو چکا ہے۔ ہر جلاوطن یہ چاہتا ہے کہ وہ جو انہونی ہے، اسی کی بدولت ہو اکرے اور اس کی واپسی ہی اس تبدیلی کا مظہر ہو جائے۔ اس کا آنا، صرف آنا نہیں بلکہ نئی شروعات ہو۔ واپسی کا سفر ایک علامت قرار پائے اور لوگ اس کی آمد سے بہتر مستقبل کی امید پال لیں۔ یہ وہ خواب ہے جس کے بل بوتے پر ہجرت کرنے والا ہر شخص پردیس میں ایک ایک دن اور رات کن کر گزارتا ہے۔ یہ وہ منزل ہے جس پر پہنچنے کے لیے جلاوطن ہونے والا ہر آدمی سالہا سال تک غریب الوطنی کے کٹھن سفر میں بھی، ہمت ہارے بغیر، چلتا ہی چلا جاتا ہے۔

لیکن محمدؐ کے لیے ابھی تک ایک بھی ایسا فاتحانہ لمحہ نہیں آیا تھا جسے جلاوطن کے خواب کی تعبیر قرار دیا جا سکے۔ پھر، جب ایسا ہوا بھی تو مقامی لوگوں کی طرف سے استقبالی نعرے بلند ہوئے اور نہ ہی خیر مقدم کے لیے پہلے سے ہجوم جمع ہوا۔ راستے سجائے گئے اور نہ ہی ان کے قدموں میں پھول برسائے گئے۔ سابقہ دشمنوں نے بھی ڈرامائی انداز میں اپنے گزشتہ سلوک پر پچھتاوے میں رو رو کر جان ہلکان نہیں کی۔ یہ بھی نہیں ہوا کہ وہ جذبات میں بہہ گئے ہوں اور بے اختیار آپؐ کو گلے لگا لیا ہو۔ ایسا کچھ بھی تو نہیں ہوا۔ جو واقعتاً ہوا، اس سے تو آپؐ کی واپسی صرف ایک ایزادی عمل معلوم ہوتا ہے۔ یہ عمل اس قدر ہنرمندی سے مکمل ہوا کہ تیسرے اور آخری مرحلے پر تو اس پر فتح کی بجائے اتمام یا کسی عمل مسلسل کی تکمیل کا گماں ہوتا ہے۔ بہرحال، پھر بھی یہ انوکھی داستان ہے۔ تاریخ میں اس جیسی دوسری کوئی مثال نہیں ہے۔

اس قصے کی شروعات 628ء کی ایک رات میں دیکھے گئے، اصل خواب سے ہوتی ہے۔ اس خواب میں، محمدؐ کعبہ کے دروازے پر کھڑے ہیں اور ہاتھ میں اس کی چابی تھام رکھی ہے۔ سر ایک نائر کی مانند مونڈا ہوا اور احرام پہنے ہوئے ہیں۔ احرام نائرین کا لباس ہے جو لینن کی دو چادروں پر مشتمل ہوتا ہے۔ ان میں سے ایک کمر سے باندھ کر اور دوسری کو پیٹھ پر سے گھما کر کندھوں پر گرا دیا جاتا ہے۔ خیر، جب بیدار ہوئے تو وہ جانتے تھے کہ انہیں کیا کرنا ہے؟ وہ میدان جنگ میں تین بار مکہ کے ساتھ برابری کی سطح پر اپنی طاقت کا مظاہرہ کر چکے تھے اور اب وقت آگیا تھا کہ وہ قریش کو احرام سے جڑی کمزوری اور حرمت کعبہ کی مجبوری کی مدد سے زیر کریں۔ حرم ایسی جگہ تھی کہ جہاں میدان جنگ کے برعکس تلوار اور تیر بھالوں کے زور پر صرف ایک دن نہیں بلکہ جیسا کہ خواب میں اشارہ ہوا تھا، غیر مسلح ہو کر کوئی بھی دن اپنے نام کیا جا سکتا تھا۔

حرم کی زیارت کے دو طریقے تھے اور وہ دونوں ہی آج بھی اسلام کا حصہ ہیں۔ ان میں سے افضل طریقہ حج کا ہے۔ تب بھی، یہ اجتماع سال کے آخری، یعنی بارہویں مہینے ذوالحج میں منعقد ہوا کرتا تھا اور واقعی زیارت تھی۔ لیکن، اس کے علاوہ ایک دوسرا طریقہ بھی تھا جسے عمرہ کہا جاتا۔ عمرہ کا مطلب، احترام، اطاعت یا عہد

وفاداری کے ہیں۔ عمرہ کی زیارت سال کے کسی بھی وقت کی جاسکتی تھی۔ محمدؐ نے خلاف توقع، اسی دوسری طرز کی زیارت، یعنی عمرہ ادا کرنے کا ارادہ باندھ کر قریش کو ہکا بکا چھوڑ دیا۔

حجاز کے طول و عرض میں محمدؐ کے اس ارادے کی خبر فوراً ہی پھیل گئی اور ہر شخص، کنبہ، قبیلہ اور خانہ بدوش آپؐ کے اس غیر متوقع اور نڈر اعلان پر مدح سرائی کرتے تھکتا نہیں تھا۔ ویسے بھی یہ زبردست حکمت عملی تھی۔ غور کریں تو بظاہر ایسا لگتا کہ جیسے محمدؐ قریش کے ساتھ ایک نئی چال کھیل رہے تھے، بلکہ انہی کی چال ایک بار پھر ان پر الٹ رہے تھے۔ کمال یہ تھا کہ اصل میں ان کا یہ قدم پورے خلوص اور سچائی کے ساتھ، ایک محترم عمل کے لیے اٹھ رہا تھا۔ دوسری طرف قریش کے لیے محمدؐ کا مکہ میں داخلہ ممنوع قرار دینا، تقریباً ناممکن تھا۔ آخر وہ ایسا کیسے کرتے؟ قریش نے ہمیشہ سے ہی خود کو حرم کی تحویل داری پر مامور کر کے اپنی ساکھ اسی بنیاد پر کھڑی کی تھی کہ وہ ہر زائر کو اس کا حق، یعنی اس کے لیے، اس کی ضرورت اور خواہش کے عین مطابق زیارت کو یقینی بنائیں گے۔ مکہ کی اشرافیہ کے لیے کسی بھی زائر کو اس کے حق سے محروم رکھنا کسی بھی صورت ممکن نہیں تھا، وہ ایسا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ ایسا کرنا خود ان کی عوامی ذمہ داری میں کھوٹ تصور کی جاتی، وہی قصوروار ٹھہرتے۔ اگر وہ کسی پر یوں ہی روک لگاتے تو گویا وہ حرم کی تحویل داری کے حق کو خطرات سے دوچار کر دیتے۔ یہ وہ حق تھا جس پر قریش نازاں تھے، خطہ عرب و حجاز میں محترم سمجھے جاتے تھے۔ ویسے بھی، یہ صرف ایک زائر یا زائرین کے گروہ کی بات نہیں تھی۔ بھلا وہ محمدؐ جیسے شخص کو زیارت سے کیسے روکتے؟ کیا وہ واقعی احرام میں لپٹے، غیر مسلح زائرین پر حملہ کر سکتے تھے؟ انہی زائرین کا خون بہا سکتے تھے جن کے تحفظ کا وہ عہد باندھتے چلے آئے ہیں؟ اس طرح تو وہ حرم کی عزت اور حمیت پر کالک مل دیتے۔ اس ایک اعلان، یعنی عبودیت کے ایک معمولی سے فعل کا ارادہ باندھنے سے ہی محمدؐ نے قریش کو چکرا کر رکھ دیا۔ قریش اس کشمکش و پیچ میں مبتلا ہو گئے کہ خدا جانے، وہ اب آگے چل کر کیا کرنے والے تھے؟ اگر وہ حرم تک پہنچ گئے تو پھر کیا ہو گا؟

آپؐ کی سربراہی میں سات سو لوگوں کا قافلہ، عمرے کی غرض سے دس روز کے سفر پر روانہ ہوا۔ یہ صف در صف لوگ امن کی نشانی بنے ہوئے تھے۔ ان کے پاس کسی بھی قسم کا جنگی ہتھیار، جیسے تلوار، تیر کمان اور نیزے وغیرہ نہیں بلکہ صرف عام خنجر تھے۔ یہ خنجر بھی ہتھیار نہیں بلکہ پانی کے کوزے کی طرح، ایک مسافر کی دوران سفر ضرورت کا سامان سمجھا جاتا تھا۔ اس قافلے کے آگے آگے موٹے تازے اور پلے ہوئے اونٹ چل رہے تھے، جو قربانی کے لیے فربہ تھے اور ان کے گلے میں ہار، مالائیں اور گھنٹیاں باندھ کر تیار کر رکھا تھا۔ ان میں سب سے اونچا اور خوب صورت اونٹ سب سے آگے چل رہا تھا۔ یہ نر سانڈ تھا جس کے نتھنوں میں چاندی کی نکیل ڈلی ہوئی تھی۔ یہ کبھی محمدؐ کے اولین دشمن، قریش کے سردار ابو جہل کی ملکیت ہوا کرتا تھا۔ بدر کی لڑائی میں ابو جہل کی ہلاکت کے بعد آپؐ نے مال غنیمت میں اس اونٹ کو اپنے لیے رکھ لیا تھا۔ اب مکہ کے اس سفر پر اس اونٹ کو قربانی کی غرض سے ساتھ لانے کا مقصد اور اشارہ، واضح تھا۔

جیسا کہ محمدؐ کو توقع تھی، قریش نے گھڑسواروں کے ایک دستے کو شہر کے داخلی راستوں کی ناکہ بندی پر مامور کر دیا۔ فوجی دستے کا سامنا ہو جاتا تو شاید صحرا کے وسط میں بد مزہ صورتحال پیدا ہو سکتی تھی، جس کی لوگوں کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوتی۔ بدمزگی نہ بھی ہوتی تو آدھے راستے سے واپس لوٹنا بھی تو کسی صورت گوارا نہیں تھا۔ چنانچہ، اس کوفت سے بچنے کے لیے آپؐ نے بجائے سامنا کرنے یا واپس لوٹ جانے کے ایک تیسرا طریقہ یعنی راستہ بدلنے کا فیصلہ کیا۔ وہ اپنے پیروکاروں کو لیے رات کی تاریکی میں بقول ابن اسحاق، 'دشوار گزار گھاٹیوں میں پتلے راستوں پر' نکل گئے۔ گھڑسواروں کا ان گھاٹیوں میں مدینہ کے زائرین کا پیچھا کرنا تو دور کی بات، داخل ہونا بھی محال تھا۔ ان گھاٹیوں میں سے ہوتے ہوئے محمدؐ کا قافلہ مکہ کے شمال میں، شہر سے چند میل باہر نشیبی علاقے حدیبیہ میں جا نکلا۔ جس جگہ پڑاؤ کیا، وہاں ببول کا صرف ایک ہی بہت بڑا درخت تھا، جس کے نیچے موسم سرما کا سیلابی پانی، ایک تالاب کی صورت جمع تھا۔ وہ صبح ہونے سے پہلے ہی یہاں پہنچ گئے اور خیمے گاڑ کر آگ روشن کر دی۔ مقصد یہ تھا کہ دھوئیں اور روشنی سے کچھ ہی دور مکہ کے لوگوں کو اس قافلے کی آمد کی خبر ہو جائے۔ ویسے بھی، انہیں کچھ بھی چھپانے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ تو زائرین تھے۔ ان کا مقصد امن تھا۔ جنگ ہرگز نہیں تھا۔ صبح ہوتے ہی اونٹوں کی ٹانگیں باندھ کر لنگڑا دیا تاکہ جب شہر میں داخل ہوں تو

جانوروں میں ہلڑ نہ مچے۔ ہر آدمی نے اپنا واحد ہتھیار خنجر بھی نکال کر ایک طرف رکھ دیا اور نہا دھو کر احرام پہن لیے۔ جب تک مکہ کے گھڑسوار ان تک پہنچتے، وہ روایت کے مطابق پیدل ہی شہر میں داخل ہونے کے لیے تیار تھے۔

چونکہ گھڑسواروں کے پاس اب اس قافلے کا راستہ روکنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا، انہوں نے وہی کیا۔ یہ روک ٹوک دیکھ کر بجائے قافلے کے زائرین ردعمل ظاہر کرتے، مکہ کے فوجیوں نے دیکھا کہ وہ تواتر سے صرف اور صرف حاضری کے کلمے 'لبیک اللھم لبیک' یعنی، 'اے اللہ میں حاضر ہوں، او لوگوں کے مالک، میں حاضر ہوں' کا ورد کیے جا رہے تھے۔ انہوں نے اس قافلے کو دھمکانے کی بہتیری کوشش کی مگر یہ تھے کہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ مومنین کی جانب سے یہ لڑائی اور جنگ کے اعلان کی بجائے ایمان کا مظاہر تھا۔ ایسا شاندار مظاہرہ کہ جس میں سات سو نڈر مرد، نہتے ہو کر کوئی مزاحمت کیے بغیر جم کر اپنی جگہ پر کھڑے تھے۔

محمدؐ نے حکم دیا کہ زائرین تب تک یوں ہی جمے رہیں جب تک کہ قریش انہیں شہر میں داخلے کی اجازت نہ دے دیں۔ ان کا صرف ایک مطالبہ تھا کہ زیارت کی غرض سے آنے والے ان زائرین کو ان کا حق، یعنی بلا روک ٹوک کعبہ تک رسائی دی جائے۔ وہ امن پسند ہیں اور امن چاہتے ہیں۔ لیکن، ایسا محسوس ہوتا تھا کہ مسلح فوجی اس انوکھے طریق پر بوکھلا چکے ہیں اور سپہ سالار کے لیے امن قائم رکھنا مشکل سے مشکل ہوتا جا رہا ہے۔

چنانچہ، جب کچھ بھی نہ سوجھا تو سپہ سالار نے فوراً ہی ایک گھڑسوار کو شہر میں آگے کے لیے احکامات معلوم کرنے کے لیے شہر بھجوا دیا۔ اس عجیب و غریب صورتحال سے نمٹنے کے لیے ابوسفیان نے بھی اسی وقت تجار کونسل کا ہنگامی اجلاس بلا لیا۔ لیکن، یہ کونسل واضح طور پر اس بابت کوئی فیصلہ لینے سے قاصر تھی۔ وہ سر جوڑ کر بیٹھ تو گئے تھے لیکن بے بسی عیاں تھی۔ اگر وہ محمدؐ کو شہر میں داخل ہونے کی اجازت دیتے ہیں، تو بھی اور اگر ان پر روک لگاتے ہیں پھر بھی مسائل کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ یعنی، وہ یہ نوالہ نگل نہیں سکتے تھے اور اگلنے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ یہی نہیں، بلکہ ان کے لیے مسائل اس لیے بھی بڑھ گئے کہ مکہ میں موجود ان کے بدو اتحادیوں نے بھی محمدؐ کی طرف داری شروع کر دی۔ 'ہم نے تمہارے ساتھ ان خطوط پر اتحاد نہیں کیا تھا' ایک بدو سردار نے انہیں متنبہ کیا، 'کہ تم ان لوگوں کو واپس لوٹنے پر مجبور کر دو گے جو یہاں خدا کے گھر کی زیارت، اسے عزت بخشنے آئے ہیں؟ یا تو محمدؐ کو اپنی مرضی سے وہ کرنے دو جس کے لیے وہ آیا ہے، نہیں تو ہم تمہارا ساتھ چھوڑ جائیں گے۔ مکہ میں ہمارا ایک بھی شخص ٹھہرنے کا مجاز نہیں رہے گا'۔

یہ آپ کے نکتہ نظر پر منحصر ہے مگر محمدؐ کا یہ مظاہرہ دیکھتے ہی دیکھتے ایک دھرنے یا احتجاج کی صورت اختیار کر گیا۔ اب ظاہر ہے، ایسی صورتحال میں کچھ دے دلانا ضروری تھا۔ اب تک ابوسفیان اچھی طرح جان چکے ہوں گے کہ محمدؐ کسی بھی صورت پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ چنانچہ، اس پیچیدگی سے نمٹنے کا ایک ہی طریقہ تھا۔ یعنی، مذاکرات شروع کیے جائیں۔ اگلے کئی روز تک دونوں فریقین کے بیچ، اعلیٰ سطح کے وفود کی آمد و رفت جاری رہی۔ مکہ اور حدیبیہ کے بیچ 'سفارتی' رابطہ قائم ہو گیا۔ جس کے تحت کئی نامی گرامی لوگ تو بلاواسطہ محمدؐ سے بات چیت کے لیے آتے رہے مگر ان کے علاوہ کئی ایسے بھی تھے جو قریش کی ایما پر چوری چھپے حدیبیہ میں محمدؐ کے پیروکاروں سے ملاقاتیں کر رہے تھے۔ ان کا مقصد محمدؐ کے قافلے میں پھوٹ ڈلوا کر، دھڑے تشکیل دینا تھا جو بالآخر پہلے خود اور پھر محمدؐ کو وہیں سے خالی ہاتھ واپس لوٹ جانے پر مجبور کر دیتے۔

محمدؐ نے اس حربے کا توڑ یوں نکالا کہ اپنے پیروکاروں کو اپنے ہاتھ پر بیعت کرنے کا حکم دیا۔ آپؐ ببول کے نیچے بیٹھ گئے اور مومنین میں سے ہر شخص، ایک کے بعد دوسرا آگے بڑھتا اور ان کے ہاتھ پر ہاتھ دھر دیتا اور بازو کو بازو سے جوڑ کر وفاداری کا دوبارہ سے عہد کر کے آگے بڑھ جاتا۔ فرداً فرداً، قافلے کے ہر شخص نے دوبارہ سے آپؐ کی رسالت کا اعتراف کیا اور اطاعت کا پکا وعدہ کیا۔ جب یہ ہو رہا تھا تو مکہ کا ایک وفد اس وقت وہیں موجود تھا۔ اس وفد میں ایک شخص پر اس نظارے کا بہت گہرا اثر ہوا۔ اس سے منسوب یہ بیان ابن اسحاق نے یوں رقم کیا ہے کہ، 'واللہ!' اس نے قریش سے کہا، 'اگر محمدؐ کو کھانستے ہوئے بلغم آجائے اور لعاب کے چھینٹے ان میں سے کسی کے کپڑوں پڑ جاتے تو وہ اسے پونچھ کر اپنے چہرے پر مل دیتا ہے۔ اگر وہ انہیں کوئی حکم دیں تو ہر شخص آگے بڑھ کر سب سے

پہلے بجالانے کی کوشش کرتا ہے۔ جس پانی سے وہ وضو کرتے ہیں، میں نے دیکھا ہے کہ لوگ اس پانی پر جھپٹ پڑتے ہیں۔ اگر انہیں محمدؐ کی موجودگی میں بولنا پڑے تو وہ احترام میں آواز نیچی کر لیتے ہیں۔ ویسے بھی ان کا مطالبہ جائز ہے۔ ہمیں اس کو تسلیم کر لینا چاہیے'۔

قریش کے پاس واقعی اس مطالبے کو تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا لیکن اب صورتحال اس نہج پر پہنچ چکی تھی کہ اگر وہ اجازت دے دیتے ہیں تو لوگ اسے ان کی کمزوری سے تعبیر کرتے اور مشہور ہو جاتا کہ بالآخر انہوں نے محمدؐ کے دباؤ میں آکر ہار مان لی ہے۔ جو ظاہر ہے، مکہ کو کسی بھی صورت قبول نہیں تھا۔ ابو سفیان اور محمدؐ دونوں ہی کے لیے اب اپنی ساکھ بچائے رکھنا ضروری ہو چکا تھا اور وہ دونوں ہی ایک دوسرے کی اس ضرورت اور مجبوری سے اچھی طرح واقف تھے۔ چنانچہ، فریقین کے لیے بیچ کا راستہ اختیار کرنا ناگزیر ہو گیا۔ لیکن، محمدؐ شروع سے ہی جانتے تھے کہ بالآخر صورتحال یہی رخ اختیار کر لے گی، اسی طرح وہ صاف دیکھ رہے تھے کہ ان کے پیروکار ان معاملات کو ویسے نہیں دیکھتے، جیسا ان کا خیال ہے۔ مطلب یہ کہ وہ اس سیاسی پیش رفت کی پوری طرح سمجھ نہیں رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے مومنین کو ببول کے درخت کے نیچے عہد وفاداری کو دہرانے کا حکم دیا اور ہر شخص سے اطاعت کا وعدہ لیا۔ یہ ان کے لیے ضروری بھی تھا کیونکہ، اس ضمن میں اگلا قدم خاصا بھاری ثابت ہو سکتا تھا۔ اور جب یہ ہو رہتا تو ان کے پیروکاروں کا یقین قائم رکھنا اور انہیں ممکنہ حالات کے لیے پہلے سے تیار رہنا پڑتا۔ لیکن، بات یہ ہے کہ عملی طور پر اطاعت کے ان وعدوں کا واقعی اور سخت امتحان ہونا ابھی باقی تھا۔

بظاہر مکہ کی تجار کو نسل کے ساتھ طویل مذاکرات کے بعد طے پانے والا معاہدہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کئی لحاظ سے غیر ضروری سمجھوتہ کیا گیا ہے۔ اس معاہدے کو 'صلح حدیبیہ' کا نام دیا گیا اور شرائط یہ تھیں کہ مکہ اور مدینہ کے بیچ اگلے دس برس تک مسلح جنگ نہیں ہو گی۔ پھر، یہ کہ مدینہ کی جانب سے مکہ کے تجارتی قافلوں پر حملے فی الفور بند کر دیے جائیں گے۔ پھر، یہ کہ اس عرصے کے دوران قبیلے اپنی مرضی سے دونوں میں سے کسی ایک فریق کے ساتھ اتحاد قائم کرنے میں آزاد ہوں گے۔ اگر وہ اس تحریر سے پہلے مکہ کے اتحادی تھے یا وہ محمدؐ کے ساتھ تھے، اب وہ بغیر کسی ہرجانے اور سزا کے بغیر دوسرے فریق کے اتحادی بن سکتے ہیں۔ لیکن، اس کے علاوہ یہ کہ محمدؐ اور ان کے پیروکار اس سال عمرہ ادا نہیں کریں گے۔

آخر وہ عمرہ کیوں نہیں ادا کر سکتے؟ محمدؐ کو اس برس اپنے قافلے کے ساتھ واپس جانا پڑے گا تاکہ لوگ یہ نہ سمجھیں کہ انہوں نے مکہ کو اس معاہدے پر رضامند ہونے کے لیے مجبور کیا ہے۔ محمدؐ اس پر راضی ہو جائیں تو قریش انہیں اور ان کے پیروکاروں کو اگلے برس انہی دنوں میں شہر میں داخلے اور عمرہ ادا کرنے کی پوری اجازت دیں گے۔

اس سارے معاملے کا یہ وہ نتیجہ نہیں تھا جس کی محمدؐ کے ساتھ اہتمام کے ساتھ دس دن سفر کرنے کے بعد کئی روز تک حدیبیہ کے مقام پر رک جانے والے سات سو لوگ توقع کر رہے تھے۔ بالخصوص، مہاجرین تو آپے سے باہر ہو گئے۔ وہ پوری تیاری کے ساتھ آئے تھے اور انہیں یقین تھا کہ بالآخر وہ وقت آن پہنچا ہے کہ طویل جلاوطنی کے بعد آبائی شہر میں داخل ہو سکیں گے، اپنے رشتے داروں اور پیاروں کو دیکھ سکیں گے اور پیچھو رہ جانے والی شہر کی گلیوں، کوچوں اور یادوں کے ساتھ ایک دفعہ پھر جڑ سکیں گے۔ لیکن، ہوا کیا؟ اس معاہدے کے تحت انہیں پیچھو ہٹنے کا کہا جا رہا تھا، جو ان کے خیال میں قابل ذلت بات تھی، ان کا اپمان تھا۔ پھر، معاہدے کی باریکیاں، اس میں نپے تلے مگر ڈھکے چھپے انداز میں، جیسے ہوا کرتا ہے الفاظ کے ہیر پھیر سے بھی کچھ اچھا تاثر نہیں ملتا تھا۔ بالخصوص، اس شق سے کہ جس کے تحت بدو قبائل سابقہ اتحاد ترک کرنے میں آزاد تھے اور اب وہ مکہ اور مدینہ میں سے کسی کے ساتھ بھی الحاق کر سکتے تھے۔ اس سے بظاہر یہ تاثر ملتا تھا کہ محمدؐ نے قریش کے ساتھ اختیار کو برابری کی سطح پر تسلیم کر لیا ہے۔ اس شق پر تو آپؐ کے قریبی مشیران بھی بٹے گئے تھے۔ جہاں ابو بکر اور علی معاہدے کے مندرجات میں طویل مدتی فائدہ دیکھ سکتے تھے، عمر اس کو کمزوری سمجھ رہے تھے۔ کیا وہ یہاں تک صرف اس لیے آئے تھے کہ انہیں 'اگلے سال' کے وعدے پر ٹرخا دیا جائے؟ کیا جنگ و جدل ترک کرنے، قافلوں پر حملے بند کرنے کی اتنی بڑی شرط کے عوض یہ سودا سودمند تھا؟ محمدؐ کے پیروکاروں میں اس معاہدے پر

تحفظات کا اظہار کرنے والوں میں عمر خاصے سرگرم تھے اور ان کی آواز اونچی ہوتی چلی گئی، لیکن یہ بھی تھا کہ سارے مجمع میں یہ صرف عمر ہی تھے جنہوں نے با آواز بلند اختلاف کی جرات کی تھی۔ ابن اسحاق نے اس کشمکش کو یوں سمیٹا ہے کہ، 'انہوں نے وہ دیکھا جو ہو چکا تھا۔ معاہدہ، پیچھو ہٹنے کی وجہ بن گیا اور محمدؐ نے اس کی کڑی شرائط کو بخوشی قبول کر لیا تھا۔ وہ اس قدر رنجیدہ ہوئے کہ مایوس ہونے کے قریب تھے'۔

اگرچہ ہم نہیں جانتے لیکن پھر بھی، اگر معاہدے کے بعد محمدؐ بھی اس سے مایوس تھے تو بظاہر انہوں نے اس کا اظہار نہیں کیا۔ اسی طرح ہم نہیں کہہ سکتے کہ آیا محمدؐ نے یہ معاہدہ بحیثیت نائر، پوری نیک نیتی سے عاجزی اور انکساری کا مظاہرہ کرتے ہوئے دستخط کیا تھا یا پھر وہ واقعی جانتے تھے کہ اس معاہدے کے تحت انہوں وہ حاصل کر لیا ہے جو وہ ایک عرصہ دراز سے حاصل کرنا چاہتے تھے۔ بلکہ، یہ کہنا مناسب ہو گا کہ انہیں امید سے کہیں زیادہ حاصل ہو چکا تھا۔ بہر حال، معاہدے کے دور رس اثرات آگے چل کر ظاہر ہو ہی جاتے، فی الوقت انہوں نے اس معاہدے کو اپنے پیروکاروں کے ایمان کا امتحان بنا کر پیش کیا۔ 'صبر کرو اور خود پر قابو رکھو' انہوں نے مومنین کو تاکید کی، 'اللہ ہمارا حامی و ناصر ہے۔ ہم نے ایک وعدہ کیا ہے اور ہم نے یہ وعدہ اللہ کے نام پر کیا ہے۔ ہم اس کو جھٹلا نہیں سکتے اور اپنی زبان سے پھر نہیں سکتے'۔

تاہم وہ دیکھ سکتے تھے کہ مومنین کا حوصلہ بلند کرنے کے لیے مزید بھی کسی چیز کی ضرورت ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہ لوگ ان کے ساتھ اتنی دور تک آئے تھے اور انہوں نے آپؐ پر یقین میں ایسا کیا تھا اور یہاں تک پہنچتے پہنچتے بہت ساری توقعات پال لی تھیں۔ محمدؐ کے خیال میں، اب یہاں پہنچ کر انہیں یوں ہی واپس پلٹ کر مدینہ لوٹ جانے کا حکم دینا، شاید زیادتی ہوتی۔ آخر، وہ کس منہ سے واپس جائیں کہ جب مدینہ میں داخل ہوں تو وہ جانور جو وہ ساتھ لائے تھے، قربان کیے بغیر ہی ان کے پیچھو چلتے ہوں؟ تو کیوں نہ وہ جانے سے پہلے وہ کام کر ہی لیں، جس کے لیے وہ آئے تھے؟ اگرچہ وہ مکہ کے اندر جا کر، کعبہ کے احاطے میں عمرہ تو ادا نہیں کر سکتے تھے لیکن حدیبیہ کے مقام پر کم از کم قربانی تو کی ہی جا سکتی تھی۔ چنانچہ، محمدؐ اٹھ کھڑے ہوئے اور حکم دیا، 'اٹھو، قربانی کرو اور سر منڈوا دو'۔

لیکن، حاضرین میں سے ایک بھی شخص نے حکم سن کر بھی حرکت نہ کی۔ یقیناً، یہ ان کی سمجھ سے باہر تھا۔ وہ بغیر عمرہ ادا کیے، کعبہ کے گرد سات چکر لگائے بنا آخر قربانی اور سر منڈوانے کی رسومات کیسے ادا کرتے؟ آخر یہ زیارت کا کونسا طریقہ ہے؟ یہاں تک کہ جب محمدؐ نے دوسری بار حکم دیا اور پھر تیسری بار سختی سے کہا تب بھی، نائرین جوں کے توں خاموشی سے ہکا بکا بیٹھے رہے۔

اگر اس وقت محمدؐ پیروکاروں کو یوں کچھ دیر قبل کی جانے والی غیر مشروط اطاعت کے وعدوں کے باوجود یوں نافرمانی کرتے دیکھ کر غصہ تھے تو انہوں نے ان جذبات کا اظہار نہیں کیا۔ اگر وہ ان کے اس رویے پر مایوس تھے تو بھی ان کے چہرے پر اس کا شائبہ تک نہیں تھا۔ بلکہ، محمدؐ چپ چاپ بیٹھے مومنین کے گروہ پر آنکھیں جمائے، اٹھ کھڑے ہوئے اور ایک خنجر تھام لیا۔ پھر وہ بغیر کچھ کہے، یوں ہی چلتے ہوئے اس اونٹ کے پاس پہنچ گئے جس کے نتھنوں میں چاندی کی نکیل تھی اور یہ کبھی قریش کے سردار ابو جہل کی ملکیت ہوا کرتا تھا۔ آپؐ کا انداز اور ابو جہل کے اونٹ کی طرف خود ہی بڑھنا دیکھ کر لوگوں کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ محمدؐ نے اونچی آواز میں کلمہ شہادت پڑھا اور اللہ سے قربانی قبول کرنے کی درخواست کی اور جانور کا سر پیچھو موڑ کر اس کی شہ رگ سامنے لے آئے۔ خنجر بلند کیا اور تیزی سے شہ رگ پر پھیرتے ہوئے جانور کا گلا کاٹ دیا۔ خون کا فوارہ پھوٹ پڑا۔

ریت پر تازہ خون پھیل گیا۔ یہ منظر دیکھتے ہی لوگوں پر چھایا سحر ٹوٹ گیا اور ہر طرف سے اللہ اور اس کے رسول کی بڑائی کے نعرے بلند ہونے لگے۔ آپؐ نے ایک ساتھی کو بلا کر ان کی زلفیں کاٹنے اور سر مونڈنے کا حکم دیا۔ یہ زیارت پوری ہونے کی نشانی تھی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے سات سو لوگوں نے آپؐ کی پیروی میں قربانی کے سارے جانور ذبح کر کے سر منڈوا دیے۔ ان نائرین میں سے ایک نے بعد میں نہایت دیدہ دلیری اور وضاحت سے بتایا کہ جب سب لوگوں نے سر

منڈوا دیے تو کٹی زلفوں اور باوں کے ڈھیر اٹھا کر ہوا میں اڑا دیے۔ اسی وقت، ہوا چلنے لگی اور باوں کے گچھے اڑتے ہوئے نو میل دور کعبہ میں جا گرے۔ یہ واضح اشارہ تھا کہ خدا نے ان کی زیارت اور قربانی قبول کر لی ہے۔

آنے والے وقت میں صلح حدیبیہ محمدؐ کی دور رس حکمت عملی کی عمدہ مثال ثابت ہو گا۔ ابن اسحاق اس کے بارے کچھ یوں لکھیں گے کہ، 'اسلام کی مختصر تاریخ میں حاصل ہونے والی یہ پہلی بڑی، بلکہ واقعی کامیابی قرار دی جا سکتی ہے۔ اس سے پہلے تو صرف لڑائیاں لڑی جاتی رہیں لیکن جب صلح ہو گئی اور ہر وقت جنگ اور انتشار کا خطرہ ٹل گیا تو لوگ ایک دوسرے کے ساتھ خود کو محفوظ سمجھنے لگے۔ وہ مکالمے اور بات چیت میں مشغول ہو گئے اور لوگوں میں جو سمجھ رکھتے تھے، انہیں تبلیغ کرنا آسان ہو گیا اور یوں جلد ہی بڑی تعداد میں لوگ جوق در جوق اس الہامی پیغام کو اچھی طرح سمجھنے کے بعد اپنی مرضی سے اسلام قبول کرنے لگے'۔ مکہ کے کئی لوگ اور صحرا کے بدو، دونوں ہی اقتدار کے ایوانوں میں آنے والی اس خوش آئند تبدیلی پر خوش تھے۔ چنانچہ یہ بھی محمدؐ کی حکمت کے گرویدہ ہو کر جلد ہی ان کے جھنڈے تلے جمع ہونا شروع ہو گئے۔ یعنی، قبیلے اب خود ہی، آپؐ کے ساتھ اتحاد کے لیے رابطہ کرنے لگے۔

اس کے باوجود کئی مومنین، بالخصوص وہ مہاجرین جو حدیبیہ میں محمدؐ کی حکمت عملی سے نالاں تھے اور ابھی تک اسے تسلیم کرنے میں پس و پیش سے کام لے رہے تھے۔ ان کی تسلی کے لیے قرانی آیات بھی نازل ہو گئیں۔ ان آیات نے انہیں واقعی خاموش کر دیا۔ 'اللہ مومنین سے خوش ہو گیا جب وہ درخت کے نیچے تم سے بیعت کر رہے تھے۔۔۔' الہامی آواز نے محمدؐ سے کہا، 'ان کے دلوں کا حال اسے معلوم تھا، اس لیے اس نے ان پر سکینت نازل کی۔۔۔ اور لوگوں کے ہاتھ تمہارے خلاف اٹھنے سے روک دیے تاکہ یہ مومنوں کے لیے ایک نشانی بن جائے۔۔۔ اور بہت سا مال غنیمت انہیں عطا کر دیا جسے وہ (عنقریب) حاصل کریں گے'۔

اگر جنگ ایک فریب ہے تو ایک لحاظ سے امن بھی کسی دھوکے سے کم نہیں ہوتا۔ اپنے ہی آدمیوں کے ہاتھوں سے ہتھیار لے کر محمدؐ نے کمال ہوشیاری سے قریش کو بھی غیر مسلح کر دیا۔ انہیں کلاسیکی طریقے سے گھیر کر حاصل جمع صفر کے کھیل میں کھینچ لائے، جہاں ان کے پاس مفاہمت کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ پھر، یہ بھی کہ مکہ کے سردار کسی بھی قسم کی مفاہمت کر لیں، اس کا سارا فائدہ محمد کو ہی پہنچتا۔ گیارہ صدی قبل گزرنے والے مشہور سپہ سالار کلاوز وویٹس کا مشہور مقولہ ہے کہ 'دراصل جنگ بھی دوسرے معنوں میں سیاست کا ہی جاری تسلسل ہے'۔ لیکن یہاں تو محمدؐ نے اس مقولے کے بالکل برعکس کر دکھایا تھا۔ ثابت یہ ہوا تھا کہ جو شے جنگ سے جیتی نہیں جا سکتی، بالآخر اس کے حصول کے لیے سیاست کام آئے گی۔ یوں غیر مسلح ہو کر، مفاہمت کی راہ پر چلنے سے دو باتیں ہوئیں۔ پہلی تو یہ کہ اس طرح محمدؐ نے قریش کو گھٹنے ٹیک کر انہیں قبول کرنے پر مجبور کر دیا اور دوسری یہ کہ عرب کے طول و عرض میں لوگوں نے دیکھ لیا کہ محمدؐ اور ان کے پیروکار تو قریش سے کہیں بڑھ کر 'آباؤ اجداد کے طریقے' سے وفاداری نبھا رہے ہیں۔ جو کارنامہ محمدؐ نے کر دکھایا تھا، گاندھی اور نہ ہی میکاویلی، تاریخ کے ان دونوں سیاسی ستونوں میں سے ایک بھی سیاست کا اس سے بہتر مظاہرہ دوبارہ نہیں کر پایا۔ محمدؐ نے رائج سیاست اور مشغولیت کے سارے اصولوں کو نیچا دکھا دیا تھا، یعنی کمزوری کو نہایت ہی عمدگی سے اپنی طاقت میں بدل کر رکھ دیا۔ اب انہوں نے مسلح اور غیر مسلح، دونوں ہی صورتوں میں اپنی دھاک بٹھالی اور جہاں سخت دلی سے جنگی اقدامات اٹھائے تھے، اب امن کی زبان استعمال کرنے میں بھی، ان کا سکہ چل گیا۔ سچ تو یہ ہے کہ محمدؐ کی یہی خاصیت، یعنی ہر دو حالتوں میں ثابت قدم رہ کر دوہری خصوصیات کا مظاہرہ کرنے کی ہی وجہ سے ان کے ناقدین اور معتقدین، دونوں ہی ہمیشہ دم بخود رہا کرتے ہیں۔ یہ معاملہ تب بھی، یعنی ساتویں صدی عیسوی میں زیر بحث ہو یا آج اکیسویں صدی میں بھی لوگ مباحثوں کے دوران ایک دوسرے کا سر پھوڑ دیں، ہمیشہ ہی لاینحل رہتا ہے کہ آیا محمدؐ 'امن کے پیغامبر' تھے یا وہ 'جنگ کے پیغامبر' ہوا کرتے تھے؟ حالانکہ یہ سرے سے 'یا' اور 'دونوں میں سے کوئی ایک' کا معاملہ نہیں ہے بلکہ محمدؐ تو ایک تہہ دار شخصیت کے مالک، تاریخ کا ایسا کردار ہیں جن کی سوچ اور بصارت، ایسے تضادات اور ناقابل مصالحت مباحثوں سے کہیں بڑھ کر ہے۔ اس طرح کے کن ٹٹے مکالموں سے ان کے کردار کی صحت پر

چنداں فرق نہیں پڑتا۔ خیر، قصہ مختصر یہ کہ اگرچہ انہوں نے خود کو مکہ کی دہلیز سے بظاہر نامراد لوٹا دیا تھا لیکن وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ واپسی کا پہلا مرحلہ کامیابی سے مکمل کر چکے ہیں۔

مکہ کے ساتھ معاہدہ ہو جانے کے بعد محمدؐ نے اب اپنا اثر رسوخ شمال کی جانب بڑھانا شروع کر دیا۔ حدیبیہ سے واپسی کے صرف ایک مہینے بعد ہی انہوں نے سولہ سو جنگجوؤں اور سفارت کاروں پر مشتمل ایک 'دستہ' تشکیل دیا، جس کا ہدف خیبر کا نخلستان تھا۔ خیبر، شمالی حجاز میں واقع امیر ترین علاقہ تھا۔ یہاں وسیع و عریض رقبے پر کھجور کے باغات تھے اور یہ یہودیوں کے سات قبائل کی ملکیت تھا۔ ان میں سے ہر قبیلہ نخلستان کے اندر الگ الگ قلعہ نما گڑھیوں میں بسر رکھتا تھا۔ جب ابو سفیان نے مدینہ پر چڑھائی کی تھی تو ان کا سامنا بھی اسی طرح کے نخلستان میں قلعہ نما گڑھیوں سے تھا اور انہوں نے ایسی ہی صورتحال میں ایک بڑی فوج کے ساتھ نخلستان کا محاصرہ کیا تھا اور بری طرح ناکامی سے دوچار ہوئے تھے۔ لیکن اب محمدؐ عملی طور پر مثال نصاب کی کتاب کے گر سکھائیں گے کہ دراصل اس طرح کا معرکہ سر کرنے کا صحیح طریقہ کیا ہوتا ہے۔

سب سے پہلے تو انہوں نے خیبر کے اتحادی بدو قبیلے کی حمایت حاصل کر کے انہیں غیر جانبدار رہنے پر مجبور کر دیا۔ یہ اتحادی، جانا مانا قبیلہ غطفان تھا۔ غطفان کو کھجور کی فصل کا جو حصہ مدینہ سے نہیں ملا تھا، اب انہیں خیبر کے معاملات میں دخل نہ دینے کے عوض ادا کیا جائے گا۔ پھر، بجائے یہ کہ پورے خیبر کا محاصرہ کرتے، محمدؐ نے یہودیوں کی مضبوط گڑھیوں کو ایک مخصوص طریقہ کار کے ساتھ، ایک ایک کر کے نمٹانا شروع کر دیا۔ انہوں نے شروعات کمزور ترین قبائل سے کی اور ایک کے بعد دوسرے کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا۔ یہ ایسا عمل تھا جس کے دوران انہوں نے سخاوت اور فیاضی کا مظاہرہ کرتے ہوئے، ہر قبیلے کو مدینہ کے یہودیوں کے برعکس بہت ہی آسان شرائط پر جانے دیا۔ وہ پہلے ہی اپنی حاکمیت قائم کر چکے تھے تو اب ماضی کے جیسے سخت اقدامات اٹھانے کی قطعاً ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔ خیبر کے یہودی قبائل، محمدؐ کے سابقہ رویے سے اچھی طرح واقف تھے۔ وہ جانتے تھے کہ مزاحمت کے نتائج کس قدر سخت ہو سکتے ہیں، تو بخوشی شرائط مان لیں۔ انہوں نے محمدؐ کے سیاسی اختیار کو بھی کسی چوں چراں کے بغیر قبول کر لیا اور ان کے تخطہ میں چلے گئے۔ حمایت کا پورا یقین دلایا اور اپنی سالانہ آمدنی کا آدھا حصہ خراج کی صورت مدینہ کو ادا کرنے پر راضی ہو گئے۔ ایک بار پھر، روایت کے مطابق اس معاہدے کو شادی کی مدد سے پختہ کیا گیا۔ خیبر کے ایک نامی گرامی سردار کی بیٹی صفیہ، جن کی عمر اس وقت سترہ سال تھی، محمدؐ کے ساتھ نکاح کر دیا گیا۔ وہ آپؐ کی آٹھویں اور دوسری یہودی بیوی تھیں۔

جب خیبر کا معاملہ طے ہو گیا تو اب آپؐ نے یہاں سے یہودیوں کے ایک دوسرے، مگر چھوٹے نخلستان تیماء کا رخ کیا۔ تیماء مدینہ اور قدیم شہر ثمود کے بیچ میں واقع تھا جو آجکل جنوبی اردن کا حصہ ہے۔ یہاں کے قبائل نے خیبر کے برعکس کسی بھی قسم کی مزاحمت نہیں کی اور اسی وجہ سے ان کے ساتھ پہلے سے بھی کہیں زیادہ رعایت برتی گئی۔ اب حجاز کے شمال میں واقع بڑی آبادیاں، محمدؐ کی پشت پر کھڑی تھیں اور یہ اب صرف وقت کا کھیل تھا کہ اس علاقے کے بدو قبائل بھی محمدؐ کے اختیار اور اقتدار کو مان کر مدینہ کی ریاست کا حصہ بن جائیں گے۔ جہاں تک جنوب میں مکہ کا سوال تھا تو اب محمدؐ اپنی واپسی کے دوسرے مرحلے کی طرف قدم بڑھانے کے لیے تیار تھے۔

629ء میں، فروری کے مہینے میں وہ اپنے ساتھ دو ہزار زائرین کا قافلہ لیے معاہدے کے تحت عمرہ ادا کرنے کے لیے نکلے۔ اس زیارت کو تاریخ کی کتابوں میں 'تکمیل کی زیارت اصغر' کے نام سے یاد کیا جائے گا۔ وہ اس سفر کے دوران قصواء پر سوار تھے۔ چرے ہوئے کانوں والی یہ وہی اونٹنی ہے جس پر سات سال پہلے محمدؐ سوار ہو کر مدینہ میں داخل ہوئے تھے اور اس کی مہار کو کھلا چھوڑ دیا تھا کہ جہاں چاہتی، بیٹھ جاتی اور اسی جگہ پر آپؐ کا پڑاؤ ہوتا جو جلد ہی مسجد بن گئی۔ اس اونٹنی پر بیٹھ کر محمدؐ نے جلاوطنی اختیار کی تھی اور اب اسی اونٹنی پر بیٹھ کر وہ مکہ واپس جائیں گے۔

ابو سفیان نے پچھلے سال کیے ہوئے وعدہ کا پورا پاس رکھا۔ جیسا کہ حدیبیہ میں طے ہوا تھا، قریش نے کعبہ کے احاطے کو مکمل طور پر محمدؐ کے حوالے کر دیا اور انہیں یہاں زیارت کے لائق ہر نشانی تک بلا روک ٹوک رسائی دے دی۔ جلاوطنی میں واپسی کے خواب نے محمدؐ کو سالہاسال تک، دن اور رات بے چین رکھا تھا اور اب موقع آگیا تھا کہ وہ آبائی شہر میں اپنی مٹی پر دوبارہ قدم رکھ سکتے تھے۔

جیسا کہ اس موقع پر پیش آنے والے واقعات اور جذباتی مناظر کی توقع ہے، اوائل دور کے اسلامی تاریخ دانوں نے متوقع طور پر عظیم الشان واقعے کی تفصیلات کو بیان کرنے میں غیر معمولی اختصار سے کام لیا ہے۔ یہاں تک کہ بیسار گوئی کے عادی، ابن اسحاق نے بھی اس واقعے کے لیے صرف اور صرف ایک صفحہ وقف کیا ہے، حالانکہ یہاں درجن بھر صفحات پر پھیلی تفصیلات جمع کی جاسکتی تھیں۔ وہ بیانیے میں بھی خاصی پھرتی سے آگے بڑھ گئے اور لکھتے ہیں کہ محمدؐ مکہ پہنچے، حجر اسود یعنی سیاہ پتھر کو اپنی چھڑی سے چھوا پھر خراماں خراماں حرم کے گرد سات چکر لگائے اور قربانی کر کے سر منڈوا دیا۔ یہ اختصار یہ خاصا عجیب اور بجھا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ یا پھر، اس پر بس ایسا گماں ہوتا ہے کہ جیسے یہ کسی نامکمل کہانی کی شروعات ہے۔ گویا، یہ عمرہ بس اسی لائق تھا کہ وہ قریش کی مرضی اور منشاء، طے کردہ شرائط کے زیر اثر ایک میکانکی عمل کیے جا رہے ہیں اور اس میں کسی بھی طرح سے ان عبادات کو ادا کرنے میں محمدؐ کی دلچسپی شامل نہیں ہے۔ اگر قریش نے اپنے وعدے کا پاس رکھتے ہوئے محمدؐ کو برداشت کر رکھا تھا اور بددلی کے ساتھ چپ سادھ لی تھی تو وہیں یہ بھی طے ہے کہ انہوں کسی بھی طور محمدؐ کا خیر مقدم نہیں کیا تھا۔ واپسی کا اصل قصہ، واقعی پیش آنا تو ابھی آنا باقی تھا۔

چلو، وہ تو قریش تھے لیکن محمدؐ کے ساتھ کیا معاملہ ہوا؟ کیا وہ اپنے جانے پہچانے گلی کوچوں سے اتنے عرصے بعد گزرتے ہوئے خود پر گڑی ہوئی نفرت انگیز نگاہوں کو محسوس کر کے پریشاں تھے؟ کیا وہ واقعی جان چکے تھے کہ مکہ کے باسی ابھی تک ان کا بر ا ہی چاہتے ہیں اور جب انہوں نے عمرے کی رسومات کھوکھلے انداز میں ادا کیں تو کیا ان کے دل میں اس وقت اسی پریشانی نے ڈیرہ ڈال رکھا تھا؟ یا پھر اب یہ سب، اس حقیقت کے سامنے کوئی معنی نہیں رکھتی تھی کہ وہ ایک بار پھر، طواف کر عا اپنی جائے پیدائش پر واپس پہنچ چکے ہیں اور سات چکر لگا رہے ہیں۔ یہ سفر صرف اور صرف ماضی میں اپنے آپ سے کیے اس عہد کا ایک حصہ تھا جو ہمیشہ ہی اندر سلگتا رہا تھا کہ چاہے جو بھی ہو، وہ واپس آکر رہیں گے یا کہو، انہوں نے کبھی خود کو اس جگہ سے جدا، دور سمجھا ہی نہیں؟ ہم صرف یہ جانتے ہیں کہ محمدؐ نے جیسا کہ طے ہوا تھا، پورے تین دن مکہ میں قیام کیا۔ چونکہ، اب لوگوں کو ان کی سچائی، یعنی صرف اور صرف زیارت کے ارادے پر یقین آچکا تھا، ان تین دنوں میں کئی لوگوں نے اسلام قبول کر لیا۔ کئی ایسے تھے، جنہوں نے کھلے عام تو اس کا اظہار نہیں کیا لیکن اشارتاً، سب کو بتا دیا۔

محمدؐ کے چچا، عباس کی مثال سامنے ہے۔ عباس مکہ کے مشہور بینکار تھے اور پچھلے سات سالوں نے انہوں انتہائی محتاط انداز میں اپنے بھتیجے سے فاصلہ کیے رکھا تھا۔ عمرے کے تیسرے دن، اپنی سالی میمونہ کا نکاح محمدؐ کے ساتھ کر دیا۔ اس طرح انہوں نے اشارہ دے دیا کہ اگرچہ وہ باقاعدہ اسلام قبول نہیں کر رہے لیکن وہ انہی خطوط پر محمدؐ سے قربت قائم کر رہے ہیں۔ ہواؤں کا رخ بھانپ جانے والے، عباس واحد شخص نہیں تھے۔ میمونہ، مکہ کے ایک نامی گرامی سپہ سالار خالد کی خالہ تھیں۔ جب تیسرے دن، محمدؐ اور ان کے پیروکاروں نے واپسی کے لیے رخت سفر باندھا تو خالد اور ایک دوسرے سپہ سالار امر نے بھی ان کے ساتھ ہی مدینہ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ ان دونوں اشخاص کا مدینہ میں خوش دلی کے ساتھ استقبال کیا گیا۔ انہیں بیٹوں جیسا رتبہ دیا۔ حالانکہ، خالد نے احد کی لڑائی میں گھڑسواروں کے دستوں کی سپہ سالاری میں محمدؐ کے خلاف کامیاب مہم جوئی کی تھی۔ وہ کئی مومنین کے قتل کے ذمہ دار تھے لیکن محمدؐ نے انہیں یقین دلایا کہ وہ سب اب ماضی کا قصہ ہے اور اسلام قبول کر لینے کی وجہ سے ان کے سارے گناہ اور جنگی جرائم معاف کر دیے گئے ہیں۔ ابن اسحاق کے الفاظ میں، 'قرضے ادا ہو گئے'۔ بے شک، اس کے بعد خالد نے بھی اپنی وفاداری کا بھرپور ثبوت دیا۔ کئی معرکوں میں جرات، بہادری اور دیدہ دلیر سپہ سالاری کے بعد بالآخر انہیں 'سیف اللہ' یا 'اللہ کی تلوار' کا خطاب عطا کیا گیا۔

ان سب سے اہم، ایک عوامی شخصیت اور بھی تھی جس کے ساتھ تین دن قیام کے دوران محمدؐ کی بات چیت چلتی رہی۔ بے شک و شبہ، وہ آپؐ کے مکہ میں قیام کے دوران بند دروازوں کے پیچھو ملاقات کر چکے تھے۔ ان تین دنوں میں مکہ کی فضا خاصے تناؤ کا شکار رہی اور ان کا کھلے عام ملاقات کرنا ممکن نہیں تھا، لیکن یہ تو طے ہے کہ ان کے بیچ بالضرور ہی کچھ معاملات آگے بڑھے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مدینہ پہنچتے ہی محمدؐ نے فوراً، نواں نکاح کیا۔ یہ نکاح ام حبیبہ کے ساتھ ہوا جو اب بیوہ ہو چکی تھیں۔ ام حبیبہ، کسی اور نہیں بلکہ مکہ کی تجار کونسل کے سربراہ ابو سفیان کی بیٹی تھیں۔ انہوں نے بہت پہلے، اوائل دور میں ہی اپنے والد کی مرضی کے خلاف اسلام قبول کر لیا تھا لیکن اب ان کی آپس میں وہ رنجش بھی ماضی کا قصہ بن چکی تھی۔ اب تو مفاہمت کا زمانہ چل رہا تھا اور ہر شے مصالحت سے جڑی ہوئی تھی۔ بہر حال، جس قدر خاموشی سے یہ شادی طے پائی، اسی زور شور سے عیاں ہو گیا کہ ابو سفیان کی من مرضی بھی اب محمدؐ کے تابع ہو چکی ہے۔ ان دونوں کے بیچ، یعنی سسر اور داماد اب آگے چل کر محمدؐ کی مکہ واپسی کے تیسرے اور حتمی مرحلے کی تفصیلات طے کریں گے۔ اور اب اس قصے میں، یہی باقی ہے۔

تیسرے مرحلے کا یہ ہوا کہ گو جنگ بندی کا معاہدہ دس سال کا تھا لیکن محمدؐ کی مکہ سے واپسی کے چھ ماہ بعد ہی حدیبیہ کا معاہدہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جائے گا۔ ہوا یوں کہ دو بدو قبائل، جو دیرینہ دشمن تھے، ان کے بیچ ایک بار پھر سے جھڑپیں شروع ہو گئیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ جھڑپیں مکہ کی تجار کونسل میں محمدؐ کے کٹر مخالفین کی شرارت تھی جو اس معاہدے کو توڑنے کے بہانے تلاش کر رہے تھے۔ چونکہ، ان میں سے ایک قبیلہ مکہ کا اور دوسرا مدینہ کا اتحادی تھا، ان کے بیچ پیش آنے والے معاملہ ان کے محافظوں یعنی ابو سفیان اور محمدؐ کے بیچ بھی شمار ہوا اور یوں مکہ اور مدینہ ایک بار پھر، ایک دوسرے کے سامنے آ گئے۔ تفصیلات یہ تھیں کہ مکہ کے حمایتی قبیلے کے لوگ اپنے دشمن قبیلے کے بیس لوگوں کو قتل کرنے کے بعد شہر حرم، مکہ پہنچ گئے اور تحفظ کا تقاضا کرنے لگے۔ اس کے جواب میں محمدؐ کے حمایتی قبیلے نے ان سے مطالبہ شروع کر دیا کہ وہ مکہ کے محترم شہر میں پناہ لینے والے قاتلوں کی وہاں سے ملک بدر کرنے پر مکہ پر دباؤ ڈالیں اور انہیں قصاص کا موقع فراہم کریں۔

اگر محمدؐ اپنے اتحادیوں کے دفاع میں ہتھیار اٹھا لیتے ہیں تو یقیناً وہ اپنے اس عمل میں حق بجانب ہوں گے۔ چنانچہ، اب کی بار ابو سفیان نے دس دن کا طویل سفر طے کیا اور تصفیے کے لیے مدینہ پہنچ گئے۔ تین سال قبل یہی شخص تھا، جس نے ایک بڑا لشکر ترتیب دے کر مدینہ کا محاصرہ کر لیا تھا لیکن آج حالت یہ تھی کہ وہ محمدؐ سے صبر کی بھیک مانگ رہے تھے۔ اپیل کر رہے تھے کہ وہ محمدؐ کے تعاون کے بغیر مکہ کے اندر کٹر مخالفین کو قابو میں نہیں رکھ سکتے۔

ابن اسحاق اور نہ ہی الطبری نے ابو سفیان کی اپیل پر محمدؐ کا جواب رقم کیا ہے۔ بلکہ، وہ یہاں حقائق سے کہیں دور جاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور اسی نکتے پر مصر نظر آتے ہیں کہ محمدؐ نے ابو سفیان کو جواب دینے سے ٹکا انکار کر دیا۔ اگرچہ یہ ان حالات میں بے جا تو نہیں ہے لیکن، ایسا ہونا ممکن نظر نہیں آتا۔ ماضی میں سخت دشمنی کے باوجود بھی یہ دونوں اشخاص ایک دوسرے کا حد درجہ احترام کرتے آئے تھے اور اب تو وہ نہ صرف رشتہ داری میں بندھ چکے تھے بلکہ یہ دونوں ہی آدمی عزت دار اور اپنے اخلاق میں خاصے دیانت دار واقع ہوئے تھے۔ یہاں تک کہ، جنگ میں بھی ابو سفیان نے آبرو کا مظاہرہ کیا تھا اور اپنی بیوی ہند کے ہاتھوں احد کے مقام پر حمزہ کے لاشے کی بے حرمتی پر باقاعدہ معذرت کی تھی۔ انہوں نے عمرے کی زیارت کے دوران بھی محمدؐ کے زہد کا مظاہرہ دیکھ لیا تھا اور وہ اچھی طرح جان چکے تھے کہ ان کا طرز زندگی تو مکہ کے تقریباً لوگوں سے کہیں زیادہ افضل اور حرم کی روایات کے عین مطابق تھا۔ لیکن، ان سب خصوصیات سے کہیں بڑھ کر، ابو سفیان حقیقت پسند واقع ہوئے تھے۔ اگرچہ تجار کونسل کے اکثر لوگ ابھی تک سمجھ نہیں پائے تھے لیکن وہ اچھی طرح جان چکے تھے کہ ان کے اقتدار کے دن گنے جا چکے ہیں۔ خالد اور امر جیسے نامی گرامی سپہ سالار اب محمدؐ کے مشیران میں شامل ہو چکے تھے اور اب اس بات میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ کسی بھی وقت، جس طرح چاہتے مکہ پر قبضہ کر سکتے تھے۔ بدوؤں کو آپس میں لڑا کر تو کونسل میں محمدؐ کے کٹر مخالفین نے ان کے لیے آسانی پیدا کر دی تھی۔ انہوں نے اپنے ہاتھوں سے قریش کے حکومتی تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی تھی۔

اب سوال صرف یہ تھا کہ قریش کے اقتدار کا خاتمہ کب اور کیونکر ہو گا اور یہی وہ تفصیلات تھیں جو اس موقع پر محمدؐ اور ابو سفیان نے نہایت خاموشی اور رازداری کے ساتھ طے کر لیں۔ یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ آج بھی دنیا بھر میں اس طرح کی گفت و شنید اور معاہدے یوں ہی طے پاتے ہیں۔ عوامی ملاقاتیں تو صرف اسی وقت کی جاتی ہیں جب بنیادی ڈھانچہ کھڑا ہو چکا ہوتا ہے اور بہت پہلے ہی نجی محافل اور خفیہ طور سے تاک جھانک کرتی آنکھوں اور باوہ گوئی سے کہیں پرے معاملات طے پا چکے ہوتے ہیں۔ اگر آپ بحیثیت سیاستدان، ذرہ بھر بھی سیاسی حکمت رکھتے ہیں تو عوامی سطح پر میل جول تبھی کریں گے جب خفیہ مذاکرات کے بعد معاملات طے پا جائیں اور ایک خوش آئند حل تلاش کر چکے ہوں۔ اس سارے قضیے کا یہی خوش آئند حل تھا، جس پر مدینہ میں محمدؐ اور ابو سفیان کے بیچ بات چیت ہوئی۔ بنیادی طور پر، انہوں نے اس موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے مکہ کے ہتھیار ڈالنے کا طریقہ کار وضع کرنے کے ساتھ ساتھ اس سیاسی کشمکش کی کہانی کا اختتام طے کیا۔

ان دو لوگوں کے علاوہ باقی سب کا یہ تھا کہ انہیں تب معلوم ہوا جب اس کہانی کا ایک دم ہی اختتام آ گیا۔ جوں ہی ابو سفیان مکہ کے لیے روانہ ہوئے، محمدؐ نے نقل و حرکت شروع کروا دی۔ انہوں اپنے تمام بدو قبائل کو بلا بھیجا اور یکم جنوری 630ء کو جنوب کی طرف ایک لشکر کی صورت روانہ ہو گئے۔ جب وہ مکہ کے مضافات میں پہنچ گئے اور خیمہ زن ہو گئے تو اس وقت تک آپؐ کے ساتھ لشکر میں حجاز کے طول و عرض سے آنے والے دس ہزار جنگجو شامل ہو چکے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو شاید محمدؐ کے خوف کی وجہ سے اور اگر نہیں تو پھر اس وجہ سے کہ تاریخ میں دائیں طرف کھڑے ہوئے پائے جائیں، صحرا کے کونے کونے سے یہاں پہنچے تھے۔ شاید، یہ دونوں ہی وجوہات تھیں۔ کئی لوگ ایسے بھی تھے، جو محمدؐ کے گرویدہ تھے اور وہ آج صرف اور صرف اسی وجہ سے وہاں محمدؐ کے شانہ بشانہ کھڑے تھے۔ یہ آپؐ کے قریب ترین، انتہائی وفادار لوگ تھے۔

اس کے بعد جو ہوا وہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے اگر وہ پہلے سے طے پایا جا چکا ہو۔ ابو سفیان ایک سفید گھوڑے پر سوار ہو کر مکہ سے نکلے اور ان کا رخ مدینہ کے لشکر کی طرف تھا۔ یہ گھوڑا، محمدؐ کی ملکیت تھا اور ابو سفیان کا یوں محمدؐ کے گھوڑے پر سوار ہونا اس بات کی نشانی تھی کہ انہیں آپؐ کا تحفظ حاصل ہے۔ مومنین میں سے کسی بھی شخص، حتیٰ کہ انتہائی غصیلے آدمی کے لیے بھی اس شخصیت کے بال کو بھی چھونے کی جرات نہیں تھی جو اس گھوڑے پر سوار تھا۔ یہ محمدؐ اور ابو سفیان کے بیچ پہلے سے طے شدہ ملاقات تھی، وہ رابطہ تھا جس کو اب عوامی ریکارڈ کا حصہ بنایا جا رہا تھا۔ اس ملاقات میں ہونے والی بات چیت بھی ریکارڈ کا حصہ بن جائے گی اور آج ہم اوائل دور کی اسلامی تواریخ میں یہاں ہونے والی بات چیت پر صاف صاف، بغیر کسی شک و شائبہ اور اختلاف سے عاری روایات پڑھ سکتے ہیں۔

ان دونوں کے بیچ ہونے والی بات چیت حریفانہ نہیں بلکہ ہنسی مذاق اور چھیڑ چھاڑ معلوم ہوتی ہے۔ ابو سفیان غمگین اور پیشمان ہیں جبکہ محمدؐ اس صورتحال سے محظوظ ہوتے دکھائی دیتے ہیں لیکن شگفتگی، دونوں طرف ہی قائم ہے۔ 'ہائے، اے ابو سفیان۔۔!' محمدؐ نے کہا، 'کیا وہ وقت آ نہیں گیا کہ تم جان لو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں؟'

'میرے باپ اور میری ماں آپؐ پر قربان ہوں، تاوان دیے جائیں!' ابو سفیان نے جواب دیا، 'آپؐ رحم دل اور عالی منش ہیں۔ اگر اللہ کے سوا کوئی معبود ہوتا تو میرا خیال ہے کہ وہ اب تک میرے بچاؤ کو پہنچ چکا ہوتا'۔

محمدؐ کو اس جواب پر مسکراتا ہوا دیکھ پانا، مشکل نہیں ہے۔ یا کم از کم، وہ اندر ہی اندر تو جھوم اٹھے ہوں گے؟ خیر، انہوں نے اس موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ابو سفیان کو پھر چھیڑا، 'اور، کیا وہ وقت نہیں آ گیا کہ تم جان لو۔۔۔ میں ہی خدا کا رسول ہوں؟'۔

'بے شک، میں اس بارے سوچتا رہا ہوں'۔ ابو سفیان نے جواب دیا۔ پھر صیغہ غائب میں آپؐ بارے کہنے لگے، 'وہ جس نے آج اللہ کے ساتھ مل کر مجھ پر غلبہ پایا، وہی تھا جس کو میں نے اپنی پوری طاقت کا استعمال کر کے نکال دیا تھا'۔ اس پر محمدؐ نے شرارتاً ابو سفیان کے سینے پر ٹھونک ماری اور کہا، 'بے شک تم نے ایسا ہی کیا!'۔

پھر وہیں، اسی وقت مکہ کے سردار ابو سفیان نے باقاعدہ اسلام قبول کر لیا۔ بلند آواز میں کلمہ ادا کیا، 'میں گواہی دیتا ہوں کہ کوئی معبود نہیں ہے مگر اللہ اور محمدؐ اس کے رسول ہیں'۔ اس طرح، انہوں نے خود کو اور اپنے شہر کو محمدؐ کی امان میں دے دیا اور جواب میں محمدؐ نے وعدہ کیا کہ جب ان کا لشکر مکہ میں داخل ہو تو مزاحمت نہ کرنے والوں کی جان اور مال کا تحفظ کریں گے۔ یوں، دستور کے عین مطابق مکہ نے باقاعدہ ہتھیار ڈال دیے۔

ابو سفیان کو شہر میں واپسی کا محفوظ راستہ فراہم کر دیا گیا اور وہ مکہ میں داخل ہوتے ہی سیدھا کعبہ کے احاطے میں جا پہنچے اور شکست کا اعلان کرتے ہوئے شرائط بیان کیں۔ تقریر کی، 'قریش کے لوگو! محمدؐ اتنی بڑی طاقت کے ساتھ وارد ہوا ہے کہ تم اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے'۔ انہوں نے دعوی کیا، 'وہ جو میرے گھر میں داخل ہو جائیں، محفوظ رہیں گے۔ وہ جو کعبہ کے احاطے میں آجائیں، محفوظ رہیں گے اور وہ جو اپنے گھر کے اندر رہیں اور کنڈی لگا لیں اور محمدؐ کے خلاف مزاحمت میں ہاتھ اٹھانے سے گریز کریں تو محفوظ رہیں گے'۔

لیکن، قریش میں ان کے قریبی رفقاء کے لیے یہ قبول کرنا مشکل تھا۔ ہند کے لیے تو یہ ناممکن تھا۔ وہ جو اپنی بھیانک ساکھ کے ساتھ، احد میں 'کلیجہ چبانے والی' کے نام کے ساتھ جیتی آئی تھی، یہ سنتے ہی غصے سے اکھڑ گئی۔ ایک دم اٹھی اور جا کر اپنے شوہر کو داڑھی سے پکڑ کر کھینچ تان کرنے لگی۔ بزدلی اور نامردی کے طعنے دیے اور عوام کے سامنے ذلیل کرنے لگی۔ نہ صرف ابو سفیان بلکہ محمدؐ کو بھی گالم گلوچ کرنے لگی۔ قریش کو جوابی لڑائی پر اکساتی رہی اور یوں ہی ہذیان بکتی رہی۔ ابو سفیان کے پاس سوائے اس کو خود سے الگ کرنے کے کوئی چارہ نہیں تھا اور ایک بار پھر اپیل کی، 'اے قریش، تم پر افسوس ہے۔ اپنے آپ کو اس (ہند) کے ہاتھوں برباد مت ہونے دو کیونکہ جو تم پر آنے والا ہے، تم اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے'۔

مکہ کی اکثریت، کچھ اور ہو یا نہیں، حقیقت پسند ضرور تھی۔ زیادہ تر لوگ محمدؐ کے ہاتھوں مکہ کی اس طرح شکست کو تسلیم کرنے سے انکاری تھے یا شاید انہیں یقین نہیں ہو رہا تھا، اب بہر حال معاملے کی سنگینی کو سمجھنے لگے تھے۔ وہ رفتہ رفتہ جان گئے کہ آخر کار، ایسا ہونا طے ہے۔ چنانچہ اکثریت نے اس تلخ حقیقت کے سامنے ہی ہار مان لی۔ مگر، پھر بھی چند گنے چنے لوگ بدستور اڑے رہے۔ وہ اب بھی مزاحمت پر آمادہ تھے۔ محمدؐ کے خیموں میں بھی ان کے پیروکار مکہ میں ایسے لوگوں کی موجودگی سے اچھی طرح واقف تھے، تو وہ محمدؐ سے ان ہٹ دھرم لوگوں کی بابت سوالات اٹھانے لگے۔ اگرچہ ابو سفیان نے شکست تسلیم کر لی تھی اور ہتھیار ڈالنے کی یقین دہانی کرائی تھی لیکن، اگر وہ مکہ میں داخل ہوں اور وہ بجائے حملہ کر دیں، تو کیا ہو گا؟ اگر لڑائی پر مجبور کیا گیا تو اس صورت میں کیا کرنا چاہیے؟ کیا اینٹ کا جواب پتھر سے دینا مناسب ہے؟ لیکن، حرم میں تو لڑائی اور جنگ جدل، خونریزی کی ممانعت ہے، وہ عدم تشدد کو کیسے برقرار رکھیں گے؟ اسی طرح، ڈر تو یہ ہے کہ اگر انہوں نے واقعی کسی کو حرم میں قتل کر دیا تو پھر؟ کیا وہ 'آگ کے ساتھی' بن جائیں گے، جہنمی ہو جائیں گے؟

ان تمام سوالات اور خدشات کے جوابات ایک نئی قرانی آیت کی صورت مل گئے۔ الہام میں کہا گیا تھا کہ وہ ایسا کر سکتے ہیں۔ یعنی، حرم میں تشدد کا سہارا لے سکتے ہیں لیکن صرف اس صورت میں کہ جب کوئی اور صورت باقی نہ ہو۔ یعنی، صرف تب ہی، جب دشمن انہیں کعبہ تک پہنچنے سے روکنے کی کوشش کرے اور صرف تب ہی، اگر وہ حملے کی زد میں ہوں۔ انہیں کسی بھی صورت حملے میں پہل کرنے کی اجازت نہیں تھی، جارحیت سے روک دیا گیا تھا اور مدافعت پر زور دیا گیا تھا۔ کہا گیا کہ وہ مکہ کے لوگوں کو ہتھیار ڈالنے کا پورا موقع فراہم کریں اور جہاں تک ممکن ہو، امن برقرار رکھنے کی کوشش کریں۔ لوٹ مار اور املاک کو نقصان پہنچانے، مال غنیمت جمع کرنے کی کوشش اور لوگوں کو قیدی بنانے کی سختی سے روک لگا دی گئی۔ چونکہ وہ ایک مقدس اور پاکیزہ شہر میں داخل ہونے جا رہے تھے، اس لیے ان سے ادب میں رہ کر سلیقہ برتنے اور انتہائی درجہ مناسب رویہ اختیار رکھنے کی توقع کی گئی تھی۔

اگلے دن، صبح ہوتے ہی یعنی 11 جنوری 630ء کو محمدؐ نے مکہ کو اپنا بنا لیا۔ لشکر کی چار ٹکڑیاں تشکیل دے کر چاروں اطراف سے شہر میں داخل ہونے کا حکم دیا۔ صرف ایک جگہ پر، یعنی شہر کے جنوب میں، لشکر کی جس فوجی ٹکڑی کی سپہ سالاری خالد کر رہے تھے، مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ چند مسلح افراد نے حملہ کر کے ایک گھڑسوار

کو ہلاک کر دیا لیکن فوراً ہی جوابی کاروائی کی گئی اور حملہ آوروں میں سے بارہ کو قابو کر لیا گیا جبکہ کئی دوسرے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ اس روز کو 'فتح کا دن' کہا جاتا ہے۔ فتح کے اصل معنی کشائش یا کھولنے کے ہیں۔ یعنی، اس روز مکہ کو کھول دیا گیا، اس میں 'کشادگی' ہوئی۔ اس لفظ کا غلبے، جیت یا تسخیر کے معنوں میں استعمال تو بہت بات کی بات ہے۔ بہر حال، ہر دو صورت اس روز مدینہ کو مکہ پر واقعی فتح حاصل ہو گئی۔

جب محمدؐ خود شہر میں داخل ہوئے تو مکہ کی گلیاں لوگوں سے بھر گئیں اور وہ ان کے بیچ میں سے گزرتے ہوئے آگے بڑھتے گئے۔ آپؐ کے پیروکار خوشی سے نہال تھے اور جب وہ کعبہ کے احاطے میں داخل ہوئے تو لوگ بے قابو ہونے لگے، نعرے بلند ہو رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے، مکہ کے وہ لوگ جو اپنے گھروں وغیرہ میں پناہ لیے ہوئے تھے، باہر نکلنے لگے اور کعبہ کے گرد پہنچ گئے۔ یہ معلوم نہیں کہ وہ اس وقت پر امید تھے یا ابھی بھی انہیں انتقام کا خوف تھا، لیکن بہر حال مکہ کا تقریباً ہر شخص خود کو باہر نکلنے سے روک نہیں پایا اور یوں ایک سماں بندھ گیا۔ محمدؐ اب دشمن نہیں رہے تھے بلکہ وہ تو ایک ایسا نائر بھی نہیں تھے جسے قریش زبردستی برداشت کیے جا رہے ہوں۔ آج کے دن وہ حکمران تھے۔ وہ شخص جس نے مکہ کے سماج میں حاشیے پر رہ کر پرورش پائی تھی، آج اسی معاشرے کا مرکز بن چکا تھا۔ وہ جو ہمیشہ غیر سمجھا گیا، اجنبیت کا شکار رہا اور باہر کا آدمی کہلوایا جاتا تھا، آج حتمی طور پر اندر کا آدمی، بھیدی اور سیاہ و سفید کا مالک بن گیا۔ محمدؐ اچھی طرح اس کیفیت کو سمجھ سکتے تھے، اس مقام کو جانتے تھے اور اندر ہی اندر انہیں شدت سے احساس ہو رہا تھا، وہ نہال تھے۔ چنانچہ فرط جذبات سے مغلوب ہو کر آگے بڑھے اور حجر اسود پر لاٹھی سے ضرب رسید کی اور دل کی گہرائیوں سے چلائے، 'اللہ اکبر' یعنی۔۔۔ 'اللہ سب سے بڑا ہے'۔ اس نعرے کا جواب میں مجمع نے بھی وہی نعرہ بلند کر کے دیا اور شہر بھر تکبیر سے چلا اٹھا۔ گلیوں کوچوں میں شور و غوغا تکبیروں میں ڈھل گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے مکہ میں اس وقت سوائے اس نعرے کے، کوئی دوسری آواز باقی نہیں رہی۔ اتنا شور ہوا کہ ارد گرد پہاڑیاں بھی 'اللہ اکبر' کے نعروں سے گونج اٹھیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے یہ محمدؐ کی مکہ میں لوٹ آنے کا نہیں بلکہ مکہ کا خود اپنے آپ کو مکہ کے حوالے کرنے، اصل کی طرف واپسی کا دن ہے۔ اور پھر، جب محمدؐ کعبہ کے دروازے کے آگے سیڑھیاں چڑھ کر عوام کے اس ٹھاٹھیں مارتے ہوئے اجتماع سے مخاطب ہوئے تو انہوں نے بھی اپنی تقریر میں یہی پیغام دیا۔

'اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور وہ یکتا ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں'۔ آپؐ نے اعلان کیا، 'اللہ نے اپنا وعدہ پورا کیا اور اپنے بندے کی نصرت کی'۔ یہ بلاشبہ نئی شروعات تھی اور واقعی روشن خیالی کے دور کا آغاز تھا، 'قریش کے لوگو! اللہ نے تم سے جہالت کے دور کا گھمنڈ اور تکبر چھین لیا ہے'، یعنی قبل از اسلام کا تاریک دور جہالت ختم ہو چکا تھا اور اس دن سے گنے چنے چند افراد کا اختیاری اصول اور اقتدار کا استحقاق بھی فسخ ہو جائے گا۔ اسلام میں، سب برابر ہوں گے اور مکہ، اشرافیہ کی جاگیر نہیں رہے گا۔ 'یاد رکھو! نسل کی بنیاد پر مبینہ طور پر کسی بھی قسم کا دعوی، چاہے وہ خون یا مال و دولت کی بنیاد پر بھی قائم کیا گیا ہو، ابھی کے ابھی ختم کر دیا گیا ہے۔ اس کی مثال اب تمہارے پاؤں تلے اڑتی ہوئی دھول جیسی ہے'۔ اور پھر، انہوں نے اپنے سامنے کھڑے ہزاروں کے ہجوم پر نظر دوڑائی۔ لوگ منہ اوپر اٹھائے، سیڑھیوں کی بلندی پر کھڑے آپؐ کی طرف متوجہ تھا۔ انہوں نے لوگوں سے سیدھا سوال کیا، 'قریش کے لوگو! تمہارا کیا خیال ہے کہ میں تمہارے ساتھ کیسا سلوک کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں؟'۔

یقیناً یہ خطیبانہ سوال تھا۔ وہ جانتے تھے کہ لوگ کس چیز سے خوفزدہ ہیں۔ انتقام، غلامی اور مال و اسباب کی ضبطی۔ وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ لوگ اچھی طرح جانتے ہیں کہ محمدؐ اس طرح کے کسی بھی سلوک کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں۔ اگرچہ، یہ خطیبانہ سوال تھا لیکن پھر بھی مکہ کے لوگوں نے یک زبان ہو کر جواب دیا، 'ہم صرف اچھائی کی امید رکھتے ہیں' چلا چلا کر کہنے لگے، 'کیونکہ اے محمدؐ، تم ایک عالی نسب قبائلی بھائی ہو اور تم ایک عالی نسب قبائلی بھائی کے بیٹے ہو!'۔ اگر وہ محمدؐ کی شرافت، کردار اور عالی نسبت کو تھوڑا بہت جانتے تھے تو اس دن وہ پوری طرح جان لیں گے کہ جس شخص کو انہوں نے قبیلے سے ہی نکال دیا تھا۔۔۔ اس کے سلوک کی وجہ سے نہ صرف اس کا خیر مقدم کریں گے بلکہ دل و جان سے، گویا نسبت کی بھیک مانگتے ہوئے قبیلے میں واپس لائیں گے اور 'ہم میں سے ہی ایک' قرار دیں گے۔ انہیں

قبول کر لیں گے۔ یہی نہیں بلکہ ہر طرف سے شور و غوغا بلند ہو گا، وہ نہ صرف محمدؐ کو اپنا رہنما، سالار اور ہادی مان لیں گے بلکہ آپؐ کی رسالت کا بھی کھلے دل سے اعتراف کر لیں گے۔

چنانچہ، محمدؐ نے ہجوم کے چپ ہونے تک طویل توقف لیا اور پھر اعلان جاری رکھا کہ، لوگوں کے بیچ مزید خون خرابہ نہیں ہو گا۔ کہا، 'اللہ نے جس دن آسمان اور زمین تخلیق کیے، مکہ کو اسی روز مقدس بنا دیا تھا اور یہ مقدس شہروں میں سب سے برتر شہر ہے اور قیامت کے دن تک یہ مقدس ہی رہے گا۔ کوئی بھی شخص جو اللہ پر اور روز قیامت پر ایمان رکھتا ہو، اس کے لیے اس شہر میں خون خرابہ کرنا حرام ہے۔ یہ مجھ سے پہلے بھی حرام تھا اور یہ میرے بعد بھی حرام ہو گا'۔ پھر آپؐ نے عام معافی کا اعلان کیا، 'جاؤ! آج تم پر کوئی ملامت نہیں۔ تم آزاد ہو'۔ آزادی کے لیے انہوں نے لفظ 'الطلقاء' استعمال کیا جس کا مطلب 'آزاد کیے گئے' ہیں۔ لیکن، یہ اس لفظ کے عمومی معنی نہیں بلکہ واقعی آزادی کے ہیں جو عربی زبان میں اس لفظ کے حقیقی معنوں سے میل کھاتا ہے۔ یعنی یہ جسمانی بندش جیسے زنجیر، بیڑیوں یا رسیوں سے بندھنے کی نہیں بلکہ ماضی کی تمام تر تاریک، غیر مہذب اور جاہلیت پر مبنی بندشوں، رسوم، رواجوں اور طریق زندگی سے آزادی ہے۔ یہ صرف فتح نہیں بلکہ حریت ہے۔ محمدؐ بتاتے چلے جا رہے تھے کہ، فتح مکہ کوئی معرکہ نہیں ہے جو سر کر لیا گیا ہے بلکہ یہ تو امن اور آشتی کی مدد سے کامیاب ہونے والا انقلاب ہے۔ چنانچہ، لوگوں نے بھی اس انقلاب کو صلح اور صفائی کے ساتھ وہیں کھڑے کھڑے قبول کر لیا۔

اس کے ساتھ ہی، واقعی انقلاب کا جو خواب محمدؐ نے دو سال قبل دیکھا تھا، پورا ہو گیا۔ خطاب کے بعد وہ پلٹے اور کعبہ کی چابی دائیں ہاتھ میں تھامے دروازے کی طرف بڑھے۔ دروازہ غیر مقفل کیا اور اندر داخل ہو گئے۔

حصہ سوئم: رہنما

باب:19

وہ جن کے خواب پورے ہو جائیں، پھر کس چیز کے خواب دیکھتے ہیں؟ پچھلے آٹھ سال تک محمدؐ کی زندگی میں مکہ کی حیثیت ایک سنگ مقناطیس کی سی رہی تھی۔ وہ دعا مانگتے تو مکہ کو مانگتے، خواہش پالی تو دل مکہ کے لیے ہی مچلتا رہا اور پھر جب لڑائیاں لڑیں تو وہ بھی اس لیے کہ مکہ سے نسبت باقی رہے۔ یہی نہیں، جب ہتھیار پھینکنے کی ٹھانی تو بھی سامنے مکہ تھا۔ یہ تو حال کا قصہ ہے، مستقبل کی ہر سوچ کا محور بھی مکہ ہی رہا۔ اور اب، بالآخر مکہ ان کا بن چکا تھا۔ کئی برسوں تک مزاحمت اور جبر برداشت کرنے کے بعد جلاوطن کا خواب پورا ہو چکا تھا۔ 'زیارت اصغر' کے بعد، جب واقعی واپس آئے تو فتح مکہ کی صورت یوں دعوی جمایا کہ اس کی گونج دور تک صحرا کے کونے کونے تک پھیل گئی۔ جب یہ ہو چکا تو پھر عجیب بات ہوئی۔ محمدؐ کے لیے ایک جلاوطن کا خواب پورا ہونے میں خوشی باقی تھی اور نہ ہی جلاوطنی کی مصیبت ختم ہونے پر مسرت تھی۔

اوائل دور کے تاریخ دان اس ضمن میں کچھ بھی نہیں بتاتے۔ ان کی تصانیف میں محمدؐ کی شادمانی اور شدید جوش و خوشی کی ہیجانی حالت کا کہیں بھی ذکر نہیں ہے۔ بجائے یہ کہ جابجا تفاصیل میں بے نیازی اور ایک کمی کا احساس ملتا ہے۔ جیسے کوئی شے گھٹ کر رہ گئی ہے، تخفیف ہو چکی ہے۔ ہم بحیثیت انسان، محمدؐ کی اس کیفیت کو سمجھ سکتے ہیں۔ ساٹھ سال کی عمر کے ایک آدمی کو جب وہ شے اچانک مل جائے، وہ شے جس کی اس نے ایک عرصے سے امید پال رکھی تھی تو وہ اس کامیابی پر کسی من چلے نوجوان کی طرح بغلیں بجانے سے رہا؟ ویسے بھی، یہ ایسا معاملہ ہے کہ جس میں خوشی لازمی طور پر دھندلا جاتی ہے۔ اس لیے کہ محمدؐ کو یقیناً یہ خیال آتا ہو گا کہ اس مقام تک پہنچنے کے لیے انہیں کیا کیا پاپڑ نہیں بیلنے پڑے؟ وہ کس کس طرح کے حالات سے گزرے اور انہیں یہ سب حاصل کرنے لیے کیا نہیں کرنا پڑا؟ ساتھ یہ بھی کہ قصہ ختم تو نہیں ہوا تھا۔ ابھی تو بہت کچھ ہونا باقی ہے، مستقبل کے دیوہیکل تقاضوں کا سامنا تھا۔ وہ جب کعبہ میں داخل ہوئے ہوں گے، یقیناً بھانپ لیا ہو گیا کہ کندھوں پر اس انقلاب کا سارا وزن ایک دم سے ہی آن پڑا ہے اور یہ صرف ایک کامیابی نہیں تھی۔ ایک دم ہی یہ منکشف ہوا ہو گا کہ سہانا خواب تو پورا ہو چکا ہے لیکن جاگنے کا وقت آچکا ہے۔ اب جب اس خواب سے جاگے ہیں تو ایک حقیقت کا سامنا ہو گا جو خاصی پیچیدہ تھی۔

اگر ہم واقعی یہ سمجھنا چاہیں کہ آخر اس دن محمدؐ کے احساسات کیا تھے تو اس کے لیے صرف مثال کے طور پر ایک دوسرے شخص کی یادداشتوں کا سہارا لے سکتے ہیں جسے ان ہی کی طرح کے حالات کا سامنا رہا تھا۔ یعنی، وہ شخص بھی تمام تر ناممکنات کے باوجود اپنی منزل تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ واتسلاو ھاول نامی یہ شخص، ایک ڈرامہ نگار اور مختلف الرائے یعنی غیر مقلد لیڈر رہیں جو بالآخر 1989ء میں چیکوسلواکیہ کے صدر بننے میں کامیاب ہوئے۔ یہ کمیونسٹ دور کے خاتمے کا وقت تھا اور ھاول نے ایک طویل جدوجہد کے بعد ملک میں عام انتخابات کا انعقاد ممکن بنایا تھا۔ 'وہ دور ہل چل کا تھا مگر اس میں ولولہ اور جوش تھا۔ فوری فیصلے کرنے پڑتے تھے اور ہر نئے قدم پر سوچتے اور سمجھتے ہوئے تدبیر سے کام لینا پڑتا تھا'۔ ھاول کی یادداشتوں میں درج ہے کہ، 'یہ تجسس آمیز اور ہیجان خیز تجربہ تھا جس کے دوران گاہے بگاہے، دلیری کا مظاہرہ کرنا تھا اور مہم جوئی کے لیے تقریباً ہمیشہ ہی تیار رہنا پڑتا۔۔۔ ایک لحاظ سے یہ طلسم ہوشربا، الف لیلویٰ داستان معلوم ہوتی ہے۔ کئی موقعے ایسے بھی آئے کہ لگتا، اب کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ ایک فاش غلطی ہمیں تباہی سے دوچار کر سکتی تھی۔ ہم انجانے راستے پر رواں دواں تھے اور یہ خطرناک بھی تھا۔ ہر قدم پر یہ ڈر ہوتا کہ شاید اب گئے یا تب غرق ہوئے۔ پاؤں تلے سے زمین کھسکتی ہوئی محسوس ہوتی۔ لیکن، شکر ہے ایسا نہیں ہوا۔ اور اب، جب

وقت آن پہنچا ہے کہ ہم منزل پر پہنچ چکے ہیں تو یقیناً یہ خوشی اور جشن کا موقع ہے۔ انقلاب، اپنے تمام تر خطرات، خدشات اور اندیشوں کے ساتھ ماضی کا حصہ بن چکا ہے اور ہمارے سامنے امن کے دور میں ایک جمہوری ریاست کی عمارت کھڑی کرنے کی ذمہ داری کا بھاری بھر کم پتھر پڑا ہے جس کو اٹھانا ہی پڑے گا۔ کیا ہماری زمین کی قسمت میں واقعی یہ خوش کن لمحہ آن پہنچا ہے؟ ہماری خوش قسمتی ہے کہ اپنی زندگی میں یہ وقت دیکھ لیا جبکہ ہمارا ملک طویل عرصے سے مطلق العنانی تلے دب کر بسر کرتا چلا آرہا ہے؟'

پھر بھی۔۔۔'حاول مزید لکھتے ہیں،'اب جب کہ یہ عظیم تاریخی لمحہ آن پہنچا ہے تو مجھے ایک عجیب احساس نے آن گھیرا ہے۔۔۔وہ یہ کہ اگرچہ جو مقصود تھا، مل چکا لیکن اس کے باوجود میں تو ایک مغلوب اور دبی ہوئی ریاست کا باشندہ ہوں۔ یہ کیسا احساس ہے کہ جس نے شل کر کے رکھ دیا ہے۔ میں اپنے آپ کو اندر سے خالی محسوس کر رہا ہوں۔ اب ملک بھر میں جاری یہ نشاط اور سرور کی محفلیں، جشن جاری ہے، عجب تناؤ کا باعث بن رہا ہے۔ ابھی تک تو یہ سب خوش کن محسوس ہوتا تھا لیکن ایک دم ہی یہ ہوا ہے کہ وہ توانائی جو محسوس ہوتی تھی، اچانک غائب ہو گئی ہے۔ جیسے کسی نے خون چوس لیا ہو۔ ایسے جیسے کسی نے سارا دم خم نکال دیا ہو۔ مجھے اب شدید تھکن کا احساس ہوتا ہے اور اپنا آپ غیر متعلق اور وجود بے محل، اٹل لگنے لگا ہے۔ وہ کیا کہتے ہیں، شاعری ختم ہو چکی اور نثر شروع ہوا چاہتی ہے۔ اب پتہ چلا کہ ہمارے سامنے کس قدر مشکل اور کئی طرح سے لاحاصل کام کا ایک اونچا پہاڑ کھڑا ہے۔ ہمیں پہلی بار محسوس ہو رہا ہے کہ ہم نے کس قدر بھاری وزن اپنے گدھوں پر لاد لیا ہے۔ سمجھ آئی ہے کہ ہم نے جو منزل چنی تھی، وہ تو ابھی بہت دور ہے۔ جو حاصل ہوا ہے، وہ تو صرف ایک سنگ میل تھا۔ ہاں، یہ تسلی ضرور ہے کہ ہماری منزل، کھوٹی نہیں ہے'۔

یہی وہ جاری کشمکش ہے جو فتح مکہ کے فوراً بعد ہم محمدؐ کے اندر دیکھی جا سکتی ہے۔ بجائے شادمان ہوتے، اچانک ہی تھکن کے بھرپور اور توڑ دینے والے احساس کا شکار ہو گئے۔ وہ اب ایک باغی نہیں رہے تھے، خواب بننے والا بنیاد پرست نہیں بلکہ ایک ایسا عظیم کردار بن چکے تھے جس نے صرف دو دہائیوں میں ناممکن کو ممکن کر دکھایا تھا۔ پھر بھی، ایک آدمی کس قابل ہو سکتا ہے، کتنا توانا ہو سکتا ہے؟ گزشتہ بیس سالوں کا خراج یوں ادا ہوا کہ آپؐ کے چہرے پر لکیریں گہری ہو گئیں، آنکھوں کے گرد حلقے سیاہ ہو چکے ہیں اور پیشانی پر جلد کا رنگ سیاہی مائل ہوتا چلا گیا۔ احد کی لڑائی میں آنے والا زخم تومندمل ہو گیا مگر اس کا نشان اب بھی باقی تھا اور مستقل سر درد کی وجہ سے اب چہرے پر سختی اور تناؤ صاف نظر آنے لگا تھا۔

اب، جب کعبہ میں داخل ہوئے تو یقیناً سمجھ چکے ہوں گے کہ ابھی ان کی خلاصی نہیں ہوئی۔ بلکہ اس نوزائیدہ ریاست کی دیکھ بھال کرنے کی بھاری ذمہ داری آن پڑی ہے اور اس کی قیمت ادا کرنی پڑے گی۔ وقت کے ساتھ یہ خراج بڑھتا ہی چلا جائے گا اور انہیں یہ محصول اپنی صحت کی صورت ادا کرنا پڑے گا۔ وہ جان چکے تھے کہ اب اس کے بعد ان کا جسم، ساتھ چھوڑ دے گا۔

اس موقع پر، محمدؐ نے اپنے آپ کو قابو میں رکھتے ہوئے بھرپور ضبط کا مظاہرہ کیا۔ جیسا کہ مشہور ہے، خطاب کے بعد وہ بتوں کو گراتے اور توڑنے لگے، ان بتوں کی بابت کہا جاتا ہے کہ وہ کعبہ کے اندر نصب تھے لیکن تاریخ میں ان واقعات کا کہیں بھی ریکارڈ موجود نہیں ہے۔ اول تو یہ کہ بت کعبہ میں نہیں بلکہ اس کے ارد گرد جمع کیے گئے تھے اور پھر دوسرا یہ کہ ابن اسحاق اور نہ ہی الطبری نے تحریر کیا ہے کہ جب وہ کعبہ کا دروازہ غیر متقفل کر کے اندر داخل ہوئے تو اس کے بعد کیا ہوا؟ شاید، یہ ایسے ہی ہونا چاہیے۔ یہ محمدؐ کے ذاتی لمحات تھے جو یوں ہی غیر تحریر شدہ رہنے چاہیے۔ وہ اس لیے کہ، ہم صفحے کی بجائے تخیل میں انہیں کعبہ میں داخل ہو کر اپنے پیچھے دروازہ بند کرتے ہوئے دیکھ سکیں اور اندر بھاری پتھر کی موٹی دیواروں کے پیچھو نعرے بلند کرتے ہوئے مردوں اور جذبات میں بے اختیار چلاتی ہوئی عورتوں کا شور دور سے آتا ہوا، دبا ہوا سنائی دے۔ وہ کعبہ کی چار دیواری میں ایک بار پھر ویسے ہی تن تنہا ہوں جیسے کبھی پہاڑی پر ہوا کرتے تھے۔ ہم اپنے تصور میں دیکھ سکیں کہ وہ نیم تاریکی میں آگے کو جھک کر کھڑے، سرگوشیاں کرتے ہوئے، خاموشی سے زیر لب شکرانے کا ورد کر رہے ہیں۔

شاید وہ نہیں جانتے تھے لیکن یہ آخری موقع تھا کہ وہ اپنی مرضی سے یوں تنہا اور اکیلے ہوں گے۔ اس کے بعد انہیں دوبارہ کبھی بھی اس طرح کی خلوت نصیب نہیں ہو گی۔

بہر حال، تاریخ میں یہ ضرور رقم ہے کہ جب وہ کعبہ میں کچھ وقت گزار کر باہر نکلے تو رسمی طور پر کعبہ کو ایک بار پھر خدائے واحد سے منسوب کرنے کا اعلان کیا اور حکم دیا کہ احاطے میں موجود ساری خدائی نشانیوں کو ہٹا دیا جائے۔ ان کے اس حکم کی فوراً ہی تعمیل کر دی گئی۔ اب کعبہ میں کوئی اوتار اور خدائی نشانی باقی نہیں تھی بلکہ عملی طور پر صرف ایک خدا کا راج تھا۔ بعد اس کے، وہ اونٹنی پر سوار ہو کر قریب ہی واقع صفوہ کی پہاڑی پر چلے گئے۔ یہاں انہوں نے مسلسل تین دن گزارے۔ ان تین دنوں میں مکہ کے لوگ اپنے گھروں سے نکل کر ایک قطار میں فرداً فرداً آپؐ کے سامنے پیش ہوئے اور اللہ اور اس کے رسول سے وفاداری کا عہد باندھا اور کلمہ پڑھ کر اسلام قبول کر لیا۔ تیسرے دن کے آخر میں، ہجوم میں ایک عمدہ لباس پہنے ایک عورت بھی نظر آئی جس نے اپنا چہرہ شال سے ڈھانپ رکھا تھا۔ وہ سارا وقت خاموشی سے اپنی باری کا انتظار کرتی رہی اور جب اس کی حاضری ہوئی تو سب کو معلوم ہو گیا کہ وہ کون تھی اور آخر اس نے اپنا چہرہ کیوں چھپا رکھا تھا؟ یہ ابو سفیان کی بیوی ہند تھی۔ وہی ہند جس نے احد کی لڑائی کے بعد حمزہ کا کلیجہ نکال کر چبایا اور لاشے کو مٹی اور دھول میں روند دیا تھا۔

ہند کو محمدؐ کے سامنے دیکھ کر مجمع کو سانپ سونگھ گیا اور سب ہی لوگ بے چینی سے محمدؐ کے ردعمل کا انتظار کرنے لگے۔ وہ ایک دوسرے پر سوار ہو کر آگے پہنچنے کی کوشش کرنے لگے تاکہ جب ان دونوں کے بیچ بات چیت ہو تو وہ پوری طرح سن سکیں۔ 'مجھے اس پر معاف کر دو جو ماضی کا حصہ ہے۔۔۔' ہند نے اس شخص سے معافی کی بھیک مانگی جس کو وہ تین دن قبل بھی لوگوں کے بیچ کھڑے ہو کر غلیظ گالیاں اور صلواتیں سنا چکی تھی، 'اور اللہ تمہیں معاف کرے گا'۔

'تم توہین آمیز اور تہمت انگیز کہانیاں نہیں پھیلاؤ گی'، محمدؐ نے اس کے لیے معیار مقرر کرتے ہوئے جواب دیا۔ ہند نے جواب میں ایک بار پھر معافی مانگی، یا کم از کم زیادتیوں کو بھول جانے کی درخواست کی، 'واللہ، افترا بازی اور تہمت باندھنا بہت بری بات ہے۔ لیکن، بعض اوقات بہتر یہی ہوتا ہے کہ اسے نظر انداز کر دیا جائے'۔

محمدؐ نے اب کی بار ہند کو آزماتے ہوئے کہا، 'تم میری نافرمانی نہیں کرو گی اور اچھائی کے احکامات سے روگردانی نہیں کرو گی' تس پر، ہند کا جواب اگر بے محل اور گستاخ نہ سہی مگر بے صبر ضرور ہے۔ وہ محمدؐ کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی بولی، 'اگر ہم واقعی نافرمانی کا ارادہ رکھتے تو یوں اتنی دیر تک اطاعت کا عہد باندھنے کے لیے انتظار ہی کیوں کرتے؟' لیکن، شاید جلد ہی اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا کہ اس جواب سے بدستور دشمنی اور عداوت کا تاثر مل سکتا تھا۔ اس کا ڈر اپنی جگہ لیکن محمدؐ کا ہند سے انتقام لینے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

قران نے بھی سابقہ دشمنوں سے، جب وہ اطاعت کی حامی بھر لیں تو درگزر کا معاملہ کرنے کی تاکید کی تھی۔ اور اگرچہ ہند نے بوجھل دل کے ساتھ، چار و چار فرمانبرداری کا وعدہ کیا تھا لیکن محمدؐ پھر بھی اسے قبول کر لیں گے۔ عین ممکن ہے کہ محمدؐ نے اس کی صاف گوئی اور بدستور کھرے پن کا لحاظ بھی کیا ہو۔ شاید انہوں نے اس بابت ہند کی بد دلی اور حقارت کو بوجوہ، خاطر میں نہ لانا مناسب سمجھا ہو؟ ویسے بھی یہ پرانے زخموں کو، جو اب تک ناسور بن چکے تھے، مندمل کرنے کا وقت تھا۔ وہ جانتے تھے کہ یہ آسان نہیں ہے۔ زخموں کو بھرنے میں وقت تو لگتا ہی ہے۔ قریظہ کے ساتھ پیش آنے والے سلوک کے بعد ہر شخص جانتا تھا کہ ضرورت پڑنے پر محمدؐ سختی سے گریز نہیں کریں گے لیکن ان کو دوبارہ اسی طرز کی سختی کا مظاہرہ کرنے کی اب چنداں ضرورت نہیں تھی۔ اس کے برعکس، اگرچہ وہ اس موقع پر انتقام لینے پر حق بجانب ہوتے لیکن پھر بھی، اس سے دست بردار ہونے سے وہ لوگوں کے دل جیت سکتے تھے، پرانی دشمنیوں کو دفن کر سکتے تھے اور ایک نئی شروعات کے لیے مضبوط بنیاد رکھ سکتے تھے۔ طاقت کے مزید استعمال سے وفاداریاں جیتنا ناممکن نہ سہی لیکن بہر حال، برحق نہیں تھا۔ مہربانی اور تواضع سے کام لینا ہی درست سمت تھی، اس سے غیر متوقع طور پر انتہائی گہرے اثرات مرتب ہوتے، بہترین نتائج مل سکتے تھے۔

علاوہ ازیں، ہند کو باوجود رویے میں ترشی کے، عوامی سطح پر معاف کر دینے سے اس کے شوہر ابوسفیان پر بھی گہرا اثر ہوتا۔ وہ پہلے سے کہیں زیادہ آپؐ کے قریب آ جاتے اور یہ اتحاد اور امت کے تصور کے لیے انتہائی ضروری بھی تھا۔ محمدؐ نے فتح مکہ کو صرف ایک تسلط یا غلبہ نہیں سمجھا کہ جس میں فاتح ہر شے لوٹ لیتا ہے۔ بلکہ، اسے بٹ جانے والے لوگوں کو دوبارہ سے ایک دوسرے کے ساتھ جوڑنے کا بر محل موقع بنالیا۔ ویسے بھی، یہ تقسیم آپؐ کی مرضی تھی اور نہ ہی پہلی فرصت میں ایسا ہونا چاہیے تھا۔ محمدؐ کا نظریہ، طاقت کے زور پر تسلط قائم کرنا نہیں بلکہ اشتراک اور اتفاق کی ایک ایسی مثال قائم کرنا تھا کہ جس میں ہر شخص اور فریق کی منشا اور مرضی شامل ہو۔ ایسا میل اتحاد جس میں پرانی دشمنیاں خاکستر ہو جائیں اور وہ تمام لوگ جو اپنی من مرضی سے شامل ہونا چاہتے، ان کے لیے امت میں برابری کی سطح پر مواقع اور مقام دستیاب ہوتا۔ چنانچہ، اسی تصور کی بنیاد پر انہوں نے عمر اور دوسرے چیدہ مشیر ان کے اعتراضات کو رد کرتے ہوئے نہ صرف ہند کی معافی کی درخواست قبول کر لی بلکہ ایک قدم آگے بڑھاتے ہوئے مکہ کے چیدہ لوگوں کو شہر کے اعلیٰ انتظامی اور عسکری عہدے بھی سونپ دیے۔ ان اقدامات کے نتیجے میں اختیار حاصل کرنے والوں میں ابوسفیان کے ساتھ ہند کے بطن سے پیدا ہونے والے فرزند، معاویہ بھی شامل تھے۔ محمدؐ کا معاویہ کو عہدہ بخشنا، کئی لوگوں کے لیے چونکا دینے والا فیصلہ تھا۔

دانستہ یا غیر دانستہ، ان اقدامات سے ایک بار پھر محمدؐ مستقبل میں اسلام کی قیادت تشکیل دے رہے تھے۔ بعد ازاں، معاویہ آپؐ کے لیے انشا نگار اور ماتحت کی ذمہ داریاں سنبھال لیں گے اور چند ہی برسوں میں جب اسلامی سلطنت پھیلتی جائے گی تو شام کے مضبوط ترین صوبے کا گورنر مقرر ہوں گے۔ لیکن، ان کا اقتدار میں عروج یہیں ختم نہیں ہو جاتا۔ محمدؐ کے وصال کے انیس سال بعد، جب اسلامی ریاست کے چوتھے اور آخری خلیفہ علی قتل کر دیے جائیں گے تو معاویہ اسلامی سلطنت کی بھاگ دوڑ سنبھال لیں گے اور خلافت امویہ کی بنیاد رکھیں گے جس کا مرکز شام کے شہر دمشق میں ہوا کرے گا۔ اس وقت تک معاویہ کی ماں، ہند کو مرے ایک عرصہ بیت چکا ہو گا لیکن ہند چونکہ اشرافیہ اور حکمران طبقے کی فرد تھی تو یقیناً ہمیشہ ہی اپنے بیٹے کو اس عہدے پر براجمان دیکھنا چاہتی ہو گی۔ وہ آخری دم تک اپنے بیٹے اور نسل کو یوں ہی اقتدار کا جائز حقدار سمجھتی رہی اور ایک عرصے بعد دوبارہ اختیار حاصل کرنا، اس کے لیے ہمیشہ جائز رہا ہو گا۔

اگرچہ مکہ کے کئی نامی گرامی لوگوں کو اختیاری فائدہ تو نہیں پہنچا لیکن کم از کم ان کی جان بخشی ہو چکی تھی اور وہ اسی پر مطمئن تھے۔ بلکہ، انتقامی روش کا مکمل خاتمہ کر دیا گیا۔ مگر محمدؐ کے اس رویے کے باوجود بھی، بارہ لوگ ایسے تھے جو بہر حال، اپنے کیے کی سزا پانے کے روادار ٹھہرائے جائیں گے۔ ان میں چار عورتیں بھی شامل تھیں جن کی شاعری اور ہجو، پریشان کن حد تک تشویش ناک اور توہین آمیز تھی۔ نہ صرف یہ کہ وہ بدستور ایسی شاعری تخلیق کرتی رہیں بلکہ وقت کے ساتھ ان کی نفرت میں اضافہ ہی ہوتا چلا گیا۔ ان کے علاوہ، ایک شخص اور بھی تھا، جس کے دل میں محمدؐ کے لیے سوائے کدورت اور بغل کے کچھ نہیں تھا۔ یہ عکرمہ بن عمرو، یعنی محمدؐ کے دیرینہ دشمن ابوجہل کے فرزند تھے۔ محمدؐ نے حکم جاری کیا کہ ان بارہ لوگوں کو، وہ کعبہ کے غلاف میں ہی کیوں نہ لپٹے ہوں، اگر معافی کی بھیک نہ مانگیں تو قتل کر دیا جائے۔ ان میں سے آدھوں نے یوں ہی کیا، یعنی معافی مانگ کر اسلام قبول کر لیا۔ اطاعت کرنے والوں میں عکرمہ بھی شامل تھے۔ اس کا محمدؐ پر گہرا اثر ہوا۔ انہوں نے عکرمہ کو مکہ میں ایک کلیدی انتظامی عہدے پر فائز کر دیا اور یوں دیرینہ دشمنیوں کو مٹانے کی ایک اور مثال قائم کر کے امہ میں یگانگت اور اتحاد کو فروغ دیا۔

جب یہ سب ہو چکا تو لگنے لگا کہ شاید قصہ تمام ہو گیا۔ وہ شہر جس سے محمدؐ کو نکال باہر کیا گیا تھا، اب رسمی طور پر ان کی 'ملکیت' بن چکا تھا۔ مکہ نے ایک عرصے تک جس شے کی مزاحمت کی تھی، اب اسے قبول کر لیا تھا اور خوش آئند بات یہ تھی کہ مجموعی طور پر یہ عمل پر امن طریقے سے مکمل ہو گیا تھا۔ پھر بھی، ظاہر ہے جیسا کہ ایسے معاملات میں ہوتا ہے، واقعات چلتے ہی رہتے ہیں اور قصہ ختم نہیں ہوتا۔ ایسا کوئی موقع نہیں آتا کہ جہاں ہاتھ جھاڑ کر پیچھو ہٹ جائیں اور قطعی اعلان کر دیا جائے کہ،

'یہ لو، ہو چکا۔ بات ختم ہو گئی'۔ ہوا یوں کہ مکہ میں داخل ہونے کے صرف دو ہفتے بعد ہی محمدؐ کو ایک نئی لڑائی کا سامنا کرنا پڑا۔ اب کی بار، یہ لڑائی قریش سے نہیں بلکہ قریش کے دشمنوں سے لڑنی پڑی۔

کئی خانہ بدوش بدو قبائل جو مل کر ایک بڑا اتحاد قائم کیے ہوئے تھے، ہوازن کہلاتے تھے۔ ہوازن کی تمام تر وفاداریاں، جنوب مغرب میں ساٹھ میل کے فاصلے پر واقع پہاڑی سلسلے کے شہر طائف کے ساتھ تھیں۔ ان کے نزدیک، مکہ کی شکست سے قریش پہلے سے زیادہ مضبوط ہو چکے تھے۔ چونکہ محمدؐ خود بھی قریش سے تعلق رکھتے تھے، انہوں نے سوچا کہ جیسا کہ روایتی طور پر ہوتا ہے، آپؐ کی مثال نئے سربراہ حکومت، قریشی سردار یا بادشاہ کی سی تھی۔ یقیناً، مکہ کے بعد ان کی نظریں طائف پر مرکوز ہوں گی۔ ویسے بھی، طائف اور اس شہر کے اتحادی، محمدؐ سے کسی بھی طرح اچھے سلوک کی توقع نہیں رکھتے تھے۔ صرف دس سال پہلے، ابوطالب کی وفات کے بعد، انہوں نے محمدؐ کو تحفظ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ انہیں لگتا تھا کہ محمدؐ بالضرور ہی انتقام لیں گے۔

اس سے پہلے کہ محمدؐ طائف کا رخ کریں، ہوازن نے پہلے ہی جنگی حکمت عملی کے تحت مکہ پر دھاوا بول دینے کا فیصلہ کر لیا۔ ہوازن کے تیس سالہ خوبرو سردار، مالک کی سپہ سالاری میں ہزاروں جنگجو ایک بڑے لشکر کی صورت مکہ کی طرف روانہ ہوئے۔ اعتماد اور ثابت قدمی کا حال یہ تھا کہ اس لشکر میں عورتوں اور بچوں کے ساتھ ساتھ مال مویشی کو بھی شامل کیا گیا تھا۔ بعض روایات میں درج ہے کہ چالیس ہزار سے زیادہ اونٹ لشکر کا حصہ تھے۔ کئی لوگوں کے مطابق یہ خالصتاً بیوقوفی تھی۔ ایک عمر رسیدہ جنگجو سردار، جو خود لڑنے سے تو قاصر تھا لیکن پھر بھی اونٹ پر لادی ہوئی پالکی میں بیٹھا اس لشکر میں شریک تھا، اس نے یوں ہر شے کو خطرے سے دوچار کرنے پر توجہ دلائی۔ لیکن، مالک نے نہایت اعتماد کے ساتھ اس کو جھڑک دیا اور اعتراضات کو یکسر نظر انداز کر دیا۔ یہ لشکر بمشکل آدھے راستے تک پہنچا ہو گا کہ دوسری جانب سے محمدؐ کی سپہ سالاری میں مدینہ اور مکہ کے مشترکہ لشکر نے انہیں حنین کے چشمے پر جا لیا۔ یہاں گھمسان کی لڑائی ہوئی اور طائف کے لشکر کو بھاری نقصان اٹھانا پڑا۔ ہوازن کا لشکر تتر بتر ہو چکا تھا اور آدھے جنگجوؤں کو عورتوں، بچوں اور مال مویشی سمیت قیدی بنا لیا گیا۔ جبکہ، مالک اور بچ جانے والے جنگجو پیچھے ہٹتے گئے۔ یہاں تک کہ بالآخر طائف شہر کی دیواروں کے پیچھے پناہ لینی پڑی۔ شہر کے دروازے بند کر قلعہ بند ہو گئے اور محاصرے کی تیاری کرنے لگے۔ حنین کی فتح ایک تلخ شیریں تجربہ ثابت ہو گی۔ قیدیوں میں ایک بوڑھی عورت تھی، جو سب کی توجہ کا مرکز بن چکی تھی۔ یہ عورت بار بار اصرار کرتی کہ وہ محمدؐ کی رشتہ دار ہے۔ یہ کیسے ممکن تھا؟ ایک بدو عورت محمدؐ کی رشتہ دار کیسے ہو سکتی تھی؟ پہرے پر فائز فوجیوں کے لیے یہ بات ناقابل اعتبار تھی۔ ان کے خیال میں، یہ عورت صرف اور صرف اپنے کنبے کے لیے رعایت حاصل کرنے کے لیے ڈھونگ رچا رہی ہے۔ لیکن، جب اس عورت کو اس کے کنبے کے افراد سمیت گھسیٹ کر محمدؐ کے سامنے پیش کیا گیا تو اس نے کمال بے ساختگی سے انہیں مخاطب کیا، 'او اللہ کے رسول! میں شائمہ ہوں۔ تمہاری رضاعی بہن، مجھے بھول گئے؟ میں وہی ہوں جس نے تمہیں اس وقت پالا تھا جب تم بچپن میں ہمارے یہاں بسر رکھتے تھے'۔

کیا یہ واقعی شائمہ تھی؟ آخری بار جب محمدؐ نے شائمہ کو دیکھا تھا، اس کے بعد پچاس برس گزر چکے تھے۔ محمدؐ کو یاد آیا کہ حلیمہ کا کنبہ ہوازن کے اتحاد کا حصہ بن چکا تھا لیکن پھر بھی۔۔۔ کیا یہ کمزور، بوڑھی عورت جس کے سر میں چاندی اتری ہوئی تھی، واقعی شائمہ تھی؟ شائمہ جسے وہ جانتے تھے، وہ تو ایک نوعمر اور نوخیز لڑکی ہوا کرتی تھی۔

'اور اس بات کا کیا ثبوت ہے؟' محمدؐ نے زوردار آواز میں پوچھا۔ جواب میں اس عورت نے آستین چڑھا کر بازو دکھایا، 'یہ دیکھو، میرے بازو پر ابھی تک زخم کا نشان ہے'۔ پھر تفصیل بتائی، 'یاد ہے جب میں تمہیں بغل سے لگائے وادی سرار میں گلہ بانوں کے پیچھے چل پڑی تھی اور تم نے مجھے یہاں دانتوں سے کاٹ ڈالا تھا، میں چلا کر رہ گئی تھی؟'

یہ سچ تھا۔ محمدؐ کے سامنے ان کی رضاعی بہن کھڑی تھی۔ اتنے عرصے بعد وہ حلیمہ کی بیٹی کو دیکھ رہے تھے۔ شائمہ، جس کے ہاتھوں میں وہ پلے تھے اور اس کو ستایا کرتے تھے۔ وہ بچاری، بکریوں کے پیچھے بھاگتے، اونٹوں کو دوڑاتے، سارا سارا دن آپؐ کو بغل سے لگائے پھرتی رہتی تھی۔ ایک ذرا خود سے الگ نہ کرتی کہ وہ

کھو نہ جائیں، ہر وقت ڈر لگائے رکھتی۔ یہ شائمہ ہی تو تھی۔ اور اب، اتنے سالوں بعد وہی شائمہ ان کے سامنے کھڑی رحم کی بھیک مانگ رہی تھی۔ جنگ و جدل اور فتح و مفتوح کا یہ کھیل، انہیں کہاں لے آیا تھا؟ یہ کب ختم ہو گا؟ حجاز کے نئے سربراہ ریاست کو بچپن کی یادوں نے آن گھیرا اور اچانک ہی ایک خیال کوندا کہ وہ یتیم لڑکا جو کبھی شائمہ کے بازوؤں میں بل کھایا کرتا تھا، اس نے زندگی میں کیا کیا نہیں دیکھ لیا؟ اس نے کس قدر طویل مگر غیر معمولی سفر طے کر لیا ہے اور وہ کتنی دور نکل آیا ہے۔ اپنے آنسوؤں پر قابو رکھتے ہوئے، محمدؐ نے بے ساختہ اپنا چوغہ اتار کر زمین پر بچھا دیا اور شائمہ سے کہا کہ وہ ان کے پاس، پہلو میں بیٹھ جائے۔ وہ دیر تک اس کے پاس چپ چاپ بیٹھے رہے اور پھر اسے کہا کہ چاہے تو وہ ان کے ساتھ، انہی کے گھر چل کر رہے۔ اور اگر نہیں تو اپنے خاندان کے ساتھ، مرضی کے جتنے اونٹ چاہے، لے کر اپنی سرزمین میں واپس جا سکتی ہے۔ چونکہ شائمہ کا قالب بدو تھا، اس نے شہر کی بجائے، صحرا میں واپس چلے جانے کو ترجیح دی۔

ہوازن کے باقی لوگ بھی شائمہ کے شکر گزار تھے کہ اس کی وجہ سے ان کی جان بخشی ہو گئی۔ قیدیوں کو رہا کر دیا گیا لیکن انہیں اونٹوں سے ہاتھ دھونا پڑا۔ محمدؐ نے مال مویشی کو اپنے لشکر میں بانٹ دیا۔ مکہ کی نامی گرامی شخصیات جیسے ابو سفیان اور ان کے فرزند معاویہ کے حصے میں سو سو، مکہ کے اتحادی بدو سرداروں میں سے ہر ایک کو پچاس اور اسی طرح ہر شخص کو اس کی حیثیت کے مطابق، جیسا کہ ابن اسحاق لکھتے ہیں، 'جن کی حمایت ناگزیر تھی، مال غنیمت عطا کیا'۔ اگر ابھی تک کسی کو یہ شبہ تھا کہ شاید محمدؐ کی اطاعت اور فرمانبرداری سے سابقہ دشمنان نقصان میں رہے تھے تو وہ اب مال غنیمت کی اس بے میل تقسیم سے ہوا ہو گیا۔ جہاں مکہ کے لوگ خود کو صرف ایک فاتح کے ماتحت کی حیثیت سے دیکھا کرتے تھے، انہیں پتہ چل گیا کہ محمدؐ نے تو انہیں برابری کی سطح پر لا کھڑا کیا ہے۔ انہیں غیر متوقع طور پر فائدہ پہنچا تھا اور ان کے قد کاٹھ میں کئی گنا اضافہ ہوا تھا۔ چنانچہ، وہ اب پہلے سے بھی زیادہ محمدؐ کے وفادار ہو گئے اور دل و جان سے آپؐ کے گرویدہ ہوتے چلے گئے۔

محمدؐ نے یہاں سے طائف کا رخ کیا، لیکن جلد ہی بھانپ لیا کہ وقت اور سیاسی ہواؤں کے زور کی وجہ سے جلد ہی مالک اور اس کے حواریوں کا معاملہ خود بخود حل ہو جائے گا۔ چنانچہ، بجائے طائف جیسے مضبوط قلعے کا محاصرہ جاری رکھتے، واپسی کا قصد کیا۔ ویسے بھی، مکہ جیسے مرکزی شہر کے ہتھیار ڈالنے کے بعد طائف کی مزاحمت کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔ وہ جلد ہی گھٹنے ٹیک دیں گے کیونکہ ان کا مکہ کے بغیر گزارا مشکل تھا۔ ایسا ہی ہوا اور مالک کو بھی دس مہینوں کے اندر ہی یہ بات اچھی طرح سمجھ آ گئی۔ طائف نے رسمی طور پر محمدؐ کے اختیار کو تسلیم کر لیا اور داخل اسلام ہو گئے۔

اگرچہ مالک کے تمام اندازے غلط ثابت ہوئے لیکن اس کی ایک بات، بہر حال درست تھی۔ اگر محمدؐ چاہتے تو وہ خود کو مکہ کی سرداری پر فائز کر سکتے تھے۔ صرف مکہ ہی کیا، چاہتے تو پورے خطہ حجاز کی بادشاہی کا دعوی کر لیتے۔ ان کے پیچھو قبائل صف در صف کھڑے تھے، وفاداروں کی ایک عظیم الشان فوج تھی اور ہر شخص بڑھ چڑھ کر اطاعت کر رہا تھا۔ اس خطے کی یادداشت میں شاید ہی کبھی کسی شخص کو اتنی پذیرائی ملی ہو، اس قدر اختیار اور طاقت ہاتھ آئی ہو۔ اس کے باوجود، جیسا کہ عام طور پر فاتحین کی روش ہوا کرتی ہے، محمدؐ نے ایسا کچھ بھی نہیں کیا۔ انہوں نے کعـبہ کے ساتھ ہی کوئی بڑی مسجد اور نہ ہی کوئی محل تعمیر کیا۔ نہ ہی جیسے ریاست میں ہوا کرتا ہے، عدالت قائم کی اور نہ ہی دربار لگایا۔ یہاں تک کہ انہوں نے مکہ کو دار الخلافہ بھی قرار نہیں دیا۔ جلد ہی لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ ریاستی ادارے، دربار اور بادشاہی تو دور کی بات، محمدؐ کا یہاں بسر کرنے کا بھی ارادہ نہیں ہے۔ آپؐ کا لشکر چار فوجی دستوں میں تقسیم ہو کر شہر مکہ میں داخل ہوا تھا، دو ماہ بعد ہی شہر سے نکل گیا۔ محمدؐ کے پیچھو پیچھو، اس لشکر کا رخ دو سو میل دور، مدینہ کے نخلستان کی طرف تھا۔

ایسا لگتا ہے کہ محمدؐ کے لیے یہ کڑا فیصلہ تھا۔ اگر ان کا دل ایک شہر کے ساتھ جڑا تھا تو روح دوسری بستی میں مقید تھی۔ یہ بتانا بھی مشکل ہے کہ دل کس شہر میں تھا اور روح کہاں کی تھی؟ اگر مکہ وحدانیت کی جائے پناہ تھا تو دوسری طرف مدینہ واحدانیت کے علم بردار، محمدؐ کی پناہ گاہ تھی۔ اگرچہ مکہ جائے پیدائش تھی لیکن مدینہ میں انہیں نئی زندگی عطا ہوئی تھی۔ اگر ایک شہر میں ان کے خواب نے جنم لیا تھا تو یہ دوسرا شہر تھا جس میں اس خواب نے تعبیر پائی تھی۔ بلاشبہ، دونوں بستیوں میں سے ایک کو دوسری پر فوقیت دینا، ان کے بیچ انتخاب کرنا ناممکن تھا۔

باوجود اس کے، محمدؐ نے مکہ میں ٹھہرنے کا کوئی عندیہ بھی نہیں دیا۔ بظاہر، جیسے ہوا کرتا ہے، بے چینی ظاہر کی اور نہ ہی وہ مچل رہے تھے۔ مکہ میں ٹھہرنا تو دور کی بات، انہوں نے اس شہر کو نئی اسلامی ریاست کی انتظامیہ کا مرکز بھی نہیں بنایا۔ وہ گھر تو پہنچ چکے تھے لیکن شاید، اتنے سالوں کے بعد گھر ان سے کوسوں دور ہو چکا تھا۔ جیسا کہ اب جا کر مکہ بے شک ان کا بن چکا تھا لیکن وائے انسان، وہ اب مکہ کے نہیں رہے تھے۔ نفسیات کی زبان میں یوں کہیے کہ، یوں واپس آ کر انہوں نے خود کو واپسی کی ضرورت اور طلب سے ہمیشہ کے لیے آزاد کر لیا تھا۔ بلاشبہ، مکہ ہمیشہ ہی ویسا رہے گا۔ حرمت کا شہر، محترم اور عالی مقدس جگہ رہے گی۔ حنین سے واپس آئے تو مکہ پہنچتے ہی، حسب دستور عمرہ ادا کیا اور واضح کر دیا کہ وہ یہاں بسر رکھیں یا نہیں، مکہ کی تعظیم جوں کی توں، ماضی کی ہی طرح برقرار رہے گی۔ لیکن، اس کے ساتھ ہی آبائی شہر، سنگ مقناطیس میں صرف اور صرف پندرہ راتیں گزارنے کے بعد ہی واپسی کا سفر باندھ لیا۔ اب وہ یہاں سے جائیں گے تو پھر، صرف ایک بار ہی یہاں واپس آئیں گے۔

مدینہ سے تعلق رکھنے والے محمدؐ کے چند پیروکار، یعنی انصار اس بات پر خاصے آزردہ تھے کہ حنین کے بعد مال غنیمت کا بڑا حصہ مکہ کے نامی گرامی سرداروں اور ان کے حواریوں میں بانٹ دیا گیا تھا۔ اب محمدؐ نے واپسی کا رخت سفر باندھ کر واضح کر دیا کہ بھلے مکہ کی اشرافیہ اور ان کے قبائلی بھائی بندوں کے ہاتھ اونٹ اور مال دولت آئی تھی لیکن مدینہ کے حصے میں وہ خود، بنفس نفیس چل کر آ رہے تھے۔ انہوں نے اپنا آپ ان کے حوالے کر دیا تھا۔ 'تم مجھ سے ہو اور میں تم سے ہوں۔ میں تمہارے بیچ رہوں گا اور تمہارے ہی بیچ مر جاؤں گا'۔ آٹھ سال پہلے، محمدؐ نے یہی وعدہ کیا تھا اور وہ اپنی زبان پر بدستور قائم تھے۔ چنانچہ، جب وہ مدینہ کے لیے روانہ ہوئے تو سفر سے قبل مدینہ کے لوگوں کو جمع کر کے ایک بار پھر اعادہ کیا، 'کیا تم اس بات پر آبلہ پا ہو کہ اس زندگی کی اچھی چیزیں تمہارے ہاتھ سے نکل گئیں؟ وہ چیزیں، جن کی مدد سے میں نے لوگوں کو اسلام پر قائم رکھنے پر راضی کیا ہے؟ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے کہ دوسرے لوگوں کے ہاتھ ریوڑ اور بھتے آئے ہیں جبکہ تم اپنے ساتھ اللہ کے رسول کو لے کر جا رہے ہو۔ کیا یہ گھاٹے کا سودا ہے؟'

اگرچہ، قران میں استعمال ہونے والا لفظ 'فتح'، بعد میں 'غلبے' یا 'جیت' کے مجازی معنوں میں استعمال کیا جانے لگے گا لیکن محمدؐ واقعتاً، اس لفظ کے حقیقی معنوں پر یقین رکھتے تھے اور یہ نازل بھی اسی پیرائے میں ہوا تھا۔ یعنی، 'فراخی' اور 'کشائش' مراد تھی۔ آپؐ کے لیے یہ لغوی اور مجازی، دونوں صورتوں میں ایک ہی بات تھی۔ جہاں دروازے بند کر دینے سے لوگ ایک دوسرے سے بچھڑ جاتے ہیں، بندشوں کی وجہ سے اندرون اور بیرون ایک دوسرے سے کٹ کر رہ جاتے ہیں، وہیں نئی راہیں نکالنے، در کھولنے سے مواقع پیدا ہو سکتے تھے۔ اس طرح، لوگ ایک دوسرے سے جڑ سکتے تھے۔ اندرون اور بیرون کو یکجا کیا جا سکتا تھا۔ غیر، غیر نہ رہتے اور یہ غیریت کا سارا قضیہ بھی ختم ہو جاتا۔ جیسا کہ کبھی انہوں نے اس سے پہلے بھی، پرانے دور کے دروازے خود پر بند کر دیے تھے اب انہوں نے اپنے آگے نئے دور کا دروازہ وا کر دیا۔ مکہ اور مدینہ کو کچھ اس طرح اکٹھا کر لیا کہ یہ زمان و مکان کے پیمانوں سے کہیں اوپر کا معاملہ بن گیا۔ اب یہ 'مکہ یا مدینہ'، یا پھر 'مکہ اور مدینہ' کی بحث نہیں رہی تھی، ایک ہی گھر ہو چکے تھے۔ پہلے وہ ایک گھر میں واپس آئے تھے اب وہ اسی طرح دوسرے گھر میں دوبارہ واپس آئیں گے۔

ہم یہ کبھی بھی معلوم نہیں کر پائیں گے کہ کیا محمدؐ کو واقعی ادراک تھا کہ انہوں نے فتح کے بعد خود کو صرف مکہ تک محدود نہ رکھنے کا جو فیصلہ کیا تھا، یعنی جو نیا دروازہ وا پس مدینہ چلے جانے کی صورت کھولا تھا، وہ بعد ازاں انتہائی بڑے پیمانے پر تبدیلی اور اسلامی ریاست کے پھیلاؤ، فتوحات کا پیش خیمہ بن جائے گا؟ اور یہ کہ وہ خود نہیں بلکہ ان کے رفقاء، یعنی آپؐ کے بعد خلفاء پے در پے، غیر متوقع طور پر عظیم الشان کامیابیاں حاصل کر لیں گے؟ 630ء میں، یہ صرف محمدؐ ہی نہیں تھے جنہوں نے جلاوطنی ختم کر کے، واپسی مکمل کی تھی۔ حجاز سے باہر نکل کر مشرق وسطیٰ پر نظر دوڑائیں تو معلوم ہو گا کہ اس برس، اس پورے خطے کے منظر نامے پر آپؐ کی مکہ آمد اور فتح کی مثال کہاوتی ریڈار پر صرف ایک باریک نکتے کی سی تھی۔

اسی برس، جب مارچ کے مہینے میں وہ مدینہ واپس پہنچ گئے تو وہاں سے صرف سات سو میل دور، شمال میں کہیں بڑے واقعات رونما ہو رہے تھے۔ بازنطینی شہنشاہ ہرقل بالآخر رسمی طور پر، اپنی فوجوں کے ساتھ یروشلم کے معبد میں دوبارہ داخل ہو چکا تھا اور ہر طرف 'حقیقی صلیب' کا چرچا تھا۔ اگر اس وقت، ایک ہی برس اور تقریباً آگے پیچھو پیش آنے والے ان دونوں واقعات یعنی فتح مکہ اور ہرقل کی یروشلم میں واپسی کا تقابلی جائزہ لیا جائے تو یہ بتانا مشکل نہیں کہ، منظر نامے پر زیادہ اہمیت کس واقعے کی تھی؟ ہرقل کی فتوحات کے سامنے، محمدؐ کی کامیابی دھندلائی ہوئی نظر آتی ہے۔ لیکن، جلد ہی تاریخ اتنی تیزی سے پلٹا کھائے گی کہ آخر کار، مکہ کی دھندلی فتح، یروشلم کے معبد میں 'حقیقی صلیب' کے گونجتے ہوئے نعروں کو دبا دے گی۔ تاریخ کے اوراق میں بازنطینی شہنشاہ محمدؐ کے سامنے پانی بھرتا ہوا نظر آئے گا۔

پچھلے دس برسوں میں ہرقل اور محمدؐ، دونوں نے ہی جد وجہد کی تھی اور ان دونوں کی اپنے یہاں کڑی مشقت میں غیر معمولی مماثلت نظر آتی ہے۔ 620ء میں، جب محمدؐ کو پہلی بار مکہ میں واقعی مخالف کا سامنا کرنا پڑا تھا، اس وقت ہرقل بھی شکست کے دہانے پر پہنچ چکا تھا۔ فارسی افواج دھڑلے سے ایک کے بعد دوسری آبادی کو روندتی ہوئیں قسطنطنیہ کے دروازوں پر کھڑی تھیں۔ یروشلم پہلے ہی فارسیوں کے قبضے میں تھا اور اب بازنطین یعنی روم میں دنیائے مسیحیت کے مرکز کو محاصرے کا سامنا تھا۔ یہی نہیں بلکہ شہر میں قحط پیدا ہو چکا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہرقل کو گھٹنے ٹیکنے پڑے اور امن کی استدعا کرتے ہوئے شرمناک شکست قبول کرنی پڑی۔ شکست اور ہتھیار ڈالنے کی شرائط یہ تھی کہ ہرقل اپنے شہر سے تقریباً اتنے ہی عرصے کے لیے خود ساختہ جلاوطنی اختیار کر لے گا، جتنی مدت کے لیے محمدؐ مکہ سے دور رہے۔ لیکن محمدؐ کی ہی طرح ہرقل نے جلاوطنی کے دوران قوت جمع کی اور پھر ایک بار پھر، صفر سے اپنی فوج کو دوبارہ جمع کیا اور آخر کار، دوبارہ فارس کے مقابلے میں آن کھڑا ہوا۔

جیسا کہ مکہ اور مدینہ کے بیچ 622ء سے لے کر 628ء تک جاری چپقلش کے نتیجے میں کئی لڑائیاں لڑی گئیں، بازنطینی اور فارسی بھی اسی طرح ان ساوں کے دوران ایک دوسرے کے ساتھ گتھم گتھا رہے۔ 627ء میں جب یہاں محمدؐ نے ابوسفیان کے بڑے لشکر کو خندق کی لڑائی میں نیچا دکھایا، اسی برس ہرقل نے بھی نینوی کے مقام پر فارس کی افواج کو غیر متوقع طور پر شکست سے دوچار کیا۔ قدیم شہر نینوی کا علاقہ آج کل شمالی عراق کا حصہ ہے۔ اس خلاف توقع جیت کے صرف تین ماہ بعد ہی ہرقل کی افواج نے فارس کے مرکز مدائن پر دھاوا بول دیا اور خسرو کے محل پر قبضہ کر لیا۔ مدائن، مستقبل میں جہاں بغداد شہر تعمیر ہو گا، اس کے قریب ہی واقع تھا۔ اس پیش رفت پر خسرو کو خاصی ہزیمت اٹھانی پڑی اور شاہی گھرانے میں ناچاقی پیدا ہو گئی، جس کا نتیجہ اپنے بیٹے کے ہاتھوں خسرو کی ہلاکت کی صورت برآمد ہوا۔ بعد ازاں جب مقتول شہنشاہ خسرو کا بیٹا، یعنی جواں سال خسرو، ہرقل سے امن کی بھیک مانگ رہا تھا، انہیں دنوں میں یہاں محمدؐ اور ابوسفیان کے بیچ حدیبیہ کے مقام پر صلح کے معاہدے پر دستخط کیے جا رہے تھے۔ فرق یہ ہے کہ ہرقل نے خسرو کی درخواست مسترد کر دی تھی۔ بازنطینی شہنشاہ نے امن کی یہ استدعا رد کرتے ہوئے پیش قدمی جاری رکھی اور فارسیوں کو مصر، شام، فلسطین اور اناطولیہ سے نکال باہر کیا اور اگست 629ء میں، دوبارہ سے قسطنطنیہ پر قبضہ جما لیا۔ جب محمدؐ یہاں مکہ میں عمرہ ادا کر رہے تھے، اس وقت ہرقل یروشلم کی زیارت پر نکلا ہوا تھا۔ یہاں مکہ میں محمدؐ کے ہاتھوں واحدانیت کا بول بالا ہو رہا تھا تو وہاں ہرقل 'حقیقی صلیب' کا جائز وارث بن کر یروشلم پہنچ چکا تھا۔

بازنطینی تاریخ میں کہیں پر بھی اس بات کا ثبوت نہیں ملتا کہ ہرقل اپنے زمانے میں خطہ عرب کے جنوب میں رونما ہونے والی اس پیش رفت سے باخبر تھا۔ ویسے بھی، وہ حجاز کی خبر کیوں رکھتا؟ اس خطے کی یادداشت میں، تاریخی لحاظ سے عربوں نے ہمیشہ ہی خود کو الگ تھلگ رکھا تھا بلکہ وہ کٹے ہوئے تھے۔ شمالی سلطنت میں جاری کشمکش اور سیاسی منظر نامے میں ان کا کردار ثانوی رہا تھا۔ بازنطینیوں کی نظر میں حجاز کی حیثیت ادنی تھی اور وہ اسے مضافاتی علاقہ شمار کرتے تھے، جس کا اس خطے کے عظیم کھیل میں کوئی حصہ نہیں تھا۔ حجاز کے صحرا میں آنے والی تبدیلیوں سے کسی کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا تھا اور یہ ہمیشہ سے یوں ہی رہا تھا۔

عرب آپس میں ہی کھپتے رہتے تھے۔ لیکن، اب کی بار یہاں حالات کے اس قدر تیزی سے بدلنے کی کسی کو توقع نہیں تھی، اس سے پہلے تک بازنطینی اور نہ فارسی عربوں کے یوں اکٹھے ہونے کی امید رکھتے تھے۔

اگرچہ بازنطینیوں کو حجاز کے مرکز میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کی چنداں خبر نہیں تھی لیکن یہ بات طے ہے کہ محمدؐ اور ان کے مشیران شمال میں پیدا ہو رہی صورتحال سے کسی طور بھی بے بہرہ نہیں تھے۔ 'رومی قریب کی سرزمین میں مغلوب ہو گئے ہیں'۔ یہ قرانی آیت فارس کے عارضی عروج اور بازنطینیوں کو پیش آنے والی شکست پر تبصرہ کرتی نظر آتی ہے۔ اور آگے چل کر پیشن گوئی ہے کہ، 'اور اپنی اس مغلوبیت کے بعد چند سال کے اندر وہ غالب ہو جائیں گے۔' اگلی آیت میں، قرانی آیات خدا کی مرضی کچھ یوں بیان کرتی ہیں کہ، 'اللہ نصرت عطا فرماتا ہے جسے چاہتا ہے اور وہ زبردست اور رحیم ہے'۔ چنانچہ، جب ہرقل کی یروشلم میں داخلے کی خبر پہنچی تو گویا اس قرانی آیت کی پیشن گوئی ثابت ہو گئی۔ نو سال بعد ہی، قرانی آیت کہ 'اللہ نصرت عطا فرماتا ہے جسے چاہتا ہے' کی ایک نئی تشریح سامنے آئے گی، جب عمر کی سپہ سالاری میں عرب افواج یروشلم میں داخل ہوں گی۔ یروشلم پر عربوں کا یہ قبضہ اس بدنصیب شہر کی تاریخ میں اس طرح کا یہ سب سے پرامن واقعہ ہو گا اور بعد اس کے، مشرق وسطیٰ میں پہلی بار اسلام واقعی ایک نئی طاقت تسلیم کر لیا جائے گا۔

انتہائی پرہیزگار اور دین دار مسلمانوں کو محمدؐ کے بعد، صرف ایک ہی دہائی کے اندر امت کی پے در پے فتوحات اور انتہائی تیزی سے پھیلنے والی اسلامی ریاست کو دیکھ کر واقعی خدا کی مرضی اور ذوالجلال کی مہربانی، یعنی 'نصرت' نظر آئے گی۔ یہاں تک کہ آج بھی، جدید تاریخ دان ورطہ حیرت میں ڈال دینے والی اس تاریخی پیش رفت کی عقلی توجیہ پیش کرنے میں بے بس نظر آتے ہیں۔ تقریباً مستشرقین اس ضمن میں جب کچھ نہیں سوجھتی تو گھسے پٹے نظریے کا سہارا لیتے نظر آتے ہیں کہ یہ 'قبائلیوں کی ضرورت تسخیر' سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ حالانکہ، سچ یہ ہے کہ اس طرح کے تہذیبی اور تمدنی مفروضے نہ صرف قابل اعتراض بلکہ غیر ضروری بھی ہیں۔ مفروضوں کی بجائے ایک حقیقت پسند سیاسی تجزیہ اس معاملے کی کہیں بہتر تشریح اور توضیح پیش کر سکتا ہے۔ جو یہ ہے کہ اگرچہ ہرقل نے فارسی سلطنت کی بنیادوں کو اس قدر کھوکھلا کر دیا کہ قریب تھا کہ وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی لیکن وہیں طویل اور مسلسل تصادم کے باعث اس کی اپنی ریاست کا بھٹا بھی بیٹھ چکا تھا۔ باوجود یہ کہ ہرقل نے یروشلم میں داخل ہوتے ہوئے واقعیت اور انتہائی عقیدت کا مظاہرہ کیا تھا، یعنی صلیب کی نئی اونچ کا دعویٰ کیا تھا لیکن حقیقت یہ تھی کہ بازنطینی شہنشاہی کا دور دراز علاقوں میں عیسائیت کے پرچارک کی حیثیت سے حالت پتلی ہو چکی تھی۔ عیسائیت میں نئے فرقے اور گروہ جنم لے رہے تھے، جن کے باعث نئے قضیے جنم لیتے رہتے تھے۔ یہ قضیے بڑھ کر مذہبی تنازعات کی شکل اختیار کر لیتے اور یوں روز بہ روز عیسائی سلطنت کی بنیادیں کھوکھلی ہوتی جا رہی تھیں اور مسیحی ریاست کی عمارت کی دیواریں، شکستہ ہو چکی تھیں۔ یہ دونوں عظیم سلطنتیں، یعنی بازنطین اور فارس ایک دوسرے کو تقریباً تباہی کے دہانے پر لے آئی تھیں اور دونوں ہی طرف ریاستی طاقت اور اختیار سلب ہو چکا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک طرف بازنطین (یعنی روم) اور دوسری طرف فارس میں، اگرچہ دونوں کے مرکز ابھی تک گھمنڈ میں تھے، ان کی اپنی حالت تو قدرے بہتر تھی لیکن بیچ کے علاقے، یعنی مشرق وسطیٰ میں طاقت کا ایک خلا پیدا ہو گیا۔

طاقت کا یہ خلا کسی نہ کسی طور تو پورا ہونا ہی تھا اور ایسا ہونا لازم تھا۔ یہ موقع، یعنی اس خلا کو پر کرنے کا موقع، عربوں کے سوا کس کے پاس تھا؟ خطہ حجاز و عرب میں اسلام کے جھنڈے تلے جمع ہونے والے قبائلی اب اس قابل تھے کہ وہ اس خلا کو پر کر لیتے۔ ان کے لیے تاریخ میں پہلی بار، صحیح معنوں میں طاقت اور اختیار حاصل کرنے کا یہ نادر موقع تھا۔ اگرچہ اب تک فارس اور بازنطین دونوں کے لیے ہی حجاز کی حیثیت نامعلوم ملک یا غیر متحقق خطے کی سی تھی لیکن اب جب یہی عرب ان کے گلے پڑیں گے تو صریحاً ان کے خیالات، ان قبائلیوں کے بارے ویسے نہیں رہیں گے جیسے کہ ہمیشہ سے چلے آ رہے تھے۔ محمدؐ کی پیدائش سے پہلے بھی مکہ کے تجار نے پہلے سے ہی شمال میں واقع بڑے شہروں میں تجارت کے ذریعے جڑیں پکڑ لی تھیں۔ قریش کے نامی گرامی تاجروں کی مصر میں جائیدادیں، دمشق میں کوٹھیاں، فلسطین میں زرعی اراضی اور عراق میں کھجور کے باغات تھے۔ یعنی ایک عرصے سے وہ ان علاقوں میں اپنے مفادات کا سامان اور تحفظ، پہلے ہی کرتے

آئے تھے۔ لیکن، اب یہ صرف مالی اور تجارتی مفادات کی بات نہیں رہی تھی۔ اس شمالی خطے میں جیسے جیسے سیاسی ڈھانچہ شکست و ریخت کا شکار ہوا، عملی طور پر یہ کسی بھی نئی نویلی اور تازہ دم ریاست کے لیے کھلی دعوت بن گئی کہ وہ گویا صرف ہاتھ بڑھا کر یہاں پر اپنا تسلط قائم کر سکتے تھے۔

اور پھر، یہی ہوا۔ 634ء تک عرب افواج دمشق کے دروازوں پر دستک دے رہی تھیں۔ 636ء میں عرب بحرالجلیل کے جنوب مشرق میں یرموک کے مقام پر ہرقل کو حتمی شکست سے دوچار کر دیں گے۔ 638ء میں یہ فارسیوں کو جنوبی عراق میں قادسیہ کے مقام پر ناکوں چنے چبوا رہے ہوں گے۔ اس کے صرف ایک سال بعد عمر کی سپہ سالاری میں اسلامی افواج یروشلم میں داخل ہو جائیں گی اور 640ء تک یہ مصر اور اناطولیہ کے بھی حاکم بن جائیں گے۔ محمدؐ کے انتقال کو ابھی ایک صدی بھی پوری نہیں ہو گی کہ اسلامی سلطنت فارس اور بازنطین، دونوں ہی سلطنتوں کے علاقوں پر اپنی حاکمیت قائم کر لیں گے۔ بلکہ، یہ اس سے بھی کہیں دور تک پھیلی ہوئی عظیم الشان ریاست ہو گی جس کی سرحدیں مغرب میں سپین اور مشرق میں ہندوستان تک پھیلی ہوں گی۔ اس سلطنت کا مرکز جدید خطوط پر حال ہی میں تعمیر کیا جانے والا، عظیم شہر بغداد ہوا کرے گا۔

مندرجہ بالا حقائق کے بارے سوچ کر ہی دل بیٹھوں اچھلنے لگتا ہے۔ یہ کس قدر دل لبھانے والی داستان ہے؟ ذرا سوچیے، اگر اس روز، یعنی جنوری 630ء میں، فتح مکہ کے موقع پر جب محمدؐ کعبہ کے اندر تن تنہا کھڑے تھے تو تصور کریں، اگر محمدؐ واقعی جانتے ہوں کہ یہ تاریخ میں قید کر دیے جانے کے لائق لمحہ ہے۔ یہ طے ہے کہ وہ اب یقینی طور پر دیکھ سکتے تھے کہ ان کے اور اللہ کے نام پر اکٹھے ہو جانے والے یہ قبائلی لوگ، جو ہمیشہ سے ہی نظر انداز کیے جاتے رہے ہیں، ان کی قسمت بدلنے والی تھی۔ انہیں ایک نئی شناخت مل چکی تھی اور وہ اب صرف حجاز نہیں، مشرق وسطیٰ بھی نہیں بلکہ پوری دنیا کے سٹیج پر اپنی حیثیت منوانے کے لیے پر پھیلانے والے تھے۔ لیکن، شاید وہ یہ سب نہیں دیکھ سکیں گے۔ جیسا کہ قران میں انہیں بار بار یاد دہانی کرائی جاتی رہی تھی کہ وہ 'صرف ایک انسان ہیں'، اس عمر تک پہنچ کر ان کا اپنا کمزور پڑتا ہوا جسم اب اشارہ دے رہا تھا کہ، 'وہ واقعی ایک انسان ہیں'۔ ہر شے کے باوجود، تصور کی عظمت اور خیال کی سرپٹ دوڑ کے باوجود، بالآخر بشری کمزوری ان کو آن لے گی۔ لیکن، حقیقت پر مبنی یہ صورتحال محمدؐ کے لیے پریشانی کا باعث نہیں تھی۔ کیونکہ اگر وہ واقعی جانتے تھے کہ اس الہامی تحریک کے باعث، دنیا کے منظر نامے پر جتنی بڑی ہلچل پیدا ہونے والی تھی تو یہ ان کے بس کی بات نہیں، بلکہ خدا کی مرضی تھی۔ تو، جب وہ کعبہ کے اندر نیم تاریکی میں چپ چاپ کھڑے تھے تو ان کے لیے یہ موقع، وہ لمحہ ہی کافی تھا۔ اس لمحے، آپؐ کی حالت یہ رہی ہو گی کہ ایمان اور یقین تو پہلے ہی اپنی حدوں کو چھو چکا تھا اب مستقبل بارے وہ بھی خاصے پر امید ہو چکے تھے۔ چونکہ اب ان کے اندر امید نے گھر کر لیا تھا، الہام بھی ان کو یقین دلا رہا تھا تو شاید انہیں محسوس ہوا ہو کہ اب بس، بعد اس کے، وہ مکہ میں رہیں یا مدینہ جا کر بسر کر لیں، بالآخر ان کی زندگی میں سکون آ جائے گا۔ لیکن، ہم دیکھیں گے کہ ایسا نہیں ہوا۔ وائے قسمت، ان کے نصیب میں ابھی بھی آرام کی کوئی سبیل نہیں تھی۔

باب:20

لوگوں کے لیے اب محمدؐ کی زندگی کا ہر لمحہ معنوی لحاظ سے کیسے تو سفر پر روانگی کے لیے تیار بحری جہاز میں لدنے والا ناگزیر سامان بن جائے گا۔ یعنی، ہر بات ہی اہم ٹھہری۔ ان کے انداز، اطوار، باتوں اور افعال حتیٰ کہ اعضا سے اشاروں پر بھی ہر وقت نظر رکھی جائے گی۔ ایک ایک لفظ اور حرکت کو لوگ نوٹ کریں گے۔ وہ کچھ بھی کہتے، کرتے یا کہا جاتا کہ کہا ہے یا مشہور ہو جاتا کہ انہوں ایسا کیا ہے، لوگ اس کو پلو سے باندھ لیتے، اپنا لیتے۔ ہر چیز عوامی دلچسپی کا سامان بن چکی تھی۔ وہ بہتیرا سادگی پر زور دیتے اور طمطراق، نمود و نمائش سے گریز کرنے کی تاکید کرتے لیکن لوگ تھے کہ ارد گرد زور و شور اور ٹھاٹھ باٹھ سے شاہی دربار لگائے رکھتے، باز ہی نہ آتے۔ چنانچہ آپؐ ہر دوسری بات پر لوگوں کو ٹوکنے لگے، روک لگاتے نظر آنے لگے۔ انشاء نگار اور شاعر آپؐ کی مدح سرائی کرتے، معاشی اور سیاسی مشیران ان

کی باتوں پر کان دھرے رکھتے اور جہاں موقع ملتا بحث شروع کر دیتے۔ دربان دن اور رات سائلوں اور عرض داشت پیش کرنے والوں کے ہجوم کو روکنے کی ناکام کوشش کرتے تھک جاتے۔ یہ تو خیر دوسرے لوگوں کا حال تھا۔ محمدؐ کے انتہائی قریبی رفقاء میں بھی رسائی اور ان کے ہمراہ زیادہ سے زیادہ وقت گزارنے اور قریب رہنے پر حسد بڑھنے لگا۔ وہ ساز باز کرتے اور ساٹھ گانٹھ کر ایک دوسرے کو پیچھے دھکیلنے کی ہر ممکن کوشش کرتے، ٹانگیں کھینچنے لگے۔ ہر شخص طاقت کے مرکز میں نمایاں رہنے میں جتا رہتا۔ یہ تو رفقاء تھے۔ محمدؐ کی مایوسی اس لیے بھی بڑھ گئی کہ ان کی بیویوں کی روش بھی دوستوں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھی۔

وجہ یہ نہیں تھی کہ محمدؐ کثیر الازواجی کے باعث دباؤ کا شکار تھے اور اس لیے بیزار تھے کہ دن بدن تناؤ اور تقاضے بڑھتے ہی جا رہے تھے۔ وہ الگ معاملہ تھا۔ یہ انہیں پورا اور برابر وقت دینے کی پوری کوشش کرتے، ہر بیوی کے ساتھ باری آنے پر رات بسر کرتے۔ لیکن، بیویاں بھی کیا کرتیں؟ ان کی رہائش، مسجد کی دیوار کے ساتھ قطار میں بنے معمولی کمروں میں تھی، جہاں تخلیہ ممکن ہی نہیں تھا۔ فتح مکہ سے پہلے بھی، ان کمروں کے آس پاس دن بھر سائلین کا تانتا بندھا رہتا۔ عام لوگ وجہ بے وجہ محمدؐ کی بیویوں کے پاس پہنچ جاتے اور ان سے سفارش کی درخواستیں کرتے، ان کے معاملات میں ثالث بن کر مصالحت کی گزارش کرتے۔ اکثر لوگ، منع کرنے کے باوجود بھی باز نہ آتے اور ان خواتین کی مرضی کے بغیر ہی آس پاس منڈلاتے رہتے۔ عرضیاں ڈالتے، التجاؤں اور مناجات سے زچ کیے رکھتے۔ دو سال قبل اس ضمن میں پردے سے متعلق نازل ہونے والی آیات کا بھی کچھ خاص اثر نہیں ہوا تھا۔ الہامی آواز نے صاف صاف تاکید کی تھی، 'اے لوگو! نبی کے گھروں میں بلا اجازت نہ چلے آیا کرو نہ کھانے کا وقت تاکتے رہو ہاں اگر تمہیں کھانے پر بلایا جائے تو ضرور آؤ مگر جب کھانا کھالو تو منتشر ہو جاؤ اور باتیں کرنے میں نہ لگے رہو تمہاری یہ حرکتیں نبی کو تکلیف دیتی ہیں مگر وہ شرم کی وجہ سے کچھ نہیں کہتے اور اللہ حق بات کہنے میں نہیں شرماتا'۔ حق بات یہ تھی کہ، 'نبی کی بیویوں سے اگر تمہیں کچھ مانگنا ہو تو پردے کے پیچھے سے مانگا کرو۔ یہ تمہارے اور ان کے دلوں کی پاکیزگی کے لیے زیادہ مناسب طریقہ ہے۔۔۔'۔

پردے کا اس وقت تک حکم صرف یہی تھا۔ یعنی، ہر کمرے کے دروازے پر ململ یا سوتی کپڑا لٹکا دیا جائے جس سے اور کچھ نہیں تو نام کو 'پرائیویسی' یا خلوت مل جاتی۔ پھر، یہ حکم صرف محمدؐ کی بیویوں کے لیے مخصوص تھا اور تاریخ میں اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ آپؐ کا ارادہ اس حکم کو باقی عورتوں پر سختی سے نقاب یا پردے کی صورت لاگو کرنا ٹھہرا ہو۔ قران میں دونوں ہی جنسوں، یعنی مرد اور عورتوں کے لیے شرم و حیا اور حجاب پر زور دیا جائے گا لیکن کہیں بھی حقیقی معنوں میں حجاب یا نقاب کی ویسی زبردستی نہیں ہو گی جیسی ہم آج دیکھتے ہیں۔ قران میں حجاب کا ذکر موجود ہے لیکن وقت کے ساتھ اس کا مفہوم غلط رسمی کا شکار ہو گیا۔ 'نقاب'، 'حجاب' یا 'پردے' سے مراد ایک پتلی چادر تھی، اسلام میں بھی جب اس کا استعمال جب واقعی عام ہوا تو محمدؐ کو گزرے کئی دہائیاں بیت چکی تھیں۔ اس نئے زمانے میں بھی، لوگوں نے اس کو حکم الہی نہیں بلکہ 'سٹیٹس' یا رتبے اور حیثیت کا معاملہ بنا دیا۔ قدیم زمانے میں اشوریہ اور فارس کی وہ عورتیں جو اشرافیہ سے تعلق رکھتی تھیں، جن کا امراء میں شمار ہوتا تھا، اسی طرح کی شال یا چادر تفریق کی غرض سے اوڑھا کرتیں تاکہ باقی عورتوں سے ممتاز اور الگ نظر آئیں۔ یہی حال، محمدؐ کے بعد اسلامی دنیا میں بھی ہوا، زمانے کے ساتھ حکومت میں اشرافیہ اور امراء کا عمل دخل بڑھتا گیا۔ جلد ہی شاہانہ طرز عام ہوتا گیا۔ عورتوں پر بھی اس طرز زندگی کا خاصا اثر ہوا اور رفتہ رفتہ حجاب کا تصور زمانہ قدیم کی امیرانہ طمطراق بن کر رہ گیا۔ جس طرح آج کل مہنگے سیلون میں ناخنوں، ہاتھوں کی صفائی اور رنگائی یا مشہور برانڈ کے جوتے استعمال کرنا عوامی سطح پر حیثیت کا اشاریہ سمجھا جاتا ہے، ویسے ہی اس طبقے کے لیے یہ خیال عام ہے کہ یہاں عورتیں سخت جان مشقت اور گھریلو کام کاج سے مبرا ہیں۔ ویسے ہی تب بھی، اشرافیہ کی عورتیں بھی نت نئے فیشن کرتی تھیں اور حجاب یا نقاب ان میں سے ایک تھا۔ نوکروں کی بہتات ہوا کرتی تھی اور وہ خود اطمینان سے بیٹھی رہتیں اور چونکہ انہیں خود کسی بھی کام کاج میں ہاتھ ڈالنے کی حاجت نہیں تھی، سارا وقت پر تکلف اور بھڑکیلے، زرق برق لباس پہنے یہاں وہاں براجمان رہتیں۔ ظاہر ہے، فرصت کے یہ پہناوے ہر لحاظ سے غیر افادی اور غیر عملی ہوا کرتے ہیں۔

پھر، یہ بات خاصی عجیب بھی لگتی ہے۔ اشرافیہ اور امراء کی بالادستی، چاہے وہ نسلی ہو یا دولت کے بل بوتے پر قائم کی گئی ہو، محمدؐ نے اپنی تمام زندگی اس امتیازی حیثیت اور تفریق کی مخالفت کی تھی۔ لیکن، طرز معاشرت اور حکومت کی جس شکل کا آپؐ کو سامنا تھا اور تحریک کے دوران اس کا بھرپور لیکن پرخطر سامنا کیا، قدیم جمہوریت کی ابتدائی شکل کہلائی جاتی ہے۔ جمہوریت کی اس شکل میں چند لوگوں کی اجارہ داری ہوتی ہے، جیسے مکہ میں قریش کی تھی۔ جب یہ طریق فسخ ہو گیا تو ستم ظریفی یہ ہے کہ محمدؐ کا دکھایا نظام بھی آگے چل کر نسل در نسل شاہوں اور سلاطین کے موروثی نظام شہنشاہی میں بدل گیا۔ ملوکیت میں ڈھل گیا۔ امہ، یعنی برابری کا تصور دھندلاتا گیا اور جلد ہی طبقات میں نہ صرف فرق بڑھتا چلا گیا بلکہ کئی نئے طبقات نے بھی جنم لیا۔ جس طرح اس سے پہلے یہودیت میں ربیوں اور عیسائیت میں پادریوں کی شکل میں طبقات نکل آئے تھے، اسلام میں بھی خالصتاً مردوں کے زیر اثر ایسا ہی ایک طبقہ، ملائیت سامنے آگیا۔ تینوں ہی مذاہب میں، ان طبقات کی حیثیت 'مذہبی اشرافیہ' کی بن کر رہ گئی۔ یہ مرد حضرات ایمان کے پہرے دار بن گئے۔ ان کا کام اسلام کے بنیادی اصولوں کی تشریحات بیان کر کے اسلام کو ایک 'ضابطہ حیات' کی شکل دینا ٹھہرا۔ چنانچہ، یہ بھی ہوا کہ یہ جید اشخاص اپنی قدامت پسندی کو قران پر تھوپنے سے بھی باز نہیں آئے۔ وقت کے ساتھ جوں جوں شریعت اور شرعی قوانین ایک شکل اختیار کرتے گئے، اسی طبقے نے، حجاب یا پردے کے معاملے میں بھی خصوصی تصور کو عمومی خیال کرتے ہوئے تمام عورتوں کے لیے لازم قرار دے دیا۔ یہ کسی حد تک قران سے میل بھی کھاتا ہے لیکن ستم یہ ہوا کہ زمانوں کی دھول پھانکتے پھانکتے سختی بڑھتی گئی اور آج ہم پردے کی ایسی شکل بھی دیکھتے ہیں، یعنی برقعہ، جس میں ایک عورت، پردے سے زیادہ بوری میں بند نظر آتی ہے۔ یقیناً محمدؐ کی بیویوں میں سے کسی نے بھی یہ سوچا تک نہیں ہو گا کہ 'ململ کی چادر لٹکا کر پردہ کرنے' یا 'باہر نکلیں تو' منہ پر چادر گرانا' ایک دن وہ شکل اختیار کر لے گا جو آج دنیا میں جابجا عجب صورتوں میں نظر آتا ہے۔ عائشہ تو یقیناً اس بات پر بھڑک اٹھتیں۔ اگرچہ، محمدؐ کی منکوحہ بیوی کی حیثیت سے انہوں نے دوسری عورتوں سے ممتاز رہنے، اور بالخصوص اس ضرورت کے تحت کہ لوگ ان کی نجی زندگی کا ہی کچھ خیال کریں، جسے قران میں کہا گیا کہ 'پہچانی جاؤ اور ستائی نہ جاؤ'، شال یا چادر کو قبول کر لیا ہو گا۔ لیکن کیا وہ اسی پردے کو بعد ازاں اس طرح استعمال ہوتے دیکھ کر، یعنی اس کے ذریعے عورتوں کو پس منظر میں دھکیلنے، خاموش کرانے یا ٹھکانے کے حربوں کی صورت قبول کر لیتیں؟ عائشہ، جو ساری عمر ایک جدا شناخت اور حیثیت بنانے کی کوشش میں رہیں، وہ نمود داری پر یقین رکھتی تھیں، یقیناً خواب و خیال میں بھی گمنامی کی اس طرز کو برداشت نہ کرتیں۔

بہر حال، اس وقت ململ کے پردے اور نہ ہی چادریں اوڑھنے سے کوئی فرق پڑا۔ لوگ باز آئے اور نہ ہی حجاب کی بدولت امتیازی حیثیت کا کچھ اثر ہوا۔ بلکہ، خود گھر کے اندر بھی، ہر طریقہ استعمال کر کے دیکھ لیا مگر محمدؐ کی ازدواج میں مسلسل جاری رہنے والی کشمکش نہ رک سکی۔ صورتحال یہ بن چکی تھی کہ بیگمات کے بیچ باری آنے پر محمدؐ کی شب بسری بھی دیکھتے ہی دیکھتے ایک 'جنس' بن گئی، جس پر لین دین کیا جا سکتا تھا۔ یعنی، اکثر ایک بیوی اپنا وقت کسی مہربانی اور احسان کے عوض دوسری بیوی کے حوالے کر دیتی۔ گھر کے باہر تو لوگوں کے ساتھ بہتیری کوشش کر لی لیکن یہ بحث گھر کے اندر بھی کسی طور ختم ہونے کا نام نہ لیتی کہ آخر محمدؐ کی پسندیدہ بیوی کونسی ہے؟ اور پھر ان میں سے جو بھی ہے، اس تک رسائی کیسے ہو اور آخر کار، اس کی سفارش سے اپنے مسائل کیونکر حل کیے جائیں؟ ہوتے ہوتے یہ ہوا کہ مکہ سے واپسی کے بعد، چند ماہ کے اندر ہی حالات خاصے بگڑ گئے۔ محمدؐ کے لیے برداشت کرنا مشکل ہو گیا۔ پھر وہی ہوا، جس کا ڈر تھا۔ ایک دن ایسا آیا کہ عملی طور پر انہوں نے تمام ہی بیویوں سے علیحدگی اختیار کر لی۔ اب بجائے ان کے ساتھ وقت گزارتے، وہ راتیں مسجد کی چھت پر ایک چھوٹے سے کمرے میں بسر کرنے لگے۔ چہار سو یہ بات جنگل میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ افواہیں گردش کرنے لگیں کہ محمدؐ نو کی نو بیویوں کو طلاق دینے کا سوچ رہے ہیں۔

محمدؐ کی برہمی کی فوری وجہ یہ بتائی گئی کہ ان کی بیویاں، ماریہ نام کی باندی سے حسد رکھتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ باندی آپؐ کو اسکندریہ کے قبطی عیسائیوں کے رئیس کی طرف سے تحفہ میں ملی تھی۔ محمدؐ نے اسے مدینہ سے باہر، مسجد اور دوسری بیویوں سے دور ایک مکان دلا رکھا تھا اور اکثر ہی اس کے یہاں چلے جایا کرتے تھے۔ وقت کے ساتھ آپؐ کا ماریہ کے یہاں آنا جانا بڑھ گیا اور انہوں نے جس قدر اس معاملے کو ہر چیز سے دور، علیحدہ رکھنے کی کوشش کی تھی، اتنی ہی شدت سے

پورے نخلستان میں اس بارے باتیں اور قصے مشہور ہونے لگے۔ بالخصوص، جب ان کی بیویوں کو بھنک لگی تو غیر متوقع طور پر، وہ سب کی سب پہلی بار کسی معاملے پر اکٹھی ہو گئیں اور عوامی سطح پر آپؐ کے ایک باندی کے یہاں زیادہ وقت گزارنے پر گلہ شکوہ کرنے لگیں اور دن بدن معترض ہوتی گئیں۔ بسا اوقات تو تلخی بھی ہو جاتی۔

بعض روایات میں درج ہے کہ ماریہ نے ایک بیٹے کو بھی جنم دیا تھا جس کا نام ابراہیم رکھا گیا۔ اگر یہ سچ تھا تو اس سے محمدؐ کے نکاح میں تقریباً تمام ہی مستورات کے غم و غصے میں اضافہ ہو گیا ہو گا۔ ان کے لیے تو یہ سوچ ہی ناقابل برداشت رہی ہو گی کہ ایک غلام لڑکی نے محمدؐ کو وہ دے دیا ہے جو ان میں سے کوئی بھی نہیں دے پائی تھی۔ ایک بیٹا؟ جائز وارث؟ یہ ایسی چیز تھی جس کی کمی محمدؐ کی زندگی کا روگ بن چکی تھی۔ علاوہ ازیں، اس معاشرے میں بسر کرتے ہوئے، باقی بیویوں کی حیثیت ادنی رہ جاتی اور ان کے لیے دکھ کی بات یہ تھی کہ ان کا رتبہ اور مقام، ایک باندی کے سامنے ثانوی ہو چکا تھا۔ ان میں سے کسی کے لیے بھی یہ بات ناقابل قبول تھی۔

کئی لحاظ سے یہ عجیب بھی معلوم ہوتا ہے۔ محمدؐ کی تمام منکوحہ بیویوں میں سے ایک بھی، بچے کو جنم نہیں دے سکی تھی۔ لیکن اب یہ عیسائی لڑکی جس کا نام بھی عیسیٰ کی ماں مریم (مریم، ماریہ، مرہ، میری) سے مشابہت رکھتا تھا، وہ کامیاب ہو چکی تھی؟ یہاں پر قدیم علامت اور اس حوالے سے تاریخی معنی خیزی عیاں ہے۔ پھر، محمدؐ اور ماریہ کا بیٹے کا نام بھی اس شخص کے نام پر رکھا ہوا ملتا ہے جسے قران نے 'پہلا حنیف' کہا تھا۔ ابراہیم کو انجیل میں بھی وحدانیت کا موجد گردانا گیا تھا۔ ان کا تعارف توحید پرستوں کے جد امجد کی حیثیت سے جانا مانا تھا۔ یوں، ان استعاروں اور اشاروں کو ملائیں تو کہا جا سکتا ہے کہ محمدؐ کی اولاد میں مشرق وسطیٰ کے عیسائیوں کے لیے دلچسپی پیدا ہو سکتی تھی۔ پھر، امکانات اور قیاس کے اس گھن چکر میں معاشرتی طور پر بھی یہ بات خاصی جم کر بیٹھتی ہے کہ جنم لینے والا ایک لڑکا تھا اور وہ اس سماج میں، جہاں مردوں کا راج تھا، کہیں بڑا اور خاصا گہرا کردار ادا کرنے کے قابل بن سکتا تھا۔

اگرچہ قران نے بارہا تاکید کی تھی کہ لڑکیاں بھی لڑکوں کی ہی طرح برابری کے لائق، قیمتی اور قابل صد عزت و احترام ہیں۔ لیکن، یہ انسانوں کی ایسی بستی تھی جہاں مقامی رسوم، رواج اور بندشوں سے فرار تقریباً ناممکن تھا۔ چنانچہ، یہی ہوا۔ عام لوگوں میں ابراہیم کی پیدائش سے محمدؐ کی رجولیت اور مردانگی بڑھ کر ثابت ہو گئی۔ اس ضمن میں روایات میں درج حقائق تو یہی ہیں لیکن آگے چل کر اس سے بھی کہیں سفاک اور کٹھور حقیقت کا پتہ چلتا ہے کہ جیسے کئی سال پہلے، خدیجہ کے بطن سے جنم لینے والے لڑکے قاسم کی شیر خواری میں موت واقع ہو گئی تھی، ابراہیم بھی بہت دیر تک جانبر نہیں ہو پائے۔ فتح مکہ کے تھوڑے عرصے بعد ہی وہ بھی طفولیت کی عمر میں چل بسے۔

یہ ابراہیم کے بچھڑنے کا غم تھا جس نے محمدؐ کو یوں بیویوں سے علیحدگی پر مجبور کیا یا وہ اب اس دباؤ سے فرار حاصل کرنا چاہتے تھے جو بیویوں نے مل کر آپؐ پر بڑھانا شروع کر دیا تھا؟ بیگمات کا اصرار یہ تھا کہ وہ ماریہ سے مکمل طور پر علیحدگی اختیار کر لیں۔ لیکن، ہوا یہ کہ بالآخر محمدؐ کی برداشت جواب دے گئی اور انہوں نے تمام بیویوں سے مکمل علیحدگی اختیار کر لی۔ ان کے شب و روز مسجد کی چھت پر، گوشہ نشینی میں بسر ہونے لگے۔ ان کے یوں ہر چیز سے منہ پھیر لینے کے سبب مدینہ میں افراتفری اور ہول پھیل گیا۔ بیویوں سے یوں منہ موڑنے کا مطلب یہ تھا کہ امت میں طاقت اور اختیار کا سارا نظام داؤ پر لگ جاتا۔ محمدؐ کے سارے نکاح اتحاد اور امت کی یگانگت کا مظہر، علامت تھے۔ چاہے یہ آپؐ کے انتہائی قریبی مشیران ابوبکر اور عمر، جو بالترتیب عائشہ اور حفصہ کے والد تھے، ان سے تعلق کی بات ہو یا مکہ میں سابقہ دشمن ابوسفیان کی بیٹی ام حبیبہ کا معاملہ ہو، محمدؐ کسی بھی صورت ان اشخاص کی بیٹیوں سے منہ پھیر کر انہیں پیٹھ نہیں دکھا سکتے تھے۔ اس طرح تو وہ امہ کے قلب میں گہرا زخم لگا دیتے، جس کے نتائج خاصے بھیانک ہو سکتے تھے۔ اس طرح اس نئی ریاست اور پورے نظریہ واحدانیت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ سکتا تھا۔ یہ

سننے میں نہایت عجیب لگتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ محمدؐ، رسول خدا ہوتے ہوئے بھی ان معاشرتی بندشوں کے بیچ اپنی مرضی کے مطابق فیصلہ کرنے سے قاصر تھے۔ انہیں بھی اس گھن چکر سے چھٹکارا نہیں تھا، کوئی رعایت نہیں تھی۔ وہ چاہتے ہوئے بھی اب پیچھو نہیں ہٹ سکتے تھے۔

عائشہ ایک بار پھر اتنی شدت سے روئیں کہ انہیں لگا، کلیجہ پھٹ کر باہر آجائے گا۔ روایت میں کہا جاتا کہ عام طور پر گند اور دیر احساس رہنے والی ام سلمہ بھی چھپ کر روتی ہوئی پائی گئیں۔ عمر جیسے جنگجو کے لیے، جو حفصہ کے والد تھے، حفصہ کے آنسو ناقابل برداشت تھے۔ عمر روکھی طبیعت اور اکھڑپن کے لیے مشہور تھے۔ وہ طوفان کی طرح، دوڑے دوڑے حفصہ کے کمرے میں پہنچ گئے۔ مسلسل روتی ہوئی حفصہ کو سختی سے ٹوک کر پوچھا، 'کیا محمدؐ نے تمہیں طلاق دے دی ہے؟'

'مجھے نہیں معلوم' حفصہ نے شکستہ انداز میں جواب دیا، 'انہوں نے اپنے آپ کو اوپر چھت پر اس کمرے میں بند کر رکھا ہے'۔ وہ پھر رونے لگیں۔

عمر حفصہ کو یوں ہی روتا چھوڑ کر مسجد میں چلے گئے۔ احاطے میں لوگوں کا ایک جم غفیر اکٹھا ہو چکا تھا اور سب ہی شدت سے روئے جا رہے تھے۔ عورتوں کے بعد مردوں کو بھی یوں روتے دھوتے دیکھ کر ان کا پارہ مزید چڑھ گیا اور وہ گویا، اسی طرح طوفان کی مانند دوڑتے اور سیڑھیاں پھلانگ کر چھت پر جا پہنچے۔ کمرے کے دروازے پر بلال کھڑے پہرہ دے رہے تھے۔ انہوں نے بلال کو گرج دار آواز میں حکم دیا، 'محمدؐ کو میری آمد کی خبر کرو اور اندر داخل ہونے کی اجازت مانگو!'۔ بلال نے ایسا ہی کیا لیکن واپس آئے تو سر جھٹکتے ہوئے کہا، 'میں نے آپ کا بتایا لیکن انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا'۔ یہ سن کر عمر کا رنگ اڑ گیا اور غصہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ وہ چھت سے نیچے اتر آئے اور مسجد کے صحن میں بے چینی سے یہاں وہاں ٹہلنے لگے۔ تھوڑی ہی دیر میں حواس بحال ہوئے تو ایک بار پھر برداشت جواب دے گئی اور وہ اسی طرح دوڑے دوڑے پھر چھت پر پہنچ گئے۔ بلال کو اب کی بار زیادہ سختی سے حکم دیا اور محمدؐ نے ایک دفعہ پھر عمر کی درخواست کو رد کر دیا۔ وہ ادھر ہی حواس باختہ کھڑے رہے اور تھوڑی بعد بلال کو ایک بار پھر دوبارہ اندر جانا پڑا۔ بلال واپس آئے تو عمر سے کہا، 'رسول اللہ اب آپ سے ملیں گے'۔

دوڑ دھوپ، نیچے صحن میں جاری شور و غل اور وہاں بیویوں کے کمرے میں جاری رواس پٹاس سے عمر کے اعصاب جواب دے چکے تھے۔ قریب تھا کہ وہ کسی کو پٹخ دیتے۔ وہ اس کمرے کے آدم قد سے چھوٹے دروازے میں سے سر جھکا کر اندر داخل ہوئے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ محمدؐ سخت زمین پر بچھی گھانس پھونس سے بُنی چٹائی پر، منہ دیوار کی طرف موڑ کر لیٹے ہیں۔ کمرے میں سوائے اس چٹائی اور ایک کونے میں سوکھی ہوئی چمڑیوں کے ڈھیر کے سوا کچھ نہیں ہے۔ قالین، بستر، لالٹین کچھ بھی نہیں، حتیٰ کہ پینے کا پانی بھی نہیں ہے۔ آرام اور آسائش تو دور کی بات، ضرورت کا سامان بھی پورا نہیں تھا۔ یقیناً، تیزی سے پھلتی پھولتی اس نوزائیدہ ریاست کے سربراہ کے لیے یہ جگہ انتہائی غیر موزوں تھی، اسے یہاں اس حالت میں نہیں ہونا چاہیے تھا۔ بہر حال، عمر نے محمدؐ کی یہ حالت دیکھ کر ہمدردی کا اظہار کرنے کی بجائے یا کچھ اس بابت کہتے، فوراً ہی مدعا پر آگئے۔ جیسے عادت تھی، دو ٹوک انداز میں پوچھا، 'کیا آپؐ نے اپنی بیویوں کو چھوڑ دیا ہے؟'۔

'نہیں۔ میں نے نہیں چھوڑا'، محمدؐ نے جواب دیا۔ یہ سنتے ہی عمر کی تقریباً رکی ہوئی سانس بحال ہو گئی اور بے اختیار تکبیر، یعنی 'اللہ اکبر' بلند کی۔ مسجد کا احاطہ، عمر کے گرج دار نعرے سے گونج اٹھا۔ صحن میں جمع لوگ عمر کی پر جوش آواز سنتے ہی سمجھ گئے اور انہوں نے بھی سکھ کا سانس لیا۔ مسجد کے احاطے میں نعرے بلند ہونے لگے اور اتنا شور ہوا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ لوگ جان چکے تھے کہ بحران ٹل گیا ہے۔ 'لیکن، میں پورا ایک مہینہ ان کے پاس نہیں جاؤں گا'، شور کم ہوا تو محمدؐ نے دھیمی آواز میں عمر سے کہا۔ بعد ازاں، انہوں نے اپنی زبان کا پاس رکھتے ہوئے، تیس دن بعد لاتعلقی اور علیحدگی ختم کر دی۔

اس بات کی ابن اسحاق اور نہ ہی الطبری نے کوئی معقول وضاحت دی ہے کہ آخر محمدؐ نے ایک مہینے تک لاتعلقی اور علیحدگی پر اصرار کیوں کیا؟ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ معاملہ صرف بیویوں سے دوری اختیار کرنے کا نہیں تھا بلکہ وہ اپنے ہی ہاتھوں سے بنائی اس نئی دنیا کے روز بروز بڑھتے ہوئے تقاضوں سے بھی تھوڑے عرصے کے لیے دور ہونا چاہتے تھے۔ مدینہ میں مسجد کی چھت پر اس کمرے میں چھدری چٹائی پر میسر آنے والی گوشہ نشینی کی مثال مکہ میں حرا پہاڑی کی تنہائی جیسی تھی۔ یہ دھیان اور مراقبے کے لیے موزوں جگہ تھی، جہاں وہ سکون سے غور و فکر کر سکتے تھے۔ نہ صرف یہ کہ انہوں نے اب تک کیا پایا ہے بلکہ یہ بھی کہ آخر آگے

کا کیا طریق ہو گا؟ یقیناً اب تک وہ سمجھ چکے ہوں گے کہ اب ان کی زندگی میں ذاتی وابستگیوں کے لیے کوئی جگہ باقی نہیں تھی اور یہ بھی کہ ماریہ کے ساتھ ان کا تعلق، یہیں ختم ہو جائے گا۔ ان کی زندگی، اب ان کی اپنی نہیں رہی بلکہ یہ امہ کی ملکیت تھی۔ صورتحال ایسی تھی کہ جس میں وہ خود اپنی من مرضی نہیں چلا سکتے تھے۔ اپنے بارے کوئی فیصلہ آزادی سے نہیں لے سکتے تھے۔ اسی طرح، بلا شک و شبہ انہوں نے بھانپ لیا ہو گا کہ اب، ان کے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ زندگی، ختم ہونے کو ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب ایک ماہ بعد وہ دوبارہ سے معمولات کی طرف لوٹے تو ازدواجی صورتحال کو نئی قرانی آیات کی روشنی میں واضح کر دیا، جس میں آپؐ کے وصال کی پیشن گوئی کی گئی تھی۔

ان آیات میں آپؐ کی بیویوں کو کئی راستے دکھائے گئے تھے، جن میں سے وہ جو مناسب سمجھتیں، اختیار کر لیتیں۔ اسی لیے، ان آیات کو 'انتخاب کی آیات' کہا جاتا ہے، جو کچھ یوں تھیں: 'اے نبی، اپنی بیویوں سے کہو، اگر تم دنیا اور اس کی زینت چاہتی ہو تو آؤ، میں تمہیں کچھ دے دلا کر بھلے طریقے سے رخصت کر دوں۔ اور اگر تم اللہ اور اس کے رسول اور دار آخرت کی طالب ہو تو جان لو کہ تم میں سے جو نیکو کار ہیں، اللہ نے ان کے لیے بڑا اجر مہیا کر رکھا ہے'۔ یعنی، مستورات اپنی مرضی سے طلاق لینے میں آزاد تھیں اور محمدؐ ان کے لیے ضروری انتظام کرنے کے پابند تھے۔ اگر یہ نہیں تو پھر، انہیں چاہیے کہ اپنے عوامی کردار کو اچھی طرح نہ صرف سمجھ لیں بلکہ اس کردار کے مضمرات سے بھی خوب آگاہ رہیں اور اس کے لیے پوری طرح سے تیاری کر لیں۔ ذہن بنا لیں۔ یہ بات الہام میں کچھ یوں ہے کہ، 'بلاشبہ نبی تو اہل ایمان کے لیے ان کی اپنی ذات پر مقدم ہے اور نبی کی بیویاں ان کی مائیں ہیں۔۔۔'، ایک دوسری آیت میں صاف صاف تاکید بھی کر دی، 'اور نہ یہ جائز ہے کہ ان کے بعد ان کی بیویوں سے نکاح کرو۔ یہ اللہ کے نزدیک بہت بڑا گناہ ہے۔'

ان آیات کے بعد، اگر کوئی عورت محمدؐ کے نکاح میں رہنے کا فیصلہ کرتی ہے تو اسے ایک عام بیوی سے کہیں بڑا اور بھاری کردار قبول کرنا ہو گا۔ انہیں اس جدید عرب میں کنبے کی ایک نئی تراش اور ساخت میں اس قدر سختی سے جڑنا ہو گا کہ بعد اس کے، وہ صرف بیویاں نہ رہتیں بلکہ ماننے والوں کی مائیں کہلائیں گی، 'امہات المومنین' ہوں گی۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ ان میں سے کسی ایک کے بطن سے محمدؐ کی اولاد پیدا نہیں ہوئی تھی۔ ایسے میں کنبے کا یہ تصور نہایت حیرت انگیز اور غیر معمولی تھا۔ جہاں، آپؐ کی ازواج مومنین کی مائیں ہوں گی، وہیں ایک لحاظ سے الہامی الفاظ انہیں مومنین کا باپ قرار دے رہے تھے۔ وہ ایک نئے سلسلے کے جد امجد کی طرح ابھر رہے تھے جو بعد ازاں تاریخ کے دھارے میں تیسرا عظیم ترین توحیدی عقیدہ بن جائے گا۔ اگرچہ محمدؐ کے یہاں اولاد نرینہ نہیں تھی، لیکن اس طرح وہ وحدانیت کے عقیدے سے جڑے روحانیت پسندوں کی ایک کثیر تعداد کی ولدیت اختیار کر لیں گے۔ سادہ الفاظ میں کہیے تو ماننے والے تمام مرد ان کے بیٹے قرار پائے اور بیٹوں پر اپنی ماؤں کے ساتھ نکاح باندھنے کی ممانعت تھی۔ مزید کھنگالیں تو، محمدؐ کے بعد ان کی بیوائیں، صرف بیوائیں نہیں ہوں گی بلکہ ہمیشہ کے لیے بیوائیں بن جائیں گی۔

نو کی نو بیویوں نے محمدؐ کے ساتھ نکاح میں بندھے رہنے کو ترجیح دی۔ ان کی مثال 'اسلام کی دوستانی کنواریوں' جیسی ہو گی جو پاک دامن، عزت دار اور مجرد ہوتی ہیں۔ آج جدید زمانے کے لحاظ سے سوچا جائے تو انفرادی سطح پر کسی بھی شخص، چاہے مرد یا عورت کے لیے یہ قسمت کا ایسا درشت کھیل معلوم ہوتا ہے جس میں مرضی سے خود پر جبر کیا جا رہا ہے۔ بالخصوص، عائشہ اور حفصہ کے لیے تو یہ مشکل سوار ہی ہو گی۔ ان دونوں کی عمریں ابھی بمشکل بیس برس ہی تھیں۔ یہ تو رہا ایک طرف، شاید ان کے لیے محمدؐ کی بگڑتی ہوئی صحت اور موت کا خیال ہی ایسا تھا کہ جس کے سامنے وہ کچھ نہ کر سکتی تھیں یا ان دونوں نے اپنی ذاتی ترجیحات کو سیاسی ضرورتوں پر قربان کرنے کا واقعی فیصلہ کر لیا، قبول کر لیا۔ لیکن، عائشہ کے لیے تو یہ واقعی بہت مشکل بات تھی۔ قسمت نے ان کے ساتھ عجب کھیل کھیلا تھا۔ شاید آج ہم اسے انتہائی سفاک اور جفا جو نتیجہ کہہ سکتے ہیں۔ وہ نوعمر تھیں، اب ساری عمر ایک ماں بن کر بسر کریں گی لیکن انہی قرانی آیات کی روشنی میں وہ ہمیشہ کے لیے حاملہ ہونے اور اپنے بطن سے جنم لینے والی اولاد سے محروم ہو جائیں گی۔

اگرچہ محمدؐ کی ازواج کو یکساں عزت اور تکریم بخشی گئی تھی لیکن آگے چل کر ان میں سے زیادہ تر بعد ازاں اسلامی تاریخ میں پیش آنے والے معاملات میں نہایت معمولی کردار ادا کریں گی۔ عائشہ کا معاملہ باقی سب سے جدا تھا۔ وہ بے باک اور حوصلہ مند تھیں۔ انہی خصوصیات کی بدولت وہ باقی تمام ازدواج کے مقابلے میں، تاریخ میں ان سب سے کہیں بڑھ کر کردار ادا کریں گی۔ یوں کہ، محمدؐ کو گزرے بیس سال گزر چکے ہوں گے۔ عائشہ ایک سرخ اونٹ پر سوار ہو کر پوری فوج کی کمان سنبھالے آپؐ کے چچازاد اور داماد کے خلاف لڑائی کے لیے نکلیں گی۔ یہ وہ زمانہ ہو گا جب علی کو خلافت سنبھالے تھوڑا ہی عرصہ گزرا ہو گا۔ اونٹ کی پیٹھ پر لدی ہوئی ہودج، یعنی پالکی میں سوار، اگرچہ ان کی فوج کے جنگجو ان کی آنکھوں کے سامنے کٹ کر مر رہے ہوں گے، لیکن وہ پھر بھی بدستور چلا چلا کر فوجیوں کو غیرت دلا رہی ہوں گی۔ دیدہ دلیری سے لڑنے پر اکسا رہی ہوں گی۔ وہ جنوبی عراق میں بصرہ شہر کے باہر مضافات میں لڑی جانے والی اس لڑائی میں ایسی لازوال اور انمٹ داستان چھوڑ آئیں گی کہ بعد ازاں تاریخ میں اس لڑائی کا نام ہی 'جنگ جمل' یا 'اونٹ کی لڑائی' مشہور ہو جائے گا۔ وہ ایک نڈر اور جری سپہ سالار کا کردار نبھائیں گی لیکن لڑائی کے نتائج ان کے حق میں نہیں نکلیں گے۔ ہو گا یوں کہ جب لڑائی ختم ہو جائے گی تو ہودج میں اتنے تیر پیوست ہو چکے ہوں گے کہ اس پر سیہ کے کانٹوں کا گماں ہو گا۔ سیہ ایک کانٹے دار جانور ہے جس کے جسم پر نوک دار کانٹے ہوتے ہیں۔ ایک تیر تو ہودج کے اندر پیوست ہو کر، عائشہ کی زرہ بکتر کو بھی چیر تا ہوا، گندھے میں پیوست ہو جائے گا۔ لیکن، اس کے باوجود بھی انہیں روکنے کی ہمت کسی میں نہیں تھی۔ وہ زخمی تھیں، ان کی فوج شکست سے دوچار تھی لیکن پھر بھی وہ لڑنے پر مصر رہیں، تا آنکہ انہیں زبردستی ہتھیار ڈالنے پر مجبور نہیں کر دیا گیا۔ عائشہ کی سیاسی بصیرت پر بحث ہو سکتی ہے لیکن ان کی جرات، دلیری اور بے خوفی کا کوئی جواب نہیں ہے۔

وہ اس لڑائی میں شکست کے بعد مکہ لوٹیں تو خائف نہیں تھیں۔ انہیں کوئی ڈر نہیں تھا اور نہ ہی مایوس تھیں۔ جس قدر وہ بے باک، صاف گو اور بے لاگ تھیں، اسی زور و شور سے اب وہ خود کو سیاست کے معاملات سے علیحدہ کر دیں گی۔ اب وہ بجائے حکومتی معاملات میں دخل دیا کرتیں، صحیح معنوں میں 'ام المومنین' یعنی، 'مومنین کی ماں' کا کردار نبھائیں گی۔ وہ آپؐ کی بیویوں میں واحد تھیں جو نکاح سے پہلے کنواری تھیں۔ اسی طرح تمام ازدواج میں یہ صرف عائشہ ہی تھیں جو محمدؐ کو تنگ کرتیں، چوٹ لگاتیں اور پھر بھی انہیں مسکرانے پر مجبور کر دیا کرتی تھیں۔ سب سے کم عمر، زندہ دل اور اس بات پر تو ان کا ہمیشہ ہی اصرار رہا کہ وہ محمدؐ کی پسندیدہ ترین بیوی تھیں۔ ازواج میں ایک کے بعد دوسری خاتون چل بسیں لیکن عائشہ ان سب کے بعد بھی تادیر زندہ رہیں۔ اس لیے آخر دور میں جب وہ محمدؐ کے ساتھ اپنی بیتائی زندگی کو یاد کرتیں تو انہیں ٹوک کر درست کرنے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ انہوں نے اپنی ان یادداشتوں کو ہزارہا احادیث کی شکل میں تحریر کروایا۔ احادیث سے مراد، محمدؐ سے منسوب وہ افعال اور اقوال ہیں جو آج بھی دنیا بھر میں مسلمانوں کے لیے پیروی، غور و فکر اور تراقب کا سامان ہیں۔ ان کی چھوڑی روایات میں اکثر ایسی بھی ہیں جو آج بھی نوخیز اور نابالغ ذہنوں کو کچلنے کے لیے کافی ہیں۔ کئی مثالیں ہیں جو اس قدر ہیجان خیز تھیں کہ بعد ازاں علماء نے ان روایات میں کانٹ چھانٹ مناسب سمجھا اور رفتہ رفتہ کئی معاملات کے بارے میں ان سے منسوب منقولات کی تعداد ہزاروں سے گھٹ کر سینکڑوں رہ گئی۔ تاہم، جب تک وہ خود زندہ رہیں، کسی شخص نے انہیں ٹوکنے یا روک لگانے کی جرات نہیں کی۔ کسی عالم دین، محمدؐ کے رفیق یا بڑے سے بڑے خلیفہ اور حکمران کو ان سے پوچھ گچھ کرنے کی کبھی ہمت نہیں ہوئی۔ جنگ جمل کے بعد گرچہ زبردستی علیحدگی اختیار کرنی پڑی مگر سبکدوشی کے بعد بھی انہوں نے اپنی قدر اور لحاظ جوں کا توں برقرار رکھا۔

ہر نئے دن کے ساتھ محمدؐ پر عوامی ضرورتوں کا دباؤ بڑھتا جا رہا تھا، نت نئے تقاضے سامنے آ رہے تھے۔ مدینہ کا نخلستان، جو کبھی منظر نامے کے حاشیے پر واقع صرف کھجور اور کھجور سے بنی مصنوعات کی ایک منڈی ہوا کرتی تھی، دیکھتے ہی دیکھتے سینکڑوں میل پر محیط حجاز کا مرکز بن گیا۔ طاقت کا اس مرکز کا گھیرا ایک طرف مشرقی ساحلوں پر بحرین اور عمان، شمال میں بازنطینی سلطنت کی سرحدوں اور جنوب میں یمن کے تقریباً حصے پر پھیلا ہوا تھا۔ مدینہ میں چوبیسوں گھنٹے بدو قبائل اور آزاد اقوام

کے بادشاہوں کے وفود کی آمد و رفت جاری رہتی جو محمدؐ کی خدمت میں حاضری دینا لازم تصور کرتے، اتحاد اور باہمی تعلقات کو وسعت دینے کی بات کرنے کے خواہاں ہوتے یا پھر اپنے ساتھ نئے اتحادیوں کو امہ میں شامل کروانے ضامن کے طور پر حاضر ہوتے رہتے۔ یہ تعداد روز بروز بڑھتی ہی جا رہی تھی، اسی لیے اس برس کو 'وفود کا سال' بھی کہا جاتا ہے۔ سفارتی سطح پر ہر وفد کو عزت بخشنا اور آؤ بھگت لازم تھی، جس کے لیے ہمیشہ ہی محمدؐ کی ذاتی اور پوری توجہ درکار ہوتی۔

محمدؐ نے اس زمانے میں درجنوں وفود کے ساتھ ملاقاتیں کیں اور انتہائی درجے کی سیاسی اور سفارتی مہارت کا مظاہرہ کرتے ہوئے معاہدے یقینی بنائے۔ اپنے تئیں، یہ سارے ہی وفود اور معاہدے اہم تھے لیکن سب سے اہم وفد نجران سے تعلق رکھتا تھا۔ نجران مکہ اور یمنی ساحلوں کے بیچ واقع ایک مقام ہے۔ تجارتی راہداری کے چوراہے پر واقع یہ شہر عرب میں، پچھلی ایک صدی سے عیسائیوں کا اکثریتی علاقہ تھا۔ اگر شہر نجران اسلام قبول کر لیتا ہے تو یہ پورے خطے میں ایک انتہائی اہم سیاسی پیغام بن سکتا تھا۔ خاص طور پر شمال میں ایک بار پھر سے سر اٹھاتی ہوئی بازنطینی سلطنت، جو عیسائیت کی پرچارک تھی، اس سے تعلقات میں خاصا فرق پڑ جاتا۔ یہ اس قدر اہم معاملہ تھا کہ نجرانی عیسائیوں کے اسلام قبول کرنے سے نہ صرف حجاز اور بازنطینی شہنشاہ پر اثر ہوتا بلکہ پورے مشرق وسطیٰ میں ایک نئی طرز کی ایجاد ہو جاتی۔ اس وقت، مشرق وسطیٰ میں عیسائیوں کی اکثریت تھی اور اس پورے خطے پر کلیسا کا غلبہ تھا۔

قران کے الہامی پیغام میں عرب کے عیسائیوں کو خصوصی توجہ دی گئی تھی۔ انہیں انتہائی پر زور انداز میں مخاطب کیا جاتا رہا تھا۔ نزول الہی میں عیسیٰ کو من و عن نبی تسلیم کیا گیا تھا اور مریم کے بارے میں تو قران میں اتنے تفصیلی بیان ملتے ہیں کہ اتنی فصاحت خود انجیل میں بھی ان سے متعلق نہیں کی گئی۔ اس کے باوجود نجران میں عوامی رائے منقسم تھی۔ سیاسی طور پر تو نجرانیوں کے لیے بہتر یہی تھا کہ وہ محمدؐ کی نوزائیدہ ریاست کے ساتھ الحاق کر لیتے لیکن دینی لحاظ سے اس معاملے کو سلجھانا قدرے مشکل تھا۔ اس میں ایسی الجھن تھی جو سمجھ میں بھی آتی تھی۔ عیسائیوں میں وہ لوگ جو محمدؐ کے طرف دار تھے، جواز پیش کرتے کہ آپؐ شفیع اور مقدس روح ہیں۔ یعنی، ناصر یا مددگار ہیں۔ 'روح القدس' نامی کردار کی 'انجیل یوحنا' میں پیشن گوئی کی گئی تھی۔ یہ پیشن گوئی خود عیسیٰ نے کی تھی اور اس کردار کے بارے کہا تھا کہ اس کی روح مقدس اور پاک ہو گی۔ لوگوں کو چاہیے کہ وہ انہیں 'عیسیٰ کا روپ'، بلکہ عیسیٰ ہی سمجھیں۔ مشہور تھا کہ یہ شخص عیسائیوں کا مددگار ہو گا۔ دوسری طرف، وہ لوگ جو اختلاف رکھتے تھے، ان کا مدعا یہ تھا کہ 'روح القدس' کے بارے میں یہ بھی تو کہا گیا ہے کہ اس کے یہاں اولاد نرینہ ہو گی۔ چونکہ محمدؐ کے یہاں بیٹے نہیں تھے تو مبینہ طور پر آپؐ وہ مقدس روح نہیں ہو سکتے جس کی پیشن گوئی کی گئی ہے۔ اس منقسم رائے اور تنازعے کو حل کرنے کے لیے تجویز ہوا کہ نجران سے ایک وفد روانہ کیا جائے جو منہ در منہ محمدؐ کے ساتھ مکالمہ کرے اور فیصلہ ہو۔ لیکن جب یہ وفد مدینہ پہنچا تو انہیں مکالمے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔

بجائے یہ کہ محمدؐ نے قوانین کے تحت، رسمی طور پر مشیران کے جمگھٹ کے ساتھ مل کر مذاکرات کرتے، انہوں نے اپنے رفقاء کو اس موقع پر رخصت کر دیا۔ ان کی بجائے، نجرانیوں کا استقبال کرنے کے لیے اپنے گھرانے کے چار افراد کو بلا لیا۔ یہ چار افراد آپؐ کی بیٹی فاطمہ، فاطمہ کے شوہر علی اور ان دونوں کے بیٹے حسن اور حسین تھے۔ بغیر کچھ کہے، محمدؐ نے آہستگی کے ساتھ ان چاروں کو اپنے پہلو میں کھڑا کر لیا۔ جو چوغہ انہوں نے اوڑھ رکھا تھا، اس کا ایک سرا پکڑا اور ہوا میں بلند کر کے گھرانے کے ان چار افراد کے سروں پر تان لیا۔ یہ وہ ہیں جو محمدؐ کا خاندان ہیں۔ ان کی اولادیں اور چوغہ پھیلانے کا مطلب تھا کہ انہیں آپؐ کی نسبت، سایہ حاصل ہے۔ یہ محمدؐ کے انتہائی قریبی، سب سے پیارے لوگ ہیں جنہیں 'اہل بیت' یعنی گھر کے افراد کہا جائے گا۔ محمدؐ کے گھر کے افراد جن سے ان کا خون اور خوند، جسم اور روح جڑی تھی۔

چاہے محمدؐ نے اس موقع پر یہ سوچ سمجھ کر کیا ہو یا اسے فطری طور پر وجدانی علامت سمجھا جائے، ہر دو صورت اعلی درجے کا عکسی مظاہرہ تھا۔ ساتویں صدی عرب میں کیے تو محمدؐ نے دیکھنے والوں کے لیے نہایت عمدہ استعارہ، تشبیہ سے مزین تصویر بنا ڈالی۔ عرب سے تعلق رکھنے والے عیسائیوں میں مشہور تھا کہ آدم نے اپنے زمانے میں ایسا نظارہ دیکھا تھا کہ جس میں ایک روشنی کی ایک نہایت تابندہ کرن کے گرد صرف چار مگر خاصی شوخ اور تاباں روشنیاں جگمگا رہی ہیں۔ استفسار پر خدا

نے بتایا تھا کہ یہ پیغامبری کی پشت، یعنی جد اور آل کا نظارہ ہے۔ نجرانی وفد نے جوں ہی محمدؐ کو اپنے گھرانے کے چار افراد پر یوں سایہ قائم کرتے دیکھا تو یہ ایسا نظارہ تھا، گویا آدم کا خواب سچ ہو گیا۔ پیغمبری کی روایت اور رسالت کے جس الہامی پیغام کی ابتداء آدم سے ہوئی تھی، ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ سے ہوتی ہوئی اب اس شخص تک آن پہنچی تھی جسے قران نے 'خاتم النبیین' قرار دیا تھا۔ نجرانیوں نے وہیں کھڑے کھڑے اسلام قبول کر لیا۔

محمدؐ کے یوں ڈرامائی انداز میں اس ملاقات کو ترتیب دینے سے ان کی فہم و فراست عیاں ہو جاتی ہے۔ پتہ چلتا ہے کہ وہ پوری طرح آگاہ تھے کہ ان کے اشارے، استعارے اور علامتیں کس قدر معنی خیز ہو سکتے ہیں۔ لیکن، وہیں یہ آگاہی ان کے لیے ایک بوجھ بھی بن کر رہ جائے گی۔ انہوں نے اس عظیم تحریک کو شروع سے ہی انکساری اور فروتنی کی بنیادوں پر کھڑا کیا تھا۔ یہ تب کی بات ہے جب وہ صرف اور صرف ایک پیغمبر تھے۔ بے شک، قران میں بھی عاجزی اور انکساری کو بہترین صفت قرار دیا تھا اور ساتھ ہی ساتھ غرور، تکبر اور نخوت سے بچنے کی تاکید کی تھی۔ لیکن، اب صورتحال یہ تھی کہ جیسے جیسے محمدؐ کی تعظیم اور تکریم میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا، اس پھیلاؤ کے ساتھ ان کی عاجزی اور حلیمی کو خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ منکسر المزاجی اب ماضی کا قصہ بن کر رہ چکی ہے۔ چاہے وہ اپنے اختیارات کو بانٹنے، ذمہ داریاں دوسروں کو سونپنے اور اس عجب رخ اختیار کرتی ہوئی طرز زندگی کو خود سے جتنی دور دھکیلنے کی کوشش کرتے، یہ پہلے سے کہیں زیادہ آگے بڑھ کر آپؐ کو دبوچ لیتی۔ ان پر نازل ہونے والا کلام، اب بھی خدا کی آواز تھا اور مومنین کا حال یہ ہو چکا تھا کہ آپؐ کے کہے کوئی بھی الفاظ، حتیٰ کہ معمول کی بات چیت اور استعجاب بھی خدائی مرضی شمار ہونے لگی۔ پھر، یہاں قران کا معاملہ بھی تھا۔ طرفہ تماشا یہ ہوا کہ اس میں کہہ دیا گیا کہ اگرچہ وہ صرف ایک آدمی ہیں لیکن ان کی اطاعت کا مطلب خدا کی فرمانبرداری شمار ہو گی۔

پھر، آگے یہ ہوا کہ محمدؐ کا عوامی کردار اس قدر بڑھ گیا کہ اب ان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اس کے لیے وقف ہو چکا تھا۔ دن تو رہے ایک طرف، رات کو بھی فرصت نہیں تھی۔ انہیں دن رات اس کردار کے تقاضوں کو نبھانا پڑتا۔ اتنی محنت اور جان توڑ روٹین کا نتیجہ آپؐ کی آنکھوں میں پھیلی سرخی، چہرے پر تھکاوٹ کے آثار اور پیشانی پر گہری ہوتی ہوئی لکیروں میں صاف نظر آنے لگا۔ وہ بیزار رہنے لگے اور ہمہ وقت تکان کا حال طاری ہو گیا۔ حکومتی امور کا سردرد کم تھا کہ اب ہر وقت جسمانی طور پر بھی سر میں درد کی شکایت رہنے لگی۔ احد کی لڑائی میں پیشانی پر لگنے والی چوٹ کے سبب پہلے ہی سر میں ٹیسیں اٹھتی تھیں، اب تناؤ بڑھ جانے کے نتیجے میں یہ درد میگرین میں بدل گیا۔ اتنا شدید درد ہوتا کہ انہیں لگتا جیسے ان کے جسم و جان اور دماغ سے ساری توانائی، رس کی طرح نچوڑ دی گئی ہے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ اس برس ذوالحجہ کے مہینے میں مکہ کا قصد کریں گے، لیکن وہ نہیں گئے۔ بجائے، ابوبکر کو مدینہ سے حج کی غرض سے جانے والے قافلے کا سربراہ مقرر کر کے روانہ کر دیا۔

ابن اسحاق نے اس سال محمدؐ کے حج پر نہ جانے کی وضاحت کچھ یوں کی ہے کہ انہوں نے یہ اعلان کیا کہ یہ آخری موقع ہو گا کہ جب غیر مسلم یا وہ لوگ جنہوں نے اسلام قبول نہیں کیا تھا، وہ بھی حج میں شرکت کریں گے۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ اب مکہ صرف تب ہی جائیں گے جب وہاں سے لادینی اور الحاد کا مکمل خاتمہ نہیں ہو جاتا۔ لیکن، ابن اسحاق کی اس وضاحت پر کئی سوال اٹھتے ہیں۔ ملحدین کا معاملہ یہ ہے کہ محمدؐ نے ایک سال پہلے ہی وہاں پھیلی لادینی کے باوجود عمرہ ادا کیا تھا۔ بلکہ دو برس پہلے جب مکہ میں مکمل طور پر تاریک خیالی چھائی تھی اور ہر طرف مظاہر پرستی اور لادینی کا دور دورہ تھا، پھر بھی انہوں نے عمرہ ادا کیا تھا۔ یہاں، مسئلہ مکہ میں الحاد یا بے دینی کا نہیں تھا۔ بات یہ تھی کہ پہلے انقلاب کی تحریک اور پھر جان توڑ ریاستی امور کے نتیجے میں کی گئی ذہنی اور جسمانی مشقت اپنا اثر دکھا رہی تھی۔ اتنی بڑی کامیابی اب اپنا خراج وصول کر رہی تھی۔ اگر یہ نہیں تو پھر کیا تھا؟ کیا یہ صرف جسمانی تکان اور اعصابی دباؤ سے بھی بڑھ کر معاملہ تھا؟

اگلا پورا سال، عائشہ بتاتی ہیں کہ محمدؐ کی زیادہ تر راتیں مدینہ کے قبرستان کے آس پاس بسر ہوا کرتیں۔ رات بھر وہاں شب بیداری کے دوران عبادت اور مرنے والوں کے لیے دعا میں مشغول رہتے۔ اس قبرستان میں کئی لوگ دفن تھے۔ آپؐ کی آنکھوں کے سامنے، دیکھتے ہی دیکھتے یہاں قبروں کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا

تھا۔ ہر قبر پر ایک بچے کے گھٹنے جتنا اونچا کتبہ نصب تھا اور ان کتبوں کی تعداد درجنوں میں تھی۔ ان میں دو کتبے تو ان کی سگی بیٹیوں اور ایک لاپالک بیٹے زید کا تھا۔ اس زمانے میں اولاد کا والدین سے پہلے چل بسنا کوئی انہونی بات نہیں تھی لیکن تب بھی اپنے بچوں کی موت دیکھنا، آج کی ہی طرح شدید دکھ اور یاس کا باعث ہوا کرتی تھی۔ ایسا لگتا کہ جیسے زندگی کی دوڑ الٹ گئی ہے۔ جنہیں پہلے رخصت ہو کر ماضی بننا تھا، وہی ماضی اپنے ہاتھوں سے مستقبل کے لاشے اٹھائے پھر رہا ہو۔

اوائل دور کے کئی دیرینہ ساتھی بھی یہیں دفن تھے۔ ان میں سے کچھ تو جنگوں میں لڑتے لڑتے مر گئے، بعض کو جوانی میں ہی بیماری نے آلیا اور صرف چند ایک ہی تھے جو اپنی طبعی عمر پوری گزار کر بڑھاپے میں رخصت ہوئے۔ ایک دن عائشہ نے انہیں قبرستان کے پاس کھڑے دیکھا۔ وہ زیر لب بڑبڑا رہے تھے۔ 'اے اہل قبور! تم پر سلامتی ہو۔ یقیناً تم ان سے بہتر ہو جو ابھی تک دنیا میں ہیں'۔ ان کی اس بڑبڑاہٹ سے ایسا لگتا ہے جیسے اب وہ خود بھی ان کے ساتھ شامل ہونے کے متمنی تھے، خواہش رکھتے تھے۔ دنیا جہاں کے آلام اور تقاضوں سے دور آرام اور سکون کی تلاش میں تھے۔

محمدؐ اکثر اپنے سابقہ حریفوں کی قبروں پر بھی چلے جاتے اور دیر تک وہیں کھڑے رہتے۔ جیسے، وہ ابن ابی کی پر قبر تو ضرور ہی جاتے رہے۔ ابن ابی، جو 'منافقین' کا سردار کہلایا جاتا تھا، کچھ ماہ پہلے اس کی موت واقع ہو گئی تھی۔ عمر سے منسوب روایت ہے کہ وہ محمدؐ کو اس کے جنازے میں شریک دیکھ کر چونک گئے تھے۔ یہ واقعہ کچھ یوں منقول ہے کہ، "میں نے انہیں راستے میں ہی جالیا اور زور سے پوچھا، 'کیا آپؐ خدا کے دشمن کے لیے دعا کریں گے؟' وہ مسکرائے اور کہا، 'عمر، مجھے میرے حال پر، ایسا ہی رہنے دو۔ مجھے موقع دیا گیا ہے اور میں اس موقع کو حاصل کرنا چاہتا ہوں'۔ پھر انہوں نے دعا کی اور ابن ابی کی میت کے ساتھ ساتھ چلتے رہے اور تب تک وہیں کھڑے رہے جب تک کہ اسے دفنا نہ دیا گیا"۔ یہ محمدؐ کا اقرار اور اعتراف تھا۔ نہ صرف یہ کہ وہ ابن ابی کی اپنی سمجھ کے مطابق اخلاص اور سچائی کے اب بھی قائل تھے بلکہ شاید دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ وہ ابن ابی کو ایسے شخص کی حیثیت سے بھی جانتے تھے جو بے خوف ہو کر ان کے فیصلوں سے نہ صرف اختلاف کرنے کی ہمت رکھتا تھا، بلکہ ضرورت آنے پر با آواز بلند اس کا اظہار بھی کر سکتا تھا۔ ویسے بھی، اب اس جیسا کوئی دوسرا شخص باقی نہیں رہا تھا۔

محمدؐ ہر وقت ہجوم میں گھرے رہتے۔ جتنے زیادہ لوگ ارد گرد جمع ہوتے، وہ اتنی ہی شدت سے تنہائی محسوس کرتے۔ 'خدا نے ان کے دل میں گوشہ نشینی اور خلوت کی محبت ڈالی تھی'، عائشہ اکثر کہا کرتیں۔ یہ تب کہا کرتیں جب وہ محمدؐ کے اس طور، یعنی راتیں بیویوں کے ساتھ نہیں بلکہ قبرستان میں بیتانے کی وضاحت پیش کر رہی ہوتی تھیں۔ لیکن انہیں رات کی تاریکی اور قبرستان میں پھیلی خامشی میں بھی حقیقی خلوت اور تنہائی نصیب نہیں تھی۔ یہ ناممکن تھا۔ وہ لوگوں کو ٹوکتے، اکثر غصہ کر جاتے اور بعض اوقات جیسے منت سماجت بھی کر لیتے کہ خدارا قبرستان میں پٹاخے نہ کریں، انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیں۔ لوگ ایسا کر بھی لیتے تھے، وہ فاصلہ برقرار رکھتے مگر پھر بھی آپؐ جانتے تھے کہ دور جھاڑیوں اور تاریکی میں لوگ چھپ کر بیٹھے انہیں تاڑ رہے ہیں۔ وہ آپؐ کے لیے شب بیداری میں مصروف رہتے اور محمدؐ خود مرنے والوں کے لیے رت جگا کاٹ رہے ہوتے۔ بلاشبہ لوگ ایسا ان کی محبت اور خیال رکھنے کی غرض سے کرتے تھے۔ وہ محمدؐ کے لیے فکرمند تھے۔ لیکن، اس قدر سروکار اور لگاؤ ان کے لیے دباؤ اور تناؤ کا باعث تھا۔ لوگوں کا محمدؐ پر انحصار تھا اور خود انہیں یہ خوف تھا کہ اب اس کے بعد آپؐ کے پاس لوگوں کو دینے کے لیے کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ تاہم، ہر چہ کسل مند اور تھک کر چور تھے، خستگی اور ماندگی کا شکار ہونے کے باوجود بھی وہ جانتے تھے کہ ایک چیز ایسی ہے جو ابھی کرنی باقی ہے۔ وہ سفر کریں گے۔ ایک بار، ایک آخری بار وہ مکہ ضرور جائیں گے۔ بس یونہی نہیں بلکہ حج کے لیے جائیں گے۔

باب:21

تریسٹھ برس کی عمر ایسی ہوتی ہے جس تک پہنچنے میں جسم یوں جواب دیتا جاتا ہے کہ جوانی کے مزے لوٹنے والے اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ محمدؐ اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ ہمیشہ زندہ رہنے والے نہیں ہیں۔ جب حج کے سفر پر نکلے تو ماننے والوں کے نزدیک یہ 'تکمیل' کا سفر تھا لیکن بالآخر 'وداع' ثابت ہوگا۔ 'لوگو! میری باتیں سن لو مجھے کچھ خبر نہیں کہ میں تم سے اس قیام گاہ میں اس سال کے بعد پھر کبھی ملاقات کر سکوں'، وہ 632ء میں مارچ کے مہینے میں مکہ پہنچ کر ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہیں گے۔ حج کے موقع پر اس برس کعبہ کے احاطے میں تل دھرنے کو بھی جگہ نہیں تھی۔

مدینہ سے مکہ تک دو ہفتے کا سفر کٹھن اور سخت دشوار ثابت ہوا تھا۔ حج کے پانچ دن اس کے علاوہ تھے۔ بالخصوص جب ہر شخص کی نظریں آپؐ پر جمی تھیں، وہ تھک کر چور ہو گئے۔ سب لوگ ان کی طرف دیکھ رہے تھے اور یہی وجہ تھی کہ انہیں یہ سفر ہر صورت مکمل کرنا تھا۔ اسی لیے ہمت باندھ کر اپنی گرتی ہوئی صحت اور جسمانی کمزوری کو آڑے نہیں آنے دیا۔ 'اول المسلمین' یعنی پہلے مسلمان کی حیثیت سے یہ واحد حج ہے جو وہ ادا کریں گے اور اسی موقع کی روایات بعد ازاں اسلام میں اس سفر کا دستور اور شعائر قرار پائیں گی۔ ایک ایک لفظ، توقف اور حرکت، یہاں تک کہ ہاتھ اور پاؤں کے اشارے اور موقعوں پر انداز بھی اجتماعی یادداشت میں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو کر اس قدیم روایت جسے پہلے بھی حج کہا جاتا تھا، اسی کی جدید شکل بن جائی گی۔ بجائے یہ کہ اسلام سے پہلے کے مراسم اور ارکان عبادت کو فسخ کر دیتے، محمدؐ نے انہیں باقاعدہ طور پر نئے طریق میں ضم کر دیا۔ کلمات، دعائیں مانگنے کے مقامات، کعبہ کا طواف یعنی سات چکر، قربانی اور سر منڈوانا وغیرہ جیسے اور کئی دوسرے شعائر اب محمدؐ کے طریقہ کار کے مطابق، یعنی خدا کی طرف سے ان کے افعال کے احیاء کی مثال، روحانی طور پر پاک اور شفاف قرار پائیں گے۔ حج، صرف ایک روایت نہیں رہے گا بلکہ امہ کے اتحاد، یگانگت اور برابری کا واقعی مظاہر بن جائے گا۔ اس برس سے یہ جدید طریق، قدیم رسوم کو خود میں جذب کر لے گا۔ یعنی، 'آباؤ اجداد کا طریق' جو قدیم ہے، نو خیز 'اسلامی روایات' کا حصہ بن جائے گا۔ قصہ مختصر، محمدؐ ماضی کو حال کے ساتھ یکجا کر رہے تھے اور یوں مستقبل کے لیے خود بخود ایک مثال قائم ہو رہی تھی۔

حج کے پانچ دنوں میں انہوں نے زائرین سے ایک سے زیادہ بار خطاب کیا۔ ان موقعوں پر محمدؐ کے الفاظ اجتماعی یادداشت میں محفوظ ہو کر امر ہو جائیں گے اور ان کی جن باتوں پر اتفاق باقی رہا، وہ تاریخ میں ایک ہی جگہ پر جمع ملتی ہیں۔ مثلاً، قبل از اسلام یعنی جہالت کے دور میں ہوئی خون ریزی پر انتقام سے منع کر دیا گیا۔ چونکہ اب نیا دور ہے تو اس میں، 'جان لو کہ ایک مومن دوسرے مومن کا بھائی ہے اور سارے مومن برادران ہیں'۔ اسی طرح کسی کو بھی زبردستی اسلام قبول کرنے پر مجبور کرنے سے بھی روک دیا گیا، بالخصوص عیسائیوں اور یہودیوں کے ساتھ بالضرور ہی عزت اور احترام سے پیش آنے کا حکم دیا، 'اگر وہ اپنی مرضی سے اسلام قبول کر لیں تو وہ قابل اعتماد اور وفادار ہیں، جنہیں ہر طرح کا حق حاصل ہوگا اور وہ تمام امور بجالانے کے پابند ہوں گے۔ لیکن، اگر وہ اپنی قدیم روایت اور عقیدے پر قائم رہنا چاہیں تو انہیں بہلانے اور نہ ہی دھمکانے کی ضرورت اور اجازت ہے'۔ آگے چل کر، شاید یہ سب سے پختہ روایت ہے، اور آج کل کے زمانے میں اس بات کا کثرت سے تذکرہ کیا جاتا ہے اور لوگ اس کو پختہ حوالہ کہتے ہیں۔ اس ایک جملے میں محمدؐ نے اپنے لیے صیغہ ماضی کا استعمال کیا اور کہا، 'میں تم میں ایک ایسی چیز چھوڑے جا رہا ہوں جس کو اگر تم مضبوطی سے تھامے رکھو تو کبھی بھٹک نہیں سکتے۔ یہ اللہ کی کتاب، قران ہے'۔

انتہائی دین دار اور پکے مسلمانوں کے لیے یہ ایک جملہ باقی ہر شے پر غالب ہے، ان کے نزدیک یہی کافی ہے۔ لیکن، اسی جملے کے تاریخ میں کئی حوالے اور ایک سے زیادہ نسخے، منقول روایات مل جاتی ہیں۔ یہیں اگر اجتماعی یادداشت منقسم ہونا شروع ہوتی ہے۔ ایک روایت یوں ہے کہ محمدؐ نے کہا، 'میں نے تمہارے بیچ دو چیزیں چھوڑ دی ہیں'۔ غور کریں، ایک نہیں بلکہ دو چیزیں چھوڑی گئی ہیں۔ ان میں سے پہلی تو بدستور خدا کی کتاب تھی لیکن دوسری چیز پر آج بھی تکرار ہے۔ اس

ضمن میں اختلاف کچھ یوں ہے کہ کہا جاتا ہے، انہوں نے کہا، 'اللہ کی کتاب اور اس کے پیغمبر کا طریقہ' یعنی سنت، جس کے لغوی معنی پیغمبر کا برتاؤ یا عادت پہ مبنی اقوال و افعال ہیں۔ یا پھر، انہوں نے کہا، 'اللہ کی کتاب اور اس کے پیغمبر کے گھرانے کے لوگ' یعنی اہل بیت، مراد آپؐ کے انتہائی قریبی، خون کی خلف، آل محمدؐ یعنی داماد علی اور نواسے حسن اور حسین ہیں۔

ابن اسحاق اور الطبری، دونوں نے ہی کئی لوگوں سے، دونوں ہی طرح کی روایات منقول کی ہیں۔ یہ لوگ اس موقع پر وہاں موجود تھے اور انہوں نے قسم اٹھا کر حلفاً کہا کہ انہوں نے اپنے کانوں سے ایک یا دوسری بات سنی۔ لیکن، جیسا کہ آج ہم ماخذ اول سے بلاواسطہ حلفی شہادت یا گواہی طلب کرتے ہوئے یہ ضرور سوچتے ہیں کہ شاید ان لوگوں نے بھی وہی سنا ہو گا جو وہ سننا چاہتے تھے یا وہ جو سننے کے لیے تیار تھے یا کہیے جس وقت اصل بات کہی گئی، جس قدر ان کی توجہ مبذول تھی، انہوں نے اتنا اور ویسا ہی سنا۔ جلد ہی ایک کبھی نہ ختم ہونے والی بحث شروع ہو جائے گی کہ اس ایک جملے کے کئی پہلو نکلتے ہیں اور دوسری طرف کہا جائے گا کہ جو بھی ہے، مطلب ایک ہی ہے۔ مطلب یہ کہ اہل بیت سے بہتر سنت کا روادار کوئی نہیں ہو سکتا۔ وہ محمدؐ کے طریقہ کار کو ویسے ہی اپنائے ہوئے تھے جیسا کہ خود آپؐ کا طریق رہا تھا، اس میں رتی بھر فرق نہیں تھا۔ لیکن، اس کے ساتھ یہ بھی کہا جائے گا کہ چونکہ محمدؐ 'خاتم النبیین' یعنی آخری نبی ہیں تو ان کے اقوال اور افعال بھی حتمی ہیں۔ ان کا کوئی جوڑ نہیں اور ان کے اقوال، افعال ہر زمانے کے لیے منفرد اور فقید المثال ہیں۔ یعنی، یکتا ہیں۔ ایک جملہ اور اس پر یہ دلائل آگے چل کر اسلامی ڈھانچے کو دو انتہائی قریبی لیکن یکسر مختلف ضابطہ کار میں باندھ دیں گے۔ ایک ہی ہفتے بعد محمدؐ کے ایک نئے بیان کے باعث بعد میں یہ فرق اور بھی بڑھ جائے گا اور تاریخ میں اس کا استعمال یوں ہو گا کہ ان دونوں مواقع پر کہے الفاظ منتشر تاویلات اور تشریحات کی نظر ہو کر اختلاف کی جڑیں مضبوط کیا کریں گے۔

حج مکمل ہو گیا۔ زائرین مدینہ کے لیے واپس ہوئے تو راستے میں ایک چشمے کے پاس رات بسر کرنے کے لیے ٹھہرے۔ یہ جگہ 'غدیر خم' کہلاتی ہے، یعنی خم کا تالاب۔ علی بھی یمن میں ایک مزاحمتی قبیلے یا گروہ کی کامیابی سے سرکوبی کرنے کے بعد یہیں پہنچ گئے۔ اس مہم کے نتیجے میں نہ صرف جنوب میں محمدؐ کی راہ میں حائل آخری رکاوٹ دور ہو گئی تھی بلکہ اچھا خاصا مال غنیمت بھی ہاتھ آیا تھا۔ یہی نہیں بلکہ یہ قبائل باقاعدگی سے مدینہ کے خزانے کو خراج ادا کرنے پر بھی راضی ہو گئے تھے۔ حج کی تکمیل اور اب اس تاریخی مہم کی کامیابی کے بعد اس دن خم کے تالاب پر جشن کا سماں تھا۔ محمدؐ نے حکم دیا کہ کھجور کی شاخیں اوپر نیچے اچھی طرح جما کر رکھ دی جائیں اور اوپر اونٹ کی کاٹھی بچھا کر ایک منبر یا چبوترہ بنا لیا جائے۔ پھر، مغرب کی نماز کے فوراً بعد، انہوں نے علی کو بلایا اور انہیں اس منبر پر اپنے ساتھ شانہ بشانہ کھڑے ہونے کا حکم دیا۔ علی کا ہاتھ تھاما، ہوا میں بلند کیا اور ان کے حق میں کلمات کہے۔ محمدؐ نے کہا، 'جس کا میں مولا ہوں، اس کا علی مولا ہے'۔ پھر توقف کیا اور بیان جاری رکھا، 'اللہ اسکو دوست رکھے جو علی کو دوست رکھے اور اس کو دشمن رکھے جو علی کو دشمن رکھے'۔

شیعہ علی، یعنی علی کے پیروکار جو بعد ازاں اپنا تعارف صرف 'شیعہ' کے طور پر منتخب کر لیں گے، ان کے نزدیک اس بات کے صرف ایک ہی معنی ہیں اور وہ صاف ہیں۔ وہ یہ کہ محمدؐ نے اپنے انتہائی قریبی عزیز کو اپنا خلیفہ مقرر کر دیا۔ خلیفہ سے مراد جانشین یا وارث ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس طرح، علی اور ان کے بعد حسین اور حسین کی صورت نسلی سلسلہ بھی محمدؐ کی جانشینی اور وراثت کا جائز حقدار ٹھہرا۔ دوسری طرف وہ لوگ جو بعد میں خود کو 'سنی' کہلوائیں گے، مراد وہ لوگ جو 'سنت' یا محمدؐ کے طریقہ کار کو ماننے والے، ان کے نزدیک یہ بات درستی سے کوسوں دور ہے۔ اگر پیغمبر خدا کی یہی مرضی تھی تو انہوں نے واضح الفاظ میں ایسا کیوں نہیں کہا؟ دلیل کی پختگی کے لیے کہا جائے گا کہ خم کے تالاب پر پیش آنے والا واقعہ اور محمدؐ کی علی کے لیے دعائے خیر اور جوش و خیرہ انسیت اور محبت کا بے ساختہ اظہار تھا۔ کسی بھی شخص کو علی کی محمدؐ سے نسبت اور قربت یا ان کی قدر و اہمیت پر شک نہیں ہے۔ لیکن، نسل در نسل وراثت اور جانشینی، وہ کہیں گے کہ در اصل اسلام کی روح کے خلاف ہے۔ دین میں تو خدا کے نزدیک سب ہی انسان برابر ہیں۔

مزید برآں، کہا جائے گا کہ محمدؐ نے علی کے لیے لفظ 'مولا' استعمال کیا۔ ساتویں صدی عیسوی کی عربی زبان میں تقریباً ہر لفظ کی طرح اس کے بھی کئی معنی اور مفہوم نکلتے ہیں۔ اس کا مطلب آقا یا متولی یا سرپرست یا قائد یا دوست یا ہمدم کچھ بھی نکل سکتا ہے اور ہر معنی سیاق و سباق سے جڑا ہے اور صورتحال کے اسی سیاق پر ہمیشہ بحث جاری رہے گی۔ علاوہ ازیں، اس شام محمدؐ کے اعلان کا دوسرا حصہ بھی جزئیات سے خالی ہے۔ 'اللہ اسکو دوست رکھے جو علی کو دوست رکھے اور اس کو دشمن رکھے جو علی کو دشمن رکھے'، یہ ایسا فارمولا ہے جو جدید ادوار کے سیاسی اسلوب کی زبان میں روبہ زوال ہو کر بہت ہی عام سی مثال بن چکی ہے جسے آج ہم، 'میرے دوست کا دشمن میرا بھی دشمن ہے' یا 'میرے دوست کا دوست میرا بھی دوست ہے' وغیرہ جیسی عبارات کی شکل میں جانتے ہیں۔ یہ اس دور میں ایسی عبارت تھی جو سیاسی، غیر سیاسی ہر لحاظ سے اتحاد یا دوستی کے اظہار کے لیے ویسے ہی استعمال کی جاتی تھی جیسی کہ محمدؐ نے کر رکھی ہے۔ اس وقت حالات و واقعات کی بدولت، محمدؐ کے انہی الفاظ کی وجہ سے علی کو عزت اور تکریم ضرور حاصل ہو گئی لیکن کیا وہ اس طرح محمدؐ کے جانشین مقرر ہو گئے؟ یہ طے ہونا ابھی باقی تھا اور جیسا کہ ہم پوری تاریخ میں دیکھتے آئے ہیں، جلد ہی یہ تاریخی ریکارڈ کی بجائے اعتقاد کا معاملہ بن کر رہ جائے گا۔ تاریخ میں صاف نظر آتا ہے کہ اس واقعہ کے صرف دو ماہ بعد ہی محمدؐ کا انتقال نہ ہوتا یا کیے وہ اس دن کے بعد تادیر زندہ رہتے تو شاید یہ معاملہ کسی بھی طرح اس قدر اہمیت اختیار نہ کرتا۔

مدینہ پہنچنے کے چند ہفتے بعد ہی انہیں بیماری نے پوری طرح آلیا۔ پہلے تو سب کا یہی خیال تھا کہ شاید یہ سر درد کا شدید دورہ ہے جو متوقع طور پر ایک یا دو دن میں اتر جائے گا، نہیں تو جیسے ہوتا آیا تھا، زیادہ سے زیادہ تین یا چار دن میں تو ضرور ہی ٹھیک ہو جائے گا۔ لیکن، ایسا نہیں ہوا۔ سر میں شدید درد ہوتا، کبھی کبھار اتر جاتا اور زیادہ تر میگرین کی شکل اختیار کر لیتا جس سے کنپٹی پر نسیں پھولنے لگتیں اور پورا جسم پسینے میں شرابور ہو جاتا۔ دن بدن، یہ درد بدتر ہوتا گیا۔ پھر، ایک دن تاپ بھی چڑھ گیا اور اس کے ساتھ حالت مزید بگڑنے لگی۔ درد کی اتنی شدید ٹیسیں اٹھتیں کہ گردن سے ہوتی ہوئی ریڑھ کی ہڈی میں اندر تک کھب جاتیں۔ ایسا لگتا کہ جیسے کوئی نوکیلی چیز سے مسلسل چھید کر رہا ہے۔ اسی درد کی شدت کے باعث آپؐ کی کمر میں تشنج کی سی مستقل اکڑن اور کھنچاؤ پیدا ہو گیا۔ محمدؐ کے اصرار پر انہیں عائشہ کے کمرے میں منتقل کر دیا گیا اور وہ سارا وقت وہیں پتھر کی سلیٹ پر لیٹے رہتے جبکہ بیویاں باری باری ان کی دیکھ بھال کرتیں۔

یہ مئی کے مہینے کا آخر تھا اور صحرا میں گرما کے موسم کی شدت بڑھتی جا رہی تھی۔ گرمی اور حبس کے باعث اس چھوٹے سے کمرے میں صحتمند آدمی کا دم گھٹنے لگتا، محمدؐ کی حالت تو پہلے ہی خراب تھی، اب بالکل ہی غیر ہو گئی۔ سر درد، بخار اور تشنج کے ساتھ ثور اور روشنی سے بھی شدید تکلیف رہنے لگی۔ روشنی کا تو کچھ نہ کچھ انتظام کیا جا سکتا تھا، مثلاً دروازے اور روشن دانوں پر پردے گرا دیے جاتے لیکن خاموشی برقرار رکھنے کا کوئی طریقہ نہیں تھا۔ عائشہ کا رہائشی کمرہ باقاعدہ مریض کمرہ بن چکا تھا۔ مشرق وسطیٰ میں جیسے آج، ویسے ہی تب بھی مریض کا کمرہ عام طور پر تیمارداروں سے بھرا رہتا تھا۔ رشتے دار، دوست، ساتھی اور حمایتی۔۔۔ وہ تمام لوگ جو طاقت کے مرکز سے تعلق رکھتے یا سمجھتے تھے کہ وہ اس کا حصہ ہیں، ہر وقت، دن اور رات موجود رہتے۔ فکر کا اظہار کرتے، مشورے دیتے، تیمارداری میں مصروف اور بار بار بلا وجہ صحت سے متعلق ایک ہی سوال کئی صورتوں میں دہرایا جاتا۔ بیماری کی اس حالت میں بھی، محمدؐ انہیں نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ یہاں بھی تقاضوں سے فرار نہیں تھا کیونکہ بہت کچھ ہے جس کا آپؐ پر انحصار تھا۔

بیویاں اس خیال سے کہ شاید اسی طرح بخار اور سر کا درد جسم سے نکل جائے، اس سے چھٹکارا مل جائے۔ وہ کپڑے کی پٹیاں ٹھنڈے پانی میں بھگو کر ماتھے پر دھرتی رہیں لیکن اگر اس سے کچھ افاقہ ہوتا بھی تھا تو عارضی تھا۔ جس رفتار اور شدت سے حالت بگڑ رہی تھی، وہ یقیناً سمجھ گئی ہوں گی کہ عام بخار ہے اور نہ ہی یہ صرف میگرین کا دورہ ہے بلکہ یہ تو وہ بیماری ہے جس کے بارے مشرق وسطیٰ کا بچہ بچہ معلوم تاریخ سے واقف چلا آ رہا تھا۔

قدیم سمیری زبان میں درج ایک منتر کا خلاصہ کچھ یوں ہے کہ، 'سر کا درد صحرا میں یوں پھرے جیسے سنسناہٹ ہو اچلتی ہوئی / آسمانی بجلی جیسے کڑکتی، اوپر اور نیچے گرتی ہوئی / اتنی روشن جیسے کوئی ٹوٹا ستارہ، شبنم کی طرح غائب سے آتی ہوئی / مسافروں کی راہ روک کر کھڑی، رات دن کی طرح پیچیدگیاں کرتی ہوئی / جس شخص کو اس نے آلیا، یہ

اس پر پلتی ہے/جیسے کوئی ہولناک آندھی، موت جو زندگی کو نگلتی ہوئی'۔ یہ صرف سر درد اور موسمی بخار نہیں تھا بلکہ ایک انتہائی مہلک اور مرگ آور بیماری کا حملہ تھا۔ جس طرح کی علامات رقم ہیں اور بیماری کی طوالت، یعنی دس روز۔۔۔ اس عارضے کی کلاسیکی نشانیاں ہیں۔ آج ہم اس جراثیمی مرض کو 'سرسام'، 'گردن توڑ بخار' یا 'ورم سجایا' کہتے ہیں۔

یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ آخر محمدؐ کو یہ بیماری کیسے لگی۔ ان کے چند پیروکاروں کا خیال تھا کہ یہ ان کی قبرستان میں کئی کئی روز تک مسلسل شب بیداری کا نتیجہ ہے، جو انہوں نے مکہ سے واپسی کے بعد دوبارہ سے معمول بنالیا تھا۔ روایت میں بتایا جاتا ہے کہ محمدؐ مردوں کو مخاطب کر کے کہا کرتے، 'اے اہل قبور! تم پر رحمت ہو' اور پھر ان سے جلد ہی ملنے کا وعدہ کرتے، 'اللہ نے اپنے ایک اور بندے کو پاس بلانے کا فیصلہ کر لیا ہے اور وہ بندہ جلد ہی اس کے حکم کی تعمیل کرے گا'۔ یقیناً ناتوانی، تھکن اور ریاستی معاملات کے دباؤ کے باعث اعصابی کمزوری کی وجہ سے وہ خاصے زد پذیر ہو چکے تھے۔ دن بدن ان کی قوت مدافعت جواب دیتی جا رہی تھی۔ پھر اسی طرح، احد کی لڑائی میں پیشانی پر لگنے والی کاری چوٹ کا بھی دوش ہے۔ سرسام کا جرثومہ کھوپڑی میں ایک انتہائی باریک دراڑ سے بھی داخل ہو سکتا ہے۔ پھر، دماغ اور ریڑھ کی ہڈی پر چڑھی حفاظتی جھلی، یعنی 'سجایا' میں سوزش کا باعث بن جاتا ہے۔ اسی وجہ سے اس بیماری کو 'ورم سجایا' بھی کہا جاتا ہے۔ آج جدید دور میں بھی اکثر گردن توڑ بخار کی یہ بیماری مہلک ثابت ہو سکتی ہے۔ ساتویں صدی عیسوی میں، جب اینٹی بائیوٹک وغیرہ بھی نہیں تھیں، اس بیماری سے ہلاکت یقینی تھی۔ تب، یہ لاعلاج مرض ہوا کرتا تھا۔

اگرچہ محمدؐ نے حج کے موقع پر صاف صاف کہہ دیا تھا کہ وہ زیادہ دیر جینے کی توقع نہیں رکھتے، اسی طرح قبرستان میں شب بیداری کے دوران بھی وہ مر جانے والوں کے ساتھ ملنے کی بات کرتے رہے تھے۔ اب بھی، جب ان کی بیماری روز بروز بگڑتی جا رہی تھی اور علامات کچھ اچھی نہیں تھیں، پھر بھی لوگ اس حقیقت کو تسلیم کرنے سے گریزاں تھے۔ یہ دسویں اور آخری روز ہی ہو گا جب محمدؐ کے علاوہ باقی سب بھی پہلی بار واقعی تسلیم کر لیں گے کہ وہ مر رہے ہیں۔

مریض کمرے کے باہر، مسجد کا احاطہ لوگوں سے کچھا کچھ بھرا ہوا تھا۔ یہ لوگ دن اور رات، یہیں پڑاؤ ڈال کر بیٹھ گئے تھے۔ گھروں کو بھی نہ جاتے اور وہیں سو جاتے یا یوں ہی بیٹھے رہتے۔ محمدؐ کی صحت بارے متفکر اور ان کی حالت بارے جاننے کے لیے بے تاب رہتے، ہر شخص کی آنکھیں عائشہ کے کمرے پر جمی ہوئی اور کان آپؐ بارے خبریں سب سے پہلے سننے کو دھرے ہوئے تھے۔ لوگوں کے لیے یہ بات ناقابل یقین تھی کہ محمدؐ بھی مر سکتے ہیں، وہ بھی اس وقت، جب کہ ابھی حال ہی میں پورا عرب ان کے جھنڈے تلے جمع ہو چکا تھا؟ یہ ایک نئے دور کی شروعات تھی اور اس تابناک صبح کے طلوع ہوتے ہی، آخر ایسا کیسے ممکن ہے؟ خدا کا رسول بھی مر سکتا ہے؟ جب پہلی بار مستقبل انتہائی روشن نظر آ رہا ہے اور امید سے پر ہے، پھر بھی مر سکتا ہے؟

یقیناً، لوگوں کی اتنی بڑی تعداد کا یوں مسجد کے احاطے میں جمع ہونے کا مطلب یہ ہے کہ کسی نہ کسی سطح پر سب ہی جانتے تھے کہ کیا ہونے جا رہا ہے۔ اگرچہ انہیں ادراک تھا لیکن اس سچائی کو ماننے سے انکاری تھے۔ جیسے، ان کے نہ ماننے سے حقیقت بدل جائے گی۔ محمدؐ کی کرشماتی شخصیت ہی ایسی تھی کہ لوگ ابھی تک اس خیال خام کے ساتھ بندھے ہوئے تھے کہ شاید، وائے شاید آپؐ باقی لوگوں کی طرح فانی نہ ہوں؟ چنانچہ، وہ انتظار کرتے رہے اور مسجد کے احاطے میں پھیلی ہوئی اداسی اور چپ کے بیچ لوگوں کی زیر لب دعائیں اور خیر کے کلمات سے یوں گونجتا رہا جیسے شہد کی مکھیاں بھنبھنا رہی ہوں۔ عائشہ کے رہائشی کمرے کے گرد فضا بوجھل ہو رہی تھی اور ماحول افسردہ تھا۔

کئی دن گزر گئے لیکن محمدؐ باہر نہیں نکلے، ہر لمحے کے ساتھ لوگوں میں بے چینی پھیل رہی تھی۔ تشویش بڑھنے لگی اور لوگ پہلے سے زیادہ فکرمند ہو گئے۔ وقت کے ساتھ امید دم توڑ رہی تھی اور مدینہ بھر میں اب ماحول ایسا تھا کہ جیسے یہ شہر مغلوب ہو چکا ہے۔ اب لوگ ناقابل تصور حقیقت کا سامنا کرنے کے لیے، قدرے تیار تھے۔ یہ خیال، تقریباً ہر شخص کے ذہن کو کچوکے لگا رہا تھا لیکن منہ پر لانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ یہ ایک بے آواز خیال تھا۔ اگر اس کو زبان مل جاتی تو اس کا

مطلب اعتراف تھا۔ اس بات کا اعتراف، ایک نئے سوال کو جنم دے دیتا، اور وہ سوال بہت بڑا تھا۔ یعنی، محمدؐ کے بعد رہنما کون ہو گا؟ کیا یہ علی ہوں گے جو آپؐ کے چچازاد اور داماد ہیں۔ انہیں تو غدیر خم میں عزت بھی بخشی تھی؟ یا پھر ابو بکر، جو محمدؐ کے دیرینہ ساتھی ہیں، ان کے ساتھ مکہ سے مدینہ سفر کیا تھا اور ان دونوں کے بیچ خاصی انسیت اور احترام کا رشتہ تھا؟ یہ دونوں نہیں تو پھر جنگجو عمر۔۔۔ جن کی صرف آواز سے ہی لوگوں کے دل دہل جاتے ہیں؟ کون ہے، جو اختیار سنبھالے گا؟ یا کیسے، کون ہے، جو اس کو حاصل کرنے کے لیے آگے بڑھے گا؟ لوگ، جو پہلے اس خیال کو زبان پر لانے سے قاصر تھے، اب جا کر پہلی بار یہ محسوس کرنے لگے کہ محمدؐ کے لیے وصیت لکھوا کر جانا لازم ہے تاکہ جنم لینے والے مشکل سوالوں کا حل آسان ہو جائے۔ یہ سننے میں بہت عجیب بات ہے لیکن صورتحال یہ ہو گئی کہ اب لوگوں کے لیے آپؐ کے گزر جانے سے کہیں زیادہ جانشینی کا سوال اہم ہو چکا تھا۔ یہ سوال جس قدر اہمیت اختیار کر لے، محمدؐ نے بہر حال وصیت نہیں کی۔

کیوں نہیں؟ ان کا ارادہ کیا تھا؟ یہ ایسے سوالات ہیں، جو آنے والی صدیوں میں اسلام کا ہمیشہ پیچھا کرتے رہیں گے۔ ہر شخص یہ دعویٰ کرے گا کہ وہ جانتا ہے کہ اس بابت محمدؐ کیا سوچتے آئے تھے، یا کہے گا کہ اس کو ادراک ہے کہ محمدؐ اسلام کا مستقبل کیسا دیکھنا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے لیے ہر آدمی کے پاس دلائل ہوں گے اور وہ اس ضمن میں بصیرت اور فراست کی کئی توجیہات پیش کی جائیں گی۔ حالانکہ، غیر مبہم اور صاف صاف انداز میں جانشین مقرر نہ کرنے کی وجہ سے، کوئی بھی شخص ایسا کسی بھی قسم کا دعویٰ کرنے کا روادار نہیں ہو سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس بابت اگر کوئی شخص، انتہائی آسانی کے ساتھ ایک دلیل پیش کر کے جانشین کا تقرر کر سکتا ہے تو دوسری جانب اتنی ہی بڑی تاویل کے ساتھ جانشینی کا یہ دعویٰ رد کرنا بھی خاصا سہل ہے۔ محمدؐ کی بیماری کے آخری دس دنوں میں، وہ تمام حضرات جو بعد ازاں ایک یا دوسری صورت، اسلام کے 'پانچ خلفاء' کہلائے جائیں گے، کئی بار ان کے کمرے میں آتے جاتے رہے۔ ان میں دو آپؐ کے سسر یعنی ابو بکر اور عمر، دو داماد یعنی علی اور عثمان اور ایک برادر نسبتی یعنی معاویہ تھے۔ بالآخر یہ تمام اشخاص اقتدار اور اختیار کی کرسی پر براجمان ہو ہی جائیں گے لیکن اس وقت سوال یہ تھا کہ ان میں سے کون پہلے اور کون بعد میں، کس ترتیب اور کس وجہ سے خلیفہ مقرر ہو گا۔ اسی پر عدم اتفاق تھا اور یہ قضیہ ہمیشہ باقی رہنے والا تھا۔

سنی محققین اور علماء کا خیال یہ ہے کہ محمدؐ کو اپنے رفقاء اور ساتھیوں کی راست بازی، شخصی سالمیت اور نیک خواہی پر اتنا یقین تھا کہ وہ ان کے بیچ فیصلہ کرنے سے گریزاں رہے۔ چنانچہ، پہلے پہل تو انہوں نے یہ فیصلہ خدا کی قدرت پر یقین رکھتے ہوئے، ان کے بیچ ہی چھوڑ دیا کہ بالآخر یہ درست فیصلے تک پہنچ ہی جائیں گے۔ یہ دلیل محمدؐ سے منسوب اس روایت سے اخذ کردہ ہے کہ، 'اللہ میری امت کو ضلالت و گمراہی پر مجتمع نہیں کرے گا'۔ اگرچہ اس روایت اور دلیل سے عام اتفاق رائے کی توثیق ہوتی ہے لیکن جو ہوا، وہ اس کے بالکل برعکس تھا۔ آگے چل کر اس توجیہ کے معنی یوں نکالے جائیں گے کہ وہ جو اکثریت سے اختلاف رکھتے ہیں، دراصل 'ضلالت'، 'گمراہی' یا 'غلطی' پر ہیں۔ اختلاف رائے کا مطلب یہ لے لیا جائے گا کہ وہ سچ مچ، کھلے دل کے ساتھ امہ کا حصہ نہیں ہیں۔ دوسری جانب، شیعہ عالمین کی دلیل یہ ہے کہ محمدؐ نے پہلے ہی علی کو اپنا جانشین مقرر کر دیا تھا اور وہ دوبارہ اس کا اعادہ کر لیتے، اگر مریض کمرے میں، آخری دنوں میں ان کی وصیت لکھوانے کی خواہش کو واقعی پورا ہونے دے دیا جاتا۔ ان کی اس آخری کوشش کو سبوتاژ نہ کیا جاتا۔

محمدؐ کو ہمیشہ ایک ہی چیز نے پریشاں رکھا اور وہ تفریقیت یا انقسام تھا، لیکن اب وہی چیز منہ پھلائے سامنے کھڑی تھی۔ افسوسناک بات یہ تھی کہ اس سے بچ بچاؤ کی سبیل، ان کے بس میں نہیں تھی۔ آپؐ کی بیماری کی وجہ سے اردگرد، ان کے انتہائی قریبی لوگوں کے بیچ آزردگی اور حسد کو ایک نئی زندگی مل چکی تھی۔ خود ان کا بخار اتنا بڑھ چکا تھا کہ اب ان کی سر سے بگڑنے لگی، وہ ہوش اور بے ہوشی کی حالت کے بیچ معلق ہو کر رہ گئے۔ اس حالت میں وہ اپنے گرد جاری بحث و مباحثے کو سن تو سکتے تھے لیکن بگڑتی ہوئی جسمانی کیفیت کے باعث اسے روکنے سے قاصر تھے۔

الطبری نے آپؐ کی بیماری کے نویں دن پیش آنے والے ایک مکالمے کا احوال لکھا ہے جس سے اس وقت درپیش انتہائی پریشان کن صورتحال کا پتہ چلتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ محمدؐ سخت ناتوانی کے باوجود طاقت مجتمع کر کے بیٹھے اور علی کو بلا کر لانے کو کہا جو اس وقت مسجد میں عبادت کر رہے تھے۔ لیکن، کسی نے بھی انہیں

نہیں بلایا۔ بجائے، عائشہ نے اپنے والد سے بات کرنے پر اصرار کیا، 'ان کی بجائے کیا آپؐ ابوبکر سے نہیں ملیں گے؟'۔ اس وقت حفصہ بھی وہیں موجود تھیں، انہوں نے بھی آؤ دیکھا نہ تاؤ، جلدی سے اپنے والد کو بلالانے کا مشورہ دیا، 'یا پھر، آپؐ عمر سے مل لیں؟'۔ محمدؐ کی حالت پہلے ہی غیر تھی، اب ان دونوں کی تکرار اور یوں اپنی ہی بات پر مصر دیکھ کر ہاتھ کے اشارے سے عائشہ اور حفصہ کی ہاں میں ہاں ملادی۔ ابوبکر اور عمر کو تو اندر بلالیا گیا لیکن علی باہر ہی رہے۔

یہاں ایک بیمار شخص کو خوشامدانہ طریقے سے اپنی مرضی پر مائل کرنا عجیب معلوم ہوتا ہے بلکہ صاف کہیے تو یہ کٹھورپن ہے۔ لیکن، ان دونوں، یعنی عائشہ اور حفصہ سے بھی کیا گلہ جو اس وقت صرف اپنے ہی تحفظ بارے سوچ سکتی تھیں اور علی کی بجائے اپنے اپنے والد، یعنی ابوبکر اور عمر کے مفادات کا تحفظ کر رہی تھیں؟ وہ جانتی تھیں کہ محمدؐ کے بعد ان کے سامنے ہمیشہ بیوہ رہ کر ایک طویل عمر گزارنی ہوگی۔ انہیں ایک طویل اور چشم نما مستقبل کا سامنا تھا۔ اس مریض کمرے میں لوگوں کا ہجوم تھا اور اس مجمع کا ہر شخص امہ کے مفادات کا تحفظ چاہتا تھا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ، خود اپنی حیثیت بھی برقرار رکھنے کی کوشش بھی ضروری تھی۔ صرف عائشہ اور حفصہ ہی نہیں، اس وقت ہر شخص اس ضمن میں مجبور تھا۔ جیسا کہ سیاست میں عام ہوا کرتا ہے، ہر اہم شخص اس بات پر قائل رہتا ہے کہ اس کے انفرادی اور قوم کے اجتماعی مفادات ایک ہی ہیں۔ آگے چل کر الطبری 'کاغذ اور قلم' کا واقعہ بیان کرتے ہیں، جس میں سیاست کی اسی گھن چکری کا عنصر صاف ملتا ہے۔

ابوبکر اور عمر کی موجودگی میں محمدؐ کی طبیعت قدرے سنبھل گئی۔ جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے، خاتمے سے پہلے اکثر لوگوں کی صحت پر بہتری کا گماں ہوتا ہے۔ تکیے کے سہارے بیٹھے تو خاصے ہشاش بشاش لگ رہے تھے۔ تھوڑا سا پانی پیا اور پھر جیسے کئی لوگ آج بھی کہتے ہیں کہ انہوں نے اپنی مرضی واضح کرنے کی آخری کوشش کی۔ لیکن، جیسے پہلے ویسے ہی اس موقع پر بھی بیان خاصا مبہم سا ہے۔ 'لکھنے کا سامان لے آؤ تاکہ میں تمہیں کچھ کہوں اور تم اسے لکھ لو۔ اس کے بعد تم کبھی بھی گمراہی اور ضلالت کا شکار نہیں ہوگے'، وہ رک رک کر کہہ رہے تھے۔

دیکھنے میں یہ نہایت سادہ اور صاف درخواست تھی۔ یہ صورتحال کے پیش نظر معقول بات بھی تھی۔ لیکن ہوا یہ کہ کمرے میں موجود افراد میں یہ سنتے ہی افراتفری پھیل گئی۔ محمدؐ کیا لکھوانا چاہتے تھے؟ کیا یہ سادہ ہدایات تھیں، جن کے تحت آگے کا لائحہ عمل طے کیا جاسکتا تھا؟ یا پھر یہ دینی تعلیمات تھیں جو وہ پیچھے رہ جانے والے امتیوں کے لیے چھوڑنا چاہ رہے تھے؟ یا یہ وہی تھا جو اس موقع پر انتہائی ضروری تو تھا لیکن لوگ اسی سے شاکی بھی تھے۔ یعنی، کیا محمدؐ وصیت لکھوانے جا رہے تھے؟ کیا مرتے ہوئے، صورتحال کو بھانپ کر پیغمبر خدا اب حتمی طور پر اپنا جانشین نامزد کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے؟

محمدؐ کیا لکھوانا چاہتے تھے، یہ جاننے کا صرف ایک ہی طریقہ تھا اور وہ یہ کہ انشاء نویس کو بلایا جاتا مگر ایسا نہیں ہوا۔ بجائے، کمرے میں موجود افراد کے بیچ بحث شروع ہو گئی۔ کہا گیا کہ محمدؐ بیماری کے سبب ناتواں اور سخت دباؤ کا شکار ہیں تو بہتر یہ ہوگا کہ انہیں آرام کرنے دیا جائے۔ مریض کمرے میں سکون ہونا چاہیے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جب وہ مریض کی ضرورتوں پر زور دے رہے تھے، ان کی آوازیں اونچی ہوتی چلی گئیں۔

یہ نہایت عجیب و غریب منظر ہے۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ شخص جس کی اطاعت اور فرمانبرداری کی ان میں سے ہر شخص نے بارہا قسم کھائی تھی، وہ ہمیشہ ہی اطاعت گزار چلے آئے تھے، اب مرتے ہوئے اپنی خواہشات کا اظہار کرنا چاہتا تھا، ممکنہ طور پر اپنا جانشین بھی مقرر کر لیتا۔ جانشینی واحد شے تھی جو اس کمرے میں موجود ہر شخص جاننے کے لیے بے تاب تھا لیکن وہیں یہ واحد شے تھی جس کو جاننے کی کسی کو خواہش نہیں تھی۔ مجموعی طور پر کہیے تو یہ خالصتاً بشری صفات اور کمزوریوں سے بھرپور منظر ہے۔ ہر شخص متفکر تھا۔ ہر آدمی کو محمدؐ کا خیال بھی تھا، وہ ایک دوسرے کو خواہ مخواہ ضد اور اصرار سے باز رہنے پر مجبور کر رہے تھے تاکہ بیماری کی حالت میں آپؐ کی زندگی آسان رہے۔ وہ سب ہی خیر خواہ تھے لیکن ہر آدمی اپنی خیر خواہی کو عجب انداز میں جتلا رہا تھا۔ ان کی آوازیں اونچی ہوتی چلی جارہی تھیں اور محمدؐ کی درخواست پر وہ خود انہی کی حالت کا نام لے کر ان کی خواہش پر عمل سے گریزاں تھے۔ جوں جوں بحث بڑھی، یہ ایک دوسرے پر چلانے لگے،

آوازیں تیز ہوتی گئیں اور نتھنے پھولنے لگے۔ اس قدر شور ہوا کہ محمدؐ کی برداشت جواب دے گئی۔ 'مجھے اکیلا چھوڑ دو' انہوں نے سب کو چپ کرا دیا، 'میری موجودگی میں ان بن اور لڑائی بند کرو'۔

اس کشمکش کے باعث وہ اس قدر ناتواں ہو چکے تھے کہ یہ الفاظ ان کے منہ سے بمشکل سرگوشی بن کر نکلے۔ صرف عمر تھے جو انہیں سن پائے اور یہ کافی تھا۔ اپنی زور آور طبیعت اور سب سے کھری اور اونچی آواز کا فائدہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے حکم صادر کیا، 'رسول خدا کا درد بڑھ گیا ہے۔ ہمارے پاس قران ہے۔ قران خدا کی کتاب ہے اور ہمارے لیے صرف یہی کافی ہے'۔

تاہم، بعد ازاں یہ کافی ثابت نہیں ہوا۔ شاید یہ کافی بھی ہوتا بلکہ کہیے کافی ہونا چاہیے تھا۔ عمر کے الفاظ آج بھی یقین اور کامل ایمان کی مثال بنا کر پیش کیے جاتے ہیں، لیکن بہر حال تب یہ ہوا کہ یہ کافی ثابت نہیں ہوا۔ وقت آئے گا کہ قران کے ساتھ سنت کا ضمیمہ بھی شامل کیا جائے گا۔ سنت، یعنی محمدؐ کے اقوال و افعال کی وہ ہزاروں روایات ہیں جو احادیث کی شکل میں ان لوگوں نے جمع کیں جو محمدؐ کے انتہائی قریبی ہونے کے دعویدار تھے۔ بعد ازاں انہی احادیث پر عالمین اسلام و شاہی نے فیصلے صادر کر کے مقولات اور افعال کی مثالوں کو مروجہ طور پر شرعی قوانین میں ڈھال دیا۔ لیکن یہ بہت بعد کا قصہ ہے۔ اس دن تو عمر کا حکم چل کر رہا۔ ان کے زور دار الفاظ نے وہی اثر کیا جو من چاہا تھا، مریض کمرے میں ایک دم کھسیانی خاموشی چھا گئی۔ اگر محمدؐ واقعی جانشین کی تقرری کرنا چاہتے تھے تو انہوں نے بہت دیر کر دی تھی۔ بخار سے جسم جل رہا تھا اور پٹھوں میں شدید درد کے مروڑوں کے باعث ان کی حالت اس قدر ابتر ہو چکی تھی کہ وہ اپنی مرضی سے وصیت لکھوانے سے بھی قاصر ہو چکے تھے۔ وصیت لکھنے کے لیے انشاء نویس نہیں آسکا اور اگلی صبح طلوع ہونے تک محمدؐ ملنے جلنے سے بھی رہ گئے تھے۔

محمدؐ سمجھ گئے تھے کہ اب بس کچھ ہی دیر کی بات ہے۔ ان کا وقت آخر قریب ہے۔ صبح کے منہ اندھیرے میں انہوں نے ایک آخری درخواست کی۔ اب کی بار، ان کی مان لی گئی۔ 'میرے جسم پر سات کوزوں میں جمع کیے گئے، سات کنوؤں کا پانی ڈالو تاکہ میں باہر جا کر لوگوں کو ہدایات دے سکوں'۔ اگرچہ انہوں نے صاف صاف نہیں کہا لیکن سب ہی بیویاں اچھی طرح جانتی تھیں کہ سات کنوؤں کے پانی سے غسل کا مطلب، میت کو نہلانا ہے۔ جب یہ ہو چکا تو پھر انہوں نے فجر کی نماز کے لیے مسجد میں لے جانے کا کہا۔

انہیں سہارا دینے کے لیے دو اشخاص، علی اور ان کے چچا عباس آگے بڑھے۔ کمرے سے مسجد کا احاطے تک چند گز کا فاصلہ تھا لیکن آپؐ کی حالت ایسی تھی کہ جیسے کوئی یہ بہت دور ہو۔ بہر حال، مسجد میں، کھجور کے پتوں کی چھت کے سایے تلے پہنچ کر کھلی فضا اور سویر کی خنکی میں وہ بہتر محسوس کرنے لگے۔ وہ نڈھال تھے لیکن منبر کے چبوترے کے ساتھ ٹیک لگا کر یوں لیٹ گئے، گویا بیٹھے ہوں۔ منبر پر ان کے دیرینہ دوست ابوبکر لوگوں کی امامت کے لیے تیار بیٹھے تھے۔ اس موقع پر جتنے بھی لوگ مسجد میں موجود تھے، بعد میں سب نے ہی بتایا کہ وہ ابوبکر کو بولتا ہوا سن کر مسکرا رہے تھے۔ وہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ محمدؐ کا چہرہ تمتما رہا تھا، اگرچہ یہ معلوم نہیں کہ آیا ان کا چہرہ گزشتہ شب کے واقعے کے بعد بھی رفقاء کا نماز کے لیے اکٹھے جمع ہونے اور اپنی جماعت پر یقین کی خوشی سے دمک رہا تھا یا بخار کی وجہ سے دہک رہا تھا۔ لوگوں کی نظریں محمدؐ پر لگی ہوئی تھیں اور دوسری طرف منبر پر وہی الفاظ دہرائے جا رہے تھے جو انہوں نے پہلی بار جبرائیل سے سنے تھے۔ ان کی قدرے بہتر حالت اور اپنے درمیان دیکھ کر لوگوں کی خوشی دیدنی تھی لیکن ساتھ ہی ہر شخص اندر ہی اندر خود کو تسلی دے رہا تھا کہ شاید اب بھی وہ جانبر ہو سکتے ہیں۔ وہ انہیں آخری بار نہیں دیکھ رہے۔ انہیں دیکھ کر لگتا تھا کہ شاید سنبھل رہے ہیں اور توانائی بحال ہوتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ لوگوں کو گماں ہوا کہ معجزہ ہو چکا ہے اور اب وہ درست ہو جائیں گے۔ لیکن، جب نماز ختم ہو چکی تو علی اور عباس نے پھر انہیں سہارا دے کر عائشہ کے کمرے میں پہنچا تو دیا لیکن اب ان کے پاس صرف چند گھنٹے باقی تھے۔

بعض لوگ دوسروں سے زیادہ معاملہ فہم تھے۔ 'اللہ کی قسم اٹھا کر کہتا ہوں کہ میں نے رسول خدا کے چہرے پر موت کے سائے دیکھے ہیں'، عباس نے علی سے کہا۔ وہ ابھی ابھی انہیں عائشہ کے کمرے میں پہنچا کر باہر آئے تھے۔ یہ آخری موقع تھا۔ وہ انہیں جانشینی کا قضیہ طے کرنے پر راضی کر سکتے تھے۔ 'چلو واپس چلیں اور ان سے صاف صاف پوچھیں۔ اگر اختیار ہمیں دے دیا گیا تو ہمیں معلوم ہو گا کہ کیا کرنا ہے۔ اگر سب کچھ دوسروں کو بھی دے دیا تو پرواہ نہیں، مگر ہم ان سے کہیں گے کہ وہ انہیں ہمارے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے کی تاکید کریں'۔

لیکن، علی میں ہمت نہیں تھی کہ وہ واپس جاتے اور ایک بار پھر محمدؐ کو اس حالت میں پریشان کرتے، تناؤ کا باعث بنتے۔ یا ہو سکتا ہے، دوسروں کی طرح وہ بھی معاملات کی اس قدر صراحت اور وضوح کے لیے تیار نہیں تھے۔ 'واللہ، میں نہیں جاؤں گا'، علی نے کہا۔ 'اگر یہ ہم سے لے لیا جاتا ہے تو محمدؐ کے بعد، وہ بھلے تاکید کر کے گئے ہوں، ہمیں کوئی نہیں دے گا'۔

اس بحث کے باوجود، اگر وہ واپس اندر چلے بھی جاتے تو اب اس کا فائدہ نہیں تھا۔ یہ دونوں ابھی یہی باتیں کر رہے تھے کہ وہاں محمدؐ پر غشی طاری ہو گئی اور وہ بے ہوش ہو گئے۔ اس کے بعد دوبارہ جانبر نہیں ہو سکے۔ 8 جون 632ء، سوموار کے دن دوپہر کے وقت، محمدؐ انتقال کر گئے۔

عائشہ بتاتی ہیں کہ جب نزع کی حالت تھی تو محمدؐ کا سر ان کی گود میں دھرا تھا۔ عربی میں ان کے الفاظ کچھ یوں ہیں کہ، 'سینے اور منہ کے درمیان تھام رکھا تھا۔۔۔'۔ بیان کے مطابق انہوں نے محمدؐ کو تھام رکھا تھا۔ اچانک انہیں لگا جیسے ایک دم محمدؐ کا سر بوجھل ہو گیا ہے۔ محمدؐ کی طرف دیکھا تو وہ جا چکے تھے اور آنکھیں زندگی سے بالکل خالی تھیں اور ان میں موت جھانک رہی تھی۔ ان کا یہ بیان سنی روایت کا حصہ بن جائے گا لیکن ایسا نہیں ہے کہ ہر شخص ان کے اس بیان سے متفق ہو۔ شیعہ کہا کریں گے کہ جب محمدؐ کا انتقال ہوا تو اس وقت ان کا سر عائشہ نہیں بلکہ علی کے سینے پر ٹکا ہوا تھا۔

مرتے ہوئے محمدؐ کو کس نے تھام رکھا تھا، اس کی اہمیت تھی۔ وہ شخص نہایت خاص تھا جس نے ان کی آخری سانس اپنی جلد پر محسوس کی، جس کے جسم کے ساتھ وہ چمٹے ہوئے تھے یا جس کی بانہوں نے انہیں سہارا دے رکھا تھا۔۔۔ الغرض اس طرح کی چھوٹی سے چھوٹی بات بھی بعد ازاں انتہائی اہم بن جائے گی۔ اتنی اہم کہ جیسے محمدؐ کی روح نے جسم سے نکل کر اس شخص جسم میں اس کی روح کے ساتھ بسیرا کر لیا ہو، جس نے انہیں اس وقت تھام رکھا تھا۔ کیا یہ عائشہ تھیں یا علی؟ عائشہ اس شخص کی بیٹی ہیں جو اسلام کے پہلے خلیفہ ہوں گے اور دوسری طرف علی ہیں، جن کے بارے اتنی صدیوں کے بعد آج بھی لوگوں کی ایک بڑی تعداد قائل ہے کہ خلافت پر پہلا حق، ان ہی کا تھا۔

علی یا عائشہ، ان میں سے جو بھی تھا۔۔۔ اسے محمدؐ کے گزر جانے کی اطلاع باہر پہنچانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ کمرے میں آہ و بکا اور رواس پٹاس شروع ہو گئی۔ بیویاں چلانے لگیں۔ ان کی چیخیں اس قدر تیز اور دلخراش تھیں کہ دور سے ایسے لگتا جیسے کوئی زخمی جانور، جھاڑیوں کے پیچھو درد سے کراہتے ہوئے جان دے رہا ہے۔ بین میں اس قدر درد اور کرب بھرا ہوا تھا کہ بیان سے باہر ہے۔ رونے کی آوازیں مسجد سے نکل کر نخلستان میں پھیل گئیں، جو سنتا وہی اشک بار ہو جاتا اور عورتوں کے بین سے پورے مدینہ میں شور و غوغا ہو رہا تھا۔ ہر گھر میں ماتم تھا۔ مرد اور عورتیں، بچے اور بوڑھے الغرض ہر شخص غم سے نڈھال اور گریہ و بکا کر رہا تھا۔ لوگ یقین نہیں کر پا رہے تھے لیکن ظاہر ہے، قدرت کے سامنے انہیں گھٹنے ٹیکنے ہی بنی۔

'ہم سیاہ اندھیری رات میں، طوفان میں گھرے ہوئے منتشر بھیڑوں کی طرح تھے جو افراتفری کے عالم میں یہاں وہاں دوڑتی پھرتی ہیں'، ایک شخص نے اس دن کا احوال بتایا ہے۔ بھیڑیں، جن کو ہانکنے کے لیے چرواہا اور نہ ہی چھپنے کے لیے چھت باقی تھی۔ لوگ صرف مرنے والے کے لیے ماتم کناں نہیں تھے بلکہ وہ خود اپنے لیے بھی غمگین تھے، واویلا مچا رہے تھے۔ وہ محمدؐ کے بعد بے قائد ہو چکے تھے۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ انہوں نے ابھی صبح ہی تو محمدؐ کو مسجد میں دیکھا تھا، جب وہ

نماز میں سجدے ٹیک رہے تھے، انہیں دیکھ کر آپؐ کا چہرہ تمتما رہا تھا؟ اس بات کا تصور کرنا بھی محال تھا، یہ خیال ہی ڈراونا تھا کہ محمدؐ اب نہیں رہے۔ اس خبر پر یقین کی کوئی صورت ہی نہیں تھی۔

یہاں تک کہ انتہائی سخت دل اور جان جنگجو، عمر بھی اس حقیقت کو ماننے سے قاصر تھے۔ وہ شخص جو ابھی گزشتہ روز ہی زور دار آواز میں کہہ رہا تھا کہ ان کے لیے صرف قران ہی کافی ہے، اب ایک دم عام لوگوں کی ہی طرح خوف زدہ اور افراتفری کا شکار ہو چکا تھا۔ انہیں بھی یقین نہیں آرہا تھا کہ موت بازی لے گئی۔ اس سے پہلے کوئی روکتا، وہ مسجد کے صحن میں نکل آئے اور لوگوں کے بیچ کھڑے ہو کر چلانے لگے کہ یہ ناممکن ہے۔ اس پر لعنت ہو جو ایسا سوچتا ہو کہ، 'واللہ، محمدؐ مرے نہیں ہیں'، وہ اصرار کرنے لگے، 'موسیٰ کی طرح اپنے خدا کے پاس گئے ہیں، جیسے وہ چالیس دن کے لیے جا کر چھپ گئے تھے۔ آپؐ بھی ویسے ہی واپس آئیں گے جیسے موسیٰ آگئے تھے، حالانکہ لوگ کہتے تھے کہ وہ مر گئے ہیں۔ واللہ، رسول خدا انہی کی طرح واپس آئیں گے اور اپنے ہاتھ سے ان لوگوں کے ہاتھ اور ٹانگیں کاٹ دیں گے، زبان کھینچ لیں گے، جو یہ سمجھتے ہیں کہ وہ چل بسے'۔

اگر ان کا مقصد ہجوم کو شانت کرنا تھا تو یہ منظر جس میں عمر کی طرح کا ایک جری اور نڈر شخص ہسٹیریائی انداز میں نفی کا شکار تھا، لوگوں میں بے چینی اور ہول مزید بڑھ گیا۔ تب، غم سے نڈھال اور دکھ کے بوجھ سے جھکے ہوئے ابو بکر سامنے آئے اور عمر کے شانے پر ہاتھ رکھ کر دلاسہ دیتے ہوئے کہا، 'نرمی سے کام لو عمر، نرمی سے۔ چپ ہو جاؤ!' پھر انہوں نے عمر کو ہاتھ سے پکڑا اور ایک طرف لے گئے۔

لوگوں کی نظریں اب ابو بکر پر جمی تھیں جنہوں نے عمر کی جگہ سنبھال لی تھی۔ قرانی آیات کی تلاوت شروع کی تو ان کی آواز غیر متوقع طور پر خاصی مضبوط اور دو ٹوک تھی۔ لوگوں کو ابو بکر جیسے کمزور اور ناتواں شخص سے اس قدر ہمت اور صبر کی امید نہیں تھی۔ یہ قرانی آیات وہ تھیں جو احد کی لڑائی کے بعد اس وقت نازل ہوئی تھیں جب محمدؐ کے پیروکار، ان کی موت کی افواہ سن کر افراتفری میں میدان چھوڑ کر بھاگ نکلے تھے۔ 'محمدؐ اس کے سوا کچھ نہیں بس ایک رسول ہیں۔۔۔' ابو بکر نے زور دے کر مگر ٹھہرے ہوئے لہجے میں دہرایا، 'پھر کیا اگر وہ مر جائیں یا قتل کر دیے جائیں تو تم لوگ الٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟'

اور پھر اس کے بعد، ابو بکر نے وہ بات صاف صاف کہی جو لوگ اپنی زبان پر لانے سے قاصر تھے اور اس وقت ہر شخص اسی بات کو بلند بانگ آواز میں سننے کی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔ 'وہ جو محمدؐ کی عبادت کرتے ہیں' انہوں نے اعلان کیا، 'محمدؐ انتقال کر گئے ہیں۔ مگر وہ جو اللہ کی عبادت کرتے ہیں، جان لیں کہ اللہ زندہ ہے اور اللہ ہمیشہ باقی رہنے والا ہے'۔

مجمع پر پہلے تو ایک دم خاموشی چھا گئی۔ پھر دبی دبی سسکیاں سنائی دینے لگیں۔ عمر کو بھی فوراً ہی ہوش آگیا۔ بعد میں انہوں نے بتایا، 'واللہ، جب میں نے ابو بکر کو وہ الفاظ کہتے ہوئے سنا تو میں گم سم، سٹ پٹا کر رہ گیا۔ جب سمجھ آگئی کہ محمدؐ اب ہمارے بیچ نہیں رہے تو مجھ پر غشی طاری ہو گئی۔ میری ٹانگیں جواب دے گئیں اور میں دھڑام سے زمین پر گر پڑا'۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے۔ ایک بوڑھے شخص کے تحمل اور حقیقت پسندی نے عمر کی ہیبت کو دھیما کر دیا۔ ایک سخت جان غصیلا شخص، روتے ہوئے معصوم بچے میں بدل گیا۔ بشریت کی کمزوری، یعنی فنا پذیری کا یقین ہو گیا تو اب واقعی ماتم کا آغاز ہوا۔ مرد اور عورتیں دونوں ہاتھوں سے اپنے چہروں کو پیٹتے ہوئے، مکوں سے سینہ کوبی کرنے لگے۔ لوگوں کے جسم پٹنے سے گویا کھوکھلے درختوں کی طرح اتنی زور سے بجنے لگے کہ مسجد میں دھمک سنائی دینے لگی۔ کچھ ایسے تھے جو ناخنوں سے اپنی پیشانیاں نوچ رہے تھے۔ خون نکل کر آنکھوں میں بہنے لگا اور آنسو سرخ ہو گئے۔ عورتیں اور مرد ایک جیسے، زمین سے مٹی اور دھول اٹھا اٹھا کر اپنے سروں پر ڈالنے لگے۔ ہر شخص دل شکستہ تھا اور نڑاس میں شام تک آہ و زاری کرتا رہا۔ ماتم شام کے بعد بھی اور پھر رات بھر جاری رہا۔

محمدؐ کی تدفین بھی عجب رنگ کی تھی۔ مخفی اور نہایت سادگی کے ساتھ، رات کی تاریکی میں انتہائی پوشیدہ انداز میں جس طرح ان کو دفنایا گیا، بعد میں اس سے متعلق تقدیس کا روپ اور آج ان کے مزار پر ایک بلند و بالا، شاندار مقبرہ دیکھ کر عجب حیرت ہوتی ہے۔

علی اور محمدؐ کے تین انتہائی قریبی خونی رشتہ داروں نے عائشہ کے کمرے کا انتظام سنبھال لیا اور ان کی میت کو تیار کرنا شروع کیا۔ رواج کے مطابق یہ کام صرف قریبی رشتہ دار ہی سرانجام دے سکتے تھے۔ انہوں نے میت کو غسل دیا اور جسم پر جڑی بوٹیوں کو پیس کر تیار کی گئی گندھی ہوئی لئی کا لیپ کیا۔ انہیں کفن میں لپیٹ دیا اور جنازے کے پاس ہی بیٹھ کر دعا اور درود میں مشغول ہو گئے۔ یہ تو ان کے مشغولات تھے جبکہ باقی لوگوں کو دوسرے مسائل کا سامنا تھا۔ چونکہ جانشین کا تقرر نہیں ہوا تھا، اس لیے 'گمشدہ بھیڑوں کے ریوڑ' کو ایک 'چرواہے' کی ضرورت تھی۔ یعنی، ان کے سامنے اپنے ہی بیچ میں سے کسی شخص کو رہنما مقرر کرنے کا سخت مرحلہ درپیش تھا۔ اگر اب تک علی کو یہ یقین تھا کہ لوگ انہیں ہی رہنما چنیں گے تو ان کا یہ اعتماد گم ہو جائے گا۔ اگرچہ ابھی بھی مسجد کے احاطے میں لوگوں کی ایک بڑی تعداد غم سے نڈھال اور محزون ہو کر جمع تھی لیکن وہیں دوسری طرف مدینہ کے سردار اور محمدؐ کے باقی ساتھی 'ثوریٰ' میں جمع ہو گئے۔ ثوریٰ سے مراد پر اثر لوگوں کی وہ کونسل ہے جس کے ذمے اہم معاملات پر فیصلہ لینے کی ذمہ داری تھی۔ وہ اب ایک انتہائی اہم فیصلہ کرنے والے تھے، یعنی محمدؐ کے جانشین کی تقرری کی جائے گی۔

ثوریٰ کا اجلاس سوموار کو رات کے وقت شروع ہوا اور اگلے دن بھی جاری رہا۔ ہر کنبے اور قبیلے کے سردار اور بزرگ کے پاس فصاحت اور تفصیل سے کہنے کے لیے بہت کچھ تھا، اس لیے ایک بعد دوسری اور پھر دیر تک کئی تقاریر جاری رہیں۔ اس طویل اجلاس کی کامیابی کا دارومدار تمام لوگوں کے بیچ اتفاق رائے اور ہم آہنگی پیدا ہونے پر تھا۔ چونکہ یہ ایک انتہائی اہم معاملہ تھا، اجلاس تب تک جاری رہتا جب تک کہ اختلاف رائے رکھنے والے بالآخر عمومی رائے سے متفق نہ ہو جاتے، قائل کر دیے جاتے یا دلائل سے لاجواب کر کے انہیں اکثریت اپنے ساتھ ملا نہ لیتی۔ ایسے موقع پر گرما گرمی بھی ہو جاتی تھی، جو یہاں بھی ہوئی۔

علی محمدؐ کے ساتھ قربت اور گہری نسبت کی وجہ سے قدرتی طور پر موزوں ترین امیدوار لگتے تھے لیکن یہی قرابت اب ان کی مخالفت کا سبب بن جائے گی۔ دلیل یہ پیش کی گئی کہ چونکہ وہ محمدؐ کے انتہائی قریبی اور بالغ رشتہ دار ہیں، اگر انہیں خلیفہ مقرر کیا جاتا ہے تو اس سے امہ کے تصور کو شدید خطرات لاحق ہو سکتے ہیں۔ خدشہ یہ تھا کہ اس طرح امہ ایک موروثی ملوکیت میں بدل جائے گی، بادشاہت بن سکتی تھی اور یہ محمدؐ کے خیالات کی سراسر نفی تھی۔ یہ ان کی عمر بھر کی جدوجہد اور تحریک کی روح کے خلاف تھا۔ مزید کہا گیا کہ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنا جانشین خود مقرر نہیں کیا۔ انہیں اپنے لوگوں پر یقین تھا کہ وہ اپنے بیچ موزوں ترین شخص کو خلیفہ مقرر کر سکتے ہیں۔ وہ امہ کی حرمت اور تقدس کا بھرپور تحفظ کر سکتے ہیں، یا کم از کم وہ اپنے بیچ محمدؐ کی تعلیمات کی روشنی میں رہنما کی تقرری میں ان کے خیالات کی روح روانی تو کر ہی سکتے تھے؟

بلاشبہ، یہ دلائل جمہوریت کے حق میں تھے۔ تاہم، اس کا دائرہ کار خاصہ محدود کر دیا گیا تھا۔ یعنی، اس موقع کی مناسبت سے مکالمے کو ترتیب دینے کی کوشش کی گئی تھی۔ تاریخ کی ستم ظریفی یہ ہے کہ اس دن بڑھا چڑھا کر پیش کی جانے والی یہی دلیل پچاس برس بعد مٹی میں رول دی جائے گی۔ ابوسفیان کے فرزند، معاویہ دمشق میں پہلے سنی خاندان شاہی یا عہد سلسلہ شاہی کی بنیاد رکھیں گے۔ وہ مرنے سے پہلے اقتدار اور اختیار اپنے سب سے بڑے بیٹے یزید کو سونپ دیں گے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس دن پیش کی جانے والی یہ دلیل آنے والے دور میں صدیوں پر محیط دور میں تمام تر سلطنتوں، شہنشاہیوں، حکومتوں، بادشاہتوں اور صدارتوں کو رد کر کے امہ کے واقعی تصور کی ترجمانی کرتی ہے۔ اگرچہ اس دن، محمدؐ کے انتقال کے فوراً بعد اس دلیل کی فتح ہو گئی لیکن بعد اس کے، آج تقریباً تیرہ صدی گزر گئیں اور یہ انتہائی خوب استدلال ساکت اور جامد ہے۔ اس مناظرے کے نتیجے میں جنم لینے والا مکالمہ پھر دوبارہ کبھی بھی اپنی اصل روح کے ساتھ رائج نہیں ہو سکا۔

علی کے چچا عباس نے زور دیا کہ وہ محمدؐ کی میت کے ساتھ شب بیداری ترک کر سکتے ہیں۔ عباس نے کہا کہ وہ خود یہاں جنازے کے پاس موجود رہیں گے، علی کو چاہیے کہ وہ ثوریٰ کے اجلاس میں شریک ہو کر رہنمائی کے مسئلے پر جاری مکالمے میں حصہ لیں۔ اپنے حق کا دفاع کریں۔ لیکن، جیسے اس سے پہلے، پچھلی صبح وہ محمدؐ کے پاس جانے پر راضی نہ ہوئے تھے، اب دوبارہ انکار کر دیا۔ وہ اس شخص کو کیسے اکیلا چھوڑ دیتے جو ان کے باپ کی جا تھا۔ علی نے پوری زندگی محمدؐ کے زیر سایہ بسر کی

تھی اور آپؐ نے ان کی تربیت اور کفالت کی تھی، وہ اب ان کی میت کو کیونکر اکیلا چھوڑ دیتے؟ وہ نہیں جائیں گے۔ چنانچہ، وہ محمدؐ کی میت کے پاس ٹک کر بیٹھے رہے اور جب منگل کا دن ڈھل کر شام آئی تو اس کے ساتھ یہ خبر بھی آ گئی کہ شوریٰ نے بالآخر اتفاق رائے قائم کر کے حتمی فیصلہ کر لیا ہے۔ اسلام کے پہلے خلیفہ علی نہیں بلکہ ابو بکر ہوں گے۔

محمدؐ کو گزرے اب ڈیڑھ دن بیت چکا تھا۔ جون کی تپتی گرمی میں بوجوہ تدفین کا معاملہ جلد از جلد طے ہونا ضروری تھا۔ رسم تو یہ تھی کہ میت کو چوبیس گھنٹوں کے اندر ہی دفن کر دیا جائے لیکن چونکہ تمام چیدہ لوگ یعنی محمدؐ کے مشیران، قبائل کے سردار اور کنبے کے سربراہان شوریٰ میں مصروف تھے، اس لیے علی اور عباس کے پاس انتظار کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اب جبکہ یہ معاملہ طے ہو چکا تھا اور ابو بکر کی بطور خلیفہ تقرری ہو چکی تھی تو حالات کا دھارا دیکھتے ہی دیکھتے، چند گھنٹوں کے اندر بدل گیا۔ یقیناً، ابو بکر محمدؐ کی تدفین کا انتظام کچھ اس طرح کروائیں گے جو ان کے شایان شان تو ہو لیکن ساتھ ہی ان کا انتخاب، یعنی محمدؐ کے جانشین کی حیثیت کا بھی نہایت زوردار اظہار ہو۔ اب، علی کی باری تھی۔ وہ ابو بکر کو اس موقع سے محروم کر دیں گے۔

بدھ کے دن، صبح کے وقت منہ اندھیرے، عائشہ کی آنکھ مسجد کے احاطے میں کھرچنے اور کریدنے کے شور و غل سے کھل گئی۔ محمدؐ کی میت ان کے کمرے میں رکھی گئی تھی اس لیے وہ حفصہ کے ساتھ ان کے یہاں منتقل ہو گئیں۔ حفصہ کا کمرہ یہاں سے چند قدم کی دوری پر تھا۔ چونکہ وہ غم سے نڈھال تھیں، اس لیے باہر نکل کر دیکھنے کی ہمت نہیں پائی۔ اگر وہ اٹھ کر دیکھتیں تو انہیں پتہ چلتا کہ یہ شور پتھریلی زمین کھودنے کا ہے۔ علی اور ان کے قریبی رشتہ دار، کدال اور بیلچے تھامے محمدؐ کی قبر، عائشہ کے ہی کمرے میں تیار کر رہے تھے۔

بعد میں اس کی وجہ بتائی جائے گی کہ محمدؐ نے ایک بار کہا تھا کہ پیغمبر کو وہیں دفن کرنا چاہیے جہاں اس کی موت واقع ہوئی ہو۔ چونکہ، آپؐ کا انتقال اسی کمرے میں ہونے کے لیے بنائے گئے چبوترے پر ہوا تھا، آخری آرام گاہ بھی یہیں بننی لازم ٹھہری۔ ان کی قبر اس چبوترے کے قدمچے میں بنائی گئی۔ جب یہ ضرورت کے مطابق گہری ہو گئی تو میت کو بستر سمیت احتیاط سے اٹھا کر، سر مکہ کی جانب رکھتے ہوئے قبر میں اتار دیا۔ پھر جلدی سے قبر کا دہانہ پتھروں سے ڈھانپ کر مٹی ڈال دی گئی اور کیچڑ سے لپائی کر دی گئی۔ اس کے اوپر پتھر کا کتبہ بھی نصب کر دیا گیا۔

اس طرح، نمود و نمائش کے بغیر انتہائی سادگی سے محمدؐ کو دفنا دیا گیا۔ عوامی سطح پر آخری رسومات ادا کی گئیں اور نہ ہی جنازے کا اجتماع منعقد ہوا، نوحہ گروں کا جلوس نکلا اور نہ ہی ان کی بیاد منائی گئی، نوحے لکھے اور نہ ہی کسی نے ان کے قصیدے گائے۔ انہیں بس یوں ہی رات کی تاریکی میں اتنی ہی خاموشی سے دفنا دیا گیا جتنا غیر معروف کبھی ان کی پیدائش کا موقع رہا تھا۔ شاید، جس طرح کے انسان تھے، محمدؐ خود بھی اپنے لیے یہی طریقہ پسند کرتے۔ آج ان کی شخصیت بارے سوچیں تو یہی خیال آتا ہے قبر میں اتارا گیا ہو گا تو وہ ایک بار پھر سے 'صرف ایک انسان' بن گئے ہوں گے۔ عوامی تقاضوں اور تنقیح سے آزاد ہو کر نہایت مطمئن ہوں گے۔ ویسے بھی، زندگی کے آخر دور میں انہی تقاضوں، مجبوریوں اور ہمہ وقت توجہ دہی اور درکاری نے ان کی زندگی اجیرن کر کے چھوڑ دی تھی۔ سکون اور خاموشی، جس کے انہیں ایک عرصے سے تلاش تھی، میسر آ گئی۔ آخر کار، اب جا کر انہیں واقعی آرام مل گیا تھا۔

ماخذ/حوالہ جات

اوائل اسلامی تواریخ اور حوالہ جات

ان دونوں کتابوں 'دی فرسٹ مسلم' اور 'آفٹر دی پرافٹ' کو انگریزی زبان میں تحریر اور اردو زبان میں بالترتیب 'اول المسلمین' اور 'اول المسلمین کے بعد' کے عنوانات سے تراجم کرنے میں سب سے زیادہ الطبری (923–839) کے حوالہ کا استعمال کیا گیا ہے۔ الطبری کے بارے یہ ہے کہ وہ اسلامی دنیا میں ہر لحاظ سے، اوائل دور اسلامی کی تاریخ کا انتہائی مکرم اور مستند ذریعہ سمجھے جاتے ہیں۔ ان کی تصنیف 'تاریخ الرسل والملوک' انتہائی شاندار، متاثر کن اور یادگار کتاب ہے۔ اس تفصیلی تاریخ میں وہ قدیم زمانے، یعنی انجیل کے زمانے سے لوگوں اور پیغمبروں سے شروع ہو کر، قدیم فارس کی دونوں یعنی روایتی اور حقیقی تاریخ سمیت سارا حال سناتے ہیں۔ پھر وہ انتہائی تفصیل کے ساتھ اسلام کی تاریخ بیان کرتے ہیں جس میں وہ صدیوں کا حال جمع کرتے ہوئے اسلامی تاریخ کا دسویں صدی عیسوی تک کا مکمل، مفصل اور انتہائی مستند حال بیان کرتے ہیں۔ الطبری کی اس شہرہ آفاق تصنیف کا کئی زبانوں، بشمول انگریزی اور اردو میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ انگریزی میں اس کا ترجمہ مکمل کرنے کے لیے ایک انتہائی گراں قدر اور پر شکوہ منصوبہ بنایا گیا تھا جس کی ادارت کا کام احسان یار شاتر نے سرانجام دیا اور اسے نیویارک کی سٹیٹ یونیورسٹی نے انتالیس جلدوں میں شائع کیا۔ یہ اس قدر محنت طلب کام تھا کہ اسے مکمل کرنے میں تقریباً پندرہ برس لگ گئے، یوں 1985ء اور 1999ء کے دوران یہ کارگراں تکمیل تک پہنچا۔ انگریزی زبان میں اس کا عنوان 'ہسٹری آف الطبری' اور اردو میں یہی تراجم "تاریخ الطبری' کے نام سے دستیاب ہیں۔ زیر نظر دونوں کتابوں میں الطبری کی تاریخ کا بطور حوالہ استعمال بارے یہ ہے کہ من و عن روایات، مکالمے اور اصطلاحات استعمال کی گئی ہیں۔ کئی جگہوں پر داستان کی روانی کے لیے ان حوالہ جات کو سادہ عبارتوں میں تبدیل کر دیا گیا ہے، مگر ان کے حوالہ جات اور اصل ماخذ بھی ہر باب کے ساتھ دستیاب ہیں۔

تاریخ الطبری بارے کیا کہا جائے؟ یہ نہایت عمدہ کام ہے۔ تاریخ دانی کی زبان میں کہیے تو یہ ہر لحاظ سے، زمان و مکان کے طول و عرض میں غیر معمولی حیثیت رکھتی ہے اور انداز بیان تو نہایت بھلا ہے۔ الطبری، جن کا پورا نام ابو جعفر محمد ابن جریر الطبری ہے۔ انہیں لوگ الطبری کے نام سے جانتے ہیں، جس کی وجہ تسمیہ ابو جعفر محمد ابن جریر کی جائے پیدائش، طبرستان ہے۔ طبرستان بحر قزوین کے جنوبی ساحلوں پر واقع ہے۔ الطبری خود ایک سنی سکالر مشہور ہیں جنہوں نے علم و عرفان حاصل کرنے اور تاریخ مرتب کرنے کی غرض سے عباسی خلافت کے دور میں، بغداد شہر میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ اگرچہ انہیں سنی نظریات کا پیروکار قرار دیا جاتا ہے مگر ان کی ترتیب دیے ہوئے تاریخ کے اس حوالے کے بارے اکثر سنی مکاتب فکر ہمیشہ سے اس بات پر زور دیتے آئے ہیں کہ شاید انہیں شیعہ کی حمایت حاصل تھی یا وہ اس مسلک سے ہمدردی رکھتے تھے۔ یہ درست نہیں ہے۔ وجہ یہ کہ الطبری نے ایک نہایت عملی اور پیشہ ور انداز میں سینہ بہ سینہ چلی آ رہی زبانی تاریخ کو تحریر میں ڈھال کر ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا۔ اس مقصد کے لیے وہ سلطنت اسلامی کے طول و عرض کا سفر کرتے رہے، سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں لوگوں اور ہر طرح کے لوگوں کا انٹرویو کیا اور ساتھ ہی ساتھ ہر روایت اور بیان کو پورے حوالے، راوی کے حوالے سمیت تحریری شکل دیتے گئے۔ یہ کام اس قدر تفصیل اور احتیاط سے کیا گیا ہے کہ واقعات اور واقعات کا ماخذ بالکل صاف ہے۔ ہر واقعہ کے ماخذ کا اس وقت تک پیچھا کیا اور اسے تاریخ کا تبھی حصہ بنایا جب اس کے عینی شاہد یا حقیقی شخصیت کا حوالہ نہیں مل گیا۔ یعنی، ہر روایت اوائل دور میں جا کر دم لیتی ہے۔ اس طرح تاریخ الطبری میں وہ رنگ اتر آیا ہے جو مغرب کی اپنی تواریخ میں بھی کبھی ممکن نہیں رہا، یعنی الطبری کی تاریخ ہر لحاظ سے غیر جانبدار اور مورخ سے بے تعلق ہو جاتی ہے۔ ساتویں صدی سے گونجتی ہوئی روایات، (یعنی شیعہ اور نہ ہی سنی) نہ صرف ان کی آواز جن سے الطبری کی ملاقات رہی بلکہ ان کی بھی، جن کی یہ تاریخ ہے اور جن کا احوال سنایا جا رہا

ہے،اس طرح ترتیب دی گئی ہیں کہ جیسے وہ شخصیات سید حاقاری سے مخاطب ہوں،یعنی بیچ میں کوئی قلمی اور ذاتی خیال کی رکاوٹ حائل نہیں ہے۔کہیے،یہ لفظ بہ لفظ بیانات ہیں۔اس جان توڑ محنت کا نتیجہ یہ ہے کہ تاریخ الطبری اس قدر واضح اور بیانیہ اتنا صاف ہے کہ قاری منظر میں کھب جاتا ہے اور تحریر میں عینی شاہدین کا انداز، آواز میں اتار چڑھاؤ،مزاج اور طور بھی صاف صاف نظر آتا ہے۔وہ جو بولتے ہیں،کہو تحریر میں صاف سنائی دیتا ہے۔یہ کمال ہے۔الطبری کے مقابلے میں جتنی بھی باقی تواریخ لکھی گئی ہیں،وہ تقابل کرنے پر انتہائی خشک اور روح سے خالی نظر آتی ہیں۔

الطبری نے زبانی روایات کو اوائل دور کی میسر تواریخ سے بھی ملایا ہے،بلکہ دوہری محنت کر رکھی ہے اور ہر قدم پر یہ کوشش کی ہے کہ کسی بھی طرح سے وہ یا ان کے زمانے کی تواریخ یا ان کے ذاتی خیالات اس شاندار علمی خدمت میں مداخل نہ ہو سکیں۔یہ کام انہوں نے اتنی جانفشانی اور ایمانداری سے سرانجام دے رکھا ہے کہ ان کی اپنی لکھی ہوئی چند دوسری تصانیف اور حوالہ جات کو وہ خود اپنے ہاتھ سے مسترد کر دیتے ہیں۔تاریخ الطبری میں جب واضح اور حقیقی بیان مل جاتا ہے تو وہ اپنی ان باقی تصانیف کو،جو اس کام سے پہلے مرتب کی تھیں،معمولی سا فرق دیکھنے پر بھی خود رد کر دیتے ہیں۔ان تصانیف اور علمی کاوش کا کسی بھی طرح سے اس تاریخ میں نہ تو حوالہ شامل کیا گیا ہے اور نہ ہی انہیں محفوظ رکھا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کی اپنی اور کئی دوسری تصانیف ان کے حکم پر یا تو تلف کر دی گئیں یا پھر ان کے بارے الطبری نے خود ہی اس حتمی تاریخ کے اندر باور کرا دیا کہ آئندہ استعمال نہ کی جائیں بلکہ جہاں ملیں،ضائع کر دی جائیں۔لیکن،جو حوالہ جات مستند تھے یا تہہ در تہہ تحقیق کے بعد بھی باقی رہے،ان کا الطبری نے اس تاریخ میں خوب استعمال کیا ہے۔مثلاً 680ء میں پیش آنے والے سانحہ کربلا کی زیادہ تر روایات انہوں نے 'کتاب مقتل الحسین' سے نقل کی ہیں جو ابو مخنف کوفی کی تصنیف ہے۔کوفی نے یہ کتاب کربلا کے واقعہ کے صرف پچاس سال بعد تحریر کی تھی اور یہ اس طرح مستند ہے کہ عینی شاہدین کے بیانات،اقوال اور خیالات مل جاتے ہیں۔اس کتاب کے راویوں میں کربلا میں بچ جانے والے،حسین کے واحد فرزند علی زین العابدین کے بیانات بھی قلم بند کیے گئے ہیں۔

قارئین میں وہ لوگ جو مشرق وسطیٰ کے مشہور و معروف،انتہائی خوب اور آزاد انداز بیاں میں دلچسپی رکھتے ہیں،الطبری کا مطالعہ ان کے لیے نہایت فرحت بخش تجربہ ہو سکتا ہے۔لیکن ظاہر ہے،ہم عام طور پر ایک ہی خط پر،گنے چنے اصولوں کے پابند اور قطعیت سے لکھی گئی کتابیں پڑھنے کے عادی ہیں تو عام قاری،اس سے لطف نہیں اٹھا سکتا۔ایسا ہو بھی سکتا ہے مگر یوں کیسے،اس کے لیے ذہن بنانا پڑتا ہے مگر جب ایک دفعہ ذہن بن جائے تو یقین جانیے،مطالعے کا اس سے زیادہ پر لطف تجربہ دوسرا کوئی نہیں ہے۔الطبری کی تاریخ اٹھا کر دیکھیں تو اکثر ہوتا یہ ہے کہ ایک ہی واقعہ یا مکالمے کو بار بار،اکثر تو درجن بار بیان کیا گیا ہے۔ہاں یہ ہے کہ، ہر روایت کو مختلف راویوں کی زبانی بیان کیا گیا ہے۔یوں ہوتا یہ ہے کہ بیانات شخصی حوالہ جات کی وجہ سے زمانے میں آگے اور پیچھو جھولتے رہتے ہیں،مگر دلچسپ عنصر یہ ہے کہ ہر روایت میں کچھ نہ کچھ ایسا ضرور مل جاتا ہے جو پہلے گزر جانے والی روایت میں نہیں تھا۔یعنی یا تو راوی بھول گیا تھا یا اس کا نقطہ نظر دوسرے سے مختلف رہا تھا،مگر اس واقعہ یا مکالمے کا ہر صورت پورا حال احوال آخر میں مکمل مل جاتا ہے۔یوں کئی راویوں اور انداز بیانات کو جمع کرنے سے ہر واقعہ یا مکالمے کے بارے پہلے یہ لگتا ہے کہ شاید کھلی چھوٹ ہے،اس انداز بیان کا ڈھانچہ بھی کوئی نہیں ہے مگر آخر تک پہنچیں تو معاملہ بالکل شیشے کی طرح صاف ہو جاتا ہے۔ہر چیز جگہ پر بیٹھ جاتی ہے اور بڑے منظر نامے پر ایک نہایت واضح ڈھانچہ بن کر انتہائی خوبصورتی سے پس منظر اور زیر نظر ماحول میں فٹ ہو جاتا ہے۔یوں تاریخ بنتی جاتی ہے اور داستان کھلتی جاتی ہے۔

اب،یہ نکتہ انتہائی اہم ہے،قارئین کی بھرپور توجہ درکار ہے۔بات یہ ہے کہ الطبری کے طریقہ کار کو دیکھیں تو ہمیں ہر واقعہ کی کئی روایات مل جاتی ہیں،بہت سے راوی ہیں اور کئی زاویے ہیں۔لیکن،آپ نے ملاحظہ کیا ہو گا کہ ان دونوں کتابوں 'اول المسلمین' اور 'اول المسلمین کے بعد' میں،ہر جگہ،ہر واقعہ اور ہر مکالمے کا ایک ہی نسخہ استعمال ہوا ہے جو اصل میں ایک نسخہ نہیں ہے۔اصل کتابوں یا تراجم میں الطبری کی طرح کسی بھی واقعہ یا مکالمے کے درجن بھر حوالے شامل نہیں کیے

گئے۔ یہ بات جیسے کہ اوپر بیان کی گئی، درست ہے کہ اصل تاریخ، یعنی الطبری کی تاریخ میں یہ ایسے ہی ہے، یعنی ایک واقعہ یا مکالمے کی کئی روایات ہیں جنہیں مختلف گواہوں اور راویوں نے بیان کر رکھا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انگریزی میں مصنفہ اور اردو میں مترجم نے ایک ہی مکالمہ یا حوالہ کیوں شامل کیا ہے؟ یا وہی الفاظ کیوں استعمال کر رکھے ہیں جو ان دونوں کتابوں میں ہم پڑھتے ہیں؟ یہ انتہائی اہم سوال ہے اور اس کا جواب قاری کے لیے اتنی ہی اہمیت کا حامل ہے۔ ہوا یہ ہے کہ، الطبری کی اصل تاریخ میں ہر واقعہ یا مکالمے کے کئی راوی ہیں، بہت سے زاویے ہیں۔ مگر لے دے کر، آخر میں ہر واقعہ یا مکالمے کا احوال اس قدر واضح ہو جاتا ہے کہ معاملہ صاف ہو جاتا ہے۔ تقریباً سب ہی روایات کا بہاؤ ایک ہی جیسا ہے، جو فرق ہے وہ الفاظ کے چناؤ کا ہے، یا جس شخص نے روایت کی اس کے انداز کا ہے، یا جس شخص کو روایت کیا ہے، اس کی طبیعت اور اس کے بارے روایت کرنے والے کا نکتہ نظر ہے۔ یوں ان روایات میں جہاں الفاظ یا بول چال میں فرق ہے، اکثر تفاصیل بھی کم یا زیادہ ہو جاتی ہیں۔ یعنی یہ کہ ایک شخص کو اگر یہ بات یا انداز یاد رہا تو دوسرے شخص کو کچھ حصہ یا تیسرے شخص کو ان دونوں سے زیادہ واضح یاد ہے۔ یعنی، ماخذوں کی یادداشت کا بھی عمل دخل ہے۔ خیر، مصنفہ کا انگریزی میں اور مترجم کا اردو میں، طریقہ کار یہ رہا ہے کہ ایک ہی واقعہ یا مکالمے کی کئی روایات میں چھان بین کر کے یہ فیصلہ کیا گیا ہے کونسی روایت استعمال کی جائے یا زیادہ واضح کرنے کے لیے، کون کون سی روایات کو جوڑ دیا جائے یا کئی روایات کو جوڑ کر ایک بنا لیا جائے تاکہ ماحول اور پس منظر کے عین مطابق، صورتحال واضح ہو جائے۔ اسی طرح، اس بات کا بھی بھرپور خیال رکھا گیا ہے کہ انگریزی یا اردو میں ترجمہ کرتے وقت الفاظ کا چناؤ بھی ایسا ہو کہ آخر میں مدعا بیان ہو جائے، صوت سے یا لفظوں کی نفسیات سے ہر واقعہ یا مکالمے کا اصل نکل کر باہر آجائے۔ مقصد صراحت اور وضوح پیدا کرنا ہے۔ یاد رہے، کسی بھی موقع پر، کسی بھی جگہ پر، ہرگز ہرگز نہ تو انگریزی اور نہ ہی اردو میں، مرصع نگاری سے کام لیا گیا ہے اور نہ ہی اصل بیانات میں کہیں کچھ کمی یا بیشی کی گئی ہے۔ کتابوں کے دونوں نسخوں، چاہے انگریزی یا اردو میں مطالعہ کرنے پر یہی محسوس ہو گا کہ ہر قدم پر، چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی تفصیل اس طرح بیان کی گئی ہے کہ بجائے عمومیت، اصلیت نکل آئے۔ اسی لیے بیان سادہ، سلیس اور واضح ہے اور تفاصیل خاصی براہ راست یا بلا واسطہ بن جاتی ہیں۔

یہ تو ان روایات کا احوال ہے جہاں بیانات جمع ہو کر ایک ہی نتیجے کا باعث بن جاتے ہیں، یعنی روایات میں انیس بیس کا فرق ہے، زیادہ نہیں۔ لیکن کئی واقعات ایسے بھی ہیں جن کی الطبری کی تاریخ میں مختلف روایات مل جاتی ہیں اور کئی بیانات تو ایک دوسرے کے متضاد ہیں۔ اس صورت میں، اصل نسخے، انگریزی اور اردو میں ترجمہ کرتے ہوئے ان تضادات کا پوری طرح خیال رکھا گیا ہے اور احتیاط برتی گئی ہے۔ یہ بات باور کرانا انتہائی لازم ہے کہ مصنفہ اور مترجم نے اس ضمن میں الطبری کا ہی انداز اپناتے ہوئے اس پر فیصلہ یا حتمی رائے دینے کی بجائے اس پر تکیہ کیا ہے جو الطبری کا بھی خاصہ ہے۔ الطبری اپنی تاریخ کے ابتدائیہ میں لکھتے ہیں، 'ہر چیز جو یہاں بتائی گئی ہے، اس کے لیے میں نے پوری تحقیق سے کام لے کر، مستند حوالہ جات سے مزین ایسی بنیاد رکھی ہے جس پر میں خود بھروسا کر سکتا ہوں۔ یاد رہے، یہ بنیاد زبانی بیانات اور کلامی روایات پر کھڑی ہے جو کئی کئی راویوں سے منسوب ہیں۔ اس بنیاد میں استعمال ہونے والا علم اطلاع دینے والوں اور راویوں کے اصل بیانات سے حاصل کیا گیا ہے۔ اس علم میں کسی بھی طرح سے مصنف کے ذاتی خیالات، سمجھ، عقل، جذبات یا بصارت کی کھوٹ داخل نہیں ہے۔ اگر اس کتاب میں ماضی کی کسی شخصیت بارے بیانات یا ان شخصیات کے اپنے بیانات شامل کیے ہیں، جو بعض لوگوں کے لیے باعث تشویش یا تکلیف ہو سکتے ہیں، وہ یاد رکھیں کہ اس کی ذمہ داری ہماری نہیں بلکہ اس شخص کی ہے جس نے یہ ہم تک پہنچایا، یا اپنی ذمہ داری پر روایت کر رکھا ہے۔ یعنی، اس تاریخ کی ذمہ داری راویوں پر ہے۔ ہم نے ان کے بیانات، اقوال اور روایات کو من و عن اسی طرح لکھ دیا ہے جس طرح یہ ہم تک پہنچے تھے'۔

محمدؐ کی سب سے پہلی سوانح حیات ابن اسحاق نے ترتیب دی تھی۔ ان کی جمع کی ہوئی یادداشتوں کے مجموعہ کو 'سیرت الرسول اللہ' کہا جاتا ہے اور یہی یادداشتیں آج تک دنیا میں جتنی بھی سیرت کی کتابیں لکھی گئی ہیں، ان کی بنیاد ہیں۔ الطبری کی لکھی ہوئی تاریخ کی ہی طرح ابن اسحاق کی 'سیرت رسول' بھی اسلامی دنیا میں ہر جگہ

مستند حوالہ سمجھی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ خود الطبری نے محمدؐ کی زندگی بارے چار جلدوں کے تقریباً مندرجات ابن اسحاق سے ہی مستعار لیے ہیں، جن پر مکمل تحقیق کی گئی۔

محمد ابن اسحاق 704ء کو مدینہ میں پیدا ہوئے اور 767ء کو بغداد میں وفات پائی۔ ان کی جمع کی ہوئی 'سیرت رسول اللہ' کی یادداشتوں کا اصل مسودہ اب ناپید ہے، کیونکہ ان کے زمانے میں تحریر لکھنا اور پھر اسے باقی رکھنا انتہائی مشکل رہا کرتا تھا۔ لیکن ان کی اصل یادداشتوں اور حوالہ جات کو ہی استعمال میں لاتے ہوئے بصرہ میں پیدا ہونے والے تاریخ دان ابن ہشام نے 'سیرت ابن ہشام' ترتیب دی تھی، جس میں ابن اسحاق کے اصل نسخوں کو وسعت دی گئی اور اس میں مزید تحقیق شامل ہوئی۔ ابن ہشام نے فسطاط (قاہرہ)، یعنی مصر میں بسر رکھی۔ ابن ہشام کے ہاتھوں ترتیب پانے والی، ابن اسحاق کی 'سیرت رسول' کا 1955ء میں انگریزی ترجمہ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس نے ممکن بنا کر شائع کروایا۔ یہی انگریزی نسخہ، زیر نظر دونوں کتابوں کے لیے بھی استعمال کیا گیا ہے۔

الطبری اور ابن اسحاق کے علاوہ یہاں اوائل دور کے دو مزید مورخین کا ذکر انتہائی ضروری ہے۔ پہلے مورخ بلازری ہیں، جنہوں نے الطبری کی تاریخ کو استعمال میں لاتے ہوئے تاریخ اسلامی میں مزید فصاحت اور نفاست پیدا کی۔ ابو الحسن احمد بن یحیی بلازری فارس میں پیدا ہوئے اور سکونت بغداد میں رکھی اور یہیں 892ء میں وفات پائی۔ ان کی تصنیف، 'فتوح البلدان' یعنی عربوں کی ملکی فتوحات کا انگریزی ترجمہ 1924ء میں نیویارک کی کولمبیا یونیورسٹی پریس نے شائع کیا۔ اسی طرح ان کی دوسری کتاب، 'انساب الاشراف' یعنی 'عربوں کی حسب نسبی تاریخ'، جس میں تمام خلفاء اور زیر نظر دونوں کتابوں میں جتنی بھی شخصیات کا ذکر آیا ہے، ان کے حسب اور نسب کا پورا بیان ملتا ہے، تحقیق کے لیے دستیاب رہی۔ اگرچہ بلازری کی اس کتاب کا انگریزی ترجمہ تو نہیں ہے مگر کوشش کر کے اس کو عربی اور فارسی زبان کی سمجھ رکھنے والے احباب کی مدد سے پوری طرح استعمال میں لایا گیا ہے۔

دوسرے مورخ ابن سعد ہیں۔ یہ وہ ہیں جنہوں نے اوائل دور اسلام کی تقریباً شخصیات کی سوانح حیات لکھ رکھی ہیں۔ ابن سعد کی لکھی ہوئی تاریخی سوانح حیات، بعد کے تقریباً سب ہی مورخین کے لیے مستند حوالہ رہی ہے، یہاں تک کہ الطبری نے بھی ابن سعد کی تصانیف کا بھرپور استعمال کیا ہے۔ ابن سعد 764ء میں بصرہ شہر میں پیدا ہوئے، بغداد میں سکونت اختیار کی اور یہیں 845ء میں وفات پائی۔ انہوں نے 'کتاب الطبقات' لکھی، جو نو جلدوں پر مشتمل ہے۔ ان نو جلدوں میں محمدؐ، محمدؐ کے اصحاب، اوائل دور کی چیدہ شخصیات اور سکالروں اور بالخصوص خواتین کا حسب نسب، کردار اور زندگیوں کا حال تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ ابن سعد کی اس ضخیم تصنیف میں سے منتخب شدہ اقتباسات کا انگریزی ترجمہ بھی ہوا۔ انگریزی زبان میں یہ کل دو نسخے ہیں۔ پہلا، 'مدینہ کی خواتین' 1995ء میں اور دوسرا 'مدینہ کے حضرات' 1997ء میں شائع ہوا۔

قرانی نسخے اور تفاسیر

زیر نظر دونوں کتابوں کو ترتیب دینے اور اردو ترجمہ کرنے کے لیے قرانی آیات کو بھی بطور حوالہ شامل کیا گیا ہے۔ اس مقصد کے لیے قران کے ایک سے زیادہ انگریزی اور اردو نسخے استعمال میں لائے گئے، تاکہ بیان، پس منظر اور ماحول کے عین مطابق واضح رہے اور مصنفہ یا مترجم سے کسی بھی قسم کی چوک نہ ہونے پائے۔ یاد رہے، یہاں اصطلاح 'نسخے' استعمال کی گئی ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ مصنفہ اور مترجم یہ سمجھتے ہیں کہ بنیادی اسلامی عقیدہ کے مطابق قران، الہامی کتاب یعنی خدا کا کلام ہے۔ ماننا یہ ہے کہ الہامی کتاب کا ترجمہ نہیں کیا جا سکتا اس لیے ترجمہ کہنا مناسب نہیں۔ دوسری زبانوں میں یہ اصل کلام کا ترجمہ نہیں بلکہ توضیح ہوتی ہے، یعنی صرف اظہار ہے۔ اسے ایسا ہی سمجھا گیا ہے، یہ اصل نسخوں کا ہرگز متبادل نہیں ہیں۔ بہر حال، ضرورت کے تحت انگریزی زبان کے استعمال کیے گئے قرانی نسخوں

میں ایڈورڈ پالمر 1900ء، آربیری 1955ء، داؤد 1956ء اور لیلیٰ بختیار 2009ء جبکہ اردو زبان میں مودودی، جالندھری، عثمانی اور تھانوی کے نسخے شامل ہیں۔

علمی، مسلکی اور تحقیقی حوالہ جات

اوپر بیان کردہ اہم اور کلیدی حوالہ جات کے علاوہ بھی کئی مورخین، نظریہ کاروں، شیعہ سکالرز، سنی سکالرز اور مشرقی و مغربی محققین کے علمی کام کو استعمال میں لایا گیا ہے۔ ان میں سے اکثر کے کام کو ان کے نام کے ساتھ دونوں کتابوں میں شامل کیا گیا ہے لیکن کئی جگہوں پر چاشنی برقرار رکھنے کی وجہ سے ایسا ممکن نہیں رہا۔ بہر حال، یہ اہم ہے کہ ان کا ذکر کیا جائے۔ ان حوالہ جات کی مکمل فہرست زیر نظر دونوں کتابوں کے انگریزی نسخوں کے آخر میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

– ختم شد –

9 781716 559327

جملہ حقوق محفوظ ہیں(2020ء)
www.omerbangash.com